ناول
کرے ناتھ
محمد حفیظ خان

کرک ناتھ

ناول

محمد حفیظ خان

اِسی قلم سے

- کچ دیاں ماڑیاں (سرائیکی ریڈیائی ڈرامے)۱۹۸۹ء
- ویندی رُت دی شام (سرائیکی افسانے)۱۹۹۰ء
- ماما جمال خان (بچوں کے سرائیکی ڈرامے)۱۹۹۰ء
- اتفاق سے نفاق تک (پاکستانی سیاست)۱۹۹۳ء
- یہ جو عورت ہے (اردو افسانے)۱۹۹۷ء
- پہلی شب تیرے جانے کے بعد (اردو نظمیں)۱۹۹۹ء
- خواب گلاب (بچوں کے سرائیکی ڈرامے)۲۰۰۲ء
- اندر لیکھ دا سیک (سرائیکی افسانے)۲۰۰۴ء
- ڈُھڑے پندھ (سرائیکی ریڈیائی ڈرامے)۲۰۰۵ء
- نوآبادیاتی خطوں کا نیا مکالمہ (تنقید)۲۰۰۶ء
- خرم بہاول پوری: شخصیت و فن (تحقیق و تنقید)۲۰۰۷ء
- حفیظ خان کی کہانیاں (سرائیکی سے اردو ترجمہ)۲۰۰۷ء
- کوئی شہر ین جنگل کو کدا (سرائیکی ٹیلی ڈراما سیریل)۲۰۰۸ء
- اس شہر خرابی میں (اردو کالموں کا انتخاب)۲۰۰۸ء
- سرائیکی ادب: افکار و جہات (تنقید)۲۰۰۹ء
- آثارِ ملتان (تاریخ)۲۰۱۱ء
- کلام خرم بہاول پوری (تدوین و انتخاب)۲۰۱۳ء
- ڈھیر ڈینہاں دا قصہ (سرائیکی ادبی تنقید)۲۰۱۴ء
- رُت جگوں کی مراد (تنقید)۲۰۱۶ء
- تن من سیس سریر (اردو کہانیاں)۲۰۱۶ء
- پٹھانے خاں: شخصیت اور گائیکی ۲۰۱۷ء
- ملتان نصف جہان (تاریخ)۲۰۱۷ء
- سرکشی (اردو کالم)۲۰۱۷ء
- کافی: سندھ وادی کی شعوری تاریخ (تنقید)۲۰۱۲ء اور ۲۰۱۷ء
- ادھ ادھورے لوک (سرائیکی ناول)۲۰۱۸ء
- ادھ ادھورے لوک (اردو ناول)۲۰۱۸ء
- انواسی (اردو ناول)۲۰۱۹ء
- کرک ناتھ (اردو ناول)۲۰۲۰ء
- لاہور جان (اردو کہانیوں کا انتخاب)۲۰۲۰ء
- مختارا (اردو ناول)۲۰۲۱ء
- ہک رات دا تجھ (سرائیکی ٹیلی ڈراما سیریل)۲۰۲۱ء
- زناخ (اردو ناول)۲۰۲۲ء

اشاعت: اوّل
۲۰۲۲ عیسوی
ایک ہزار

زیر اہتمام:
قاضی محمد زکریا

کمپوزنگ:
کونین حیدر

سرورق:
وزیر حسن چندا

پروسیسنگ
Premier Process
7-C/6, Havelock Road, Colony
Lucknow - 226001 (INDIA)

طباعت:
لکشمی آفسیٹ
نخے گاندھی پورم
فیض آباد روڈ، لکھنؤ

Karak Nath
(Novel)
By : Muhammad Hafeez Khan

Edition
2022

₹ 600.00

MATTERLINK PUBLISHERS
1870, Ist Floor Likhraj Dollar, Indira Nagar, Lucknow
E-mail: aglawaraq@gmail.com, intisharaat@gmail.com
Website: www.matterlinkbooks.com

ISBN 978-93-90887-70-5
9 789390 887705 >

معاشرے میں پھیلی ہوئی کالک
کے نام
اس آس کے ساتھ کہ کہیں کوئی روشنی کی درز دِکھائی دے۔

﴿۱﴾

مبشر رضا کے ساتھ عجیب معاملہ تھا۔ کہنے کو تو وہ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کاپی رائٹر تھا مگر شہرت یہی تھی کہ نسوانی وجود سے کراہت کی حد تک بیگانگی کے باوجود وہ اپنے آس پاس کی ہر جوان لڑکی کو اپنی کامل دسترس میں رکھنا چاہتا ہے کچھ اس طرح کہ وہ اُس کی نہ ہوتے ہوئے بھی صرف اُسی کی ہو کر رہے۔ سانس بھی لے تو اُس کی رضا سے اور زندگی کرے تو اُس کی منشا کے تحت، اُسی کی ڈھب پے۔ بظاہر ایسا بھی نہیں تھا کہ محض قبول صورت ہوتے ہوئے بھی اُس میں مردانہ وجاہت کی کہیں کمی رہی ہو مگر اپنی طرف کھنچی چلی آنے والی ہر حسینہ سے کھنچا کھنچا رہنا اُس کا وطیرہ ہو چلا تھا۔ مگر یہ بات الگ کہ اُس کی لکھی ہوئی ہر لائن، اُس کے تخلیق کیے ہوئے ہر اسکرین پلے اور اُس کی ڈیزائن کی ہوئی ہر اشتہاری کمپین صرف اور صرف عورت کے گرد گھوما کرتی۔ یوں لگتا تھا کہ اُس کا تخلیقی جوہر عورت پر ہی کھلتا اور عورت پر ہی نکتۂ کمال کو پہنچتا ہے۔ اُس کے ناقدوں کے نزدیک نسائی خبط میں مبتلا وہ ایک ایسا جنونی تھا کہ جس کی تخلیقی صلاحتیں عورت کے وجود میں مقید اور اُس کی چشم ہنر عورت کے بدن کے زاویوں سے آگے دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر پھر بھی واقفان حال کے مطابق اُس کے ذاتی حصار میں کسی عورت کا وجود تو کیا اُس کا سایہ تک موجود نہیں تھا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اُس کی ایسی ویسی شہرت کیسے اور کیونکر ہوئی۔

کہنے کو تو اپنے ظاہر کی حد تک مبشر رضا کچھ ایسا مال دار بھی نہیں تھا اور نہ ہی کسی قابل فخر خاندانی وراثت کا وارث یا ضرورت سے زیادہ تنخواہ کا تنخواہ دار مگر پھر بھی اپنی طبع، مزاج اور ظاہر داری سے اس طرح دکھائی دیتا کہ جیسے لاکھوں میں کھیلتا ہو، کروڑوں لٹاتا ہو۔ وہ خالی

جیب ہو کر بھی آسودہ حال اور خالی پیٹ ہوتے ہوئے بھی کھایا پیا دکھائی دیتا تھا۔ مبشر کی عمر چالیس برس ہو چلی تھی مگر مجال ہے کہ عمر کے دوسرے پہر کے آغاز میں رونما ہونے والی تنزلی آمیز تبدیلیوں کا شائبہ تک اُس کے چہرے مہرے سے دکھائی دیتا ہو۔ ہاں یہ بات اور کہ تیزی سے گزرنے والے برسوں نے ہر آنے والے برس میں اُس کی کنپٹیوں پر اُگنے والے اِکا دُکا سفید بالوں کو اِس طرح سے ترتیب دے رکھا تھا کہ وہ اُس کی شخصیت میں بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی جنسی بے حسی کو بھی فراواں کیے چلے جا رہے تھے جو عورت ذات کے لیے ہمیشہ سے باعث کشش رہے ہیں۔ وہ جانتا تھا یا نہیں جانتا تھا کہ عورت اولیں مرحلے میں اُسی مرد کی جانب ٹوٹ کر لپکتی ہے جو اُسے بے اعتنائی سے دیکھے اور بے حسی سے برتے مگر ان دونوں رویوں نے مبشر کی شخصیت کے گرد ایک عجیب سا حصار قائم کر رکھا تھا کہ جو اُس کے آس پاس موجود خواتین کو مضطرب کیے رکھتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا، کسی قسم کا کوئی سماجی منصب یا مرتبہ نہ ہوتے ہوئے بھی ہر عمر کی عورت کا مرکزِ نگاہ ٹھہرتا مگر اُس کی کوشش بہر صورت یہی ہوتی کہ اُن کی طرف دیکھنا تو کیا، اُن کی موجودگی کو ہی نظر انداز کیے رکھے۔

عجیب بات تھی کہ مبشر کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو ایک طرف رکھتے ہوئے اگر اُسے اجزا میں دیکھا جاتا تو وہ اچھا خاصا بدصورت واقع ہوا تھا۔ سانولی رنگت، درمیانی کاٹھی کا دبلا جسم، ناک ایسا نہ تھا کہ جس کی ستائش کی جاتی، آنکھیں چھوٹی اور مخاطب کے روبرو عموماً جھکی رہنے والی، ہونٹ مردوں کے ہونٹوں کے برعکس باریک اور پتلے جن پر خشکی کی علامات ہر وقت نمایاں، گردن نہ زیادہ لمبی اور نہ ہی نہ دکھائی دینے والی، ہاتھ پاؤں کا سائز باقی بدن کے تناسب سے کچھ کم اور چہرے پر ہر وقت ایک بے نام سی اُکتاول اور کنفیوژن۔ کام کو ہمہ وقت سر پر سوار کیے رکھنا، آنکھوں میں بے چینی اور باقی کا سارا جسم مسلسل حالتِ اضطراب میں۔ لیکن جب یہ سب کچھ اکٹھا جوڑ کر دیکھا جاتا خاص طور پر کسی دوشیزہ کی موجودگی میں تو ایک الگ سے مبشر رضا وجود پاتا، پرکشش اور سالم و ثابت مبشر رضا، ایک عجیب سی گھمبیرتا لیے ہوئے، بے اعتنائی سے دیکھتا اور بے حسی سے چھلکتا ہوا۔

اِس "سونے پر سہاگہ" اُس کی انتہائی کم گوئی اور کم آمیزی نے کر رکھا تھا۔ بہت سی

باتوں کا جواب تو محض ہوں ہاں یا گردن کا دائیں بائیں یا اوپر نیچے ہلا دیا جانا کافی ٹھہرتا۔ وگرنہ چار پانچ جملوں میں کی جانے والی استفساریہ گفتگو کا جواب ایک آدھ جملہ اور وہ بھی دو تین لفظوں کا۔ دفتر کے اکثر لوگوں کے نزدیک مبشر بیمار ذہنیت کا ایک ایسا متکبر شخص تھا جس کے پاس غرور کرنے کو نہ تو کوئی وصف تھا اور نہ ہی کوئی جواز۔ جب کہ کچھ کے تئیں اُس کی کھوکھلی شخصیت میں کچھ بھی نہیں تھا ماسوائے شخصی نرگسیت کے جسے مسلسل محرومیوں نے آدم بیزاری سے مردم آزاری کی نوبت تک پہنچا رکھا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود وہ اپنے کام میں ماہر اور کلائنٹس کا پسندیدہ ترین کاپی رائٹر گردانا جاتا تھا۔ ملکی کاروباری ادارے ہوں یا ملٹی نیشنل، سبھی کی خواہش ہوتی کہ اُن کے پراڈکٹ کی اشتہاری مہم کا مسودہ مبشر رضا کا لکھا ہوا ہو۔ وہ نہ بکنے والی چیز کے بارے میں بھی انتہائی مختصر مگر اس قدر موثر سلوگن لکھتا کہ الیکٹرانک میڈیا پر محض سات سیکنڈ کا اشتہار چلتے ہی مٹی سونا بن جاتی۔ اِسی سبب نہ چاہتے ہوئے بھی جہاں وہ ملک کی سب سے بڑی اشتہاری کمپنی "مہ نور" کی مالکن زفیرہ احمد کا چہیتا تھا وہاں دفتر کے چپڑاسی سے لے کر اکاؤنٹنٹ تک سبھی کی خفی نفرت کا نشانہ بھی۔ خفی اِس لیے کہ نفرت کے اعلانیہ اظہار کی صورت میں اُن کی اپنی ملازمت داؤ پر لگ سکتی تھی۔ زفیرہ احمد کیسے گوارہ کرتی کہ اُس کی کمپنی کا کماؤ پوت اُسے چھوڑ کر کسی اور مخالف کے ہاتھ لگے۔ لہٰذا وہ دفتری مراعات جن کے لیے دوسرے ملازموں کو کئی کئی مہینے ترلے کرنے پڑتے تھے، اُسے واجب الادا ہوتے ہی اور اکثر اوقات اُس سے پہلے ہی عطا کر دی جاتیں۔

ترجیحی سرپرستی کے اِس رویے نے مبشر اور اُس کے ساتھی ملازموں پر دو رُخا اثر کر رکھا تھا۔ ایک جانب تو یہ عمل مبشر کی خوئے نرگسیت میں غیر ضروری اضافے کا سبب بنا تو دوسری جانب دیگر کارکنوں میں محرومی، بے چینی اور کام سے لاتعلقی کا باعث ہوا کہ جو اُسی کی مانند تخلیقی کاوشوں پر مامور تھے۔ لیکن زفیرہ احمد اپنی کمپنی میں اِس قسم کے ماحول کی قیمت چکانے کے باوجود کوئی ایسا رویہ اپنانے کو تیار نہیں تھی کہ جو مبشر رضا کی انانیت میں ٹھیس کا باعث ہوتا۔ کمپنی کی انتظامی سربراہ کے اِس طرزِ عمل نے مبشر کو ایک ایسا بگڑا ہوا بچہ بنا دیا جو کھیلنے کو چاند تو نہیں مانگتا تھا مگر اپنے اطوار میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔ دفتری نظم و ضبط اور قاعدے

قواعد کا تو وہ شروع سے روادار نہیں تھا مگر بے جا نرمی کے برتاؤ نے اب کچھ ایسا کر دکھایا کہ وہ من مانی کرنے لگا۔ اپنی مرضی سے دفتر آتا اور اپنی مرضی سے واپس جاتا حتیٰ کہ چھوٹی موٹی اسائنمنٹ کے لیے تو اکثر اوقات ای میل اور واٹس ایپ کا سہارا لینے لگا لیکن جب بھی اُس کے ذمے کوئی اہم اور محدود مدت میں کی جانے والی اسائنمنٹ لگا دی جاتی تو مبشر کے لیے نہ تو رات اور دن کا فرق باقی رہتا اور نہ ہی صبح و شام کا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ کوئی اہم اسائنمنٹ مبشر کے ذمے لگی ہو اور اُس نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہو۔ بلکہ اس قسم کے بحرانی حالات میں اُس کی کارکردگی پہلے سے کئی گنا بڑھ جاتی اور وہ ایسی ایسی اختراعات سامنے لاتا کہ نکتہ چیں کلائنٹ کو بھی مطمئن ہوئے بن پڑتی۔ ایک سے بڑھ کر ایک خیال آفرینی اور وعدے کی پاسداری ہی وہ صفات تھیں کہ جنھوں نے اُسے باقی دفتری معاملات میں اپنی سی کرنے کا اختیار دے رکھا تھا جب کہ اُس کے جیسے باقی کاپی رائٹرز کے لیے حالات بالکل برعکس اور قطعی نامساوی۔ صرف کاپی رائٹرز پر کیا موقوف، باقی کا عملہ چاہے وہ جس شعبے سے بھی تھا، مبشر کے ساتھ پابندیٔ اوقات کے معاملے پر ضرور پرخاش رکھتا تھا۔ یہ اُن سبھی لوگوں کی اجتماعی سازشیں تھیں کہ کئی بار کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں مبشر کی ملازمت سے برخواستگی کا معاملہ پوری شد و مد سے اُٹھایا گیا مگر اُس کے پیشہ ورانہ سروس ٹریک، کامیابیوں کے تناسب اور چیئر مین زفیرہ احمد کی مداخلت سے ہمیشہ ناکامی سے دوچار ہوا۔

مبشر کو اس سے کچھ غرض نہیں تھی کہ اُس کے خلاف دفتر میں کیا کیا کھچڑیاں پکتی رہتی ہیں یا کیسی کیسی سازشیں اُس کی ملازمت کے درپے چلی آتی ہیں۔ جوں جوں ''مہ نور'' کا بزنس گراف اوپر کو جا رہا تھا توں توں مبشر رضا کی مصروفیت میں اضافہ ہونے کے باوجود اُس کے مزاج میں گندھی ہوئی بے اعتنائی بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں ''بیسٹ کاپی رائٹر'' کا مسلسل تیسرا ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد اُس کی طبع میں پہلے سے موجود ملائم سا روکھا پن کچھ اور کسیلا ہو گیا۔ اُس کے دفتر کے ساتھی جو پہلے اُسے نخوت اور نفرت سے تکا کرتے تھے اب حیرت اور حسرت سے دیکھنے لگے تھے۔ اُن کے نزدیک مبشر کی ناموری میں اُس کی ہُنر مندی کا کمال کم اور میڈم زفیرہ کی عنایات کا دخل زیادہ تھا کہ جن کے سبب ایک عام سا کاپی

رائٹر ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں نام سے زیادہ برانڈ کے طور پر شناخت کیا جانے لگا تھا۔

جس طرح مبشر کی شخصیت اسرار کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی اُسی طرح نہ تو کوئی اُس کے خاندانی پس منظر کے بارے کچھ جانتا تھا اور نہ ہی اُس کی بود و باش یا خانگی تفصیل سے آگہی کا دعویدار تھا۔ دفتری اوقات کے بعد وہ کہاں جاتا ہے، کس سے میل ملاقات رکھتا ہے، شادی بھی کی ہے یا نہیں، کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ اِس دوران اگر کسی نے رسم و راہ بڑھانے کی کوشش بھی کی تو اُس کے لہجے اور رویے میں اُتری ہوئی سرد مہری نے تمام راستے مسدود کیے رکھے۔ مبشر کی ملازمتی من مانیاں، بے مروتی و بے حسی اور متکبرانہ چھب شاید دفتر کے باقی ملازمین کے لیے قابلِ قبول رہتیں اگر اُن کے ساتھ بھی کسی حد تک وہی سلوک کیا جاتا جو مبشر کے ساتھ روا رکھا جا رہا تھا مگر ایک ہی دفتر میں ایک ہی نوعیت کا کام کرنے والے لوگوں کے ساتھ انتظامیہ کے اِس قدر تفاوت بھرے رویے نے متاثرہ اکثریت کو مجبور کر دیا کہ وہ زیرِ لب بدخواہی پر اُتر ہی آئیں۔ ظاہر ہے اِس صورت میں اُن کا نشانہ وہی ہستی ہو سکتی تھی کہ جس کی ناروا مہربانیوں کے سبب دفتر کا ہر ملازم کمپنی کے ساتھ اپنی وفاداری پر خود ہی تشکیک کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ پہلے جو باتیں اشارے کنایوں یا آنکھوں آنکھوں میں ہوتی تھیں اب وہ سرگوشیوں میں ہونے لگی تھیں۔ اِس کے باوجود کہ وہ اِس طور اپنی بھڑاس تو کسی حد تک نکال لیتے تھے مگر پھر بھی اُن میں سے شاید ہی کوئی اِس بات پر یقین کرتا ہو کہ زفیرہ احمد جیسی حسین، طرحدار اور سراپا رعونت عورت خلوت میں مبشر جیسے مرد پر تھوکنا بھی پسند کرتی ہو۔ مگر وہ لوگ جو مبشر رضا سے کچھ زیادہ ہی اَن بَن رکھتے تھے، باقیوں کو اِس دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کرتے کہ طبقہ اشرافیہ کی خواتین عموماً اپنے خلوت کے لمحات کے لیے کسی ایسے گئے گزرے مرد کا انتخاب کرتی ہیں کہ جسے اگر کوئی کھلی آنکھوں دیکھ بھی لے تو ایسا ویسا شک تو کیا گماں تک نہ کر سکے۔ کبھی کبھار یہ رائے بھی قائم کی جاتی کہ ایسی خواتین بخوبی جانتی ہیں کہ سوٹ بوٹ اور ٹائی کوٹ سے محض رسوائی ہاتھ آتی ہے، گوہرِ مطلوب نہیں۔ جب کہ مزدور کا کیا ہے، مزدوری دی اور چلتا کیا۔ دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ۔

جب کہ ''مہ نور'' کے پرانے ملازم اِن سرگوشیوں کو سُن تو لیتے مگر صرف کان دھرنے کی

حدتک۔ اس سے زیادہ نہیں۔ وہ زفیرہ احمد کو اُس کے بچپن سے جانتے تھے کہ جب کمپنی کی سربراہی اُس کے والد فیروزالدین احمد کے پاس ہوا کرتی تھی۔ اپنی چہیتی بیگم کی وفات کے بعد وہ کمپنی کی سربراہی سے علیحدہ ہو کر محض بورڈ آف ڈائریکٹرز میں رہ گئے تھے اور وہ بھی نام کی حد تک جب کہ زفیرہ احمد نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کرتے ہی ''مہ نور'' کو سنبھالا اور دیکھتے ہی دیکھتے فیروز صاحب کے انتقال سے قبل ہی گذشتہ دس برسوں میں اُسے مُلک کی سب سے بڑی اشتہاری کمپنی بنا دیا۔ اس سفر میں بس اتنا ہوا کہ وہ لڑکی کہلانے والی عمر سے نکل کر عورت نام کی دہلیز پر آ گئی اور گئے وقتوں میں لڑکیوں کی شادی سے منسوب روایتی عمر کہیں پیچھے رہ گئی۔ زفیرہ احمد کا تعلق چونکہ معاشرے کے اُس طبقے سے تھا کہ جو خود ہی روایت شکن اور خود ہی روایت ساز ہوتے ہیں اِس لیے اسی طبقے کی ایک کامیاب بزنس وومن ہوتے ہوئے شادی نام کا لایعنی چوتیاپا نہ تو اُس کی ترجیحات میں تھا اور نہ ہی اُس کے گمان میں اور نہ ہی کبھی اِس کی کچھ خاص ضرورت محسوس کی گئی۔

اپنی ہی چیف ایگزیکٹو کی مخالفت پر اترے کمپنی کے اِن ملازمین کو ادراک ہی نہیں تھا کہ اگر زفیرہ احمد کی شخصیت اور اُس کے خلوت کے تقاضوں کو اُس کے طبقاتی پس منظر میں دیکھا لیا جاتا تو اُن کی سوچ ایک جمالیاتی بے ہودگی کے سوا کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ جانتے ہوئے بھی نہیں جان پا رہے تھے کہ اگر اُن کے اپنے طبقے کی عورت کی بقا کا وجود اُس کی جنسی دیانت اور بد دیانتی سے جڑا ہوا ہوتا ہے یا اُس کی معاشرتی وجودیت عمر کے ہر حصے میں اُس کی اندامِ نہانی کا ہی طواف کرتی دکھائی دیتی ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ سماج کے طبقہ بالا میں بھی ایسا ہی ہوتا ہو کہ جہاں کی معاشرتی بُنت میں عورت سے منسوب اخلاقیات کا محور اِس نوعیت کی سستی جنس کاری سے لگا نہیں کھاتا۔ وہاں عورت عموماً بہت بڑے حجم کے سیاسی، تجارتی اور معاشی مفادات کے حصول میں عمل انگیز کے طور پر برتی اور برتائی جاتی ہے۔ مڈل کلاس کی عورت تو اخلاقیات کے اتوار بازار میں پڑی پڑی گل سڑ جانے والی ترکاری کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جو نہ بکتی ہے نہ پھینکی جاتی ہے اور نہ ہی کسی مفاد کے حصول کا جواز بن پاتی ہے جب کہ یہی عورت اگر اشرافیہ سے ہو تو مفادات کے ایکسپو میں بکنے کے لیے اُس کا حسب نسب ہی

کافی ہوتا ہے، وہ خود نہیں۔

کمپنی کے دفتر میں ہونے والی سرگوشیاں اگر زفیرہ احمد تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں تو بات سمجھ میں آتی تھی کہ اُن لوگوں اور زفیرہ احمد کے درمیان ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے خوف کی خلیج حائل تھی لیکن مبشر رضا کی حد تک تو کوئی ایسا امر مانع نہیں تھا مگر پھر بھی اُس تک اِس قسم کی کسی افواہ، کسی خبر یا کسی سرگوشی کا نہ پہنچ پانا کچھ عجیب نہیں تو حیران کن ضرور تھا۔ شاید اِس کا باعث مبشر کا وہ رویہ رہا ہو جس کے سبب کوئی اُس کے منہ لگنا یا اُسے منہ لگانا پسند ہی نہیں کرتا تھا لیکن اِس کے باوجود دفتر میں کمپنی کا کام کم اور مبشر کا ذکر زیادہ ہوتا تھا اِس سے قطع نظر کہ خود مبشر اپنے دفتری ساتھیوں یا کمپنی کی سربراہ کے بارے میں کیا سوچتا ہے یا کیا رائے رکھتا ہے۔

اُنہی دنوں کہ جب مبشر کے بارے میں منفی خبروں کی طومار طرازی عروج پر تھی، وہ دفتر سے غائب ہو گیا۔ ہفتے میں ایک آدھ دن کی غیر حاضری تو معمول ہوا کرتی تھی مگر اب کے تو اُسے غائب ہوئے ہفتے سے زیادہ ہو چلا تھا۔ ایسے میں سب سے زیادہ پریشان زفیرہ احمد تھی کہ وہ ساری کی ساری اسائمنٹس جو محدود وقت میں مکمل کی جانی تھیں، ویسی کی ویسی نامکمل پڑی ہوئی تھیں۔ اِن میں اکثر اسائمنٹس مختلف کمپنیوں کے نئے پراڈکٹ لانچ کرنے کے سلسلے میں تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر ''مہ نور'' دیے گئے وقت میں انہیں مکمل نہیں کر پاتی تو اُن کمپنیوں سے بزنس لائن ہمیشہ کے لیے ختم۔ زفیرہ احمد کو مبشر رضا کی گمشدگی کی صورت اپنی کمپنی کی مکمل بربادی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے واسطے تو یہ امر بھی باعث حیرت تھا کہ مبشر کی پروفائل میں اُس کا دیا گیا رہائشی پتا بھی غلط تھا۔ وہ ظاہر کیے گئے مکان میں تو کیا، اُسے تو اُس علاقے میں بھی کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ زفیرہ کے پاس نہ تو اپنی اِس نااہلی کا کوئی جواز تھا کہ مبشر جیسے شخص پر اندھا اعتماد کیوں کیا اور نہ ہی اِس بات کا جواب کہ اُس جیسا کوئی دوسرا ہنرمند متبادل کے طور پر پنپنے کیوں نہ دیا گیا۔ محض ایک شخص پر انحصار کرنے کے سبب جہاں کمپنی کی بربادی ایک ڈراؤنے خواب کی صورت اُس کے سامنے موجود تھی وہاں نہ تو کوئی اِس صورتحال سے نکلنے کا راستہ اور نہ ہی کوئی ایسا ہنرمند نگاہ میں کہ جو کلائنٹس کمپنیوں کی تشفی کے مطابق مطلوبہ نتائج دے پاتا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ بزنس محض ''مہ نور'' کو نہیں بلکہ مبشر رضا کے دستخطوں کو ملتا تھا۔

۞

﴿۲﴾

راولپنڈی اوراسلام آباد کے وجود کو جدا کرتا ہوا فیض آباد اُوور ہیڈ برج کئی دنوں سے پوری طرح ایک نیم مذہبی نیم سیاسی جماعت کے متشدد کارکنان اور آتش دہن رہنماؤں کے قبضے میں آیا ہوا تھا۔ پل کے وسط میں مرکزی رہنماؤں کا خیمہ اوراُس کے گرداگرد چہار جانب لاٹھی بردار کارکن چہرے پر ڈھاٹے باندھے چوکس انداز میں دن رات پہرے پر متعین تھے۔ اگرچہ سو کے لگ بھگ اِن پہرے داروں کی پہرے داری شفٹوں میں تھی مگر دوسو سے زیادہ کارکن وہ تھے جو پل کے دونوں جانب داخلی راستوں کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے سرسبز گھاس کے قطعات میں خیمہ زن تھے۔ اُن کے ساتھ ہی تازہ کمک اوراشیائے خورد ونوش کے واسطے ایک تیسری صف اِس طرح سے آراتھی کہ اُس میں تازہ دم نفری ایک منضبط حکمت عملی کے تحت خود بخود شامل ہوتی رہتی اور تھکے ماندہ کارکن اُسی ترتیب سے اپنے محفوظ ٹھکانوں کا راستہ لیتے۔ پہرے کی اِن تین صفوں کے بعد ایک مناسب سا فاصلہ تھا جس کی حد بندی رکاوٹوں کے سے انداز میں رکھے گئے کنکریٹ کے بلاکس سے کی گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کے دوسری جانب پنجاب اوراسلام آباد پولیس کے جوان کچھ زیادہ مستعدی کی بجائے ڈھل مل انداز میں ڈیوٹی پر موجود تھے۔ اُن کے رویے سے ظاہر نہ ہوتے ہوئے بھی یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خلق خدا کی بجائے فیض آباد جیسی شہ رگ کو جامد کرنے والے متشدد مظاہرین کی حفاظتی ڈیوٹی پر مامور کردیے گئے ہوں۔

پولیس کی صفوں کے بعد کاروں، موٹر سائیکلوں، ویگنوں اور بائی سائیکلوں پر سوار عام

لوگ ایک گھمسان کی صورت اِس امید پر کچھ دیر کے لیے وہاں رُکے رہتے کہ شاید اس دوران پولیس فیض آباد کا محاصرہ ختم کرانے میں کامیاب ہوجائے مگر اُلٹا جب اِن عام شہریوں کو پولیس الگ سے دھمکاتی اور ڈنڈا بردار محاصرین الگ سے تو اُن کے پاس اِس کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہ رہتا کہ وہ مڑیں اور ایکسپریس وے کے دائیں جانب واقع آبادی غوری ٹاؤن سے ہوتے ہوئے راول روڈ کی راہیں، راول ڈیم کے قریب واقع راول چوک پر جانکلیں۔ مگر یہ سفر اتنا بھی سہل نہیں تھا۔ گنجان آبادی میں سے گزرتی ہوئی تنگ سڑک پر راولپنڈی سے آنے والی ساری کی ساری ٹریفک کا گزرنا ایک عذاب تھا کہ جس میں مزید اضافہ اُن ٹرکوں، ٹرالوں اور بھاری ٹریفک کے سبب ہوگیا جسے ٹریفک پولیس نے نہ جانے کس نوعیت کے لالچ کے باعث اِسی تنگ سڑک پر دندنانے کے واسطے چھوڑ رکھا تھا۔ نتیجتاً منٹوں کا سفر گھنٹوں میں گھسیٹا جانے لگا۔

فیض آباد دھرنے کے چھٹے روز ٹریفک کے اِس اژدہام میں ایدھی سنٹر کی ایک سوزوکی ایمبولینس بھی شامل تھی جس کا نحیف سا سائرن اپنے آگے گھُسی ہوئی گاڑیوں کے ڈرائیوروں میں راستہ دینے کی ہلکی سی جنبش پیدا کرنے میں بھی مسلسل ناکام چلا آرہا تھا۔ پچکے ہوئے گالوں مگر اکہرے بدن کا پھرتیلا ڈرائیور بار بار عقبی شیشے میں ایمبولینس کے پچھلے حصے میں اسٹریچر پر بے سُدھ پڑی لڑکی کی طرف دیکھتا اور ہر بار دیکھتے ہی سردی ہونے کے باوجود اُس کے ماتھے پر اُبھرنے والے پسینے کے قطروں میں کچھ اور قطروں کا اضافہ ہوجاتا۔ تئیس چوبیس برس کی اِس لڑکی کے منہ سے بہنے والا جھاگ اُس کی گردن سے ہوتا ہوا پانی کے قطروں میں منقلب ہو کر اسٹریچر سے نیچے گاڑی کے فرش پر گرنے لگا تھا۔ قدم قدم پر جام ہو چکی ٹریفک میں رینگ رینگ کر راستہ بناتے ہوئے ڈرائیور کو ہرگز یقین نہیں رہا تھا کہ وہ اُسے زندہ اسلام آباد کے پمز ہسپتال تک پہنچا بھی پائے گا یا نہیں۔ ہر گام پر پہلے سے زیادہ رش جہاں ڈرائیور کے حوصلے کا امتحان لے رہا تھا وہاں اُس کے اعصاب کا بھرتا بھی بنائے چلا جارہا تھا۔

یہ لڑکی ایدھی ایمبولینس کے ڈرائیور کو کہیں سڑک کنارے یا کسی کھیت میں گری پڑی نہیں ملی تھی بلکہ وہ اُسے فیض آباد چوک سے ذرا پہلے ایکسپریس وے کے بائیں جانب گرین بیلٹ کے اُس پار نوتعمیر شدہ پوش کالونی گلشن کریم کی ذیلی گلیوں میں واقع ایک نسبتاً چھوٹے گھر

کے اوپری پورشن سے اُٹھا کر لا رہا تھا۔ اُسے ایدھی سنٹر سے موبائل فون پر اطلاع دی گئی تھی کہ جتنا جلدی ہو سکے اِس کالونی کی گلی نمبر پندرہ کے مکان نمبر بائیس سے کسی انتہائی سیریس حالت کی مریضہ کو اُٹھا کر اسلام آباد کے پولی کلینک یا پمز ہسپتال پہنچا دے۔ راولپنڈی کے مری روڈ پر واقع بینظیر ہسپتال میں پہنچانا اِس لیے ممکن نہیں تھا کہ فیض آباد چوک اور پل کا محاصرہ کرنے والے متشدد جتھے لاٹھیاں اُٹھائے ہوئے کمیٹی چوک تک زبردستی دکانیں بند کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں مری روڈ کی طرف ایمبولینس کا لے جانا مریضہ کی زندگی سے کھیلنے کے مترادف ہوتا۔

ایدھی سنٹر سے فون کال موصول ہونے کے بعد ڈرائیور جب دیے گئے پتے پر پہنچا تو وہاں موجود ایک ہراساں اور حواس باختہ خاتون نے اُسے عقبی دروازے سے اوپری منزل کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے مزید کچھ پوچھنا چاہا تو اُس نے بولنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دروازہ ہی بند کر لیا۔ شاید پریشانی کے مارے الفاظ اُس کے حلق سے نکل نہیں پا رہے تھے یا پھر وہ جان بوجھ کر کچھ بھی کہنے سے گریزاں تھی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ڈرائیور جب عقبی سمت کے یک طاقے آہنی گیٹ پر پہنچا تو وہ نیم وا حالت میں تھا۔ یہ گیٹ اندر کی سمت سیڑھیوں میں کھلتا تھا جو اوپری پورشن کی طرف جا رہی تھیں۔ ڈرائیور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا تو سامنے والے کمرے کا دروازہ بھی آدھے سے زیادہ کھلا تھا جس کے فرش پر بچھائے گئے میٹرس پر ایک جوان لڑکی نیم برہنہ حالت میں بے ہوش پڑی تھی۔ ڈرائیور نے گڑبڑاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کمرے کے ایک کونے میں ڈھیر کی گئیں چند کتابوں اور کھانا کھائے ہوئے برتنوں کے سوا وہاں چادر یا فرنیچر نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ ڈرائیور نے لڑکی کی برہنگی چھپانے کے لیے میٹرس پر بچھی بیڈشیٹ کے دونوں کونے اُٹھا کر اُس پر اُلٹا دیے۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے ایک درمیانے سائز کا کندھے سے لٹکانے والا لیڈیز بیگ بھی دکھائی دیا جو لڑکی کے بائیں بازو کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اِن کے علاوہ اگر وہاں کچھ تھا تو وہ واش روم سے ملحقہ ڈریسنگ روم کی چھت تک بلند الماری جو اُس وقت بھی شاید لاک دکھائی دے رہی تھی۔

ڈرائیور کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے اور کس طرح اُس لڑکی کو ایمبولینس میں

منتقل کرے۔ اُسے اِس بات کی بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ پولیس کو اِس واقعہ کی رپورٹ بھی کی گئی ہے یا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور اُسے بتایا گیا تھا کہ کسی قریبی ہمسایہ خاتون نے لڑکی کی سیریس حالت کی اطلاع ایدھی سنٹر کو دی تھی۔ ''وہ نچلے پورشن میں مقیم عورت کے علاوہ کون ہو سکتی ہے''۔ ڈرائیور کچھ سوچ کر سیڑھی سے نیچے اترا، ایمبولینس سے اسٹریچر نکالا اور ایک بار پھر بنگلے کے فرنٹ گیٹ کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبانے لگا۔ کچھ دیر بعد وہی خاتون پھر باہر آئی لیکن دروازہ کھلتے ہی ڈرائیور کی صورت دیکھ کر جھٹ سے واپس اندر جانے لگی تو ڈرائیور نے دفعتاً اٹھ آئے تلخ لہجے میں اُسے اُس کی بات سننے کو کہا۔

''ہمیں کچھ نہیں پتا ___ تم لے جاؤ اُسے جہاں لے جانا ہو''۔ اور پھر خود ہی منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔ ''بدذات گشتیاں ___ نجانے کہاں کہاں سے مرنے کے لیے چلی آتی ہیں کرائے کے گھروں میں''۔

''گھر میں کوئی ہے جو اُسے ایمبولینس میں شفٹ کرانے میں میری مدد کر سکے''۔ ڈرائیور نے اب کے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

''کون ہو سکتا ہے اِس وقت گھر میں! وقت دیکھا ہے دس بج رہے ہیں، سب اپنے دفتروں کو چلے۔ خود ہی اتارو اُسے اور سنو! مرتی ہے تو مرنے دو۔ نجانے کیسے والدین ہیں، بیٹیاں پیدا کر کے شہروں میں بھیج دیتے ہیں ٹکے ٹک لگوانے کے لیے۔'' دروازہ پھر دھڑام سے بند ہو چکا تھا۔ ڈرائیور نے گلی میں اِدھر اُدھر دیکھا جو کسی ویرانے کی طرح سنسان پڑی تھی۔ کچھ سوچ کر اُس نے اسٹریچر کو پھر سے ایمبولینس میں رکھا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دوبارہ اُس میں کمرے میں جا پہنچا جہاں لڑکی بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے ایک نظر لڑکی کے سراپے پر ڈالی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کے وزن کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ لڑکی کا بھرا بھرا بدن بتا رہا تھا کہ اُسے ایک اکیلے بندے کا اُٹھا کر کندھے پر ڈالنا ممکن نہیں ہو گا۔ ڈرائیور نے ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل کر نیچے گلی میں جھانکا جہاں ابھی تک ہو کا عالم تھا۔ ڈرائیور کی نگاہ لڑکی کے چہرے پر پڑی، اُس کے منہ سے بہنے والا جھاگ بتا رہا تھا کہ اگر وہ جلدی سے ہسپتال نہ پہنچی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ڈرائیور نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر جھک کر میٹرس پر پڑی ہوئی لڑکی کو اپنے کندھے پر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کے پورے بدن کی طاقت مجتمع ہو کر اُس کے بازوؤں میں آ چکی تھی جب کہ ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ ٹانگیں کپکپانے سے بڑھ کر لڑکھڑانے پر آ چکی تھیں مگر اُس نے جیسے تیسے لڑکی کو ایمبولینس میں رکھے اسٹریچر تک پہنچا دیا۔ اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے بار بار اُکھڑ رہی تھی۔ اُس نے اسے بحال کرنے کے لیے ایمبولینس کی باڈی پر سر ٹکا دیا۔ کچھ دیر میں جونہی سانسوں میں ٹھہراؤ پیدا ہوا وہ جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور چابی کو گھما دیا۔ ابھی وہ گیئر لگانے ہی لگا تھا کہ پھر سے ہینڈ بریک کھینچی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لڑکی کے کمرے میں چلا گیا۔ واپسی پر اُس کے ہاتھ میں لڑکی کا ہینڈ بیگ تھا۔ نیچے اترتے ہوئے ڈرائیور نے کمرے کے کھلے دروازے کو باہر سے بند کیا اور سیڑھیاں اترنے کے بعد گلی میں کھلنے والے دروازے کو بھی باہر سے کنڈا لگا دیا۔ لڑکی کے ہینڈ بیگ کو اگلی سیٹ پر رکھا اور گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔

ڈرائیور کو ہمز ہسپتال کی ایمرجنسی تک پہنچتے پہنچتے دن کے بارہ بج چکے تھے۔ دو گھنٹے مسلسل کہیں جامد اور کہیں ساکت رش میں سے گاڑی نکالتے نکالتے وہ لڑکی کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ ایمرجنسی کے کاؤنٹر پر جا کر اُس نے ڈیوٹی پر موجود جونیئر ڈاکٹر کو جتنی بار اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی اُتنی ہی بار اُسے ڈانٹ کر ایک طرف کر دیا گیا۔ رش اتنا تھا کہ ایک ڈاکٹر اور چار پانچ پیرا میڈیکل ملازمین سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ ڈرائیور نے اپنے ایک پرانے شناسا وارڈ بوائے کو بازو سے پکڑا اور تقریباً کھینچتے ہوئے اُسے اپنے ساتھ ایمبولینس تک لے گیا۔ وارڈ بوائے نے ایمبولینس میں اسٹریچر پر بے سُدھ پڑی لڑکی کی طرف دیکھا تو بجائے اسٹریچر کو تھام کر باہر نکالنے کے اُس نے لڑکی کے نتھنوں کے سامنے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی لہرائی اور پھر جلدی جلدی اُس کی آنکھوں کے پپوٹے اُٹھا کر دیکھے۔ وارڈ بوائے کا سپاٹ چہرہ کچھ اور سپاٹ ہو گیا۔ ڈرائیور نے پریشان ہو کر اُسے استفساریہ انداز میں دیکھا جس کے جواب میں اُس نے گردن نفی میں ہلا دی اور یہ جا وہ جا۔ لڑکی کے زندہ نہ بچنے کا خدشہ تو ڈرائیور کو پہلے ہی سے تھا مگر اب وہ اِس لاش کا کیا کرتا۔ اُسے اگر وہ زندہ ہسپتال نہیں

پہنچا سکا تو مرنے کے بعد بھی اُسے اندر ہی پہنچانا تھا۔ وارڈ نہ سہی مردہ خانہ ہی سہی۔ اُس نے جاتے ہوئے وارڈ بوائے کو آوازیں دیں مگر اُس نے کان نہیں دھرے اور بھیڑ میں اِدھر اُدھر ہو گیا۔ اِس صورتحال میں ڈرائیور بوکھلا گیا اور اپنے اطراف میں کوئی شناسا تلاش کرنے لگا کہ جو لڑکی کا اسٹریچر اندر ایمرجنسی تک پہنچانے میں اُس کی مدد کر سکے۔ اتنے میں نے ایک شخص نے پیچھے سے آ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایدھی ایمبولینس کے ڈرائیور نے فوراً پیچھے گھوم کر دیکھا۔ وہ اُس کا جاننے والا تھا رشید احمد، ایک پرائیویٹ ایمبولینس کا ڈرائیور۔

دونوں نے جلدی سے اسٹریچر کو گاڑی سے نکالا اور تیزی سے اُٹھائے ہوئے اندر ایمرجنسی کی طرف بڑھ گئے۔ اندر بدستور وہی صورتحال تھی۔ ایک ایک بیڈ پر تین تین مریض پڑے ہوئے کراہ رہے تھے اور ہسپتال کا عملہ ڈاکٹر سمیت صرف اُسی طرف توجہ کرتا کہ جہاں تک اُن کی نگاہ جاتی۔ مریضوں کے لواحقین کے پاس سوائے بے چارگی سے انہیں تکتے اور تڑپتے رہنے کے اور کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر لڑکی سمیت اُس اسٹریچر کو اُٹھائے کھڑے رہے مگر کوئی بھی اُن کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ تھی کہ جہاں وہ اسٹریچر رکھا جا سکتا۔ تھک کر ابھی وہ اسٹریچر کو نیچے فرش پر رکھنے ہی لگے تھے کہ ایک نرس دور سے دھاڑی۔

''کون ہے یہ؟ کیوں رکھ رہے ہو اِسے؟''

''لاش ہے یہ اور میں ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ہوں۔'' ڈرائیور نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''تو پھر اسے یہاں کیوں رکھ رہے ہو___ لے جاؤ اسے مردہ خانے۔'' نرس کی تنبیہہ اُن کے پلے پڑی تو انہوں نے پھر سے اسٹریچر کو اوپر اُٹھا لیا۔

''ٹھہرو! کہاں سے لائے ہو اِسے اور یہ مری کیسے؟'' اتنے میں نرس اُن کے قریب آ گئی اور لڑکی کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔ ''کسی اچھے گھر کی لگتی ہے___ مگر تم نے بتایا نہیں کہ یہ مری کیسے اور لائے کہاں سے ہو؟'' مگر اِس سے پہلے کہ ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور کچھ بولتا نرس ہی بول پڑی۔ ''لیکن یہ تو زندہ ہے___ اندھے ہو گئے ہو کیا___ زندہ لڑکی کو لاشوں میں ڈالنے جا رہے تھے۔''

ڈرائیور وارڈ بوائے کا کہا سُنا مصلحتاً گول کر گیا اور خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی جب کہ نرس اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ڈاکٹر کو بلانے جا چکی تھی۔ ایدھی ایمبولینس کے ڈرائیور نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ لڑکی زندہ حالت میں ہسپتال تک پہنچ چکی تھی۔ اُسے رہ رہ کر وارڈ بوائے پر غصہ آ رہا تھا کہ اگر اُس کے کہنے پر وہ لڑکی کو مردہ خانے میں پھینک آتے تو نجانے کیا ہوتا۔ اتنے میں ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گیا اور ابتدائی ملاحظے کرتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ نرس کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ بعد میں پیچھے کی طرف مڑا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا کہ اُسے وہاں کون لایا ہے۔ ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ڈاکٹر کے سامنے آ گیا۔ ''جی میں لایا ہوں اِسے فضائیہ کالونی سے۔''

''تم کون ہو اور کیا لگتے ہو اِس کے اور پولیس رپورٹ بھی کی ہے کہ نہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب! میں اِس کا کچھ نہیں لگتا، میں تو ڈرائیور ہوں ایدھی ایمبولینس کا ـــــ مجھے تو آفس سے فون آیا اور میں بڑی مشکل سے اسے یہاں لے آیا ہوں دھرنے سے ـــــ شاید ہمسایوں نے فون کیا تھا اور پولیس رپورٹ کا ہمارے آفس کو پتا ہوگا ـــــ مجھے نہیں ہے پتا۔'' وہاں کچھ زیادہ ہی پوچھ گچھ ہوتے دیکھی تو دوسرا ڈرائیور موقع سے کھسک لیا۔

''مگر اِس کا کوئی نام پتا؟'' ڈاکٹر نے اپنا سوال بدل لیا

''میں تو نہیں جانتا مگر اس کا ایک پرس وہاں پڑا تھا جو میں ساتھ لایا ہوں۔''

''کہاں ہے وہ پرس؟''

''ابھی لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ڈرائیور تیزی سے باہر گاڑی کی طرف بھاگا اور اُتنی ہی تیزی سے پرس اُٹھائے واپس آیا اور اُسے ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ڈاکٹر نے اُس کی زپ کھولی اور اُسے میز پر اُلٹ دیا۔ پرس میں خواتین کے میک اپ کی کچھ بنیادی اشیاء تھیں جو تقریباً ختم ہو چلی تھیں۔ پچاس روپے کا ایک مڑا تڑا کرنسی نوٹ اور ایک بوسیدہ ہو چکی پاسپورٹ سائز تصویر بھی تھی جس کی پشت پر سرخ بال پوائنٹ سے ''ثمینہ'' لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بازو لمبا کر کے تصویر لڑکی کے چہرے کے روبرو کی، وہ واقعی بے ہوش پڑی لڑکی کی تھی۔

۞

﴿۳﴾

موٹر وے ایم ٹو سے ٹھوکر نیاز بیگ اُتر کر رائل پام کنٹری کلب جاتے ہوئے دانش سعید کی گاڑی نے لاہور شہر کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی نہر کے کنارے کنارے جانا تھا۔ نئے ماڈل کی مرسیڈیز ہونے کے باوجود موٹر وے سے اُترتے ہوئے دو تین جھٹکے اگرچہ دھیرے سے لگے مگر یہ اُسے نیند سے بیدار کر دینے کے لیے کافی تھے۔ ڈرائیور نے بیک مرر میں اُسے آنکھیں کھول کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے دیکھا تو اور بھی محتاط ہو گیا۔ بہت کم ایسا ہوا کہ دانش سعید کو ایک ماہ سے زیادہ لاہور سے باہر رہنا پڑا ہو مگر وہ جب بھی لاہور آتا تو اپنے دائیں بائیں عمارتوں، دکانوں، سڑکوں اور اُن پر رواں دواں ٹریفک کو یوں دیکھتا کہ جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ چند دنوں کی دوری سے سب کچھ بدل جاتا ہو یا اُس کی یادداشت سے محو ہو جاتا ہو مگر اُس کا اپنے اطراف کو ہر بار اجنبیت کی بجائے کسی ناشناسا اشتیاق سے اس طرح دیکھنا کہ جیسے اُسے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر رہا ہو، معمول سے کہیں ہٹ کر غیر معمولی تھا۔ اُس کا ڈرائیور مراد حسین بھی اپنے صاحب کی اِس کیفیت کو پہلے حیرت اور اب دلچسپی سے دیکھا کرتا۔ اب تو کبھی کبھی اُسے بھی وہم ہونے لگا تھا کہ شاید وہ واقعی لاہور میں پہلی بار آ رہے ہیں۔

گاڑی پنجاب یونیورسٹی کے انڈر پاس سے گزری تو دانش سعید نے مراد سے کہا کہ وہ گاڑی فیروز پور روڈ کے انڈر پاس سے گزارنے کی بجائے اوپر سڑک پر بنے ہوئے نہر کے پُل کے پاس ہی سے گزارے۔ ''مگر صاحب رات ہو چکی، اِس وقت تو وہاں رش ہوگا۔''

''کوئی حرج نہیں اور نہ ہی ہمیں کوئی جلدی ہے۔''

ڈرائیور نے گاڑی فیروز پور انڈر پاس سے گزارنے کی بجائے اُسے سڑک کے بائیں جانب رہنے کے لیے انڈیکیٹر لگا دیا مگر سامنے کا اشارہ سرخ ہونے کے سبب وہاں گاڑیوں کی لمبی لائن لگی ہوئی تھی اِس طرح کہ مسلم ٹاؤن مڑنے والی گاڑیاں بھی وہیں پھنسی ہوئی تھیں۔ مراد حسین کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے صاحب کے اِس فیصلے سے خوش نہیں تھا۔ قریب سے گزرنے والا کوئی بھی غیر محتاط رکشہ یا گدھا گاڑی، مرسیڈیز کی سائیڈیں چھیلنے کے لیے کافی تھے کہ جن سے بچ نکلنے کے لیے تدبیر سے زیادہ تقدیر پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔

ٹریفک سگنل کے دو بار سبز ہونے کے باوجود بھی دانش سعید کی گاڑی بمشکل سگنل کے قریب ہی پہنچ سکی مگر امکان ہو چلا کہ اب کی بار سگنل سبز ہونے پر وہ سڑک عبور کر جائے گی۔ لہذا جونہی اشارہ کھلا ڈرائیور نے گاڑی تیزی سے آگے نکالی مگر سڑک پار کرتے ہی دانش سعید نے ایک بار پھر اُسے ٹوکا کہ یہاں سے گاڑی بہت دھیمے سے گزارے۔ ڈرائیور کے پاس اپنے صاحب کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر وہ شرمندہ ہو رہا تھا کہ ایک قیمتی گاڑی کے وہاں یوں آہستہ سے رینگنے کے سبب سڑک کے ساتھ ساتھ بائیں جانب کھڑے پیشہ ور نوجوان لڑکے، برقعے میں ملبوس لڑکیاں اور زنانہ لباس پہن کر اشارتاً تالیاں بجاتے خواجہ سرا اُن کی گاڑی کے ساتھ ساتھ تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اپنی مخصوص حرکات وسکنات سے اپنی اپنی خوبیاں اور نرخ بتاتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی نگاہیں دانش سعید کے چہرے کے تاثرات پڑھنے میں مگن تھیں کہ وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا لڑکوں کی طرف۔ وہاں موجود دو تین لڑکیاں تو ایک دو قدم اُٹھاتے ہی پیچھے ہٹ گئیں کہ اِس قسم کی گاڑی کا سوار اُن جیسی پسینے میں نہائی اور گرد میں اَٹی ہوئی لڑکیوں کو کیوں وہاں سے اُٹھائے گا۔ اُس کے لیے تو معطر معنبر ٹھکانوں کی کمی نہیں ہو گی۔ لیکن کچھ بنے سنورے لڑکے ابھی تک گاڑی کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے یا شاید گاڑی اُن کی رفتار کا ساتھ دے رہی تھی۔ پیشہ وروں کے ذہن میں مخمصہ تھا تو بس اتنا کہ اُسے لڑکا فاعل چاہیے یا مفعول یا پھر ٹو اِن وَن۔ لیکن دانش کا چہرہ اپنے تاثرات سے اِس نوعیت کے سوالات کے جواب نہیں دے پا رہا تھا اور ڈرائیور سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں

جا رہا تھا اِس لیے اُس نے اپنی نگاہیں بالکل سامنے ونڈ اسکرین کے اُس پار گاڑ رکھی تھیں۔

گاڑی اِن پیشہ وروں کی حدود سے باہر نکلنے لگی تو بنے سنورے لڑکوں کی لاٹ بھی کہیں پیچھے رہ گئی۔ اب گاڑی کے ساتھ ساتھ نسوانی لباس والے وہ خواجہ سرا دوڑ رہے تھے کہ جو خواجہ سرائی کی آڑ میں حسبِ طلب ہر قسم کا کردار ادا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ مراد حسین نے ونڈ اسکرین سے آنکھیں اُٹھا کر عقبی شیشے میں صاحب کی طرف دیکھا کہ جیسے اُس کا مدعا جاننا چاہتا ہو مگر وہ تو مسلسل کھڑکی سے باہر تیز تیز قدم اُٹھاتے، کچھ کچھ دوڑتے، ہاتھوں اور آنکھوں سے اشارے کرتے خواجہ سراؤں کی جانب اس طرح تکے جا رہا تھا کہ جیسے یہ سب کچھ پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ لیکن اب کی بار اُس کی آنکھوں میں حیرت یا اشتیاق نہیں بلکہ بے تاثر سی کیفیات تیر رہی تھیں یا خیال وخواب ہوئی کچھ صورتوں کی پرچھائیاں۔ ڈارئیور نے دانش سعید کی جانب سے کوئی مزید ہدایت نہ پا کر ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ ہلکا سا بڑھا دیا۔ خواتین کا لباس ملبوس کیے ہوئے گھٹیا قسم کے تیز میک اپ سے لیپے پوتے چہرے بھی اندھیرے میں گم ہوتے چلے گئے۔ دانش جس آسن میں تھا، اُسی میں ہی رہا، کوئی بھی جنبش کیے بغیر اور نگاہیں بدستور کھڑکی کے شیشے سے باہر، اب جھانکنے سے زیادہ کسی کو ڈھونڈتے ہوئے۔

وہ شاید شبیر عرف شاکا کا چہرہ تلاش کر رہا تھا، اُن دنوں کا چہرہ جب وہ ابھی شبیر ہی تھا، شاکا نہیں ہوا تھا۔ آٹھ نو برس کا چٹا گورا شبیر۔ ضلع پاکپتن کی تحصیل عارف والا اور ضلع وہاڑی کی تحصیل بورے والا کو ملانے والی روڈ پر واقع بورے والا کی سب تحصیل گگو منڈی کے کمہار محمد الیاس کا بڑا بیٹا شبیر۔ اُن دنوں پاکستان کے دیگر علاقوں کی طرح گگو کے محنت کشوں کی اکثریت بھی مشرق وسطیٰ کی ریاستوں میں طویل اکلاپا سر پر اوڑھے آنے والے اچھے دنوں کی آس میں صرف اُن خطوط میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں تلاش کرتی رہتی تھی کہ جو مہینے بھر کے انتظار کے بعد اُن تک کہیں پہنچ پاتے۔ جب کہ اُن کے والدین، بیوی بچوں اور بہن بھائیوں کے لیے اُن کی خیریت اور سلامتی اُن کی پاکستان آمد کی بجائے اُن کی جانب سے بھجوائی جانے والی رقم کی مقدار سے ہی جھانکتی دکھائی دیتی۔ دیر سویر کی صورت میں سارے کیے کرائے پر پانی پھر ار ہنا الگ اور لعنت ملامت اُس پہ سوا۔

کیا ہوا کہ الیاس کبھار بھی چار برس تک پاکستان نہ آ سکا مگر یہاں گاؤں میں دو پکے گھر ضرور بن گئے۔ ایک ماں باپ اور بہن بھائیوں کا اور دوسرا اُس کی بیوی کا جس نے باقیوں کا منہ بند رکھتے ہوئے اپنے ماموں زاد روشن کو بھائی بنا کر وہ سارے کے سارے حقوق اُسے سونپ دیے جو شاید الیاس کو بھی حاصل نہیں ہو سکے تھے۔ مالی مفادات کی زمینی حقائق کے مطابق منصفانہ تقسیم ہوئی تو تمام رشتے خود بخود پدھرے ہوتے چلے گئے۔ نہ کوئی معترض اور نہ ہی کوئی اعتراض۔ سبھی ایک ہی ڈور میں پروئے گئے۔ ہر کوئی اسی کوشش میں ایک دوسرے کے کان قصور پر پردہ ڈالے رہتا کہ خبر کہیں الیاس تک نہ پہنچ پائے۔ نتیجتاً سب نے آنکھیں موند لیں۔ رات گئے اگر کبھی کوئی آنکھ کھلتی اور پھر رات بھر حیرت سے کھلی ہی رہتی تو وہ سات آٹھ برس کے شبیر کی ہوتی۔ وہ نہیں سمجھ پاتا تھا کہ شام کو الگ چار پائی بچھا کر قدرے دور سونے والا ماما روشن باقی کی رات اُس کی ماں کے ساتھ کیوں سوتا ہے اور کیسی کیسی عجیب حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ ایک آدھ بار وہ چار پائی پر اُٹھ بیٹھا تو اُس کی ماں نے اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر سو جانے کو تو کہہ دیا مگر نیند ماں کے کہے سے تو نہیں آتی ناں۔

شبیر کو اس بات کی بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ اُس کی ماں مامیں روشن کو کیوں کہتی ہے کہ اب اُس میں وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی لہٰذا افیم کی کنی لگایا کرے اور تھوڑی سی شبیر کو بھی کھلا دیا کرے کہ رات کو وہ اُس کے سبب تنگ نہ ہوں۔ شبیر اسی ٹوہ میں لگ گیا کہ یہ افیم کیا ہوتی ہے۔ اُس نے اسکول میں اپنے دوست سے بھی اِس کے بارے میں پوچھا مگر وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔ ایک شام ماما روشن اُسے شام کے کھانے کے بعد ایک طرف لے گیا اور اُس کے ہاتھ پر باجرے کے دانے جتنی کوئی سیاہ سی چیز رکھی اور کہا کہ اسے پانی سے کھا لو تمہیں زکام نہیں ہو گا۔ یہ کہہ کر اُس نے چنے کے دانے برابر وہی چیز خود بھی نگل کر ایک گھونٹ پانی پی لیا تا کہ ہو چکے زکام کے آگے بند باندھا جا سکے۔ اُس رات کوشش کے باوجود اگلی صبح دیر تک شبیر کی آنکھ ہی نہ کھلی۔ اسکول تو اُس نے کیا جانا تھا گھر میں بھی اچھا خاصا نقصان ہو گیا کہ اُس کی ماں کی چار پائی کی پائنتی گذشتہ رات اپنے آپ ہی ٹوٹ گئی۔ لیکن حیرت اُسے اِس بات پر تھی کہ چھوٹے چھوٹے نقصان پر پورے گھر کو سر پر اُٹھا لینے والی اُس کی ماں اتنے بڑے نقصان کے

باوجود بہت خوش تھی۔ اُس نے ناشتے میں مامیں روشن کو دیسی گھی کے پراٹھے پر ڈھیر سا مکھن اور شکر ڈال کر دی۔ اُسے بھی ایک عرصے کے بعد دیسی گھی کی دو چوپڑی روٹیاں، گنے کی گُڑ کے ساتھ کھانے کی عیاشی کرا دی گئی۔

شبیر اِس بات پر بھی حیران تھا کہ جس رات ماما روشن اُسے نزلے کی دوائی دیتا ہے تو اگلے روز وہ اسکول نہیں جا پاتا۔ جاگ ہی نہیں ہوتی اور پھر غیر حاضری کے بعد ماسٹر جی کے ڈنڈے سے پھینٹی الگ۔ سو ایک شام جب پھر اُسے نزلے کی دوائی دی گئی اُس نے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر پھکا مارتے ہوئے منہ میں ڈالنے کی بجائے جان بوجھ کر نیچے گرا دی۔ وہ رات پوری کی پوری اُس کی نیم کھلی آنکھوں سے گزر گئی۔ اُس رات پہلی بار اُس نے وہ سب کچھ دیکھا جو پہلے نہیں دیکھ پایا تھا۔ ماں اور ماما روشن کی پوری رات کی برہنہ حرکتیں شبیر کے چھوٹے سے ذہن میں بہت سی گرہیں ڈال گئیں۔ صبح اسکول جانے سے پہلے ثقاوے میں نہاتے ہوئے اُس کے ذہن میں جو پہلا سوال اُبھرا وہ ماما روشن کے جسم سے اُس کے اپنے جسم کا تقابل تھا۔

اسکول جانے کے بعد اُس کے رویے میں پہلی تبدیلی اُس کے اندر بیدار ہو چکا تجسس تھا۔ جونہی کوئی مرد اُس کے سامنے آتا وہ خیال ہی خیال میں اُس کے ملبوس جسم کا تقابل ماما روشن کے غیر ملبوس جسم سے کرنے لگتا۔ کیا یہ سب ماما روشن کی طرح ہوں گے؟ اگر وہ سب اُس کی طرح ہیں تو وہ خود ویسا کیوں نہیں ہے؟ اسکول میں دھوتی باندھے چار پائی پر بیٹھا ماسٹر بھی سارا دن مشکوک سا اپنی دھوتی کا پلو ٹھیک کرنے میں لگا رہا کہ شاید وہ بار بار ننگا ہو رہا تھا۔ تبھی تو شبیر پورا دن اُسے اِس طریقے سے تکتا رہا کہ جیسے اُس کی توجہ دلا رہا ہو۔ لیکن ہر بار کی جانچ کے بعد اُس کا پلو ٹھیک ہی ہوتا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ بچہ اتنا سیانا ہو گیا ہے کہ اُستاد کے دل کا حال جاننے لگا ہے۔ اِس دیہاتی پرائمری اسکول کے اکلوتے ماسٹر کو چالیس طالب علموں کی کلاس میں ویسے تو "رزق" کوئی کمی نہیں تھی مگر شبیر تو اپنی گوری رنگت اور بھولے بھالے چہرے کے سبب کب سے ماسٹر جی کی نگاہ میں اَٹکا ہوا تھا لیکن وہ اِسی دن کا منتظر تھا کہ گوہر مقصود خود چل کر اُس کی طرف آئے تو پھر سواد ہے۔ چھٹی ہونے سے پہلے ماسٹر نے جان بوجھ کر دھوتی کے پلو کو ایک طرف سرکایا اور بظاہر بے دھیانی میں دن بھر کے سبق کا اعادہ

کرانے لگا۔ ماسٹر کی ایک آنکھ مسلسل شبیر پر تھی۔ اُس نے دیکھا کہ اِس دوران وہ پلک جھپکائے بغیر اُس کی دھوتی کے ہٹے ہوئے پلو کی جانب دیکھتا رہا تھا۔ اعادے کے بعد اُس نے جان بوجھ کر شبیر سے آج کے سبق کے بارے میں پوچھا مگر وہ جواب بھی نہ دے سکا۔ ماسٹر کی باچھیں کھل اُٹھیں، مگر دل ہی دل میں۔ دکھاوے کے لیے اُس نے شبیر کو اسکول ٹائم کے بعد روک لیا مگر سخت ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد کیونکہ آج کا سبق یاد کیے بنا گھر جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ جو لڑکے ماسٹر کی اس روٹین کا حصہ رہے تھے وہ تو خوش ہوئے کہ آج کی مشقت سے جان چھوٹی مگر شبیر نہ تو خوش تھا اور نہ ہی پریشان بلکہ خاموش تھا، مسلسل خاموش۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے ماسٹر نے اُسے گھر جانے کی اجازت دی تو اُس سے اپنے قدموں پر چلا نہیں جا رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کی کسی کو نہ بتانے کی دھمکی اپنی جگہ مگر آج ایک بہت بڑے جہان کا چھوٹا سا حصہ بن کر شبیر بہت خوش تھا۔ اُس پر وہ سارے راز کھل چکے تھے جو آج سے پہلے گرہوں کے اندر گرہیں ڈال کر اُس کے ذہن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آج کے بعد اُسے کسی مرد کے جسم کا تقابل ماما روشن کے جسم سے کرانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اُس کے ننھے سے ذہن پر آشکار ہو چکا تھا کہ سرِ شام کہیں دور چارپائی پر سونے والا ماما روشن پوری شب اُس کی ماں کے ساتھ کیوں سوتا ہے یا چارپائی ٹوٹنے کے نقصان پر غصہ کرنے کی بجائے اُس کی ماں ماما روشن کو دیسی گھی کے پراٹھے پر مکھن اور شکر ڈال کر کیوں کھلاتی ہے۔

ماسٹر کے ہاتھوں شبیر کا جسمانی استحصال معمول بنا تو اُسے اسکول جانے اور پڑھنے سے نفرت ہو گئی۔ چند دنوں کی ہچکچاہٹ انکار میں بدلی تو ماں نے کپڑے دھونے والے ڈنڈے سے اتنا مارا، اتنا مارا کہ ہڈیاں تو نہ ٹوٹیں مگر ماس کچلے جانے کی حد سے بھی زیادہ کچلا گیا اور دل ماں نام کی مخلوق سے اس قدر متنفر ہوا کہ شکل دیکھنے کا روادار نہ رہا۔ ماں نے شبیر کی ہٹ دھرمی دیکھی تو بگڑنے سے بچانے کے لیے اُسے روشن کے حوالے کر دیا۔ روشن کے ہاتھ میں آنے کے بعد اُس نے ایک وعدہ لیا کہ اسکول نہیں جائے گا مگر اس کے بدلے وہ سب کچھ کرے گا جو ماما چاہے گا۔ ماما روشن نے اُسے گاموں لوہار کی دوکان پر کام سیکھنے بٹھا دیا۔ اسکول ماسٹر جو پہلے سے ہی شبیر کی اِس طور بے وفائی سے برانگیختہ تھا سیدھا گاموں لوہار کے پاس جا

پہنچا اور اُس کے ذوق کی پہلے سے خبر رکھتے ہوئے جس قدر تعریف اُس لڑکے کی کر سکتا تھا، کر گزرا۔ نتیجہ وہی کہ یہاں بھی شبیر کو گاموں لوہار کی خواہش کے سامنے سر جھکانا پڑا کیونکہ بچ نکلنے کا اور کوئی راستہ بجھائی نہیں دیتا تھا۔

ماسٹر اور اُس کے بعد گاموں لوہار کی جانب سے کی گئی جنسی زیادتی کے بعد اُس کا اپنے آپ پر اعتماد اتنا مجروح ہوا کہ اُسے کسی بھی شخص سے آنکھ ملاتے ہوئے شرمندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اُسے اپنے آس پاس ہر مرد میں اسکول ماسٹر دکھائی دیتا تھا جو اُسے رگیدنے کے لیے اُس کی طرف جھپٹ رہا ہوتا۔ مگر گاموں لوہار کے ہاں کام کرتے ہوئے شبیر میں عجیب سی تبدیلی آنے لگی۔ ماسٹر کے متشددانہ رویے کے برعکس گاموں اُسے بہت پیار سے لبھاتا، کھانے کو بھی چنگا چوکھا دیتا اور جب بھی اُسے چھٹی کی طلب ہوتی، اُسے فراخ دلی سے جانے دیتا۔ لیکن جب کبھی خود اُس نے من مانی کرنی ہوتی تو کر کے رہتا مگر اِس طرح کہ کمسن شبیر اُس سے متنفر نہ ہونے پائے۔ شبیر کا اعتماد بحال ہوا تو اُس نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے۔ آتے جاتے اپنے سے چھوٹی عمر کے لڑکوں کے ساتھ اُنگل بازی تو جہاں رہی سو رہی گھر میں بھی اُس نے ماما روشن کو اِس طرح گھوری ڈال کر دیکھنا شروع کر دیا کہ جیسے ماں کے یار کو دیکھتے ہیں۔ پہلے پہل تو ماما روشن بھی پریشان ہوا کہ آخر ماجرا کیا ہے مگر جب ذرا سی کھوج لگانے پر گاموں لوہار کی مہربانیوں کا پتا چلا تو سمجھ گیا کہ کمہار کا لونڈا اگر لوہار کی صحبت میں رہے گا تو اکڑنے کے سوا اُسے آئے گا کیا۔ روشن یہ بھی سمجھ گیا کہ اِس اکڑ کے پیچھے محض لوہار کی صحبت ہی نہیں بلکہ شبیر کے گھر میں ایک عرصے سے پک رہی ہنڈیا کی خوشبو بھی شامل ہے۔

کافی غور و خوص کے بعد روشن نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ شبیر کی گھوری کا جواب مسکراہٹ سے دے اور اِس طرح کا رویہ رکھے کہ جیسے نہ تو کچھ ہوا ہے اور نہ ہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مگر روشن کی حکمتِ عملی شبیر کی اکڑ کے سامنے پھُسپھسا پٹا کا ثابت ہوئی۔ وہ بچہ ضرور تھا مگر اسکول ماسٹر کے راہیں ایک ہی جست میں بلوغت کے رموز سے آشنائی کے بعد اب گاموں لوہار کے ہاتھوں منصبِ دلبری کی جزیات بھی وقت سے پہلے سیکھ چلا تھا۔ روشن نے بھی مزید انتظار کیے بغیر فتنہ گری کی آخری چال سب سے پہلے چل دی۔ گاموں لوہار کی بیوی کو

ہونے والی مخبری اِس حد تک پکی اور یقینی تھی کہ اُن دونوں اُستاد شاگرد کو دکان کے پچھواڑے سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ گاموں لوہار کے ساتھ باقی جو کچھ بھی ہوا وہ اُس کے سالوں نے کیا جس میں منہ پر کالک اور گلے میں جوتوں کے ہار جیسی عزت افزائی بھی شامل تھی۔ گاموں لوہار کی درگت کے اِس سارے عمل میں شبیر کے لیے موقع سے فائدہ اُٹھانے کے وافر مواقع موجود تھے سو وہ اس طرح وہاں سے کھسکا کہ کسی کو کان و کان خبر تک نہ ہوئی۔

شام سے کچھ پہلے شبیر گھر پہنچا تو اُس کی ماں کیکر کا اَن چھلا گیلا ڈنڈا ہاتھ میں لیے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کے ویڑھے میں داخل ہوتے ہی کچھ حد حساب نہ رہا کہ ڈنڈا آ کہاں سے رہا ہے، کس سمت میں آ رہا ہے اور اُس بچے کو کہاں کہاں مضروب کر رہا ہے۔ لگتا تھا کہ وہ عورت نتائج سے غافل ہو کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ ضربات جتنے زور سے پڑ رہی تھیں اِن سے نو دس برس کے بچے کی ہڈیوں کا سالم رہ جانا کوئی معجزہ ہی ہوتا۔ خدشہ یہی تھا کہ اِس ڈنڈے کی ضرب اگر سر پر پڑ گئی تو کھوپڑی کا اوپری حصہ ناک تک اندر دھنس جانے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ اِس سے پہلے کہ شبیر کی حال دہائی پر اُس کا ددھیال اور آنڈ گوانڈ اکٹھا ہوتا وہ چھلانگ لگا کر قریب پڑے ماچے پر چڑھ گیا اور ہانپتے کانپتے سوٹا اُلارتی ماں کو دو تین جھکایاں دے کر سُوٹا اُس کے ہاتھ سے چھین لیا اور اپنے سر سے گھما کر بہت زور سے دور پھینک دیا۔

اِس سارے عمل نے شبیر کو گھما کر رکھ دیا۔ اُس کا سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اُس سے ماچے پر کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُسے ماں کی صورت سے ہی نفرت ہو چلی تھی کہ جو دیدے پھاڑے اُس کے یوں سوٹا چھین کر دور پھینکنے پر حیران کھڑی تھی۔ شبیر کے سامنے روشن اور اُس کی ماں کے وہ سارے لمحات واجھلوڑوں کی طرح اُس کی نگاہوں میں تلاطم برپا کیے ہوئے تھے کہ جو دونوں اُسے افیم کی کنی کھلا کر رات بھر ساتھ گزارتے تھے۔ کھلے بالوں والی وہ عورت اُسے ایک ڈائن کی طرح لگی کہ جو ہر وہ رشتہ کھا جاتی ہے جو اُس کے عزائم کی راہ حائل ہو۔ اُس کی ماں گاموں لوہار کی فعالیت سے منسوب وہ ساری گالیاں اُسے دینے لگی کہ جو جو اُسے یاد آتی چلی جا رہی تھیں۔

''اگر مجھے پتا ہوتا کہ تو کمہار کا جنا ہو کر اِس عمر میں کسی لوہار کا گانڈو کہلائے گا تو میں تجھے

پیدا ہوتے ہی مار دیتی۔'' یہ کہہ کر وہ اونچی آواز میں بین کر کر کے رونے لگی۔

''اگر مجھے پتا ہوتا کہ تو میری ماں ہو کر اُس بھڑوے روشن کو رات رات بھر اپنے ساتھ سلائے گی تو میں تیرے پیٹ ہی میں مر جاتا۔'' شبیر کی بات سنتے ہی وہ اُسے گالیاں دیتے ہوئے اُس کے پیچھے لپکی مگر شبیر ویڑھے سے باہر نکل گیا اور باہر ہی سے چیخ کر بولا کہ میں جا رہا ہوں تمہارا یہ کنجر خانہ چھوڑ کر ____ اب جیتے جی میرے ملنے کی آس نہ رکھنا ___ اور ہاں تیرا پُتر ہونے سے تو کسی چوہڑے کا گانڈو ہونا زیادہ معتبری کی بات ہے۔''

شبیر کی بات سُن کر اُس کی ماں کو سکتہ سا ہو کر رہ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا کرے۔ شبیر کے پیچھے بھاگے، اُسے مارے پیٹے یا اُن لوگوں کی نگاہوں کا سامنا کرے جو اُس کے سسرال اور آنڈ گوانڈ سے مسلسل اکٹھے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں روشن بھی موقع پر پہنچ گیا مگر وہاں تک آتے آتے وہ ماں بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو کا وہ حصہ سُن چکا تھا جس میں اُس کے کردار کا تذکرہ بطورِ خاص ہوا تھا۔ وہ دور ہی سے شبیر پر چیخا۔ ''او حرامی! ماں تیری تو میری بہن ہے لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تو ایسے کمہار کا نطفہ ہی نہیں، ضرور تیری ماں نے کسی چوہڑے مصلی کے ساتھ گھچ ماری ہے ___ تو ٹھہر تو سہی! میں کیسے تیرے ڈکرے کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ شبیر کے پیچھے دوڑا مگر اُس کے دوڑنے سے پہلے ہی وہ جنگل نما جھانگی کے پھیلتے اندھیرے میں گم ہو چکا تھا۔

گاڑی رُکی تو دانش سعید کو احساس ہوا کہ وہ رائل پام کلب کے سیکورٹی پوائنٹ پر پہنچ چکا ہے جہاں گاڑی کو مخصوص سکینر کے اوپر سے گزارنے کے بعد گیٹ میں داخل ہونے دیا جاتا ہے۔ گاڑی گیٹ سے گزر کر پورچ میں پہنچ چکی تھی۔ ڈرائیور کے دروازے کھولنے سے پہلے ہی کلب کا باوردی گارڈ گاڑی کا عقبی دروازہ کھول چکا تھا۔ دانش نیچے اترا تو اُس کے استقبال کے لیے کچھ اور لوگ بھی موجود تھے جن سے ہاتھ ملاتا ہوا وہ لابی کے داخلی راستے میں بنی ہوئی تین چار سیڑھیوں کی طرف بڑھا مگر جھانگی کے اندھیرے میں شبیر کا گم ہوتا ہوا چہرہ ابھی تک اُس کے ذہن سے نکل نہیں سکا تھا۔

۞

﴿۴﴾

مبشر رضا کو غائب ہوئے نو دن گزر چکے تھے اور ہر گزرنے والا دن ''مہ نور ایڈورٹائزرز'' کو معاشی تباہی کے قریب کیے چلا جا رہا تھا۔ کم و بیش پچاس کروڑ روپے کی نئی اشتہاری مہمات تھیں جن کے ذریعے ملک کی دو بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے نئے پراڈکٹس لانچ کرنے جا رہی تھیں۔ بات صرف اِسی پچاس کروڑ کے بزنس پر ختم نہیں ہو رہی تھی بلکہ اربوں روپے کا وہ تمام بزنس بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا کہ جو اِن کمپنیوں کے معمول کے بزنس کے ساتھ ساتھ دیگر کمپنیوں سے بھی جڑا ہوا تھا۔ زفیرہ احمد جس محنت سے کاروباری مسابقت کی اس مہم جوئی میں سب سے ارفع مقام پر پہنچی تھی وہ اُسے یوں کاغذ کے گھروندے کی طرح بکھرنے دینے کے لیے قطعی تیار نہ تھی۔ مبشر رضا جیسے شخص کے یوں دھوکا دینے کے عمل کو اُس نے اپنے لیے ایک نئے چیلنج کے طور پر لیا۔ اُسے اپنی کمپنی کے ہر شعبے میں موجود تمام ملازمین کی اہلیت کا بخوبی ادراک تھا مگر پھر بھی اُس نے ہر ایک کو نئے سرے سے پرکھنا شروع کیا۔ اِن میں تقریباً چالیس فیصد تو وہ تھے کہ جو ایڈورٹائزنگ کے عہدِ موجود میں اپنی افادیت کھو چکے ہونے کے باوجود صرف اس لیے کمپنی میں ملازم چلے آ رہے تھے کہ انہیں اُس کے والد کا قرب حاصل رہا تھا۔ باقی ساٹھ فیصد میں سے اکثریت انتظامی اور اکاؤنٹس جیسے غیر تخلیقی شعبہ جات میں تھی جب کہ تخلیقی شعبے میں جو چند ایک ملازم بچ رہتے تھے وہ بھی نام کی حد تک تخلیقی معاملات سے وابستہ تھے وگرنہ اُن کا کام محض بتائے گئے تخیل کو بہتر انداز میں عملی طور پر لاگو کر لینا ہی تھا۔ اِن سب میں اگر اعلیٰ پائے کا کوئی تخلیق کار تھا تو وہ مبشر رضا ہی تھا۔ وہ جس قسم

کے خیالات کلائنٹس کے سامنے بیٹھے بٹھائے لے آتا تھا وہ سننے والوں کو حیران کن حد تک اپنے سحر میں جکڑ لیتے۔ جدت اور جدت طرازی تو اُس کے روبرو سجدہ ریز رہتے کہ کب مبشر رضا کو اُن کی ضرورت پڑ جائے۔

مبشر رضا کے پیدا کردہ بحران سے نمٹنے کے لیے زفیرہ احمد نے جہاں نیا ٹیلنٹ لانے کا پلان ترتیب دیا وہاں اُن چالیس فیصد ملازمین سے بھی چھٹکارے کا فیصلہ کر لیا کہ جو موجودہ حالات میں بہتری کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے پر کمپنی کی معاشی کمر توڑ کر رکھ سکتے تھے۔ لیکن اس کے لیے اُسے بہر طور مناسب وقت کا انتظار کرنا تھا وگرنہ موجودہ بحرانی حالات میں اتنی بڑی تعداد میں ملازمین کی ڈاؤن سائزنگ کاروباری حلقوں کے ساتھ ساتھ شیئر مارکیٹ میں بھی ''مہ نور ایڈورٹائزرز'' کی ساکھ کو ملیا میٹ کر سکتی تھی۔ زفیرہ احمد کمپنی کے اُن ملازمین کے ارادوں سے بھی آگاہ تھی کہ جو نا مساعد حالات کی ذرا سی بھنک پا کر مختلف قیاس آرائیوں کو ہوا دیتے ہوئے آسمان کو زمین بنا دینے کی منفی قدرت رکھتے تھے۔ بہر حال اِن تمام مشکلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے زفیرہ احمد نے جو بھی کرنا تھا وہ اپنے طور کرنا تھا، اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اور کسی کو بھی اس غیر معمولی صورتحال کا ادراک کروائے بغیر کرنا تھا خاص طور پر اِن حالات میں کہ جب کمپنی کے ملازمین کا سازشی ٹولہ نہ صرف مبشر رضا کی گمشدگی سے بخوبی واقف تھا اور بلکہ اُسے من چاہے معنی بھی پہنا رہا تھا۔

پہلے پہلے تو اُس نے اپنی تخلیقی ٹیم کے ارکان کو ون لائنز اور کاپی رائٹنگ پر لگایا مگر کوئی بھی مطلوبہ نتائج نہ دے سکا۔ زفیرہ نے جتنی کوشش کی کہ وہ نہ تو فرسٹریٹ ہو گی اور نہ ہی ٹیمپر لوز کرے گی مگر جب مایوسی اور غصہ حد سے بڑھے تو اُسے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ایسے میں ڈرائیور کے بغیر اسلام آباد کے نواح میں پیر سوہاوا کے پہاڑی راستوں پر انتہائی تیز ڈرائیونگ اُس کے جذباتی ٹھہراؤ میں کرشماتی کردار کا باعث ہوتی۔ کبھی مونال کے کسی خاموش گوشے میں بلیک کافی کے مگ سے اپنے ہونٹوں اور گالوں کو سینکتے ہوئے اسلام آباد شہر کی پھیلتی ہوئی وسعتوں کو گھنٹوں تکتے رہنا اور کبھی مونال سے بھی چند کلو میٹر اوپر بلندی کی جانب ایک چھوٹی سی چپٹی چوٹی پر بنے ہوئے اپنے فارم ہاؤس میں اپنے لبراڈار نسل کے پالتو کتے شونی

کے ساتھ کچھ دیر کی گپ شپ اور پھر دن رات کی پروا کیے بغیر وہسکی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے اکیلے ہی شطرنج کھیلتے رہنا زفیرہ احمد کے لیے ڈیپریشن دور کرنے اور اُسے نئی جنگ کے لیے تیار کرنے کا ماحول بنا دیتا تھا۔ اِس فارم ہاؤس میں کُک کے علاوہ تین گارڈز تھے جو آٹھ آٹھ گھنٹے کے لیے اِس خوبصورت ترین مسکن کی نگہبانی کا فریضہ انجام دیتے رہتے۔ وہسکی کے ساتھ سٹیم کیے گئے مٹر کے نمکین دانے اور آرگینک چکن کے بھنے ہوئے قیمے کا ایک ایک چمچ اُس کی خاص خوراک ہوا کرتے۔ فارم ہاؤس کے عقبی حصے میں باورچی نے ضرورت کی حد تک کافی سبزیاں اُگا رکھی تھیں اور ساتھ ہی ایک ڈربے میں درجن کے قریب دیسی مرغیاں جن کے لیے آرگینک خوراک کا خاص خیال رکھا جاتا۔ زفیرہ احمد نے چونکہ یہاں مہینے میں ایک دوبار ہی آنا ہوتا تھا اِس لیے باورچی کو اِس سے زیادہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اُس روز بھی وہ اپنے فارم ہاؤس میں انتہائی تنے ہوئے اعصاب اور دہکتے ہوئے طیش کے عالم میں پہنچی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی شونی دوڑا ہوا آیا اور اُس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ زفیرہ نے خلافِ معمول اُس کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر لپٹانے کی بجائے محض جھک کر اُس کی گردن اور کمر پر ہاتھ پھیرا اور انتہائی بے تابی سے سیدھی اپنی لائبریری روم کے ایک کونے میں بنی ہوئی بار کے پاس پہنچی اور بلیک لیبل کا ایک ڈبل پیگ بنا کر برف ڈالے بغیر ایک لمبا سا گھونٹ اِس طرح لیا کہ اُس کا حلق محسوس کیے جانے کی گہرائی تک خوشگوار تلخی سے سیراب ہوتا چلا گیا۔ وہسکی کا اگلا گھونٹ لینے تک وہ اچھی بھلی پرسکون ہو چکی تھی۔ شونی بھی دبے قدموں کمرے میں آیا اور چوبی فرش پر بیٹھ کر زفیرہ کی طرف استفساریہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ زفیرہ نے اُس کی آنکھوں میں چھپا پیغام پڑھ لیا اور مسکرا دی۔ شونی ایک دم اُٹھا اور حجت آمیز بے تکلفی سے اُس کے قریب جا کر اُس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ ”یہ مرد ایسے کیوں نہیں ہوتے؟“ شونی کی لجاجت بھری محبت دیکھ کر اُس کے ذہن میں مبشر رضا کا چہرہ اُبھر آیا جو اُس کی پوری ساکھ داؤ پر لگا کر غائب ہو چکا تھا۔ اُس کے چہرے کے نرم پڑتے نقوش ایک بار پھر تن گئے۔ زفیرہ احمد کے اعصابی تناؤ اور طیش کی وجہ اب صرف یہ نہیں تھی کہ مبشر بدستور گم تھا اور کلائنٹس کمپنیوں کے جاب کی تکمیل بروقت نہیں ہو رہی تھی بلکہ ”مہ نور“ کے اندر سے یہ خبر لیک

ہونا شروع ہو چکی تھی کہ مبشر رضا کمپنی کی جاب چھوڑ کر جا چکا ہے۔

شونی نے ایک بار پھر فرش پر اپنا منہ بچھاتے ہوئے کان لٹکا کر چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ زفیرہ نے دوسرا پیگ بھی برف ملائے بغیر بنایا اور پہلی کی سی تیزی سے آدھے سے زیادہ حلق میں انڈیل لیا۔ اُس نے شونی کی طرف دیکھا۔ وہ اُس سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ اب کے زفیرہ کے اندر سے طمانیت عود کر اُس کے چہرے پر بکھر گئی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر شونی کا سر اپنی ران پر رکھا اور دوسرے ہاتھ میں تھاما ہوا وہسکی والا گلاس اُس کے قریب لے آئی۔ گلاس کو قریب آتا دیکھ کر شونی نے منہ کھول کر زبان باہر نکال لی۔ زفیرہ نے پیگ کی باقی ماندہ وہسکی شونی کے کھلے ہوئے منہ میں اُنڈیل دی۔ حلق میں وہسکی کا ذائقہ محسوس ہوتے ہی شونی نے تشکر سے لبریز آنکھوں سے اُسے دیکھا اور چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اب اُس کی مالکن کو کچھ ضروری کام کرنا ہوں گے کہ جس کے دوران اُس کی موجودگی غیر ضروری تھی۔

زفیرہ نے تیسرا پیگ بنا کر ابھی ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ کمرے میں خانساماں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ٹرے اور ٹرے میں خالی پلیٹ اور کٹلری کے علاوہ اسٹیم شدہ مٹر کے دانوں سے بھری ہوئی کرسٹل کی رکابی رکھی تھی۔ زفیرہ کے سامنے تپائی پر برتن رکھنے کے بعد خانساماں اُلٹے قدموں واپس چلا گیا۔ نہ زفیرہ نے اُس کی طرف دیکھا اور نہ ہی خانساماں نے کوئی بات کی۔ شونی کی طرح وہ بھی سمجھتا تھا کہ اِس وقت مالکن کو مکمل سکون مکمل تنہائی چاہئے۔

تیسرا پیگ ہولے ہولے سپ کرتے ہوئے زفیرہ نے اپنے مخصوص برانڈ کا سگریٹ سلگایا اور ایک گہرا کش لینے کے بعد اپنے موبائل فون کی ڈائری کھولی اور انتہائی گہری سوچ کے ساتھ اُس میں لکھے ہوئے کچھ ناموں کو پڑھنے لگی بار بار کئی بار۔ پھر اُس نے میز پر رکھے سفید کاغذ کے پیڈ پر تین نام بال پوائنٹ سے لکھے اور اُن کے گرد دائرہ لگانے کے بعد اُن کے دائیں بائیں کچھ اور نام لکھنے لگی۔ یہ تین نام ایڈورٹائزنگ کے تخلیقی شعبہ کے اُن ہنرمندوں کے تھے جو مارکیٹ میں مبشر رضا کے بعد اہم ترین جانے جاتے تھے لیکن یہ تینوں ”مہ نور ایڈورٹائزرز“ کے سب سے بڑے کاروباری حریفوں کی کمپنیوں میں ملازم تھے۔ اپنی کمپنی کو بچانے کے لیے زفیرہ احمد ہر قیمت پر اِن تینوں میں سے کسی ایک کو توڑنا چاہتی تھی۔ اُن کی بولی

زیادہ سے زیادہ کیا ہوسکتی تھی، اس کا تعین بھی زفیرہ احمد نے اپنی حد تک کر رکھا تھا۔فوری طوری پر کسی بھی ہنگامی بندوبست کے لیے وہ اپنے تئیں صفر مالی مفاد تک جانے کو بھی تیار تھی، حتیٰ کہ مائنس مالی پوزیشن کے لیے بھی۔لیکن وہ ''مہ نور''، اُس کی ساکھ اور ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں اپنی اجارہ داری کو داؤ پر لگانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اِس مہم جوئی میں زفیرہ احمد اِس حد تک آگے نکل گئی کہ متبادل پلان کے طور پر اُس نے ایک ایجنٹ کے ذریعے بیرون ملک بھی ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں ناموری رکھنے والے میڈیا ہاؤسز سے روابط شروع کر رکھے تھے۔ خاص طور پر انڈیا کے میڈیا ہاؤسز سے جن کے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پراڈکٹس کے لیے بنائے گئے اشتہارات نے اِن دنوں الیکٹرانک میڈیا میں نہ صرف دھوم مچا رکھی تھی بلکہ معیاری پروڈکشن کے لحاظ سے ''مہ نور'' کے قریب ترین حریف سمجھے جاتے تھے۔

نجانے کیوں اُسے یقین تھا کہ مبشر رضا کو اُس کی سب سے بڑی حریف کمپنی ''کرشمہ ایڈورٹائزرز'' کے عیار ترین چیف ایگزیکٹو خالد رومی نے توڑ لیا ہے۔کسے معلوم نہیں تھا کہ جس اشتہاری مہم پر مبشر رضا کے دستخط ہوں، کلائنٹس کمپنیاں اُس کی پریزنٹیشن آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتی ہیں۔ایسے میں مارکیٹ پر چھا جانے کا خالد رومی کا خواب صرف مبشر رضا کے ذریعے ہی پورا ہوسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اُسے یہیں اسلام آباد کے کسی فارم ہاؤس میں چھپایا گیا ہو۔اس کا بھی امکان تھا کہ اُسے زفیرہ احمد کے دباؤ سے اُسے بچا رکھنے کے واسطے کچھ عرصے کے لیے کسی دوسرے ملک بھجوا دیا گیا ہو اور پھر جب سب بہتر ہو جائے تو اُسے ایک دم اُسے ظاہر کر دیا جائے۔ بری سے بری ایک صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ اُسے توڑنے میں ناکامی پر کسی کرائے کے قاتل سے جھٹکا کرا کے کسی کھائی میں پھینکوا دیا گیا ہو۔

زفیرہ احمد سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اِس تیسرے آپشن کی طرف تو اُس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔شاید تفکر اور طیش نے اُس کے ذہن کی دہی بنا کر رکھ دی تھی۔''اگر ایسا ہی ہوا ہے تو اُس نے اب تک سب غلط کیا ہے ___ شدید غفلت کا ارتکاب۔'' زفیرہ احمد کا ذہن ایک دم قلابازیاں کھانے لگا تھا۔ وہ بدحواس سی اُٹھی اور تیزی سے ایک اور پیگ بنا لیا۔

''اگر اُس کے گھر کا پتا غلط تھا تو کمپنی کو اُس کی گمشدگی کی ایف آئی آر درج کرانی

چاہیے تھی ___ کل کلاں کو ایسی ویسی صورتحال میں اُسے بھی قانونی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔'' زفیرہ کو اِس بات پر پریشانی بھی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ کمپنی کے شعبہ ہیومن ریسورس نے اِس طرف توجہ کیوں نہیں دی۔ ایسے میں وہ تینوں نام اُس کے ذہن سے نکل گئے کہ جنہیں توڑنے کا ٹاسک اُس کے زیرِ غور تھا۔ اپنے ذہن کو اِس پیدا شدہ تناؤ سے فوری نجات دلانے کے لیے اُس نے پہلا رابطہ اپنی کمپنی کے ڈائریکٹر ہیومن ریسورس خوشنود ملک سے کیا اور اُسے فوری طور پر اپنے لیگل ایڈوائزر کی مشاورت سے مبشر رضا کی گمشدگی کی ایف آئی آر درج کرانے کو کہا۔

ایف آئی آر کے بارے میں خوشنود ملک کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اِس کی بجائے محض اشتہار اخبار ہی دیا جائے اور وہ بھی مبشر رضا کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بلکہ اُس کی دفتر سے غیر حاضری اور یوں اُس کے خلاف انضباطی کاروائی کی وارننگ کا۔

''you are totally an ass hole Mr.Malik__ کبھی دماغ سے بھی کام لیا کرو ___ تم سمجھتے کیوں نہیں کہ اخبار میں اشتہار دینا صریحاً خودکشی ہوگی __ تاکہ جن کلائنٹس کو مبشر کے بھاگ جانے کا ابھی تک علم نہیں اُنہیں بھی ہو جائے ___ اِس سے بہتر یہ نہیں کہ تم سب کو فائر کرنے کے بعد میں خود ہی کمپنی کو لپیٹ کر پھینک دوں دیوالیہ کے طور پر۔'' خوشنود ملک کے جواب پر زفیرہ احمد ایک دم بھڑک اُٹھی تھی جب کہ فون پر دوسری جانب خوشنود کے حلق سے تھوک بھی نہیں نگلی جا رہی تھی۔

''تمہیں عقل کیوں نہیں کہ آنے والے دنوں میں اگر اُس کی لاش کہیں سے ملتی ہے تو پولیس تم سے پوچھ گچھ نہیں کرے گی کہ مہ نور کے ہیومن ریسورس ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ ہوتے ہوئے تم نے اپنے ایک ایمپلائی کی گمشدگی کا نوٹس کیوں نہیں لیا؟'' زفیرہ کے شاؤٹ کرنے کے جواب میں خوشنود بمشکل صرف ''جج __ جی'' ہی کہہ سکا۔

''سنو خوشنود! جیسے میں تمہیں کہتی ہوں ویسے کرو ___ اپنے علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر کی بجائے صرف ایک رپورٹ درج کرا دو کہ ہماری کمپنی کا ایک ایمپلائی مبشر رضا دس دنوں سے غائب ہے اور بس ___ اِس سے زیادہ کچھ نہیں اور ہاں تھانے کے

آفیسر سے اُس کی کاپی کے ساتھ ساتھ شیورٹی بھی لے لو کہ جب تک ہم نہ کہیں نہ تو اِس کی کوئی نقل جاری ہو اور نہ ہی اِس رپورٹ کی کسی دوسرے کو کوئی بھنک۔"

"ایسا ہی ہوگا میم ـــــ" خوشنود ملک اب منمنانے پر آ گیا تھا۔

"مجھے یقین ہے مسٹر ملک کہ تمہیں پولیس والوں سے شیورٹی لینے کا ہنر تو آتا ہی ہوگا۔"

زفیرہ احمد کے لہجے میں بھی ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ خوشنود سے بات ختم ہوتے ہی اُس نے ایک اور نمبر ڈائل کیا۔ نمبر ملتے ہی دوسری جانب سے تیز میوزک کی آواز سنائی دی جو بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ فون ریسیو کرنے والا شخص کسی ایسی جگہ سے اُٹھ کر نسبتاً دور جا کر فون سننا چاہ رہا ہے کہ جہاں ناچ گانا اپنے عروج پر تھا۔

"بھڑوے میں عورت کے موئے زیریں تک اُکھیڑنے کی سکت نہیں لیکن پھر بھی ہر رات بازار سجا کر بیٹھتا ہے۔" زفیرہ زہرخند لہجے میں زیرِ لب بڑبڑا رہی تھی۔ دوسری جانب سے کوئی ایک دم پاٹ دار آواز میں چلایا۔

"ہاں ڈیئر! کیا مسئلہ ہے؟ کوئی کھجلی وُجلی یا پھر کوئی کیڑا وِیڑا؟"

"میرا ٹیکسٹ میسج مل گیا ہے؟"

"مل بھی گیا ہے اور پڑھ بھی لیا ہے ـــــ اب جان چھوڑو بور نہیں کرو۔" دوسری جانب سے کوئی ابھی تک چلا کر ہی بات کر رہا تھا۔

"بڑے صاحب! مجھے کل تک اُن تینوں میں سے کوئی ایک لازمی چاہیئے۔" زفیرہ احمد کے لہجے میں نجانے کہاں سے اِس قدر لجاجت در آئی تھی کہ تصنع کا گماں ہو رہا تھا۔

"کہہ تو دیا کہ کوشش کریں گے ـــــ اور کیا جان دے دیں؟"

"ایسے نہ کریں بڑے صاحب! کچھ نہ ہوا تو مجھے اپنی جان دینی ہوگی۔"

"آئے ہائے ہائے ـــــ تمہاری جان کے تو ہزاروں طلب گار میرے سمیت، کس کس کو دو گی؟" بڑے صاحب کا لہجہ مزید غیر سنجیدہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"بڑے صاحب! آپ آدمی توڑیے، کسی بھی قیمت پر ـــــ میں اُسے کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں بھی شامل کر سکتی ہوں۔" زفیرہ لجاجت میں بھی سنجیدگی پر قائم تھی۔

"اور مجھے کیا ملے گا؟"

"آپ کے لیے میں جو ہوں۔" زفیرہ نے اپنے لفظ لفظ میں التفات پرو لیا تھا۔

"زفیرہ ـــــ بے بی بہت چالاک ہو تم ـــــ اپنی طاقت اور مقابل کی کمزوریوں سے کھیلنا جانتی ہو اور میں تمہارے اِسی ہُنر کا عاشق ہوں ـــــ کوئی اچھی سی شام اِسی ہفتے میرے لیے سنبھال رکھنا۔" اِس سے پہلے کہ زفیرہ کوئی جواب دیتی اُس کا مخاطب دوسری جانب سے فون بند کر چکا تھا۔ زفیرہ سمجھی کہ شاید لائن ڈراپ ہوگئی ہے۔ ابھی وہ دوبارہ سے ملانے ہی لگی تھی کہ بڑے صاحب کی سبھی عادتیں اُس کے ذہن میں گھوم گئیں۔

"بھڑوا ـــــ" اُس نے بند فون کو دیکھا، مسکرائی اور ایک طرف صوفے پر پھینک دیا۔ سکون کی ایک لمبی سانس نے اُسے یاد دلایا کہ گذشتہ لمحات کے ذہنی تناؤ نے اُس کا سارا سرور بھاپ بنا کر اُڑا دیا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیڈ روم میں گئی، بلیک شیفون کی نائٹی پہنی اور گنگناتی ہوئی واپس لائبریری میں آ کر پھر سے پہلا پیگ بنایا اور اب کے اُس میں برف ڈال کر لمبا سا گھونٹ لیتے ہوئے ایزی چیئر پر نیم دراز ہوگئی۔ اچانک اُسے احساس ہوا کہ کمرے میں وہ اکیلی نہیں بلکہ کوئی اور بھی اُسے دیکھ رہا ہے۔ اُس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو سامنے کا منظر دیکھ کر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شونی کافی دیر سے منہ فرش پر ٹکائے لمبی سی زبان نکلے خاموشی سے اُس کی طرف تکے جا رہا تھا۔ زفیرہ کو شونی کی اس ادا پر بہت پیار آیا۔

"کتنا مزاج شناس ہے اُس کا ـــــ کس قدر سمجھتا ہے اُس کی پریشانی اور سکون کو!" یہ سوچتے ہوئے زفیرہ نے اپنی بائیں پنڈلی سے نائٹی کو اوپر گھٹنے تک سرکایا اور وہسکی کی بوتل اُٹھا کر پیگ بھر شراب اُس پر اُنڈیل دی۔ شراب کا پنڈلی پر اُنڈیلا جانا تھا کہ شونی لپک کر زفیرہ کے قریب پہنچا اور اپنی کھردری زبان سے اُسے چاٹنے لگا۔ کھردری زبان کے لمس سے اُس کے سارے بدن میں ایک قیامت سی جاگ اُٹھی جس کے وفور سے اُس کی آنکھیں خود بخود بھاری ہوتی چلی گئیں۔

۞

﴿۵﴾

اپنی تصویر کے ذریعے ثمینہ نام سے شناخت کی جانے والی لڑکی دو دن بعد ہوش میں آ چکی تھی۔ ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے سوالات سے اتنا گھبرایا کہ ڈاکٹر کو لڑکی کا پرس پکڑانے کے بعد اپنے بارے میں کچھ بھی بتائے بغیر کھسک لیا۔ اِس طور اِن دو دنوں میں لڑکی کی طرح ہسپتال کا ریکارڈ بھی بالکل خاموش رہا کہ وہ کون ہے، کیا ہے، کہاں سے ہے، رہتی کہاں ہے، کرتی کیا ہے، پڑھتی ہے، پڑھاتی ہے یا پھر کوئی اور جاب کرتی ہے؟

ڈاکٹر نے ازراہ احتیاط خود ہی قریبی پولیس اسٹیشن کو اِس میڈیکولیگل کیس کی اطلاع کر دی تھی لیکن اس طرح کی لاوارث لڑکیوں کی موت چاہے حادثاتی ہو، قتل یا خودکشی، پولیس کم ہی توجہ دیتی ہے۔ اگر توجہ دی بھی تو اتنی کہ بس ضابطے کی کاروائی ہوئی اور لاش میونسپلٹی کے حوالے جس کا آخری ٹھکانہ لاوارثوں کے قبرستان کا کوئی ویران گوشہ یا پھر آٹھ دس ہزار روپے کے عوض کسی پرائیویٹ میڈیکل کالج کے شعبہ اناٹومی کی کوئی میز کہ جہاں زیرِ تربیت ڈاکٹروں کے اناڑی نشتروں سے اُن کے بدن کا ریشہ ریشہ اُدھڑ کر نالیوں میں بہتا رہتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ لڑکیاں پیار کی آڑ میں پیار کے بیوپار اور پیار کے دھندے سے جُڑ جاتی ہیں اور پھر ایک لامتناہی سلسلہ کہ پیار کے اِن بیوپاریوں میں سے کس بیوپاری کے ساتھ ربط کہاں ٹوٹا اور کسی اور سے تعلق کیونکر اور کہاں جڑا۔ جھوٹ، چھل اور فریب کی اِس سحر کاری میں اُنہیں ہر وہ شخص زہر لگتا ہے کہ جو اُن سے سچ بولے یا سچ کی طرف لانے کا جتن کرے۔

ظاہر ہے ثمینہ نے ہوش میں آنے کے بعد بھی کیا سچ بولنا تھا۔ ہوش میں آتے ہی پہلے

پہل تو اُس نے نیم وا آنکھوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا کہ جان سکے وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ جونہی اُسے صورتحال کا ادراک ہوا اُس نے کوشش کی کہ کچھ دیر اور اپنے اوپر بے ہوشی طاری کیے رکھے تا کہ اِس دوران اِن حالات سے نمٹنے کے لیے مزید سوچ بچار کا موقع مل سکے۔ مگر ایمرجنسی وارڈ میں موجود نرس اُسے ہوش میں آتا دیکھ چکی تھی۔ اُس نے فوراً انٹرکام پر ڈاکٹر سے رابطہ کیا اور بتا دیا کہ وہ نامعلوم لڑکی ہوش میں آ چکی ہے۔ نرس کی بات ہوش میں آتی ثمینہ کے کانوں میں پڑی تو اُس نے پھر سے آنکھیں موند لیں۔ دوسری جانب انٹرکام پر بات ہوتے ہی ڈاکٹر دوڑا دوڑا اندر آیا مگر ثمینہ کو آنکھیں بند کیے لیٹا دیکھ کر اُنہیں قدموں رک کر خفگی سے نرس کی طرف دیکھنے لگا جو اِس صورتحال میں خود بھی حواس باختہ ہو رہی تھی۔

''سر! یہ ابھی ہوش میں تھی۔'' نرس کے پاس گھگھیانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے نرس کی کیفیت کو بھانپ کر اپنے تئیں کچھ اندازہ لگایا اور آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے ثمینہ کی کلائی تھام کر انگلیاں اُس کی نبض پر رکھ دیں اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے پپوٹے اُٹھا کر آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگا جو کچھ اور ہی روداد بیان کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر سمجھ گیا کہ لڑکی ہوش میں ہوتے ہوئے بھی ابھی بے ہوش رہنا چاہتی ہے۔ اُس نے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ نرس کو دیکھا تو نرس کے چہرے پر بھی اطمینان کی لہر پھیل گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر نے انتہائی سنجیدگی سے نرس کو ہدایات دیں کہ یہ لڑکی اگر اگلے پانچ منٹ تک ہوش میں نہیں آتی تو اُسے آپریشن تھیٹر میں شفٹ کر دیا جائے۔ نرس نے حیران ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو اُس نے مسکراتے ہوئے بائیں آنکھ دبا دی۔ جواباً نرس بھی مسکرا دی۔ ڈاکٹر ابھی کمرے سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ اُسے لڑکی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ثمینہ آنکھیں نیم وا کیے اپنے اردگرد کے ماحول کا ادراک کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اداکاری کر رہی ہے۔

''کیسی ہو آپ؟''____ ڈاکٹر نے ایک بار پھر واپس اُس کے بیڈ کے پاس آ کر پوچھا۔ جواب میں لڑکی نے سر کو اثبات میں ہلکی سی جنبش دے کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ ڈاکٹر نے

نرس کو اُس کا بلڈ پریشر چیک کرنے کا اشارہ کیا اور خود کرسی گھسیٹ کر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

''کیسا محسوس کر رہی ہو آپ! کہیں کوئی سر تو نہیں چکرا رہا؟''____ لڑکی جو بازو پر بلڈ پریشر کا اسٹریپ باندھے جانے کے سبب اب کے آنکھیں کھولے ہوئے تھی، پھر سے پلکیں جھپکا کر اشارہ کیا کہ ہاں چکرا رہا ہے۔ ڈاکٹر نے لڑکی کی طرف غور سے دیکھا اور دائیں ہاتھ کی اُلٹی ہتھیلی کو اُس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن پر وہاں رکھا کہ جہاں شہ رگ کا بہاؤ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس دوران نرس نے بھی بلڈ پریشر چیک کر لیا تھا۔ اُس نے بیڈ ہیڈ چارٹ میں اس کا اندراج کیا اور چارٹ ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ نہ صرف دل کی دھڑکن اور شہ رگ میں خون کا بہاؤ نارمل تھا بلکہ بلڈ پریشر بھی مناسب ترین سطح پر تھا۔ ڈاکٹر بیڈ ہیڈ چارٹ کے اندراجات پر دستخط کرنے ہی لگا تھا کہ رُک گیا۔

''آپ کا نام ثمینہ ہے؟'' ڈاکٹر کی نگاہیں لڑکی کے چہرے پر جمی تھیں۔

''نہیں تو______'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی اور گردن کو بھی انکار میں جنبش دی۔

''تو پھر کیا ہے آپ کا نام؟'' ڈاکٹر کی نگاہیں تشکیک سے بھر چکی تھیں لیکن لڑکی بدستور خاموش چھت کی طرف یوں دیکھے جا رہی تھی کہ جیسے اپنا نام تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ خاصی دیر ہو گئی اور جواب پھر بھی نہ ملا تو ڈاکٹر کی لہجے کی سنجیدگی بھی اتنی بڑھی کہ چہرے سے ٹپکنے لگی۔

''میں نے تم سے تمہارا نام پوچھا ہے۔''

''عارفہ____'' اِس بار اُس کی آواز اگرچہ مدھم تھی مگر ہونٹوں کی جنبش میں واضح قرار آ چکا تھا۔

''لیکن تمہارا نام تو ثمینہ ہے____ تصویر پر تو یہی لکھا ہے۔'' لڑکی کا ٹیڑھا رویہ دیکھ کر ڈاکٹر بھی اب آپ سے تم پر آ چکا تھا۔ لڑکی نے بھی کوئی جواب دینے کی بجائے آنکھوں کے پپوٹے ڈھیلے کر لینے پر اکتفا کیا۔

''میں نے تم سے پوچھا ہے۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں بھی زچکائی آ چکی تھی۔ لڑکی نے بھی ڈاکٹر کے لہجے کا کوئی زیادہ اثر لینے کی بجائے بس آنکھوں کو پھر سے ذرا سا وا کر لیا۔

''میں نے پوچھا ہے کہ تمہارا نام تو ثمینہ ہے____ تو پھر یہ عارفہ کون؟'' ڈاکٹر کا لہجہ مزید بگڑ کر ڈانٹ ڈپٹ والا ہو چکا تھا۔

''لیکن____ میرا نام____ ثمینہ____ تو نہیں۔'' لڑکی کے یوں وقفوں وقفوں سے بولنے میں کہیں بھی بناوٹ کا شائبہ نہیں تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اتنا چھوٹا سا جملہ بولتے ہوئے بھی اُس کی سانس پھول پھول جاتی تھی۔ ڈاکٹر ایک بھر سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے پھر سے اُس کا بیڈ ہیڈ چارٹ اُٹھا کر دیکھا۔ اگرچہ اُس کے ظاہری جسم پر کسی تشدد کے نشان نہیں تھے مگر وہ بری طرح جنسی تشدد کا نشانہ بنی تھی جو کسی طرح بھی ایک مرد کی انتہا وحشت کی کارستانی نہیں لگتی تھی۔ ایک سے زیادہ لوگ رہے ہوں گے کہ جنہوں نے اُس کے اعضائے زیریں کی حدود و قیود کو بری طرح خلط ملط کر دیا تھا۔ لڑکی چاہے عارفہ رہی ہو یا ثمینہ کسی زہر خورانی کی بجائے انتہائی سریع الاثر نشے آئس کے زیر اثر تھی کہ جس کے سبب اُسے احساس ہی نہ ہوا کہ اُس کے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر لڑکی نے آئس استعمال کی ہو گی تو اُن مردوں نے کیوں نہیں کی ہو گی۔ جس وحشیانہ تشدد کا سامنا لڑکی تین دن پہلے کر چکی تھی وہ آئس لینے کے بعد ہی ممکن تھا، کسی اور نشے کے ساتھ نہیں۔

بیڈ ہیڈ چارٹ پر لکھی روداد کو ایک بار پھر پڑھنے کے بعد ڈاکٹر دوبارہ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے لڑکی کے چہرے پر نگاہ ڈالی____ وہ نچڑ کر کسی کملائے ہوئے زرد گلاب کی طرح لگ رہا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں لیکن خشکی کے سبب ہونٹوں پر پڑپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ شاید اُس کے جسم کو مزید پانی اور نمکیات کی ضرورت تھی۔ بیڈ ہیڈ چارٹ کے مطابق اُس کے اعضائے زیریں کو ٹانکے لگا کر پھر سے اپنی اصل حالت میں بحال کر دیا گیا تھا۔ زخموں کے اندمال کے واسطے چونکہ اینٹی بائیوٹک دیے جا رہے تھے لہذا ہونٹوں اور زبان میں خشکی کے اثرات فطری تھے۔ ڈاکٹر ابھی تک تیقن کے ساتھ کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے خود کو قاصر محسوس کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ اور پڑھ لینے کے بعد بھی اُسے لڑکی کی موجودہ کیفیت حقیقت سے زیادہ اداکاری لگ رہی تھی۔ اُس نے دوبارہ سے لڑکی کی نبض دیکھی لیکن نبض کی توانا رفتار اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی مردنی سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ ایسے میں شش و پنج بہت چھوٹا

لفظ تھا جو ڈاکٹر کی اِس کیفیت کے لیے تجویز کیا جا سکتا تھا مگر اِس کے باوجود وہ کوئی بھی رسک لینے کو تیار نہیں تھا کہ جب تک پولیس کا تفتیشی افسر اُس کا بیان نہ لکھ لے۔ اگرچہ لڑکی بظاہر بیان قلمبند کرانے کی پوزیشن میں تھی لیکن کسی بھی قسم کا شک رفع کرنے کی غرض سے اُس نے بیڈ ہیڈ چارٹ پر نرس کو کچھ انجیکشن ڈرپ میں دینے کی ہدایت لکھ کر کی اور پھر جاتے جاتے قدرے بلند آواز میں بتا گیا کہ اگلے دو گھنٹے تک تھانیدار کو اُس کا بیان قلمبند کرنے کے لیے بلا لیا جائے گا۔

ڈاکٹر کے کمرے سے باہر جاتے ہی نرس نے بیڈ ہیڈ چارٹ اُٹھایا، لکھے ہوئے انجیکشنز کی تفصیل دیکھی اور ایک نئی ڈرپ اسٹینڈ پر لٹکا کر اُسے لڑکی کے دائیں ہاتھ پر لگے ہوئے برینولا سے منسلک کر دیا۔ اِس دوران اُس نے دو مختلف انجیکشن بھی ڈرپ کے اندر انجیکٹ کیے اور ڈرپ سے ٹیوب میں گرنے والے قطروں کی رفتار کو مناسب سطح پر لانے کے بعد ایک کونے میں رکھی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ نجانے پھر کیا خیال آیا کہ دوبارہ اُٹھی اور لڑکی کے سرہانے جھک کر اُس کی طبیعت کا پوچھنے لگی مگر اُس نے نہ تو آنکھیں کھولیں اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ بس لبوں میں تھوڑی جنبش ہوئی لیکن جو کچھ اُس نے کہا وہ نرس کے پلے ہی نہیں پڑا۔ وہ چہرے پر ناگواری کے تاثرات لیے ہاتھوں سے ''دفع دور'' کا اشارہ کرتے ہوئے پھر سے کرسی پر آن بیٹھی اور سائیڈ پر رکھی ہوئی ادویات کی آہنی ٹرالی کے نیچے سے خواتین کے لیے شائع ہونے والا ایک ڈائجسٹ نکال کر کسی ادھوری کہانی کو دوبارہ وہیں سے پڑھنے لگی کہ جہاں چھوڑا تھا۔

ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ لڑکی کے پورے بدن کو اِس طرح جھٹکے لگنے لگے کہ جیسے اُسے کوئی اوپر اُٹھا اُٹھا کر پھر سے بستر پر پٹک رہا ہو۔ نرس جلدی سے اُٹھ کر لڑکی کے پاس پہنچی تو اُس کی آنکھیں کھلی ہی نہیں بلکہ پھٹی پھٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے انٹر کام کی طرف لپکی مگر دوسری جانب سے کوئی بھی فون نہیں اُٹھا رہا تھا۔ اتنے میں لڑکی کے گلے سے اِس طرح کے گرگاٹ نکلنا شروع ہو گئے کہ جیسے کسی جانور کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ نرس کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس اور تو کچھ سُجھائی نہ دیا بس جلدی سے لپک کر ڈرپ کو لاک کر دیا جس

سے قطرہ قطرہ خون میں شامل ہونے والی ادویات کا موہوم بہاؤ وہیں رُک گیا۔

ڈرپ کے بند ہوتے ہی نہ صرف لڑکی کے گلے سے نکلنے والی آوازیں آہستہ ہوتی چلی گئیں بلکہ اُس کے بدن کو لگنے والے جھٹکوں کی شدت میں بھی کمی آنے لگی۔ نرس کی جان میں جان میں آئی مگر وہ حیران تھی کہ اُس نے ڈرپ کے ساتھ ساتھ دیگر انجیکشن بھی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دیے تھے تو پھر یہ ریکشن کیوں ہوا جب کہ اِن میں سے کوئی میڈیسن ایسی نہیں تھی کہ جس کا ریکشن ہوتا ہو۔ شاید یہ ادویات نقلی ہوں یا پھر لڑکی کو تکلیف کا سبب کچھ اور ہو۔ لیکن بہتری یہ ہوئی کہ نرس کے اپنے تئیں اِس معاملے کے بارے سوچنے کے دوران ہی لڑکی پھر سے نارمل ہو گئی۔ اب وہ پھر سے آنکھیں بند کیے اُسی حالت میں واپس آ چکی تھی کہ جس حالت میں ڈرپ لگانے سے پہلے تھی۔

اب کے نرس نے لڑکی کے سرہانے آہنی بیڈ سے اَٹکا ہوا بیڈ ہیڈ چارٹ اُتارا اور تمام صورتحال سے ڈاکٹر کو باخبر کرنے کے لیے اِس کمرے سے کچھ دور نرسنگ اسٹیشن کی طرف چلی کہ جس کے ساتھ ہی ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کا کمرہ تھا۔ ڈاکٹر نے روداد سُنی تو ایک لمحے کے لیے وہ بھی لرز کر رہ گیا۔ جو کچھ اُسے بتایا جا رہا تھا ویسا اِن میڈیسن کے دیے جانے سے ہونا انتہائی ناممکن تھا۔ ڈرپ میں صرف سیلائن واٹر تھا اور دونوں انجکشنز میں سے ایک اعصابی تناؤ سے بچاؤ اور دوسرا ملٹی وٹامنز کا تھا۔ اِن سب سے کسی بھی قسم کے ریکشن کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شبہ اُسے یہ ہو رہا تھا کہ نرس نے کہیں کوئی اور انجکشن ڈرپ میں نہ ملا دیا ہو۔ وگرنہ ڈرپ بند کرنے سے لڑکی کی بیان کی گئی کیفیت کیسے ختم ہو سکتی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا اُس کا تعلق ڈرپ سے ضرور تھا۔ ڈاکٹر کا دل تو چاہا کہ نرس پر برسے اور اُسے کہے کہ جتنے نخرے سے تو چلتے ہوئے اپنے دُمبی جیسے چوتڑ گھماتی ہے اُسی طرح دماغ کو بھی دائیں بائیں گھما لیا کرے مگر یہ اُس سے اُلجھنے کا موقع نہیں تھا لہٰذا نرس سے کچھ کہے بغیر اُس کے ہاتھ سے بیڈ ہیڈ چارٹ اُچکا اور تیزی سے لڑکی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ نرس بھی اُس کے پیچھے پیچھے تقریباً دوڑتی ہوئی کوشش کر رہی تھی کہ اگر ہم قدم نہیں تو کم از کم زیادہ پیچھے نہ رہے۔

وہ دونوں کم و بیش ایک ہی وقت میں کمرے میں داخل ہوئے مگر کمرہ خالی تھا۔ لڑکی خواہ

وہ ثمینہ تھی یا عارفہ ___ نہ تو وہ بیڈ پر تھی اور نہ ہی کمرے میں کسی اور جگہ۔ڈاکٹر نے باتھ روم کے بند دروازے کی طرف غور سے دیکھا۔نرس سمجھ گئی کہ ڈاکٹر کیا سوچ رہا ہے۔اُس نے آگے بڑھ کر باتھ روم کے بند دروازے کو دھکا دیا۔ یک طاقہ دروازہ چونکہ اندر سے بند نہیں تھا لہذا کھٹاک سے دیوار کے ساتھ جاٹکرایا۔باتھ روم میں بھی کوئی نہیں تھا۔ڈاکٹر نے پھر بیڈ کی طرف دیکھا۔تین چوتھائی بھری ہوئی ڈرپ کی ٹیوب اسٹینڈ کے ساتھ لٹکی ہوئی جھول رہی تھی جب کہ بستر کی بری طرح مسلی ہوئی چادر صاف بتا رہی تھی کہ لڑکی اپنی مرضی سے باہر نہیں گئی بلکہ اُسے اچھی خاصی مزاحمت کے بعد یہاں سے زبردستی اُٹھا کر لے جایا گیا ہے۔

ڈاکٹر پہلے تو بوکھلا گیا مگر پھر اپنے حواس مجتمع کر کے پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھتی نرس پر چلایا۔''کیا ضرورت تھی اُسے اکیلا چھوڑ کر میرے پاس آنے کی! انٹرکام پر بات نہیں کرسکتی تھی کیا؟ ___ اب میں کیا جواب دوں گا تھانیدار کو جو ابھی آتا ہی ہوگا اُس حرامزادی کا بیان ریکارڈ کرنے۔''

۞

﴿ ۶ ﴾

قبل اِس کے کہ وہ رائل پام کلب میں اپنی طے شدہ مصروفیات میں کھب جاتا، دانش سعید نے مناسب سمجھا کہ پہلے خود کو تازہ دم کر لے کیونکہ اسلام آباد سے یہاں تک پانچ گھنٹے کے سفر نے اگر اُسے تھکایا نہیں تھا تو کم از کم ایک عجیب سی بیوسیت ضرور طاری کر دی تھی۔دانش سعید کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے اُس کی آمد کے منتظر ایگزیکٹوز نے اُسے اُس کے لگژری سوئیٹ تک پہنچا دیا جہاں اُس کا پہلا قدم فطری طور پر واش روم کی جانب تھا۔سکون کی ایک طویل سانس کے ساتھ مثانے کا بوجھ کم ہوا تو تنے ہوئے اعصاب اپنے آپ ہی ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔کسی حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھیلے ہوئے کرسٹل کے جار میں بھاپ کی تمام تر حدت کو اپنی تہوں میں سموئے ہوئے چھوٹے سائز کے نفیس تولیوں نے چہرے اور ہاتھوں سے رہی سہی تھکن بھی مساموں کے ذریعے باہر نکال پھینکی تو سکون کی لہر آنکھوں کے پپوٹوں تک پھیل گئی۔

دانش سعید واش روم سے باہر آیا تو سیاہ رنگ کے پینٹ کوٹ اور سینے تک کھلے ہوئے گریبان والی آف وائٹ کلر کی شرٹ پہنے ایک پچیس چھبیس برس کی دراز قد حسینہ اپنے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ میں اُس کی پسندیدہ وہسکی کا پیگ لیے کھڑی تھی اس طرح کہ دیکھنے والے کی نگاہ اُس کے چہرے سے زیادہ اُس کے سینے کی ظاہر و پوشیدہ گولائیوں کی جستجو میں اُلجھ کر رہ جائے۔مگر دانش سعید نے اُسے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ کے بعد اس طرح نظر انداز کر دیا کہ جیسے کمرے میں کوئی اور وجود ہی نہیں۔لڑکی کی طرف پشت کیے اُس نے اپنے

کف لنکس کو درست کیا اور شرٹ کے کالرز کو کوٹ سے باہر نکالتے ہوئے ہولے سے بڑبڑایا۔

"لے جاؤ ___ طلب نہیں ہے ابھی۔"

لڑکی نے اپنے جمال اور جاذبیت کی یوں درگت بنی محسوس کی تو ایک لمحے کے لیے اُس کے ہونٹ مسکرانا بھول گئے مگر بس ایک ہی لمحے کے لیے، اُس کے بعد وہی انداز اور وہی مسکراہٹ لیکن آنکھوں میں اُترنے والی ہلکی سی نمی صاف بتا رہی تھی کہ مہمانداری کے اِس پیشے میں آئے ہوئے اُسے زیادہ راتیں نہیں ہوئیں لیکن اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ جس مرد میں عورت کو آنکھ بھر کر دیکھنے کی تاب نہیں اُس کی آنکھوں کو بار بار ہراساں کیے رکھنے کی اذیت دینا ہی کمالِ نسایت ہے، بار بار اِس انداز میں سامنے آ کر جس سے جسم کا وہ وہ انگ بھی نمایاں ہو کہ بینائی دنگ اور حسرت گُنگ ہو کر رہ جائے۔ لہٰذا وہ وہیں اُسی انداز میں اُس وقت تک کھڑی رہی کہ جب تک اُس کے موجود نہ ہونے کا یقین کرتے ہوئے دانش واپس نہیں مڑا لیکن جونہی وہ مڑا وہ لڑکی بھی اپنی ایڑیوں پر اس طرح گھومی کہ اُس کے جسم کا پُرکشش ترین زاویہ اپنے آپ ہی دانش کی طرف گھوم گیا اور وہ نہایت طرحداری سے اُس کو دائیں بائیں جنبش دیتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

دانش سعید کی آنکھوں میں اب بھی اُس حسینہ کے لیے پسندیدگی کا کوئی شائبہ کہیں سے ظاہر نہیں ہوا تھا اُلٹا اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہو چلے تھے۔ وہ منہ ہی منہ خاصا کچھ بڑبڑاتا ہوا سویٹ کے اُس حصے میں آیا کہ جہاں کارپوریٹ ایگزیکٹو دکھائی دینے والے تین صاحبان اپنے لکڑی سے تراشیدہ بے تاثر چہروں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیانی عمر کے اوائل میں داخل ہو چکیں یہ روبوٹک شخصیات سیاہ رنگ کے پینٹ کوٹ اور سفید شرٹ کے ساتھ سیاہ نیکٹائی لگائے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ سب کسی دفتری تقریب میں شرکت کے لیے وہاں اپنے سے کہیں بڑی شخصیت کے منتظر ہوں۔ دانش سوئیٹ کی نشست گاہ میں داخل ہوا تو وہ سب اِس طرح تعظیماً کھڑے ہوئے کہ اُن کی باچھیں دائیں بائیں چِرنے کی آخری حدود کو چھونے لگی تھیں۔ اُن سب کی اگلی منزل ایک میٹنگ روم تھا کہ جہاں موجود گیارہ حاضرین میں ایک بار پھر دانش سعید کو مرکزی حیثیت

حاصل تھی۔ اگرچہ اِن گیارہ حاضرین میں سے چار خواتین بھی تھیں مگر وہ اپنی شخصیت کو بھڑکیلے لباس اور جسمانی سج دھج سے خاصی حد تک پُرکشش اور جاذبِ نظر بنانے کے باوجود دانش سعید کی نگاہوں میں ایک اُچٹتی ہوئی دید سے زیادہ وقعت خیز بنانے میں ناکام رہی تھیں۔

آدھے گھنٹے کی اِس میٹنگ کے بعد ایک ڈنر کا اہتمام تھا لیکن ڈنر سے پہلے کا ایک گھنٹہ اپنے اپنے پسندیدہ مشروب کے ساتھ غیر رسمی گپ شپ کے لیے رکھا گیا تھا مگر یہ بات اور کہ غیر رسمی گفتگو بھی رسماً اپنے اپنے مفادات سے متعلق ہونا تھی وگرنہ ایسا موقع پھر کہاں ملتا ہے کہ باس ہلکے پھلکے موڈ میں آپ کی دسترس میں ہو اور اُس کی موجودگی سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ لہٰذا وہاں موجود مہم جو خواتین اور حضرات سب اِسی کوشش میں تھے کہ وہ دانش سعید کے ساتھ سکاچ شیئر کریں، بے شک چند لمحات کے لیے سہی مگر انفرادی طور پر۔ لیکن اِس کی نوبت آنا ہی محال، نتیجتاً اُس کے گرد ایگزیکٹوز کا ایک ہالہ سا بنا ہوا تھا اور جس نے جو کہنا تھا وہ کہہ نہیں پا رہا تھا بلکہ اُس کی بجائے وہ کہے جا رہا تھا جس کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جب کہ دانش سعید محض پیگ ہاتھ میں تھامے سب کی سنے جا رہا تھا، کسی بھی قسم کا تاثر آنکھوں میں یا چہرے پر لائے بغیر۔

یہ سب کچھ چار پانچ منٹ کے لیے یونہی برپا رہا۔ دانش سعید کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر ایک سینئر ایگزیکٹو آگے بڑھا۔ وہ بھانپ چکا تھا کہ اُس کا باس اب کیا چاہتا ہے۔ جونہی وہ دانش کے قریب پہنچا، دانش نے اپنے پیگ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا اور ہاتھ کے اشارے سے سب لوگوں کو پارٹی ڈنر انجوائے کرنے کا کہتے ہوئے اُسی ایگزیکٹو کے ساتھ ہال سے باہر جانے کے دروازے کی طرف ہو لیا۔ ایگزیکٹو جو اپنا اور دانش کا پیگ ویٹر کے حوالے کر آیا تھا، ایک قدم کے وقفے سے دانش کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ لفٹ قریب آئی تو اُس نے آگے بڑھ کر لفٹ کا بٹن دبانا چاہا مگر دانش نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور سیڑھیوں کی جانب ہو کر نیچے اُترتا چلا گیا۔ گراؤنڈ فلور پر پہنچا تو اُس کا رُخ بار کی اوپن سائیڈ کی طرف تھا جو ایک ہرے بھرے لان کی طرف کھلتی تھی۔ اوپن سائیڈ میں کچھ کرسیاں سنگ مرمر کے مستطیل چبوترے پر رکھی ہوئی تھیں جہاں دھیمی دھیمی روشنی میں اپنے متمول چاہنے والوں کے ساتھ ہلکی

ہلکی سرگوشیاں کرتی حسینائیں نہایت نفاست سے پیش کی گئی شراب کا نشہ ہزار آتشہ کیے جا رہی تھیں۔ اِس مستطیل چبوترے پر پڑنے والی دھیمی روشنی براہ راست کسی منبع سے آنے کی بجائے سامنے بچھے ہوئے گہرے سبز رنگ کے گھاس سے ہرے بھرے وسیع و عریض قطع پر مرتکز فلڈ لائٹس سے منعکس ہو کر آ رہی تھی۔ لیکن محسوس یوں ہو رہا تھا کہ یہ روشنی وہاں بیٹھی حسیناؤں کے دودھیا چہروں، گدرائے بازوؤں اور بلیک لیبل وہسکی سے بھیگے ہوئے لبوں سے اُمڈ رہی ہے۔

اگرچہ سنگِ مرمر کے مستطیل چبوترے پر ایک ٹیبل پہلے سے ہی دانش سعید کے لیے ریزرو کرادی گئی تھی مگر وہ حسبِ معمول چبوترے کی بجائے اُس نیم تاریک گوشے کی طرف چلا گیا کہ جہاں سے سبز میدان شروع ہو رہا تھا۔ اُس کے ساتھ موجود ایگزیکٹو نے چند لمحوں ہی میں اُسی جگہ پر ایک میز اور ایک کرسی رکھوا دی۔ اِس جگہ کے بالکل مقابل مگر سوا سو گز کی دوری پر سبز لان کے وسط میں ایک عجیب سا درخت تھا۔ بے تحاشہ پھیلی ہوئی شاخیں مگر پتا ایک بھی نہیں۔ اِس درخت کے نیچے براؤن، زرد اور سفید شیڈز میں پینتالیس ڈگری کے درجے پر اوپر کو رُخ کیے فلڈ لائٹس اِس طرح رکھی گئی تھیں کہ درخت کی ایک ایک ٹہنی تین تین رنگوں کی روشنی سے روشن ہو کر سایہ در سایہ طلسماتی تاثر پیدا کر رہی تھی۔ دانش سعید مسمرائز سا ہو کر درخت پر نگاہیں مرکوز کیے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز کے ساتھ دوسری کرسی اور دوسرے مہمان کی گنجائش دانش کے ذوقِ طلب پر چھوڑ دی گئی اور اُس کی ٹیبل پر اُس کے پسندیدہ برانڈ رائل سیلوٹ کا پیگ اور دیگر لوازمات رکھوانے کے بعد ایگزیکٹو اِس طرح عقب میں پھیلے ہوئے اندھیرے کا حصہ بنا کہ جہاں سے وہ خود دِکھے بغیر تمام خدمات کی بجا آوری کے لیے دانش کی باڈی لینگوئج پر آنکھ دھر سکے۔

نصف پیگ کے ختم ہوتے ہوتے نجانے کیسے وہ ٹُنڈ مُنڈ درخت ایک دم جھانگی والے جنگل میں بدل گیا۔ اونچے اونچے بڑے گھیر والے درختوں کی گھنی اور تاریک پٹی کہ جس سے واہموں اور توہمات کا طویل سلسلہ جڑا ہوا تھا۔ دانش نے آنکھیں مَل کر دیکھا مگر وہاں تو واقعی ایک جنگل سا اُگ آیا تھا ____ گگو منڈی کا جھانگی والا جنگل۔ شام ڈھلے جس کے پھیلتے اندھیروں میں شبیر کچھ ایسا گم ہوا کہ پھر کبھی اپنے قصبے میں دکھائی نہ دیا۔ دانش نے جلدی سے

وہسکی ایک لمبا گھونٹ بھرا اور یاد کرنے لگا کہ شبیر اُسے کہاں ملا تھا۔ وہ اُسے اِس جھانگی میں تو نہیں ملا تھا؟ پھر یاد آیا کہ وہ تو اُسے گھر سے بھاگنے کے تین سال بعد بادامی باغ لاہور کے جنرل بس اسٹینڈ پر ملا تھا۔ جونہی بادامی باغ بس اسٹینڈ اُس کی یادوں میں بیدار ہوا سامنے کا منظر ایک چھناکے سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اب وہاں پھر سے وہی درخت کہ جس کی لاتعداد برہنہ شاخیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ہم جنسیت کا کھلا مظاہرہ کرنے پر تُلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

اتنے میں ایک ویٹر نے انتہائی مودب انداز میں میز کی دوسری جانب مگر اُس کے روبرو ایک کرسی لا کر رکھ دی۔ دانش ویٹر کی اِس حرکت پر جز بز ہو کر ابھی استفساریہ نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھ ہی رہا تھا کہ اِسی دوران ایک خوشبو میں نہائی ہوئی پری وش اٹھلاتی ہوئی آئی اور مسکراتی ہوئی اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔ سیاہ جینز پر سیاہ شیفون کا بنا آستینوں کا کرتا اُس کے بدن کی رنگت اور قوسین کو اِس طرح نکھار کر پیش کر رہا تھا کہ معمولی سے معمولی مردانگی بھی خرد کو مقابل لانے سے قاصر دکھائی دے رہی تھی۔ مگر دانش نے اُسے دیکھنے کے بعد بھی چڑ چڑے پن سے نارمل ہونے میں اتنی دیر ضرور کر دی کہ اُس پری وش کو خود ہی کہنا پڑا ____

''واہ! یہ دن بھی دیکھنا تھا دانش کہ تمہیں مجھے پہچاننے میں بھی دقت کا سامنا ہو۔''

اِس کے جواب میں دانش کی جانب سے محض ایک پھیکی سی مسکراہٹ ذرا سی دیر کے لیے اُبھری اور پھر اُتنی ہی جلدی معدوم ہو گئی۔ اِسی دوران تاریکی میں بیٹھا ہوا ایگزیکٹو بھی دوڑا چلا آیا کہ یہ دخل اندازی کیسے اور کس نے کی ہے مگر جیسے اُس کی نگاہ اُس حسینہ پر پڑی وہ اُنہی قدموں واپس لوٹ گیا۔ شاید جانتا تھا کہ اُن دونوں کے درمیان مراسم کی نوعیت کیا ہے۔

''آج کل کس کے بستر پر ہو دُرخانئ؟'' ____ دانش نے اِس سوال تک پہنچتے پہنچتے دوسرا پیگ تیزی سے نمٹا لیا تبھی اُس کے اندر کی سبھی کڑواہٹ اِن لفظوں میں آ گئی تھی۔ مگر اِتنے تلخ سوال کا جواب بھی دُرخانئ نے اتنے بلند قہقہے میں دیا کہ چبوترے پر رکھی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے جوڑے بھی گردنیں موڑے بغیر متوجہ سے ہونے لگے تھے۔ اگرچہ دُرخانئ کا قہقہہ شراب کے ایک بڑے گھونٹ میں ڈوب چکا تھا مگر دونوں کے درمیان سکوت کے ہوتے

ہوئے بھی دانش کے چہرے پر گہری لاتعلقی اور دُرخانئے کے لبوں پر اُتنی ہی گہری لیکن معنی خیز مسکراہٹ حیران کن حد تک موجود تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ بظاہر پرسکون دکھائی دینے والی خاموشی میں بھی کس قدر شدید تلملاہٹ موجود تھی۔ اِس دوران ویٹر دونوں کے لیے نئے پیگ رکھ کر بھی جا چکا تھا مگر دانش کے ایک جملے سے پیدا ہو چکا تلاطم بلا خیز ہوتے ہوئے بھی ابھی تک دُرخانئے کی مسکان میں قید تھا، باہر آنے کا نہیں تھا۔ جب کہ اُن کے عقب میں موجود ایگزیکٹو الگ سے اندھیرے کا جزو ہوتے ہوئے بھی تناؤ میں تھا۔ اُسے اندازہ تھا کہ اُن دونوں کی اس اتفاقیہ ملاقات کے بعد باس کا موڈ کیسا ہوگا۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ وہ تمام مراعات جن کی توقع آج کی کمپنی میٹنگ کے بعد کی جا رہی تھی کہیں غتر بود تو نہیں ہو جائیں گی؟

چند لمحے اور گزرے ___ دانش سعید اپنے زہر آلود جملے کے اثرات سے بدستور لاتعلق اور دُرخانئے کسی ملامتی کی مانند اپنی تذلیل سے حظ کشید کرتے ہوئے وہسکی کی چھوٹی چھوٹی چسکیوں میں اُسے یوں تکے جا رہی تھی کہ جس میں بیک وقت طنز بھی تھا اور ترس بھی۔ بالآخر اُس کے لبوں کے ساتھ اُس کی آنکھیں بھی مسکرائیں۔

''حیران ہوں کہ ایک بھڑوا ___ ایک رنڈی سے پوچھ رہا ہے وہ آج کل کس کے بستر پر ہے ___ واہ! واہ! ___ میری جان! بھڑوے رنڈیوں کے بستر نہیں گنتے، اپنے نوٹ گنتے ہیں، اپنے بینک اکاؤنٹ گنتے ہیں، اپنی کوٹھیاں، گاڑیاں اور کمپنیاں گنتے ہیں ___ روز بروز اونچا ہوتا ہوا اپنا منصب دیکھتے ہیں، امارتوں، وزارتوں اور حکومتوں پر نظر رکھتے ہیں کہ یہ کون سی رنڈی کی دین ہے ___ کونسی دُرخانئے کو کس کس کے بستر پر پہنچایا تو یہ سب کچھ حاصل ہوا ___ یہ عظمتیں، یہ منصب اور یہ جاہ و جلال تو بھڑوے لے جاتے ہیں اور رنڈی کے پاس تو صرف بستر رہ جاتا ہے، رنڈی اور بستر کا تو وہی رشتہ ہے جو مچھلی کا پانی سے ___ اب مچھلی سے پوچھتے ہو کہ وہ کس پانی میں ہے۔''

یہ سب کچھ سننے کے باوجود دانش سعید کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا سوائے اِس کے کہ اب اُس کے چہرے پر بھی لاتعلقی کی جگہ موہوم سی مسکراہٹ نے لے لی تھی جب کہ دُرخانئے اب پرسکون تھی۔ نہ وہ پہلے جیسا اضمحلال نہ حیرت اور نہ ہی کوئی

ملال۔ اب وہ منتظر تھی کہ دانش جیسے منتقم شخص سے جواباً کیسا ردِعمل سامنے آتا ہے۔ اُس نے جو بھی کہا سوچ سمجھ کر کہا تھا اور اب ردِعمل کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار تھی۔ بس اندیشہ تھا تو اتنا کہ یہ ردِعمل کب آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے۔ اُس نے دانش کی جانب بدستور مسکراتے ہوئے پیگ اُٹھایا اور اُس کا ایک ہی گھونٹ بنا کر بظاہر اندیشہ سود و زیاں سے خود کو مامون کر لیا۔

اتنے میں اچانک ایگزیکٹو اندھیرے سے نکلا اور پریشان چہرے کے ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا دانش سعید کے قریب آیا اور اُس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ ایک لمحے کے لیے دانش کے چہرے کا رنگ بدلا مگر فوراً ہی پرسکون تو ہو گیا مگر وہ خود کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چبوترے پر بیٹھے ہوئے جوڑے بھی تیزی سے اِدھر اُدھر ہو رہے تھے۔ اِسی دوران دُرخانئے کا ذاتی سیکورٹی گارڈ بھاگا بھاگا اُس کے قریب آیا اور اُس کے کان میں بھی کچھ کہا۔ اُس کا ردِعمل بھی دانش سعید جیسا تھا۔ وہ بھی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

دانش نے جانے کے لیے ایک دو قدم آگے بڑھائے مگر پھر رک کر واپس دُرخانئے کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ دُرخانئے نے بھی ہاتھ آگے کیا، دونوں ہاتھوں کے لمس میں کہیں بھی گرم جوشی کی رمق تک نہیں تھی۔

''درخانئے تم نے میری آج کی شام برباد کر دی ___''

''یہ تو ایک شام تھی ___ ابھی تو کئی شاموں کا قرض تمہاری طرف رہتا ہے۔'' دونوں ایک دوسرے کے اعصاب کو تولنے کے سے انداز میں مسکرائے اور اپنے ہاتھوں کو سرد اور بے مہری ڈھیلی گرفت سے آزاد کرا لیا۔

اُن دونوں کے وہاں سے جانے تک پولیس اِس وسیع و عریض کلب کو چاروں طرف سے گھیرے میں لینے اور وہاں کے سیکورٹی اسٹاف کو غیر مسلح کرنے کے بعد اب عمارتی حدود میں داخل ہونے لگی تھی۔ جب کہ پولیس فورس سے بھرے ہوئے کئی ٹرک کلب کے داخلی دروازے کو پہلے ہی بلاک کیے کھڑے تھے۔

۞

﴿ ۷ ﴾

گذشتہ شب کی تمام تر ہنگامہ خیزی اور آخری پہر میں شونی کے التفات نے زفیرہ احمد کو اِس قدر تھکا دیا تھا کہ اگلی صبح کے دو پہر ہو جانے تک بھی اُس کے بدن نے بستر پر کروٹ تو کیا بدلنی تھی، اُس میں جنبش تک نہ ہوئی۔ فارم ہاؤس کے ملازمین میں کہاں ایسی جرات کہ کوئی اُس کو جگانے یا اُس کی خبر رکھنے کا خطرہ مول لیتا۔ شونی بھی آخرِ شب کی وحشت آمیز مشقت کے بعد اگرچہ اپنے لیے خاص طور پر بنائے گئے بستر میں جا گھسا تھا مگر سحر خیز ہونے کے ناتے وہ صبح سے اب تک کئی بار چپکے چپکے تھوتھنی سکیڑتا ہوا دبے قدموں اپنی مالکن کے کمرے میں جھانک چکا تھا۔ لیکن ہر بار اُسے بے سُدھ سویا ہوا دیکھ کر جیسے ہی وہ واپس پلٹتا، نجانے کیوں اُس کی آنکھوں میں بھی طمانیت کے جذبات جاگنے لگتے۔

ایک لمبی سی انگڑائی کے بعد از فیرہ احمد کی آنکھ تو کھل گئی مگر اگلے کئی لمحے حواس بیدار ہونے کی نذر ہو گئے۔ بستر میں بے لباس سونا اور کمبل سے بے لباس ہی باہر آنا اُسے شروع سے ہی بہت محبوب رہا تھا۔ لڑکپن تک تو وہ اِس من مانی کی خواہش میں رہی مگر جونہی بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئی تو پہلی شب سے ہی وہ تمام خواہشات پوری کرنے کی ٹھان لی کہ گھر پر جن کا انجام دیا جانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ مگر اِس کے باوجود کوئی نہ کوئی رات ایسی مل ہی جاتی کہ جب کچھ بھی آڑے آنے کا اندیشہ نہ ہوتا۔

زفیرہ اپنے گورے بدن کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی کھڑکی کے سامنے آئی اور اُس پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کی کئی تہوں کو ایک ہی جھٹکے سے دائیں بائیں ہٹا دیا۔ باہر سے آنے والی

روشنی نے اُس کا گدرایا بدن سنہری کر دیا۔ شاید اِس سبب کہ بادلوں سے گھرے ہوئے آسمان میں سے سورج کا محض کونا اُس کی کھڑکی کی طرف جھانک رہا تھا کچھ اِس طرح کہ کبھی اُس کی روشنی زرد ہو جاتی اور کبھی ہلکی سی سرخی مائل۔ زفیرہ مسکرا دی یہ سوچ کر کہ برہنہ تو وہ ہے مگر کیا کسی نے سورج کو بھی لباس کر دیا کہ یوں شرمائے جا رہا ہے۔

اگرچہ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی مگر اب بھی بادلوں کی خاموش گھن گرج میں سے کبھی کبھی باہر کو جھانکتے سورج کے زاویے اور رنگ روپ نے صبح سات آٹھ بجے کا تاثر تشکیل دے رکھا تھا۔ اِس قدر جلد بیدار ہو جانے کے تصور سے ہی زفیرہ کے بدن میں انگڑائیاں جاگنے لگیں۔ اُس نے پردے برابر کیے اور پھر سے بستر پر آ کر بیٹھ گئی اور لیٹنا چاہا مگر بدن کی تازگی کا سندیس اِس سے ہٹ کر تھا۔ زفیرہ احمد نے ریموٹ اُٹھایا اور ٹیلی وژن آن کر دیا۔ ٹیلی وژن کی اسکرین پر اُس کے کمرے اور کمرے سے باہر کے ماحول سے قطعی مختلف منظر تھا۔ تقریباً سبھی چینلز پر ٹاک شوز میں حصہ لینے والے شرکاء ملک بھر میں چھائی ہوئی سیاسی ابتری، ناقص طرزِ حکمرانی، میگا کرپشن اسکینڈلز، بیوروکریسی کی کارکردگی پر چھائے ہوئے جمود اور روز افزوں مہنگائی پر ایک دوسرے کے زبانی لتے لے رہے تھے۔ حکومتی پارٹی کے نمائندے اِسے اپوزیشن کی خرافات قرار دے رہے تھے تو اپوزیشن جماعتوں کے ارکان اِسے حکومتی نااہلی سے تعبیر کر رہے تھے۔ ایسے میں ٹی وی اینکرز حسب معمول اچھی ٹی آر پی لینے کے لیے جلتی پر تیل ڈالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تا کہ کسی نہ کسی طریقے نوبت گالم گلوچ تک تو آئے۔

ادھر اُدھر چینلز گھمانے کے بعد ہر جگہ ایک جیسے چہرے اور ایک جیسی گفتگو۔ کون نہیں جانتا کہ ملک میں کس قدر سیاسی اور معاشی ابتری ہے اور کون اس کا ذمہ دار ہے۔ پھر بھی ہر روز ایک جیسی بلیم گیم۔ زفیرہ نے اُکتا کر ٹیلی وژن آف کر دیا۔ ایسے میں اُسے اپنا موبائل فون یاد آیا۔ گذشتہ شب کے تیسرے پہر کے بعد کہیں سے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ رنگر تو آف تھا مگر وائبریشن پر ہونے کے باوجود اتنی دیر تک کسی فون کا نہ آنا بظاہر ناممکنات میں سے تھا۔ فون تلاش کرنے کے سے انداز میں اُس نے ادھر اُدھر دیکھا مگر دِکھنا تو کیا، وہ تو اُس کی یاداشت

میں بھی نہیں تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد صوفے کی درز سے فون تو مل گیا مگر اُس پر آئی ہوئی کالز کی ایک لمبی فہرست اور وقت دیکھ کر زفیرہ احمد ٹپٹا کر رہ گئی۔ باہر کا منظر جسے وہ صبح کا سمجھ رہی تھی دراصل ڈھلتی ہوئی سہ پہر کا تھا جب کہ سب سے زیادہ کالز دفتر سے ڈائریکٹر ہیومن ریسورس خوشنود ملک کی تھیں۔ کچھ کالز اُس کے پرائیویٹ سیکریٹری منصور اور باقی اِکا دُکا کالز اِدھر اُدھر سے تھیں لیکن اس طویل فہرست میں ایک کال بڑے صاحب کی بھی تھی۔ زفیرہ کے ہونٹوں پر ایک حرامی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور لطف بن کر وہیں چسپاں ہوگئی ___ ''بھڑوا کہیں کا ___''

زفیرہ نے کال کیے جانے کا وقت دیکھا تو وہ دس بج کر اُنتالیس منٹ پر آئی ہوئی تھی۔

''دس بج کر اُنتالیس منٹ پر تو اُس کے فرشتے تک نہیں جاگتے تو وہ کیسے جاگ گیا ___ ضرور کوئی اہم بات رہی ہوگی۔'' زفیرہ نے تیزی سے اُسے کال بیک کرنا چاہا مگر یہ سوچ کر فوراً رُک گئی کہ پہلے دفتر سے آج ابھی تک کی صورتِ حال معلوم کر لینی چاہئے کیونکہ بڑے صاحب جیسے حرامی سے بات کرنے سے پہلے اپنے آپ سے ''باخبری'' ضروری تھی وگرنہ وہ بھڑوا تو مخاطب کی بے خبری تک کو بیچ ڈالتا ہے اور وہ بھی اُسی مخاطب کے ہاتھ۔ لہٰذا دوسرے لمحے زفیرہ احمد خوشنود ملک سے رابطے میں تھی۔ خوشنود نے اُس کے احکامات کے مطابق پولیس اسٹیشن میں مبشر رضا کی گمشدگی کی رپورٹ تو درج کرادی تھی مگر ایس ایچ او کو اُس کی حسبِ طلب رشوت دینے کے باوجود وہ اُس کے طرزِ عمل سے مطمئن نہیں تھا۔

''خوشنود! کان کھول کر سُن لو ___ اب تم بکو یا اپنی بیوی بچوں کو بیچو ___ اُس پولیس والے کا منہ تم بند رکھو گے ___ مہ نور ایڈورٹائزرز کے اکاؤنٹ سے اب ایک روپیہ اِس سبجیکٹ پر خرچ نہیں ہوگا اور ہاں اگر مبشر کی گمشدگی کی خبر باہر نکلی اور ہمارے مخالفین یا کلائنٹس تک پہنچی تو تم سے زیادہ بہتر کون جانتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کچھ کر سکتی ہوں۔'' خوشنود نے تو محض اپنا اندیشہ ظاہر کیا تھا مگر جواباً ایک بار پھر وہ غصے سے اپنے حواس پر قابو رکھنا بھول چکی تھی۔

''باسٹرڈ ___ صرف یہ بکواس کرنے کے لیے مجھے کال پے کال کیے جا رہا تھا۔'' زفیرہ

دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''پریشانیاں یونہی بے سبب نہیں آتیں، اِن نکمے حرامیوں کو ایکسپوز کرنے کے لیے آتی ہیں۔''

اتنے میں شونی نے دبے پاؤں اندر جھانکا لیکن مالکن کو غصے کی انتہائی حالت میں دیکھ کر دونوں اگلی ٹانگیں آگے دراز کرتے ہوئے ٹھوڑی کو فرش پر ٹِکا کر زبان باہر نکال لی اور بھول پن سے زفیرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن شاید اُسے شونی کی آمد کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اُس نے غصے کو جھٹکنے کے لیے سر جھٹکا اور اپنے پرائیویٹ سیکریٹری منصور کو کال پر لے لیا۔ اِدھر سے بھی کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ اُس کے سب سے زیادہ بزنس دینے والے کلائنٹس مقررہ مدت میں ایک دن بھی زیادہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ منصور نے مزید مہلت کے لیے انہیں اپنے طور قائل کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ مزید ایک گھنٹہ تک بھی دینے کو تیار نہیں تھے۔ زفیرہ ایک بار چلا اُٹھی۔ ''کس نے کہا تھا تمہیں اُن بھڑووں کی منتیں کرنے کو اور وہ بھی مجھ سے پوچھے بغیر۔ کیا اثر ہوا ہوگا اُن پر ہمارے ادارے کی ساکھ کا۔ تم بھی یہ بکواس کرنے سے پہلے کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیتے! ___ میں اپنی کمپنی تحلیل کرنا پسند کرلوں گی مگر ان ''چوتیے نودولتیوں'' کا منت ترلا نہیں کروں گی۔ کمپنی دیوالیہ ہوتی ہے تو بھلے سے ہو، بھاڑ میں جائے ___ میں کسی سے بزنس کی بھیک نہیں مانگوں گی۔''

اِس سے قبل کہ منصور کوئی جواب دیتا، زفیرہ نے فون بند کیا اور پھر سے صوفے پر پٹخ دیا۔ ''کیسے کیسے بھڑوے پال رکھے ہیں میں نے اِس کمپنی کو دیوالیہ کرنے کے شوق میں ___''

اپنے آپ سے کلام کرتی ہوئی زفیرہ احمد اُٹھنے لگی تو احساس ہوا کہ وہ تو ابھی تک بے لباس ہی گھوم رہی ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر نائٹی اُٹھائی اور کندھوں پر ڈالنے لگی۔ نائٹی پہن کر تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بے لباس دکھائی دے رہی تھی۔ زفیرہ نے انتہائی برے موڈ کے ساتھ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے بدن پر ڈالی مگر اُسی ایک ہی نگاہ میں سرشار ہوتی چلی گئی۔ چند لمحے پہلے کا غصہ اور تناؤ شاید اُس کی ملائم ڈھلوانوں سے پھسلتا ہوا کہیں قدموں میں جا گرا تھا۔ اپنی اس کیفیت سے آشنا اور اِسی کے احساس سے سرشاری کا تفاخر کشید کرتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر فون اُٹھایا اور بڑے صاحب کو کال بیک کے لیے بٹن دبا دیا۔

''آہا میری جان! آنکھ کھل گئی کیا۔'' زفیرہ کو یوں لگا کہ جیسے وہ اُس کی کال کا منتظر تھا، اِسی لیے پہلی بیل کے ختم ہونے سے بھی پہلے کال اٹینڈ کر لی گئی۔

''آپ کو کیا خبر کہ میں سو رہی تھی ــــ یہ وقت سونے کا ہے کیا۔'' اب کے زفیرہ کے لہجے میں نخرہ بھری خفگی تھی۔ دوسری جانب سے ایک طویل اور جاندار قہقہہ گونجا کہ جیسے دونوں طرف تمسخر اُڑانا مطلوب ہو۔

''میری جان! مارگلہ کی پہاڑیوں کے فارم ہاؤس میں اگر شونی جیسے وحشی لبراڈار کی صحبت میں رات گزرے تو کس حسینہ کی آنکھ شام ڈھلے سے پہلے کھل سکتی ہے۔'' بڑے صاحب کے لہجے میں کہیں ہلکی ہلکی خبریت اور میٹھا میٹھا طنز بھی تھا۔

''میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ آپ کو یہ جھوٹی خبریں کہاں سے ملتی ہیں مگر آپ بکواس بند رکھیں تو بہتر ہوگا۔''

''کس کے لیے ــــ میرے لیے یا تمہارے لیے؟''

''ویل ــــ چھوڑیں اس بات کو ــــ فون کیوں کیا تھا؟'' ــــ زفیرہ سٹپٹا چکی تھی مگر لہجے کی ساختہ لاپرواہی کے سبب محسوس نہیں ہونے دے رہی تھی۔ دوسری جانب سے پھر ایک قہقہہ۔

''فون میں نے نہیں تم نے کیا تھا ــــ کل رات کو ــــ بھول گئی کیا سرور ہی سرور میں؟ خیر میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہاری بدحواسیاں سنتا رہوں۔ غور سے سُنو! وہ تینوں لوگ تمہیں مل جائیں گے لیکن تمہیں منسٹر صاحب کا رانجھا راضی کرنا ہوگا۔''

''کون سے منسٹر صاحب؟''

''بچی نہ بنو اب ــــ کتنے منسٹر ہیں اِس حکومت میں کہ جو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر سکنے کی طاقت رکھتے ہیں؟''

''راؤ صاحب؟''

''اور کیا ــــ بس اپنی سپر ماڈل کو بھیج دو تین چار راتوں کے لیے اور پھر تمہاری رکی ہوئی گاڑی پھر سے چل پڑی گی۔''

''آپ ثنیعہ کی بات کر رہے ہیں؟''

''جی ــــ''

''آپ نے اُسے کال گرل کب سے سمجھ لیا؟'' ــــ دوسری جانب سے پھر ایک قہقہہ گونجا اور زفیرہ احمد کا منہ چڑا گیا۔

''اچھا بے بی میں نہیں سمجھتا اُسے کال گرل ــــ بہر حال اُسے راؤ صاحب کے بستر کی زیارت کرانی ہے۔'' بڑے صاحب کا لہجہ تحکمانہ ہو چلا تھا۔

''سُنو بڑے صاحب! نہ تو میں بھڑوا گیری کرتی ہوں اور نہ ہی میرے پاس ثنیعہ کو راؤ صاحب کے بستر تک پہنچانے کے وسائل ہیں ــــ مجھے نہیں چلانی اپنی رُکی ہوئی گاڑی اِس طریقے سے۔ اجازت چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اُس نے فون پھر صوفے پر پٹخ دیا۔ موڈ کی ایک بار پھر ایسی کی تیسی پھر چکی تھی۔ ''بھڑوا ــــ مجھے نہیں کرنا اس طور اپنا بزنس ــــ جاتا ہے بھاڑ میں تو جائے۔''

زفیرہ احمد نے نائٹی اُتار کر بیڈ پر پھینکی اور واش روم میں گھس گئی۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ کے گرم باتھ نے جہاں دماغ کو ٹھنڈا کیا وہاں اُسے پور پور اور مسام مسام تک تازہ دم کر دیا تھا۔ زفیرہ تولیہ لپیٹے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپکاتی واش روم سے باہر نکلی تو شونی اُس کے موڈ کی خوشبو پاتے ہوئے لپک کر وہاں آیا اور اُس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ زفیرہ نے جھک کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا مگر موبائل کی گھنٹی نے اُسے ایسا نہ کرنے دیا۔ فون اُٹھایا تو اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر بلنک کر رہا تھا۔ اُس نے چاہا کہ سن لے مگر پھر کچھ سوچ کر رہنے دیا اور اُسی حالت میں صوفے پر آنکھیں موندے نیم دراز ہوگئی۔ معاً اُس کی نگاہ خاموش ہو چکے موبائل کی اسکرین پر پڑی تو اس نمبر سے تین کالیں کی جا چکی تھیں۔ کچھ ٹیکسٹ میسجز موصول ہونے کی علامت بھی بنی ہوئی تھی۔ اُس نے میسجز کھولے تو سب سے پہلا میسج ہی اُسی نمبر سے تھا جہاں صرف ایک ہی لفظ لکھا تھا ''رومی'' ــــ

''رومی؟ کون ہو سکتا ہے رومی؟ شاید خالد رومی؟ اُس کا سب سے بڑا کاروباری حریف اور ''کرشمہ ایڈورٹائزرز'' کا چیف ایگزیکٹو؟ اگر یہ وہی رومی ہے تو اُسے کیوں فون کر رہا

ہے؟'' زفیرہ شش و پنج میں گھر چکی تھی۔

''وہ کیا کہنا چاہتا ہوگا اُسے؟ کیا مبشر رضا اُسی کے قبضے میں ہے؟ اگر وہ اُسی کے پاس ہے تو کیا کوئی بلیک میلنگ یا پھر کسی ڈیل کی کوشش؟ مگر کیسی ڈیل؟ کیا توقع رکھتا ہے وہ مجھ سے؟'' زفیرہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ زفیرہ نے تجسس کو ایک طرف رکھا اور فون کی ریکارڈنگ ڈیوائس کو آن کرنے کے ساتھ ہی فون بھی اٹینڈ کر لیا۔

''خالد رومی بول رہا ہوں'' ___ اُس کا لہجہ دھیما اور خوشامدانہ حد تک مہذب تھا۔

''کرشمہ ایڈورٹائزرز سے؟'' زفیرہ ابھی تک غیر یقینی کا شکار تھی۔

''جی میں کرشمہ سے ہی بول رہا ہوں۔''

''فرمایئے؟''

''جی اک ایسی اطلاع تھی جو براہ راست آپ ہی کو پہنچانی تھی۔'' خالد رومی نے توقف کیا تو نجانے کتنے خیالات اور کتنے واہمے آن ہی آن میں زفیرہ کے ذہن کو چھو کر گزر گئے مگر وہ خاموش رہی۔

''پہلے تو کہیں سے سنا تھا کہ ''مہ نور'' کا برین مبشر رضا کہیں غائب ہے مگر آج تو اپنی آنکھوں سے پڑھ لیا کہ وہ واقعی غائب ہے۔ یہ کیا حماقت کی آپ نے کہ پولیس رپورٹ کے ذریعے ایک مخالفانہ افواہ کو حقیقت بنا کر مجھ جیسے دشمنوں کے حوالے کر دیا۔'' رومی کا لہجہ تہذیب سے ماورا ہو کر بے رحمانہ حد تک سرد ہو چکا تھا جب کہ زفیرہ احمد کے لیے اپنے حواس پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اُسے یوں لگا کہ زمین اُس کے پاؤں تلے سے کھسک چکی اور وہ کہیں پاتال میں جا گری ہے۔

''یہ رپورٹ کہاں سے ملی آپ کو؟'' ___ زفیرہ بری طرح نروس ہو رہی تھی۔

''میڈم بہت سنا تھا کہ آپ غیر معمولی ذہین اور شاطر کھلاڑی ہیں لیکن معاف کیجئے جو سوال آپ نے کیا ہے وہ تو کوئی چوتیا ہی کر سکتا ہے۔''

''شٹ اپ ___''

''اگر آپ میرے سامنے ہوتیں تو اِس کے جواب میں آپ کے منہ پر تھوکتا لیکن ایک

کاروباری حریف ہونے کے ناتے اب میں آپ کی اُس جگہ پر تھوکوں گا کہ جہاں آپ کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوگا کہ یہ تھوک ہے یا کچھ اور ہے۔''

تذلیل اور غصے کی شدت کے سبب زفیرہ سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے زور سے چیخنا چاہا، خالد رومی کو گالیاں دینی چاہیں مگر اُس سے کچھ بھی تو نہیں ہو پا رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ فون بند کر کے پاؤں تلے روند ڈالے مگر اُس میں فون تک بند کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

''اور ہاں اب ایک آخری بات! اِس رپورٹ کی کاپیاں آپ کے اُن تمام کلائنٹس کو پہنچا ہی چاہتی ہوں گی کہ جو صرف مبشر رضا کے نام پر آپ کو کروڑوں کا بزنس دیا کرتے ہیں۔ بس ایک نظر وہ اسے پڑھ لیں پھر میں دیکھتا ہوں کہ ''مہ نور'' کا انجام کیا ہوتا ہے۔'' خالد رومی کا لہجہ بدستور نرمی آمیز سرد اور مودبانہ تھا مگر الفاظ بے حد سخت تھے۔ اُس نے اپنے تئیں کرم کیا کہ فون تو بند کر دیا مگر زفیرہ اُسی طرح بُت بنی ہوئی تھی، بے حس و حرکت جیسے کسی نے کوئی منتر پھونک کر پورے بدن سے زندگی نچوڑ لی ہو۔

کچھ دیر کے بعد ہذیانی انداز میں اُس نے اِس قدر اونچی آواز میں چیخیں ماریں کہ جیسے اُس کے جسم کے ایک ایک مسام میں کیل ٹھونکے جا رہے ہوں۔ مالکن کی چیخیں سُنیں تو شونی خوفزدہ ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُس کا کُک اور چوکیدار جو صبح سے اُس کے بیدار ہونے کے منتظر تھے، کمرے میں داخل ہونے کی ہمت نہ پا کر کھڑکیوں کے گرد چکرانے لگے کہ کہیں سے اِن چیخوں کا سبب جان سکیں مگر ناکام رہے۔ چند لمحوں کے بعد چیخنا تھما تو بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ اس قدر تذلیل اور اپنی پلاننگ میں اتنی بڑی ناکامی اور وہ بھی اپنے سب سے بڑے کاروباری حریف کے ہاتھوں۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اُس کے اسٹاف میں سے کون ہے جو اُسے یوں برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ ابھی ابھی ایک فون کال پر سب کو فائر کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن جوں جوں ٹھہراؤ آتا گیا، حواس بھی بیدار ہوتے گئے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی جاگنے لگی تھی۔ مبشر رضا کی گمشدگی کے سبب کمپنی میں آئے ہوئے بحران سے نمٹے بغیر کسی ملازم کو برطرف کرنا بحران کو اور ہوا دے سکتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بار بار یزادانی ملک کا چہرہ آ رہا تھا کہ جو پولیس کے ہاں رپورٹ نہیں کرانا چاہتا تھا۔ نجانے بے عقلی کی وہ کونسی گھڑی تھی

کہ جب وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ہوگئی اور اپنا سب سے بڑا کاروباری راز پولیس کے دو ٹکے کے ملازم کو سونپ دیا۔

بے عقلی کی کیفیت نے اُسے یاد دلایا کہ وہ تو کافی دیر سے اسکاچ کی طلب محسوس کر رہی تھی مگر اُسے کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ گذشتہ شب کی صوفے کے ساتھ دھری بوتل جوں کی توں رکھی تھی۔ بوتل اُٹھا کر اُس کا ڈھکن کھولتے ہوئے زفیرہ نے گلاس تلاش کرنا چاہا مگر وہ کچھ دور کونے میں پڑی ہوئی میز پر رکھا تھا۔ اپنے اندر اُٹھنے کی تاب نہ پا کر اُس نے بوتل ہی کو منہ لگا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ وہسکی کی تلخی سے اُس کا سینہ تو جل اُٹھا مگر دماغ روشن ہوگیا۔ کتنی دیر سے طاری بیوسیت دوسرے گھونٹ کے ساتھ ہی عقلیت کے ہاتھوں چت ہوگئی۔ عقل کی باگ ہاتھ میں آئی تو اُمید خود بخود پا بہ رکاب ہوتی چلی گئی۔ بار بار ایک ہی سوال کئی کئی شکلیں بدل کر اُس کے سامنے آ رہا تھا کہ خالد رومی کی چال کا توڑ کیا ہو؟ کس طرح وہ اُس کی گیم اُسی پر ہی پلٹ دے؟ وہ بھی اب اُس کی اُسی جگہ پر تھوکنا چاہتی تھی جہاں وہ سوچتا ہی رہ جائے کہ تھوکنے والا کیا تھوک گیا؟

۞

﴿ ٨ ﴾

بنیادی طور پر وہ ایک کم ہمت اور شرمیلی سی لڑکی تھی کہ نہ تو جس میں کسی لڑکے کے ساتھ اپنے جذبات کے اظہار کی سکت تھی اور نہ ہی کسی کی جانب سے پہل کیے جانے پر اُس کا مثبت جواب دینے کی اہلیت۔ اب یہ بات بھی نہیں تھی کہ یونیورسٹی میں لڑکے اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے بلکہ کچھ زیادہ ہی کھنچے چلے جاتے تھے باوجود اِس کے کہ وہ اپنے آپ کو سرتا کمر ایک لمبی چادر میں لپیٹ کر رکھتی تھی۔ مگر ماہین کے اِس طرح اپنے آپ کو لپیٹ کر رکھنے میں اُس کے جسمانی خطوط، کسی خط سے زیادہ پارسل کی سی وضع اختیار کر لیتے کہ جو محروم طبقے کے سرفروشوں کو جان کی بازی لگا دینے پر اکسائے رکھتے۔ اُس کی کلاس فیلو لڑکیاں بھی اُسے عموماً چھیڑتی رہتیں کہ اِس ڈبل بیڈ کی بیڈ شیٹ سے جان چھڑاؤ ورنہ کسی دن خوامخواہ اغواء ہوگئیں تو اغواء کرنے والا ہی مایوس ہو کر تمہیں جان سے مار دے گا، کہ چادر کے اندر سے نکلا بھی تو کیا نکلا۔

ماہین یہ سب باتیں سنتی رہتی اور آنکھیں جھکائے زیرِ لب مسکراتی رہتی مگر اتنی ہمت پھر بھی نہیں تھی کہ کسی لڑکے یا کسی لڑکی کے کہے گئے فقرے یا پھبتی کا جواب ہی دے سکے۔ ایم فِل کیمسٹری کے کلاس ورک میں آ چکی ماہین پر رفتہ رفتہ ہر آنے والی شب ایک قیامت بن کر گزرنے لگی۔ دن بھر لڑکوں کی زبان سے ادا ہونے والے غلیظ جملے، اُس کے جسمانی خطوط کے بارے میں دی گئیں بے ہودہ تشبیہات اور وہ خواہشات جن کا پورا کیا جانا اُن سب کے لیے ابھی ایک خوابِ محرومی تھا، رات ڈھلے سب کے سب قطار باندھے اُس کے بیڈ روم میں

آن کھڑے ہوتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سبھی غلیظ جملے، نابکار خواہشات اور بے ہودہ الفاظ جو دن کے وقت اُسے اپنی سماعت میں ٹپکایا جانے والا پگھلا ہوا سیسہ لگتے، رات ڈھلے وہی جملے، وہی خواہشات اور وہی الفاظ اُس کے انگ انگ کو میٹھے میٹھے انداز میں گدگدانے لگتے۔ اُس کا دل چاہتا کہ وہی توصیفی الفاظ، وہی ننگے جملے، وہی فحش کلامی مشاعرے میں پڑھے جانے والے اشعار کی طرح مکرر ہی نہیں بار بار اور مسلسل سنائی دیتی رہے۔ دن بھر کسی عذاب کی مانند پیچھا کرتی بے شرم آوازیں رات کے اِس تیسرے پہر ماہین کے بدن میں کسی شرارتی سنسناہٹ کی طرح بہتی ہی چلی جاتیں اور اُس کی خواہش ہوتی کہ سنسنی کا یہ بہاؤ نہ تو کبھی تھمے اور نہ ہی کہیں رُکے۔ چلتا رہے یونہی مسلسل رواں رہے۔ لیکن رات کے دم توڑتے توڑتے یہ آوازیں بھی کہیں اُن جذبات کی پرتوں تلے دفن ہوتی چلی جاتیں کہ جنہیں نہ تو کوئی راستہ سُجھائی دیتا تھا اور نہ ہی منزل دکھائی دیتی تھی۔ یہ عمر کا کون سا حصہ تھا کہ اپنے آپ سے محبت ہونے کی بجائے اُسے اپنے آپ سے، اپنے جسم سے اور بے نام جسمانی طلب سے نفرت ہو چلی تھی۔ صبح کو بیدار ہونا ماہین کے واسطے ہمیشہ تھانے کی حوالات میں پڑے کسی ایسے زیرِ تفتیش ملزم کے جسم کی طرح کا ہو چکا ہوتا کہ جو شب بھر کی چھترول کے بعد دُکھتا ہوا پھوڑا بن چکا ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود اونگھتے ذہن کے ساتھ پھر وہی کلاس اور کلاس میں آتے جاتے پھر وہی بے ہودہ کلمات، پھبتیاں اور مکروہ جملہ بازی۔

اُن تمام بے چینی بھری راتوں میں سے ایک رات ماہین کے فیس بک میسنجر میں ایک ایسے شخص کی جانب سے دوستی کی پیشکش آئی ہوئی تھی کہ جو اپنے نام کی طرح منفرد اور اپنے الفاظ کے چناؤ میں انتہائی شائستہ تھا۔ جمال احسن نام کا یہ آدمی خود اپنے مطابق ہی پینتالیس برس کا تھا۔ وہ شادی شدہ تھا، دو بچے بھی تھے مگر بیوی سے اختلاف کے سبب ان دنوں اکیلا رہ رہا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے انجینئر اور ایک نیم سرکاری ادارے میں نمایاں حیثیت کی جاب کر رہا تھا یعنی مالی لحاظ سے بھی آسودہ تھا۔ ماہین اُس کی ریکوئسٹ رد کرتے کرتے رُک گئی اور پھر کچھ سوچ کر اُسے قبول کر لیا۔ اُسے عجیب سا لگ رہا تھا کہ جھوٹ سے لبالب بھری سوشل میڈیا کی اِس دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو اُس نوعیت کے تمام سچ خود ہی بولے جا رہا ہے کہ جن سے

لڑکیاں بدک کر دوستی کرنا تو کیا منہ تک لگانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ پہلی بار کے رابطے کے بعد اُس نے نہایت مہذب انداز میں اُس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اُس وقت تک رابطے میں نہ آیا کہ جب دس بارہ دن کے بعد خود ماہین نے اُس سے ہیلو ہائے نہ کی۔

کس قدر مودب محتاط اور مہذب تھا جمال احسن۔ عام نوجوانوں کی عامیانہ گفتگو سے ماورا۔ اُتنی ہی بات کرتا کہ جتنی اُسے گراں نہ گزرتی۔ اِس سے پہلے کہ ماہین کسی طور اُکتاہٹ کا شکار ہو وہ خود ہی اجازت لے لیتا۔ وہ حیران تھی کہ جمال کس قدر اُسے سمجھتا ہے، کتنا دھیان رکھتا ہے اُس کے موڈ کا، اُس کی مصروفیت کا اور اُس کے آرام کا۔ رات کا وہ پہر جو پہلے وحشت بن کر آتا اور اُسے چُور چُور کرتے ہوئے گزر جاتا، اب قدرے سکون سے گزرنے لگا تھا۔ جنون تو اب کے بھی تھا مگر یہ جنون کی کوئی اور قسم تھی جس میں جھنجلاہٹ کم اور بے چینی زیادہ تھی۔ یہ بے چینی ہوا کرتی جمال سے دن بھر کا احوال سانجھا کرنے کی، کیا کھایا کیا پیا، کس کس نے چھیڑا، کس کس نے جملہ کسا، کلاس ٹیسٹ میں نمبر کم کیوں آئے، کونسا ٹیچر ٹھرکی ہے کونسا نہیں ہے وغیرہ۔ جمال کی خوبی یہ تھی کہ وہ سب کچھ خاموشی سے ایک اچھے سامع کی طرح سنتا رہتا۔ لیکن کبھی کبھار تو ماہین اُسے ڈانٹ دیتی، عمر کا لحاظ کیے بغیر کہ وہ چپ کر کے سنتا ہی کیوں رہتا ہے، اپنا تبصرہ شامل کیوں نہیں کرتا؟ اپنی رائے کیوں نہیں دیتا؟ ___ اِس کے جواب میں جمال ہنس دیتا اور ماہین غصے میں آ کر چیٹ باکس کھلا چھوڑ کر غائب ہو جاتی۔

ایک روز جمال نے تکلف کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہہ ہی دیا کہ وہ اُس کی گفتگو کا جواب اُتنی تیزی سے نہ لکھ پاتا کہ جتنی سرعت سے وہ کر سکتی ہے۔ ''اوہ! تو آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' ماہین کو پہلی بار احساس ہوا کہ ایک مہینہ گزر جانے کے باوجود وہ ابھی تک چیٹنگ کیے چلے جا رہے تھے۔ ''تو آپ نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟''

''میرے پاس نمبر ہی نہیں تھا۔''

''تو مانگ لیتے ___ میسنجر پر ہی کال کر لیتے۔''

''میں آپ سے کیسے نمبر مانگتا ___ آپ انکار کر دیتی تو؟''

''یا خدا! تو پھر کیا ہو جاتا ___ بہت پرانے بندے ہو آپ، آج کل تو لڑکے پہلے نمبر

مانگتے ہیں اور پھر اگلا قدم اُٹھاتے ہیں۔ اب جلدی کریں بتائیں اپنا نمبر! حد نہیں ہوگئی بھلا؟''

نمبر ملتے ہی ماہین نے جمال کو اپنے ہاں ایڈ کیا اِس میسج کے ساتھ کہ انتظار کرو، ابھی فون کرتی ہوں۔ نجانے وہ کونسا کمزور لمحہ تھا کہ جب ماہین کے ہیلو کے جواب میں جمال کے سلام کی آواز اُس کی حسِ سماعت تک پہنچتی محسوس تو ہوئی مگر اُس کے بعد دوسری جانب سے کیا کچھ کہا جاتا رہا، اُس کا یارا ماہین کو نہیں رہا تھا۔ اُس کے تصور کی آخری حدوں اگر کسی مرد کا کوئی عکس اپنی پوری مردانہ وجاہت کے ساتھ موجود تھا تو وہ اُس آواز میں منقلب ہوتے ہوئے اُس کی سماعت میں سمو کر بدن کی ایک ایک حس میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ اپنی آواز کی گھمبیرتا سے مخاطب کو مسمرائیز کرنے پر قادر تھا۔ جمال بولتا چلا جارہا تھا اور ماہین میں اُسے کہیں روک پانے کی تاب باقی نہیں رہی تھی۔ جس طرح اُس میں کسی مرد کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی اُسی طرح جمال نے آج اُسے اپنی آواز کی مدھرتا سے کسی مرد کا سامنا کرنے کی سکت سے بھی محروم کر دیا تھا۔ مگر اتنا ضرور ہورہا تھا کہ اگر اُس کی گویائی میں جرات اظہار مفقود ہو چلی تھی تو بدن کے ایک ایک مسام میں وہی وحشت پھن پھیلائے جاگ اٹھی تھی کہ جو کبھی اُسے رات کے تیسرے پہر نہ دکھائی دینے والے چابکوں سے اُدھیڑ کر رکھ دیا کرتی تھی۔

ماہین کو کچھ یاد نہ رہا کہ کب اور کتنے دنوں کے بعد جمال احسن نے اُسے رات کے تیسرے پہر ایک ایسے ذائقے سے آشنا کر دیا کہ جو موبائل فون کی دوسری جانب اُس کے بولے ہوئے آتش صفت لفظوں سے اُس کے رگ وپے میں اُترتا اور پھر اُسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان باریک سا پیتا ہوا دھیرے دھیرے اُس نہج تک لے جاتا کہ جہاں اُس کا پورا جسم دھوئے جارہے کپڑے کو مروڑنے کے سے انداز میں اپنے اندر ہی نچڑ کر اس طرح کی لذت کشید کرتا جسے کسی نام کا دیا جانا نہ تو ممکن تھا اور نہ ہی اُس کے بس میں۔ جس طور سے جمال احسن ماہین کو اپنے لفظوں کے سحر میں جکڑ کر ایک ایک قدم لذت کی معراج تک لے جاتا، دم واپسیں بھی اُسے اُسی طرح ہولے ہولے آسودگی کے پالنے میں لٹا کر سرگوشیوں کی تھپکیوں سے سُلا دیتا کچھ اِس ہنر سے کہ آنے والی صبح اُس کے انگ انگ میں کیف وسرور کے

ساتھ ساتھ ایسی مستی سموئے رکھتی کہ اُس کا پورا بدن خرام میں محوِ خرام نہیں بلکہ ایڑیوں پر اُچھلتا اور ہوا میں تیرتا محسوس ہوتا۔

وہ جہان جو ماہین نے اپنے ذہن میں آباد کر رکھا تھا اُس میں جمال ایک بہت اونچے سنگھاسن پر کسی دیوتا کی مانند براجمان تھا کہ جہاں سے لطف وعطا کے چشمے پھوٹتے تھے۔ ایک کام دیو جس کی محض آواز ہی تشنگی کی دراڑوں میں بٹی ہوئی دیویوں کو آسودگی کی اُس منزل تک لے جاتی کہ جہاں تک پہنچنے کی کوشش میں قوی سے قوی مرد بھی ہانپ جاتے۔ خودلذتی کے اِس شراکتی سفر میں ماہین کی زندگی کا رنگ ڈھنگ بدلا تو آئے روز کا غصہ، جھنجلاہٹ اور بیزاری خود ہی کہیں ہوا ہو گئے۔ اِس دوران نہ تو جمال نے اُس سے کہیں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور نہ ہی ماہین نے اُسے دیکھنے کے لیے اپنی بے تابی کا اظہار کیا۔ جمال پر اعتماد اور پختہ ہوا تو ماہین نے اُسے سکائپ پر آنے کی خواہش کی مگر وہ ٹال گیا۔ کسی مرد کے سامنے سکائپ پر یوں برہنہ آنے کی خواہش ماہین کی زندگی میں آنے والا بہت بڑا انقلاب تھا۔ وہ جو کسی کے سامنے آنکھ اُٹھا کر بات تک نہیں کر سکتی تھی اِس طرح اِس قسم کی خواہش کے رد کیے جانے کا جھٹکا نہ سہار سکی اور بجھ کر رہ گئی۔ وہ جو اپنے خول سے باہر نکل کر سانس لینے لگی تھی پھر سے خول میں بند ہو کر رہ گئی۔ ایک اور قیامت یہ گزری کہ جمال کی وہ آواز جو اُس کے پورے بدن میں مستی کے الاؤ روشن کر دیا کرتی تھی، ایک دم بے اثر ہو کر رہ گئی۔ وہ پوری کوشش کرتی کہ خودلذتی کی اس شراکت میں وہ اُسی جنون کی سی کیفیت میں جمال کی آواز کا ساتھ دے مگر یوں لگتا کہ اُس کے بدن نے سماعت کی سبھی حسیات کا سوئچ کہیں سے بند کر رکھا ہے۔ تمام تر ڈھول پیٹے جانے کے بعد بھی اُس کا بدن جاگنے سے انکاری ہو چکا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک ہی بات بیٹھ گئی کہ وہ شخص جو جمال بن کر اُس سے رابطے میں آیا تھا وہ جمال تھا ہی نہیں۔ اُسے اپنے اطراف میں موجود ہر شخص جمال دکھائی دیتا کہ جس نے کسی سوچے سمجھے ایجنڈے کے تحت اُسے خودلذتی کے دام میں اُلجھا کر ایک نارمل لڑکی سے ابنارمل بنا دیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ کیسے اُس کی عقل وقتی ہیجان کے تحت ماؤف کر دی گئی تھی۔ کبھی کبھی اُسے یہ خیال بھی آتا کہ

جمال اگر بدنیت ہوتا تو اُسے خود سکائپ پر آنے کو کہتا یا اُس کی جانب سے کی گئی پیشکش کو قبول کر لیتا۔ لیکن اِس کے باوجود نجانے کیوں ماہین کا دل اب جمال کو اِس حیثیت میں قبول کرنے کو کسی طور تیار نہیں تھا۔

جمال سے رابطہ ختم ہوا تو جیسے ایک آسیب اُس کے اعصاب سے اُتر گیا۔ اُس کے بدن نے ایک بار پھر بھی بے حس ہو چکی وحشتوں کو اپنے آپ ہی جگا دیا۔ عجیب بات تھی کہ جس سبب جمال سے ناتا توڑا، اب اُسی سبب پھر سے کسی ایسے چرب زبان مرد کی تلاش تھی کہ جو اُسے رات کے تیسرے پہر باتوں ہی باتوں میں اُن منزلوں تک لے جائے کہ جہاں کی شناور وہ جمال کی سمعی رفاقتوں میں رہ چکی تھی۔ اُس نے پھر سے رات رات بھر سوشل میڈیا کے وہ تمام کونے کھدرے کھنگالنا شروع کر دیے کہ جہاں اُسے کسی جمال جیسے مرد تک رسائی کی ہمت ہو سکے۔ اُس کی جستجو میں یہ تضاد بھی سمجھ سے بالاتر تھا کہ جمال احسن کو خود ہی رد کیے جانے کے بعد اُسے اگر کسی دوسرے مرد کی تلاش تھی تو وہ پھر سے جمال احسن جیسے کی ہی تھی۔

جلد ہی اُسے دو مختلف شہروں میں رہنے والے دو لڑکے ایسے ملے جن کی اُتاول، ضرورت سے زیادہ کتابی علمیت اور خوامخواہ کی بے تکلفی نے خود لذتی کی اُس جمالیات کو کراہت میں بدل کے رکھ دیا کہ جس سے اُسے جمال کی سنجیدہ طبع اور عملی علمیت نے روشناس کرایا تھا۔ ماہین کو اُن کی باتوں سے حظِ نفسانی تو کیا حاصل ہونا تھا اُلٹا اُس کا جی متلانے لگتا۔ جمال سے رات گئے کی گفتگو میں اُسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کئی چادروں میں لپٹی ہوئی کسی محفوظ پناہ گاہ میں ہے مگر اُن دونوں سے بات کرتے ہوئے اُسے اپنا آپ کسی بھرے بازار میں گندگی سے لتھڑا برہنہ پڑا ہوا سجھائی دیتا۔ ماہین نے اُن سے جان چھڑانے کے لیے وہی معاملہ کیا کہ جو جمال سے کیا تھا۔ لیکن یہاں بھی سب کچھ اُس کے برعکس۔ جمال نے قطع تعلق کے ایک میسج کے بعد پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تھا مگر اِن دونوں نے تو جان عذاب کر دی۔ فون پر فون، میسج پر میسج، نہ صبح کا خیال اور نہ شام کا۔ ایک نمبر بلاک کیا تو دوسرے سے، دوسرا بلاک کیا تو تیسرے سے۔ کبھی عاجزی، کبھی منت زاری اور پھر کبھی دھمکیاں۔ لیکن اِس

دوران یہ ہوا کہ ماہین نے اپنے آپ کو کسی بھی لمحے کمزور نہیں پڑنے دیا۔ یہ شاید اُس کی استقامت کا اثر تھا کہ دو تین ہفتوں کے ذہنی فساد کے بعد وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کہیں بہت ہی پیچھے رہ گئے لیکن ماہین کے لیے اپنے آپ کو اِس طور آسودہ رکھنے کا عمل ایک بھیانک خواب بن کر رہ گیا۔

کچھ ہفتے اور گزرے تو ماہین کے جسم میں پھر سے جاگنے والی وحشت نے اپنے خلاف اُس کے ذہن میں موجود کڑواہٹ کو نیچا دکھانے کے لیے کئی کئی جتن شروع کر دیے۔ رات کے تیسرے پہر کی بے چینی اور جگراتا تو ایک طرف رہا اُس کے انگ انگ سے جمال احسن کا تکلم ایک سنسناہٹ کی صورت گونجنا شروع ہو گیا۔ اب کے یہ تکلم آسودگی کی بجائے مزید بے چینی، کچھ اور جھنجلاہٹ کا سندیسہ لے کر آنے لگا۔ رات کے اِس پہر کے کئی کمزور لمحوں نے اُسے نجانے کتنی بار اُکسایا کہ وہ سبک سر بن کر جمال احسن سے خود ہی رابطہ کر لے کہ جو اُس سے محض ایک فون کال کی دوری پر تھا مگر اُس کے اندر کی خودسری ہر بار اُسے ایسا کرنے سے روکے رہی کہ جب تک نوید نام کے شخص نے اُس کے ان باکس میں ''آداب'' نہ کہہ دیا۔ ماہین کو یہ بالکل جمال کی طرح لگا بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر رکھ رکھاؤ اور ادب آداب والا۔ اُس نے پہلے دن ہی اُسے صاف صاف بتا دیا کہ اُس کی عمر لگ بھگ پچاس برس ہے، دوبئی میں اپنا بزنس کرتا ہے اور اچھی لڑکیوں سے محض بے تکلف گفتگو کا خواہش مند ہے۔ اب جسے قبول وہ دوستی رکھے نہیں قبول تو کوئی گلہ نہیں۔ ماہین کو احساس ہو چلا تھا کہ لونڈے لپاڑوں کی نسبت زیادہ عمر لے لوگ نہ صرف ذمہ دار ہوتے ہیں بلکہ ترکِ تعلق کی نوبت آئے تو لسوڑا بن کر چپکو بھی نہیں ہوتے۔

ماہین کو اور کیا چاہئے تھا۔ وہ تو اتنی اُتاولی ہوئی کہ دو ایک روز ہی میں ان باکس سے فون کال پر آ گئی۔ کیا آواز تھی نوید کی۔ شہد کی مٹھاس سے زیادہ میٹھا ایک بھرپور مردانہ لب ولہجہ کہ جس کا ایک ایک لفظ ماہین کے مسام مسام میں حشر برپا کرنے لگا۔ اُس کی آواز اُس کا جسمانی روپ دھار کر ماہین کو اپنے آپ سے یوں لپٹا لیتی کہ اُسے بات کا جواب دینے تک کا ہوش بھی

نہ رہتا۔نوید نے اُسے اپنی اور اپنے دوبئی آفس کی تصاویر بھیجیں۔کیا شخصیت اور کیا رہن سہن تھا اُس کا۔یوں لگتا کہ کہ کوئی مقتدر اپنی اقلیم میں راج کر رہا ہو۔اِن تمام باتوں نے کچھ ایسا سحر انگیز ماحول ترتیب دیا کہ اگلے چند دنوں میں وہ ٹیلی فونک سیکس سے ہوتے ہوئے سکائپ پر غیر ملبوس خود لذتی کے عمل تک پہنچنے میں بھی کسی ہچکچاہٹ کا شکار نہ رہے۔ماہین کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا جنون کی منزل تک کا سفر بھلے سے ایک جیسا ہوتا ہے مگر اُس کی جنوں خیزی میں وحشت بپا کرتے ہوئے آسودگی اور تلذذ کو ہم رکاب رکھنے کا ہُنر ہر کسی کو نہیں آتا۔نوید کی ہنر مندی کے جوہر کھلے تو جمال کا نام تک حافظے سے محو ہو گیا۔

ہوسکتا تھا کہ یہ سرمستی اور خمار ایک طویل عرصے تک ماہین کے ذہن و وجود میں گھر کیے رہتے کہ اگر ایک دن نوید اُسے اسلام آباد پہنچ کر ملاقات کے لیے نہ کہتا۔ماہین کے لیے جہاں نوید کا یہ مطالبہ حیران کن تھا وہیں اِس کا پورا کیا جانا ناممکنات میں سے تھا۔ماہین کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا کہ مالی طور پر آسودہ تر ہوتے ہوئے بھی لڑکیوں کے لیے سخت ترین سماجی جکڑ بندیاں لیے ہوئے تھا۔اُن کے ہاں اب بھی شادی کی پہلی رات دلہن کے بستر پر بچھی سفید چادر اگر اگلی صبح خون آلود نہ پائی جاتی تو طلاق نامہ تیار رکھا ہوتا تھا۔اس نوعیت کی پابندیوں میں وہ کیسے نوید سے ملاقات کر کے اپنا باکرہ پن اُس کی دسترس میں دے دیتی۔سو ماہین نے پہلے کچھ ہچکچاہٹ ظاہر کی، اپنی مجبوریاں بتائیں مگر جب نوید کی طرف سے اصرار بڑھا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ماہین کے اس طور انکار سے نوید کا رویہ بھی بدلتا چلا گیا۔شہد ٹپکاتا لہجہ اس قدر کسیلا ہوا کہ ماہین کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی نوید ہے کہ جس سے بات کرنے کو اور جس کی بات سننے کو وہ دن بھر بے چین رہتی اور ترسا کرتی کہ نجانے کب رات ہو اور وہ تسکین کی منزل تک پہنچے۔لیکن اب تو نوید کے فون آنے کا دھڑکا ہی اتنا روح فرسا ہو کر رہ گیا کہ ہر کال پر لرزہ طاری ہو جاتا۔

ہر آنے والے دن کے ساتھ ہی نوید کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔اب تو اُس نے واضح طور پر کہنا شروع کر دیا کہ وہ اُسے بس ایک بار ملے، اُس کی مرضی اور خواہش کے مطابق پھر وہ

واپس چلا جائے گا کبھی نہ تعلق رکھنے کے وعدے کے ساتھ۔ظاہر ہے کہ ماہین کے پاس اِس کا کوئی مثبت جواب نہیں تھا اِس لیے اِس کے ردِعمل میں نوید کا مطالبہ طیش میں بدلتا چلا گیا۔ماہین کے لیے یہ امر بھی مسلسل تشکیک کا باعث تھا کہ اگر نوید واقعی دوبئی میں رہتا ہے تو اِدھر اسلام آباد میں اتنے دنوں سے کیا کر رہا ہے؟ کیا اُس نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا کہ وہ دوبئی میں رہتا ہے؟ ابھی وہ اِس مخمصے سے نکل نہیں پائی تھی کہ نوید نے ایک اور چال چلی۔اُس نے سکائپ سے ریکارڈ کیا گیا ایک ویڈیو کلپ ماہین کو بھجوا دیا کہ جس میں وہ نیم برہنہ حالت میں خود لذتی کے عمل سے گزر رہی تھی۔نوید کا کہنا تھا کہ یہ تو محض نمونہ ہے۔اب بھی اگر اُس نے ملاقات نہ کی تو وہ اِس قسم کی ڈھیروں ریکارڈنگز یوٹیوب پر ڈال دے گا اور پھر اُس کے بعد جو ہوگا، اُس کا تصور وہ خود ہی کر لے تو بہتر ہوگا۔

اِس ویڈیو کلپ نے جہاں ماہین کے اعصاب کو کچل کر رکھ دیا وہاں اُس کی پوری شخصیت میں دراڑیں ڈال کر اُس کی سوچ تک کو بھی منجمد کر دیا۔وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نوید اس طرح اُس کے اعتماد کو دھوکہ دے سکتا ہے۔اپنے کیے پر اب خود کو لعنت ملامت کرنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔تو اب کیا کرے؟ اُس کے ہاں تو اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ وہ پورا ویڈیو کلپ ہی دیکھ پاتی۔وہ حیران تھی کہ اب تک ملنے والے چاروں مردوں میں سے اگر کسی نے دھوکا کیا ہے تو اُسی نے کہ جس پر اعتماد سب سے زیادہ تھا۔سکائپ پر نوید کی آواز کے جادو میں جکڑی ہوئی ماہین کو کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ نوید سرور کے اُن لمحات میں اتنا عیار بھی ہوسکتا ہے۔لیکن اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا، مسئلہ اب اُس سے نمٹنے کا تھا۔ویڈیو موصول ہونے کے بعد کا پہلا دن اُس پر بہت بھاری گزرا۔رات کے تیسرے پہر سے دن چڑھے تک تو اُسے ہوش ہی نہ رہا کہ وہ زندوں میں ہے یا مُردوں میں۔ویڈیو کلپ ہی پورا دیکھنے کا حوصلہ نہ تھا کہ کب کا، کیسا اور کتنی دیر کا ہے۔پوری رات آنکھوں میں کٹی ہونے کے باوجود وہ یونیورسٹی تو گئی مگر اِدھر اُدھر کے کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر آنسو بہاتی رہی۔جی کسی صورت ہلکا نہیں ہو پا رہا تھا۔کلاس فیلوز سیاہ چشمے کا پوچھتیں تو آشوبِ چشم کا بہانہ گھڑا

گھڑ ایا مگر آواز رُندھی ہوئی ہونے کا کبھی کوئی ناکافی عذر اور کبھی کوئی بودا جواز۔

نوید نے ماہین کی ہاں یا ناں جاننے کے لیے اُسے محض چوبیس گھنٹے کا وقت دے رکھا تھا۔ اِس لیے جب وہ گھر واپس آئی تو کئی گنا بڑھے ہوئے ذہنی بوجھ کے ساتھ۔ لیکن جوں جوں نوید کی جانب سے دی گئی مہلت ختم ہونے کو آ رہی تھی حیران کن طور پر اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کچھ کچھ بہتر ہو چلی تھی۔ شام ڈھلی تو صوفے پر بیٹھے بیٹھے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ مگر نیند میں بھی ہر طرف سے حملہ آور ہوتی بلاؤں کا سامنا کہ جو منہ پھاڑے اُسے زندہ نگل جانے کی مسابقت میں تھیں۔ بے چینی اور بے سکونی سے بھری ہوئی نیند اگرچہ چند منٹوں کی تھی مگر پھر بھی اُس نے ماہین کو اچھا خاصا ہشاش بشاش کر دیا۔ کافی دیر تک واش روم میں بار بار چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد ماہین اِس قابل ہو چکی تھی کہ چائے کا ایک گرم کپ گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے کسی فیصلے پر پہنچ سکے۔ اِس طور گومگو کی کیفیت ختم ہوئی تو وہ پُرسکون ہوتی چلی گئی۔ اُس نے نہایت اطمینان سے اپنا دور پھینکا ہوا موبائل فون اُٹھایا اور نوید کا نمبر ملانے لگی۔

''شکریہ کہ تم نے میرے دی گئی وارننگ کا پاس رکھا۔''

''مجھے تین دن کا اور وقت چاہیے۔''

''میں تو تین منٹ تک کا انتظار نہیں کر سکتا۔''

''فار گاڈ سیک ___ میری ذہنی حالت ایسی نہیں ___ بس تین دن اور دے دیں۔''

''تو پھر کیا ہوگا ___ کیا فیصلہ میرے حق میں ہو جائے گا؟''

نجانے کیسے ایک دم ماہین کے ذہن نے پلٹا کھایا اور اُس کا ملتجیانہ لہجہ التفات سے بھرے انداز میں بدل گیا۔ ''حق میں بھی ہو سکتا ہے۔'' ماہین کے لبوں کی مسکراہٹ فون کے دوسری جانب بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔

''سوچ لو! کوئی چالاکی نہیں چلے گی۔''

''اگر چالاک ہوتی تو کیا یوں تمہارے چنگل میں ہوتی؟'' ___ ناقابل یقین طور پر

ماہین کی مسکراہٹ اور گہری ہو چکی تھی۔

''اوکے ___ تین دن اور۔'' نوید نے کہہ تو دیا مگر اُس کے لہجے میں یقین کی بجائے تشکک تھا۔ ماہین نے کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا اور ایک اور نمبر ملانے لگی۔

''آہا ___ آج کیسے ہمارا خیال آ گیا۔''

''جمال! کیا تم مجھے رات دو بجے فون کر سکتے ہو؟''

''میں! اور فون نہ کروں؟ کیسے ممکن ہے۔''

''شٹ اپ، مجھے تمہاری چاپلوسی اچھی نہیں لگتی، کمانڈ کیا کرو، ڈیمانڈ نہیں۔'' ماہین نے فون تو بند کر دیا مگر ابھی تک شش و پنج میں تھی کہ اس صورتحال سے کیسے نمٹ پائے گی لیکن نجانے کیا ہوا کہ اُس کے بدن میں پھر سے زندگی نے ایک اور کروٹ لینی شروع کر دی۔ پھر وہی ہیجان، وہی اکڑاہٹ اور مسام مسام سے جان نکلنے کی لطف آگیں اذیت۔

✿

﴾ ۹ ﴿

اگرچہ دانش سعید کو بحفاظت رائل کلب سے نکال کر مال روڈ کے فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچا دیا گیا تھا مگر وہ ابھی تک حیران تھا کہ جس ملک میں سرمایہ دار کا سرمایہ اور عزت دونوں محفوظ نہ ہوں، وہ کیا خاک ترقی کرے گا۔ جھگڑا ایک بہت بڑی حکومتی شخصیت کے ایسے مطالبے سے شروع ہوا جو کلب میں سرمایہ کاری کرنے والوں کے لیے ناقابل پزیرائی تھا۔ اُن کے مطابق یہ کلب ایک قانونی لیز کے تحت وجود میں آیا تھا کہ جس کے تحت ایک ہزار کنال سے زائد سرکاری اراضی پر کثیر سرمایہ کاری سے سماجی رابطوں اور اجتماع کا ایک جدید ترین ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ معاملہ تلخی سے بڑھ کر ''پوائنٹ آف نو ریٹرن'' تک پہنچا تو اگلا قدم عدالتی مقدمہ بازی تھا۔ اس دوران طاقت کا توازن بدلا تو راتوں رات اُس طویل مدتی لیز کو ہی غیر موثر بنا کر بزورِ پولیس کلب پر قبضہ کر لیا گیا۔

ایک بزنس مین ہونے کے ناتے فطری طور پر دانش سعید کی ہمدردیاں رائل کلب کے سرمایہ کاروں کے حق میں تھیں مگر آج کی شام کے حوالے سے اُس کی آزردگی اپنی پسندیدہ جگہ پر رات گئے تک بیٹھ کر اُس طلسماتی درخت کی صحبت سے محروم رہنے کے سبب تھی۔ وہ جب بھی لاہور آتا تو اُس کے لیے باعث کشش وہی عجیب و غریب درخت ہوتا کہ جس کے روبرو بیٹھ کر سکاچ کے چار پیگز پر رات کے تین پہر گزارنے اُسے کچھ عجیب اور غیر محسوس سی توانائی عطا کرتے۔ اُسے یوں لگتا کہ وہ کسی ساکت زبان مرید کی مانند اپنے مرشد کے حضور بیٹھ کر عطا ہی عطا اپنی جھولی میں سمیٹے جا رہا ہے۔ کئی بار اُس نے قصداً ایسا کمرہ بھی لیا کی جس کی کھڑکی سے

وہ ٹُنڈ مُنڈ درخت صاف دکھائی دیتا تھا مگر نہ تو دن کو اور نہ ہی رات کو اُس پر وہ کیفیت طاری ہو سکی کہ جو اُس کے روبرو بیٹھ کر ارتکاز کے دوران محسوس ہوتی تھی۔ دانش سعید نے پہلے پہل تو یہ جانا کہ وہ ایک پراسرار سی کیفیت شاید وہاں بیٹھ کر مسلسل شراب پیتے رہنے کے سبب کسی واہمے کی مانند ذہن میں گھر کر لیتی ہو گی مگر درخت کے سامنے والے کمرے میں پورا پورا دن اور پوری پوری رات بیٹھ کر بوتلیں خالی کرنے کے بعد بھی وہ مخصوص کیفیت تو کہاں در آنی تھی اُلٹا اپنے آپ سے بیزاری بڑھتی چلی جاتی۔

آج شام سے پیدا ہونے والی مسلسل بے سکونی کا آغاز دُرخانئے کے اچانک ٹپک پڑنے سے ہوا تھا وگرنہ وہ رائل کلب پر پولیس کا قبضہ ہونے تک سکون کی چند گھڑیاں تو گزار ہی لیتا۔ کئی برسوں کے بعد دُرخانئے کی اچانک آمد پر وہ حیران اِس لیے بھی تھا کہ اُس کا آنا کبھی بھی محض اتفاق نہیں رہا تھا بلکہ اُس کے پس منظر میں صرف ایک نہیں بلکہ کئی ایک کہانیوں کے ٹریک ایک ساتھ چل رہے ہوتے۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں اگرچہ کلب کی نسبت کئی گنا فراواں لوازمات اُس کی جنبشِ ابرو کے فاصلے پر تھے مگر یہاں آ کر بھی نہ تو اسکاچ میں اسکاچ کا ذائقہ باقی رہا تھا اور نہ ہی اُس کا سرور۔ اضطراب تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

اپنے آپ کو اِس نحوست سے نکالنے کے لیے دانش سعید پیگز کا حساب رکھے بغیر ہی پیتا چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد اُس کا جسم سست اور دماغ سو چکا تھا لیکن آنکھیں تھیں کہ سوئے ہوئے ہونے کے باوجود کھلی تھیں۔ بار بار دُرخانئے کا چہرہ اُس کے سامنے سے منہ چڑاتا ہوا گزر رہا تھا مگر وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ دُرخانئے کا یوں پھر سے اُس کی زندگی میں دخیل ہونا کیا معنی رکھتا تھا۔ گو کہ اُس کے سامنے دانش سعید نے کچھ ایسا تاثر نہ دیا تھا کہ وہ اُس کی اچانک آمد سے کس قدر پریشان ہوا ہے مگر دل ہی دل میں وہ اِس حد تک مضطرب تھا کہ اُسے گفتگو کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب بھی اُس نے دُرخانئے پر چلانے کی کوشش کی مگر اُس کے حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔ اُس نے کئی بار سر کو جھٹکا کہ دُرخانئے کا منہ چڑاتا ہوا چہرہ اُس سامنے سے ہٹ جائے مگر کچھ بھی تو نہ ہوا۔

اس دوران دانش سعید کو محسوس ہوا کہ ایک اور چہرے کا نقش پانی کی رنگین لہروں پر بہتا

ہوا اُس کے روبرو اِس طرح آیا کہ ڈُرخانئے کا منہ چڑاتا چہرہ اُس کے پس منظر میں غروب ہوتا چلا گیا۔ اُس نے پورے بدن کے زور سے آنکھیں کھول کر اِس نقش کو پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ شبیر کا چہرہ تھا کہ جس نے اُس کے دماغ میں چلتا ہوا پورا منظر ہی بدل کر رکھ دیا۔ اپنی ماں کے یار روشن کے خوف سے بھاگ کر جھانگی میں چھپنے والا شبیر ایک ٹرک ڈرائیور کی جنسی تسکین کے عوضانے لاہور پہنچ چکا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے اُسے رات گئے شاہ عالمی مارکیٹ کے نزدیک اُتارا کہ جہاں سے داتا دربار پر ہونے والی قوالی کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔

لاہور آنے سے پہلے اپنے شہر گگو منڈی کے علاوہ اُسے صرف اُن شہروں کے نام معلوم تھے کہ جن کا ذکر وہ اسکول کے زمانے میں اپنی مطالعہ پاکستان کی کتابوں میں پڑھتا تھا۔ اُسے وہ شہر ایک خواب نگر کی طرح سجھائی دیتے اور وہ اُن کے نام کے صوتی تاثر سے ایک تصویر سی اپنی ذہن میں بٹھا لیتا تھا۔ لاہور کا ذکر ایک تاریخی شہر کے طور پر اُسے رٹوایا گیا مگر رٹا لگانے کے باوجود اُسے معلوم نہیں تھا کہ تاریخی ہوتا کیا ہے۔ پہلے پہل شبیر کو یہ لفظ عجیب سا لگا کہ جس کی کوئی تصویر ذہن میں نہیں بن پا رہی تھی۔ ایک دن کہ جب اسکول ماسٹر اُس سے بہت خوش تھا اُس نے اپنے ذہن میں اٹکے ہوئے اِس لفظ کے معنی پوچھ ہی لیے۔ پہلے تو ماسٹر اُسے عجیب سا منہ بنا کر دیکھتا رہا کہ جب وہ کسی کو چھینٹی لگانے سے پہلے بنایا کرتا تھا مگر پھر جسم میں مزید مشقت کی سکت نہ پا کر مسکرا دیا اور بولا۔

''پُتر اپنی ماں سے پوچھنا کہ تاریخی کیا ہوتا ہے؟'' _ شبیر سمجھ گیا کہ ماسٹر جو چیز ماں سے پُچھوا رہا ہے وہ ضرور کوئی گالی رہی ہوگی اور یوں لفظ تاریخی بھی ایک گالی کی صورت اُبھر کر اُس کے ذہن میں ثبت ہو گیا۔

ایک منہ بھر گالی اُسے ٹرک سے اتارتے ہوئے ڈرائیور نے بھی دی کہ جس سے اُس نے روٹی کھانے کے لیے پیسے مانگے تھے۔ ڈرائیور تو چلا گیا مگر شبیر رات گئے فُٹ پاتھ پر بیٹھ کر وہ تمام گالیاں یاد کرنے لگا کہ جو اُسے پیدا ہونے کے بعد اب تک دی گئی تھیں تا کہ غصے کے مارے اُسے بھوک کا احساس ختم ہو جائے۔ ویسا غصہ جیسا اُسے اپنی ماں اور روشن کو دیکھ کر آیا کرتا تھا مگر نہ تو اُسے گالیاں یاد کر کے غصہ آ رہا تھا اور نہ ہی ماں اور اُس کے یار روشن کو یاد کر

کے۔ بھوک شدید ہوئی تو اُس نے دھاڑیں مار کر رونا چاہا مگر اُسے رونا بھی نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسا تاریخی شہر تھا کہ جس نے اُس کے اندر سے تمام حسیات نچوڑ کر اُسے ڈھیٹ اور بے حس بنا دیا تھا۔

اتنے میں اُس نے دیکھا کہ پندرہ بیس لڑکے ہاتھوں میں جھنڈے پکڑے کسی بے نظیر کے نعرے لگاتے چلے آ رہے تھے۔ اُن کی آوازوں میں غصہ تھا مگر خوف کی لرزش بھی تھی جس پر قابو پانے کے لیے وہ نعرے لگاتے لگاتے آپس میں ٹھٹھا مخول شروع کر دیتے۔ شبیر اُٹھ کر اُن کے ساتھ ٹولی میں شامل ہو کر نعرے لگانے لگا تو اُسے ایک لڑکے سے معلوم ہوا کہ اُن کی لیڈر شہید بھٹو کی بیٹی جنرل ضیاالحق کو للکارنے چھ دن بعد دس اپریل کو پاکستان آ رہی ہے۔ بھوک سے شبیر کا چکرایا ہوا سر اور بھی چکرا گیا کہ ایک منٹ میں اُس نے ایسے ایسے لفظ سن لیے تھے جن کا مطلب جاننا تو کیا انہیں یاد رکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ بس دو لفظ اُس کی یادداشت میں رہ گئے __ لیڈرا اور شہید۔

یہ چھوٹا سا جلوس تو داتا دربار کے پاس آ کر اِدھر اُدھر گلیوں میں گم ہو گیا مگر اُسے دربار کے ساتھ پکویوں والی گلی تک پہنچا گیا کہ جہاں درجنوں پکی ہوئی دیگوں سے گرما گرم پلاؤ کی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کسی سے مانگتا ایک دیگ کا کسی نے ڈھکن اُٹھایا اور مانگنے والوں کے ہجوم نے پلک جھپکتے اُس کے گرد اِس طرح گھیرا ڈالا کہ شبیر کے دیکھتے ہی دیکھتے دیگ خالی ہو گئی۔ اُسے یوں لگا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی ٹپ ٹپ زمین تک ہو رہی ہے مگر ہاتھوں کی اُلٹی ہتھیلیوں سے پونچھنے پر بھی خشک کی خشک۔ اُس نے تھوک نگل کر حلق کو تر کرنے کی کوشش میں دوسری دیگ پر نگاہیں ٹِکا لیں کہ جس کا خریدار مول تول کے آخری مراحل میں تھا۔ جیسے ہی دیگ سے ڈھکن اُترا شبیر سب سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ دھکم پیل میں تقسیم کرنے والے کا کنڑ چھا سڑک پر گر گیا۔ ظاہر ہے کہ زناٹے دار تھپڑ اور دس بارہ گالیاں بھی شبیر کے حصے میں آنی تھیں کہ جو سب سے آگے موجود تھا لیکن اس کے باوجود وہ وہاں سے اُس وقت ٹلا کہ جب تک جھولی میں کابلی چنے کے پلاؤ کی دو پلیٹیں ناں اُنڈوا لیں۔ شبیر کی جھولی میں بھاپ اُڑاتے چاول تو موجود تھے مگر گھی نیچے سے نچڑ کر سڑک پر گرتا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے ہر

چیز کی پرواہ کیے بغیر تیزی سے دربار کے برآمدوں کی طرف جانے والی سیڑھیاں پھلانگیں اور ایک ایسے کونے میں بیٹھ کر لپ لپ چاول کھانے لگا کہ جہاں پانی کی سبیل بھی قریب ہی تھی۔

چاولوں سے پیٹ بھرتے ہی اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں اور کچھ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے اور کس جگہ ہے۔ جب آنکھ کھلی تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ یونہی نہیں کھلی تھی بلکہ چوتڑوں پر ایک پولیس والے کی پشاوری چپل کی ٹھوکروں کی تکلیف سے کھلی تھی۔ شبیر ابھی نیم بیداری کی حالت میں تھا کہ سپاہی نے بالوں سے پکڑ کر اُسے کھڑا کر دیا۔ تڑاخ تڑاخ منہ پر پڑنے والے تھپڑوں اور پان کی پیک کی طرح منہ سے نکلتی عجیب و غریب گالیوں نے اُسے بوکھلا دیا۔ جو گالیاں سمجھ میں نہ آئیں اُس نے سمجھ لیا کہ یہ ضرور تاریخی رہی ہوں گی۔

''او بہن یکا___ گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟'' ظاہر ہے ایسے میں شبیر نے کیا جواب دینا تھا لہٰذا ایک اور تھپڑ اور نئی مگر تاریخی گالیوں کی ایک اور بوچھاڑ۔

''مال نکالو حرامزادے جو گھر سے لے کر بھاگے ہو___ جلدی کرو مال نکالو ورنہ بہن بھانجیوں کو ایک ساتھ___ سمجھ گئے ہو ناں۔''

شبیر کچھ نہ بولا تو سپاہی نے اُس کی ہر وہ جگہ ٹٹول لی کہ جہاں کچھ چھپائے جانے کا امکان ہو سکتا تھا۔ جب کچھ نہ ملا تو غصے کے اُتارے کے لیے دائیں بائیں کچھ تھپڑ مزید جڑ دیے اور کندھے سے پکڑ کر ایک اور آدمی کے حوالے کر دیا جس نے پولیس سے ملتی جلتی وردی پہن رکھی تھی۔ وہ آدمی اُسے دھکیلتا ہوا باہر سڑک پر لے آیا اور ایک بازو اور ایک ٹانگ سے اُٹھا کر لوڈر گاڑی میں پھینک دیا جس میں شبیر کے ہم عمر تین بچے اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

دن چڑھے اُن کی سواری ایک پرانی عمارت کے سامنے جا رکی جہاں اُنہیں ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا گیا جہاں چار بچے پہلے سے موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک بچے کاشف عرف کاشی سے اُس کی اچھی گپ شپ ہو گئی۔ وہ رحیم یار خان کا رہنے والا تھا اور تیسری بار گھر سے بھاگ کر آ رہا تھا۔ کاشی نے اُسے ہولے سے بتایا کہ ''یہ گمشدہ بچوں کا دفتر ہے۔ اگر یہاں اصلی پتا بتا دو تو خرچے کے نام پر والدین سے ایک موٹی رقم اینٹھ کر بچہ اُن کے حوالے کر

دیتے ہیں مگر جہاں پتا درست نہ ہو اور والدین بھی غریب ہوں تو بچوں کو بھاٹی، لوہاری، بادامی باغ اور پرانی انارکلی میں واقع سرائے نما ہوٹلوں میں بیچ دیا جاتا ہے۔ تو دعا کرو ہمیں کوئی بادامی باغ والا لے جائے۔''

''بادامی باغ کیوں؟'' شبیر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بڑے لوشے ہیں وہاں___ مزے ہی مزے___ ٹھیک ٹھاک کمائی ہو جاتی ہے۔'' کاشی ایک آنکھ دبا کر نہایت حرامی انداز میں بولا۔

''یہ لوشہ کیا ہوتا ہے؟___ کیا کوئی تاریخی شے؟''___ شبیر تصور میں لوشے کا نقش ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تو نہیں سمجھے گا___ یہ سمجھایا نہیں جاتا___ بس ہوتا ہے___ تم خود دیکھ لینا۔'' کاشی اب اُس سے جان چھڑانے پر آ گیا تھا۔

اُن دونوں کی بادامی باغ بس سٹینڈ کے کسی سرائے نما ہوٹل میں فروخت کیے جانے کی آرزو تو پوری نہ ہوئی مگر یہ ضرور ہوا کہ دونوں ایک ساتھ لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب بنے ہوئے ایک ایسے ہوٹل کے لیے خرید لیے گئے جو نسبتاً صاف ستھرا ہونے کے سبب وی آئی پی ہوٹل کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس ہوٹل میں جہاں کمرے کا کرایہ باقی سرائے نما ہوٹلوں سے کچھ زیادہ تھا وہاں لواطت کے لیے دستیاب لڑکے بھی خوبصورتی کا ایک معیار رکھتے تھے۔ مصروفیت چاہے کاروباری رہی ہو یا سرکاری اور دفتری، لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے ایک مخصوص عمر کے لوگ جو زیادہ تر چالیس سے اوپر کے ہوتے، بذریعہ ٹرین لاہور آتے ہوئے اسی کوشش میں ہوتے کہ کم از کم ایک رات تو ضرور اسی ہوٹل میں اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ گزاریں۔

اس ہوٹل تک آتے آتے شبیر اور کاشف دونوں اپنی اپنی کہانیاں اور تجربات ایک دوسرے سے سانجھے کر چکے تھے۔ دونوں نے آپس میں طے کیا کہ کوشش کریں گے اپنے رویے اور کارکردگی سے ہوٹل کے مالک، ملازمین اور گاہکوں کا دل جیتے رکھیں کیونکہ کاشی کے تین بار کے تجربات کے مطابق لڑائی جھگڑے اور بھاگم دوڑی سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا اُلٹا

اپنا سفر ہی کھوٹا کرنا پڑتا ہے اور پھر بار بار کی مہم جوئی سے حاصل کیا ہوتا ہے، بس یہی کہ کوئی اعتماد ہی نہیں کرتا۔

جو آدمی انہیں گمشدہ بچوں کے ایک نمائشی ادارے سے خرید لایا تھا وہ ہوٹل کا مالک نہیں بلکہ کرتا دھرتا نما منیجر تھا۔ اُس نے ہوٹل پہنچتے ہی دونوں کو خوب نہا دھو کر آنے کو کہا اور یہ بھی بتا دیا کہ اُن کی ماپ کے سلے ہوئے کپڑے بھی غسل خانے میں پہنچا دیے جائیں گے۔ کئی دنوں کی میل اُن کے جسم سے اُتری اور مناسب کپڑے پہننے کو ملے تو اُن کی چمک دمک دیکھ کر منیجر بھی حیران رہ گیا۔ دونوں گورے چٹے اور مست آنکھوں والے۔ منیجر نے چشم تصور سے اُن کے لیے گاہکوں کو آپس میں دست گریباں ہوتے دیکھا۔ لیکن سب سے اہم بات اُن پر نگاہ رکھنے کی تھی کہ اُنہیں کوئی اور نہ لے اُڑے اور یہی بات اہم اِس دھندے کی تھی۔

کھانا کھلائے جانے کے بعد اُنہیں ہوٹل کے معاملات سے آگاہ کرنے کے لیے کچھ سینئر ویٹرز کے ساتھ لگا دیا گیا۔ شبیر نے آج مین کاؤنٹر پر رہنا تھا۔ اُس کی ذمہ داریوں میں ہر نئے آنے والے گاہک کا سامان اُس کے کمرے تک پہنچانے کے علاوہ حسبِ ضرورت روم سروس بھی فراہم کرنا تھی۔ ''روم سروس'' کی اجازت کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ڈیوٹی منیجر دیا کرتا مگر اِس سے پہلے متعلقہ کمرے کے گاہک کے ادا شدہ ایڈوانس سے مطلوبہ سروس کی فیس کاٹ لی جاتی۔ عام طور پر روم سروس کا دورانیہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ ہوا کرتا جس میں مزید فیس کی ادائیگی پر اضافہ بھی ممکن تھا۔ پہلے دن کے لیے کاشی کی ڈیوٹی بھی مین کاؤنٹر پر تھی مگر اُس کے ذمہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے آرڈر لینے اور انہیں کچن کے ڈیوٹی منیجر تک پہنچانے کے علاوہ اگر کوئی گاہک اُس میں دلچسپی لیتا ہے تو اُسے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ڈیوٹی منیجر تک رسائی کا راستہ دکھانا بھی تھا۔ اِس صورت میں گاہک کو گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے ہوٹل کا کمرہ بھی لینا ہوتا تھا تاکہ روم سروس کا جواز فراہم کیا جا سکے۔ ہوٹل میں اگرچہ تیس کے قریب لڑکے مختلف حیثیتوں میں پہلے سے کام کر رہے تھے مگر کاشی اور شبیر کے آنے کے بعد ماحول میں خود بخود دنیا پن در آیا تھا۔

ڈیوٹی لگ جانے کے بعد کافی دنوں تک دونوں کو آپس میں مل بیٹھنے کا موقع ہی نہ ملا۔

ایک کی اگر رات مصروف تو دوسرے کا دن۔ شاید اُن کی آپس میں دوستی کو بھانپ کر ڈیوٹیاں ہی اِس طرح لگائی گئیں کہ اُنہیں ایک دوسرے سے دور رکھا جائے۔ لگ بھگ دس بارہ دنوں کے بعد ایک شب تیسرے پہر تک جب وہ دونوں پے در پے کئی گاہکوں کو روم سروس فراہم کر چکے تو اُن کی مزید ڈیمانڈ کو نظر انداز کرتے ہوئے اُنہیں اگلے دن دوپہر تک کا ریسٹ دے دیا گیا۔ شبیر جسے اب ''شاکا'' کہا جانے لگا تھا، کاشی سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ اگرچہ اُس کی پہلے کی زندگی کاشی کے علم میں آ چکی تھی مگر اِس سب کے باوجود نجانے کیوں شاکا کے لیے اُس کا سامنا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ کاشی نے اُس کے جذبات بھانپ کر کسی بڑے کے سے انداز میں اُسے تھپکی دی اور پوچھا کہ مال کتنا بنا؟

''پچاس روپے ___ ''

''میں نے آج کا نہیں، اب تک کا پوچھا ہے۔''

''گنے نہیں، تین ساڑھے تین سو روپے تو ہو گئے ہوں گے۔''

''بس یہی کچھ ___ !''

''اور کیا ___ انعام تو بس اِتنا ہی ہوتا ہے۔'' ___

''انعام ملتا نہیں، نکلوانا پڑتا ہے ___ '' پھر اپنا منہ شاکا کے کان کے قریب لا کر آہستہ سے بولا۔ ''نہ تو گاہک ہمارے ساتھ مخلص ہیں اور نہ ہی ہوٹل والے۔ ہر کوئی اپنا مطلب نکالتا ہے تو پھر ہم کیوں ناں اپنا مطلب نکالیں۔ میرے یار جتنا کما سکتے ہو کما لو یہاں سے۔'' کاشی کی بات سُن کر شاکا سوچ میں پڑ گیا۔ یکدم اُس کے بدن کا ایک ایک ریشہ درد کرنے لگا۔ نجانے کیوں اُسے اپنی ماں یاد آنے لگی تھی مگر شبیر نے دوسرے ہی لمحے اُس کی یاد کو ذہن سے جھٹک دیا۔

''وہ کون سی مخلص تھی اپنے سَر کے سئیں کے ساتھ جو اُسے پردیس سے پیسے کما کر بھیجتا رہتا اور وہ گھر میں بیٹھے بٹھائے اُس حرامی روشن کو ٹھنسواتی رہتی۔ اُسے تو اپنے پُتر تک کا احساس نہیں تھا کہ کیا سوچتا ہو گا ماں کو کسی غیر کے ساتھ ایک ہی بستر میں دیکھ کر مزے لیتے ہوئے۔''

''یار کاشی! یہ ہوٹل والے کیا لیتے ہوں گے گاہکوں سے؟'' ___ شاکا نے اپنا ذہن

بدلنے کی کوشش کی۔

''دواڑھائی سوفی گاہک تو لیتے ہی ہوں گے ___ پر تو چھوڑ اِن باتوں کو ___ ہمیں تو اپنے روٹی کپڑے اور انعام سے غرض ہے ناں ___ باقی جتنے پیسوں میں وہ ہمیں خرید کر لائے ہیں، اُس کی وصولی تو کر کے رہیں گے۔'' کاشی کے تجربے نے اُسے بزرگانہ حیثیت دے دی تھی۔

ابھی اُن کی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ کالا وہاں آ گیا۔ شبیر اور کاشی کے ہوٹل میں آنے سے پہلے وہ یہاں کا ''وی آئی پی مُنڈا'' کہلواتا تھا مگر اُن دونوں کے آنے کے بعد ''پکے'' اور ''آئے گئے'' دنوں قسم کے گاہکوں کی ایک ہی فرمائش ہوتی تھی کہ بس کاشی ہو یا شاکا ہو۔ اِس ہوٹل کا مالک کالے کی شہرت سن کر اُسے مچھ بلوچستان کی کوئلوں کی کان کے باہر ہوٹلوں میں چلنے والی ''منڈا منڈی'' سے خرید لایا تھا۔ کئی کئی دن کوئلے کی کان سے کوئلہ نکالنے والے مزدور تھکن اور جنسی بے زاری سے مغلوب ہو کر اِن کچے ڈھابوں میں پہنچتے تو چھوٹی چھوٹی کچی کوٹھڑیوں میں رکھی چارپائیاں اپنی کڑکڑاہٹ سے ہمسایہ کوٹھڑیوں کو پیغام دے رہی ہوتیں کہ چائے زیادہ کڑک تھی یا کان کن کی رانوں دھنسا ہوا مُنڈا۔ کان کنوں کی ہفتہ بھر کی اذیت ناک تھکاوٹ کو راحت میں بدل دینے والے یہ نابالغ لڑکے اپنے غریب والدین کی معاشی زبوں حالی اور چھوٹے بہن بھائیوں کے بہتر مستقبل کے لیے اُن کی رضا سے یہاں جنسی مزدوری کیا کرتے مگر یہاں سے باہر کسی دوسرے شہر جانے کو قطعی تیار نہ ہوتے۔ لیکن وی آئی پی ہوٹل کے مالک نے کالے کی ماں کو اتنی زیادہ تعداد میں نوٹ دکھا دیے کہ وہ خود بیٹے کو لاہور چلے جانے کے لیے منت کرنے لگی اور یوں کچھ دیر اپنے بے در و دیوار گھر کی یاد میں آنسو بہانے کے بعد وہ لاہور جانے والی بس میں ہوٹل والے کے ساتھ سوار ہو گیا۔

اگرچہ آج رات کے تیسرے پہر کالے کا شبیر اور کاشف کے سونے والے تھڑے پر یوں چلے آنا کوئی حیران کن بات نہیں تھی لیکن اُن دونوں نے ہی ایک ساتھ محسوس کر لیا کہ وہ یہاں آنے سے پہلے عقبی تاریک گوشے میں کھڑا رہ کر اُن کی باتیں سُنتا رہا تھا۔ وہ اُن کے سامنے آنے پر بھی کوئی بات نہیں کر پا رہا تھا۔ بس اُنہیں دیکھ کر معنی خیز انداز

میں مسکراتا ہوا وہاں سے گزر گیا۔ اپنی اہمیت میں کمی دیکھ کر اولین دنوں میں تو اُس نے اِن دونوں سے سلام دعا بند ہی رکھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اُن دونوں سے زیادہ چٹا گورا، زیادہ خوبصورت اور چنگیرا تجربہ کار ہے مگر پھر بھی وہ تمام پکے گاہک جو اُس کے دیوانے ہوا کرتے تھے اچانک ہی نگاہیں بدل کر شاکا اور کاشی کی فرمائشیں کرنے لگے اور یوں اُس کی آمدن صرف نئے گاہکوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بدلے ہوئے حالات میں ایک پرانے لڑکے نے اُسے دل چھوٹا نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے آس ضرور دلا دی تھی کہ نئے آنے والوں کی چاہت نو دنوں کی ہوتی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ اِس کے بعد وہ شبیر اور کاشف کی طرف دیکھنے تو لگا مگر کچھ اِسی طرح کی تمسخر اُڑاتی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ۔ جیسے نو دنوں کے گزرنے کی چتاونی دے رہا ہو۔

کالے کو گئے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کاشی کو پھر سے ڈیوٹی منیجر کی طرف سے بُلاوا آ گیا۔ اُن دونوں کے رنگ فق ہو کر رہ گئے۔ کاشی اِس طرح جانے کے لیے اُٹھا کہ جیسے بدن میں جان ہی نہ ہو۔ شبیر نے اندھیرے میں اُس کے ہاتھ پر ہاتھ کر اُسے ہلکا سا دبا دیا جیسے ڈھارس بندھا رہا ہو۔ کاشف تو چلا گیا مگر ایک انجانا خوف شبیر کے پاس چھوڑ گیا۔ چند لمحے پہلے جس شبیر کی تھکاوٹ کے مارے آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں اب اُسی شبیر کو آنکھیں بند رکھنے میں دقت کا سامنا تھا۔ ہر آہٹ پر اُسے یوں محسوس ہوتا کہ ابھی کوئی بُلاوا اُس کے لیے آیا چاہتا ہے۔ اگر معاملہ صرف روم سروس کی حد تک ہوتا تو کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا لیکن محسوس یوں ہو رہا تھا کہ اُن کی غیر محتاط گفتگو کی سزا شاید بہت سخت ہو سکتی تھی۔ کاشی کا سابقہ تجربہ تو کم از کم اِسی قسم کا تھا۔ ایک مسلسل خوف نے اُس کے جسم میں عجیب سی کپکپاہٹ پیدا کر دی۔ ہاتھ پاؤں برف کی مانند سرد۔ اُسے رہ رہ کر اپنا قصبہ گگومنڈی یاد آ رہا تھا۔ ایسے میں اُس کا دل چاہا کہ باپ کے سینے سے لپٹ کر اتنا روئے اتنا روئے کہ اُس کا سارا خوف جاتا رہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اُس کے باپ کو تو شاید یہ خبر بھی نہ ہو کہ وہ گھر سے بھاگ کر کس قسم کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکا ہے۔ کپکپاہٹ تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

رات کا آخری پہر گزرا تو قریبی مسجد میں ہونے والی اذان کے ساتھ ہی اطراف میں

زندگی جہاں جہاں تھی، بیدار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اتنے میں شبیر کو کسی بھاری چیز کے فرش پر گھسیٹے جانے کا احساس ہوا۔ وہ خوف کے مارے ایک دم اُٹھا اور پیچھے دیوار کے ساتھ دبک کر آواز کی جانب اپنے کان لگا دیے۔ اب یوں لگا کہ کوئی گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہوا اُس کی طرف آ رہا ہے۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں زور سے دانتوں تلے دبا لیں۔ آواز اور قریب تر ہوئی تو شبیر کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ کالا تھا جس سے پچھواڑے میں شدید تکلیف کے سبب چلا نہیں جا رہا تھا اور وہ گھسٹتا ہوا اُس کی جانب آ رہا تھا۔ پہلے سے دیوار کے کونے میں دبکا ہوا شبیر کچھ اور سہما تو اُس کی ٹھوڑی گردن برابر آئے ہوئے گھٹنوں میں گھس گئی۔ کالے نے شدید تکلیف کی حالت میں بھی اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لیکن شبیر اپنی جگہ پریشان کہ کاشف کہاں گیا اور کالے کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا جب کہ بظاہر اُس کا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔

اِس عجیب سی صورتحال نے شبیر کے دل سے ''ہونی'' کا خوف تو نکال دیا مگر اُس کی جگہ ''انہونی'' کے شدید اضمحلال اور پریشانی نے لے لی۔ ایک عجیب سی غیر یقینی نے اُسے جکڑا کر رکھ دیا تھا۔ کالا آہستہ آہستہ گھسٹتا ہوا اُس کے قریب آ کر اوندھے منہ فرش پر لیٹ گیا۔ اُس کے منہ سے کراہنے کی بجائے ہچکیوں کی آواز اِس طرح آ رہی تھی جیسے وہ آنکھوں سے رونے کو روکنے کی کوشش میں پورے بدن سے روئے جا رہا ہو۔ شبیر نے چاہا کہ اُٹھ کر کالے سے لپٹ جائے، اُسے تسلی دے مگر ڈر گیا کہ اِس کی آڑ میں بھی کوئی اور عذاب نہ ہو خاص طور پر اِن حالات میں کہ جب کاشف کی گمشدگی ابھی تک ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔

شبیر ابھی اِسی مخمصے میں تھا کہ نیم روشن ہو چکی گیلری میں سے اُسے کاشف آتا ہوا دکھائی دیا۔ شبیر کے اندر جمع ہو چکا اضطراب اُمڈ کر اُس کی آنکھوں میں آ گیا۔ وہ کاشف کی خیریت جاننے کے لیے بے تاب تھا اور کاشف بھی بظاہر ٹھیک ہی لگ رہا تھا۔ جونہی وہ کٹھڑے کے پاس پہنچا شبیر نے فرطِ جذبات سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ مگر اُس کی جانب سے کسی گرم جوشی کا خفی مظاہرہ تک نہ ہوا۔ شبیر کو لگا کہ جیسے وہ تھکن سے چور اور شب بیداری کے سبب بس گرنے والا ہوا پھرتا ہے۔ شبیر تو اِس بات پر بھی حیران تھا کہ اُس نے نیچے فرش پر اوندھے پڑے مسلسل

روتے ہوئے کالے کی طرف بھی کوئی توجہ نہ دی کہ جیسا جانتا ہو وہ کون ہے اور اِس حالت میں کیوں ہے۔ شبیر کی اب تک کی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ اُسے درپیش تھا۔ کاشف پر اکثر و بیشتر پڑنے والے اجنبیت کے یہ دورے شبیر کو عموماً اُس کی ذات سے خوف زدہ کیے رہتے۔

کھٹاک!!!!____ شیشے کا شراب سے ادھ بھرا گلاس آرم چیئر پر نیم دراز دانش سعید کے ہاتھ سے پھسل کر کمرے کے چوبی فرش پر گرنے کے باوجود ٹوٹنے سے تو بچ گیا مگر شراب فرش پر پھیلتی چلی گئی۔ کچھ دیر پہلے کی غنودگی بھی گرے ہوئے گلاس کے ساتھ ایک دم اِدھر اُدھر ہو چکی تھی۔ مگر شبیر کا مضطرب چہرہ ابھی تک اُس کی آنکھوں میں گھر کیے بیٹھا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر انٹر کام پر ہاؤس کیپنگ والوں کو فرش صاف کرنے کا تو کہہ دیا لیکن شبیر کے عکس کو آنکھوں سے صاف کرنے کی کوئی سبیل سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دانش سعید زچ ہو کر دکھتی ہوئی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے مسلنے لگا تھا۔

﴿۱۰﴾

زفیرہ احمد جس قسم کے حالات میں جکڑی جا چکی تھی وہاں سے نکلنے کے لیے اُس کے پاس بڑے صاحب کے سامنے سرنڈر کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ مگر ابھی کچھ دیر پہلے کا اُس کا اپنا شدید ردِعمل بھی آنکھوں کے سامنے تھا۔ بار بار ایک ہی سوال اُس کے ذہن میں چکرا رہا تھا کہ بڑا صاحب اُس کے ہاتھوں بری طرح بے عزت ہونے کے بعد کیا اب بھی اُسے منہ لگانا پسند کرے گا؟ وہ تو اُسے یہاں تک کھری کھری سُنا چکی تھی کہ بھڑوا گیری کی شرط پر اُسے نہیں چلانی کاروبار کی رکی ہوئی گاڑی۔ بھاڑ میں جاتا ہے کاروبار تو بے شک جائے۔ تو اب کیسے بات کرے وہ بڑے صاحب سے؟ ویسے بھی اِس سچوایشن میں ڈیل کرنے سے اُس کی حیثیت کمزور ترین فریق کی ہوگی کہ جس کے کندھوں پر باقی تمام اسٹیک ہولڈرز اپنے اپنے بوجھ سمیت سوار ہوں گے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ وہ ایک ایسی ڈھلوانی چٹان پر مسلسل پھسلتی ہوئی پاتال کی طرف اتنی تیزی سے جا رہی تھی جہاں ہر ایک آنے والا لمحہ اُس کی سودا بازی کی حیثیت کو کمزور تر کیے چلا جا رہا تھا۔

تمام تر کنفیوژن کے باوجود زفیرہ نے بڑے صاحب کا فون نمبر ڈائل کرنے کے آپشن پر ٹچ کر ہی دیا۔ اُس کے واہموں کے برعکس نہ صرف دوسری جانب سے فون فوراً ہی اٹینڈ کر لیا گیا بلکہ بڑے صاحب کی آواز میں شگفتگی بھی ہمیشہ کی طرح جوں کی توں موجود تھی۔

''آہا میری جان ___ لگتا ہے گرمی نکال دی کسی نے دماغ سے۔''

زفیرہ احمد نے اطمینان کی سانس لی۔ اُس کے تئیں اب کم از کم بات کی جا سکتی تھی۔

وہ ایک ادا سے مسکرائی اور پھر سے اپنی آواز میں نخرہ نما تمکنت پیدا کرتی ہوئے بولی ___ ''میں شرمندہ ہوں بڑے صاحب۔ آپ جانتے تو ہیں کہ حالات نے مجھے پاگل کر کھا ہے۔ اتنی محنت سے کھڑی کی ہوئی ایمپائر اگر دشمنوں کے ایک ہی ہلے سے زمیں بوس ہونے جا رہی ہو تو دماغ کا تندور بن جانا نیچرل ہے۔''

''لیکن اُس بھڑوے کی گمشدگی کی اطلاع پولیس کو دینے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تو کیا یہ خبر آپ تک بھی پہنچ چکی ہے؟'' ___ زفیرہ کو اپنی آواز میں کپکپاہٹ چھپانی مشکل ہو رہی تھی۔

''اوہ میری جان ___ لگتا ہے تم ابھی تک مجھے نہیں جان پائی ___ میرے ہاتھ چھوٹے سہی مگر میری مار بہت دور تک ہے۔ جس قسم کا بزنس تم جس طریقے سے کر رہی ہو ناں ___ ویسے نہیں ہوتا۔ بزنس کی دنیا بڑی عجیب ہے۔ جو عورت دن کے چوبیس گھنٹے میں یہاں ایک سو چوبیس روپ نہیں بدلتی وہ پٹ جاتی ہے۔ کتے کے سامنے ٹانگیں کھولنے سے دماغ کی کھڑکیاں نہیں کھلتیں اُلٹا بند ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہم بہن چود مرد وفادار بھلے نہ ہوں مگر عورت کے مفادات کی سب سے موثر رکھوالی مرد ہی کرتے ہیں، کوئی لبراڈار کتا نہیں۔''

زفیرہ احمد کا خون کھول کر رہ گیا مگر اُس نے زبان کو دانتوں تلے دبا کر نہ تو لہجے کی کھنک کو ماند پڑنے دیا اور نہ ہی نخرہ آمیز تمکنت کو۔ ''آپ کیوں جیلس ہو میرے لبراڈار سے؟ ایک کتے سے رقابت آپ کو کہاں زیب دیتی ہے جناب ___ کہاں آپ اور کہاں ایک بے چارہ کتا ___ برا نہیں ماننا بڑے صاحب ___ لبراڈار کو دو گھونٹ جوانی چکھا دو تو عمر بھر پاؤں چاٹتا ہے مگر یہ مرد عورت کی پوری کی پوری جوانی چوس لینے کے بعد بھی اُس پر کبھی اعتبار نہیں کرتا، ہمیشہ بے اعتبار کر کے مارتا ہے۔''

''چھوڑو بے بی تمہیں تو دلیل دینی بھی نہیں آتی۔'' بڑے صاحب کے قہقہے میں چھپی ہزیمت صاف بجھائی دے رہی تھی۔

''بڑے صاحب! نہ ہی میرے پاس کوئی دلیل اور نہ ہی وکیل ___ بس آپ کی مہربانی چاہیئے۔'' زفیرہ کے لہجے میں اگرچہ لجاجت در آئی تھی مگر تصنع پھر بھی نمایاں تر تھی۔

''مہربانی تو تم نے کرنی ہے بے بی ـــــ ہم نے تو محض آسانیاں پیدا کرنی ہیں۔''

''مہربانی کہاں بڑے صاحب! ہم تو آپ کے غلام ہیں ـــــ مسئلہ یہ ہے کہ وہ کتیا اب سُپر ماڈل ہے، نخرے بھی سُپر کرتی ہے اور معاوضہ بھی سُپر مانگتی ہے، تین راتوں کا ایک کروڑ ـــــ اگر منسٹر صاحب ایک آدھ رات کم کر لیں تو میری پچاس لاکھ کی بچت ہو سکتی ہے۔''

''فرض کرو اگر تمہارا کام نہیں ہوتا یعنی اُن تینوں بھڑووں میں سے کوئی بھی اپنی فرم چھوڑ کر تمہاری فرم جائن نہیں کرتا تو تمہیں کنٹریکٹ کینسل ہونے پر کتنا نقصان ہوگا؟ میرے خیال میں تو کم از کم دس کروڑ روپے کا! اب تمہاری مرضی پچاس لاکھ بچاؤ یا دس کروڑ فی کلائنٹ کماؤ۔''

''ہاہاہاہا ـــــ بڑے صاحب! ایک تو آپ خوامخواہ جھٹ پَٹ میں ناراض ہو جاتے ہو۔ میرا کہنا یہ تھا کہ راؤ صاحب ایک دو راتیں شنیعہ کو انجوائے کریں اور اُس کے بعد ایک نئی لڑکی بھجواتی ہوں جسے ابھی سُپر ہونے کا ڈنڈا نہیں گھسا ـــــ انجوائمنٹ بھی زیادہ اور نخرا بھی کم ـــــ اس کی ایک آدھ کمپین ہٹ ہو گئی تو دو چار مہینے بعد یہی سُپر ماڈل ہو گی۔''

''میری جان! کل کس نے دیکھی ہے ـــــ جو آج سُپر ہم اُسی کے اوپر ـــــ کل کی کل دیکھی جائے گی۔ تم شنیعہ ہی کو بھیجو اُس وقت تک جب تک راؤ صاحب کا دل بھر نہیں جاتا۔''

''ٹھیک ہے بڑے صاحب ـــــ جیسے آپ خوش ویسے میں خوش۔'' زفیرہ ساری تمکنت بھلا کر تھکے تھکے لہجے پر آ گئی تھی۔

''ارے! اس پر میں کہاں خوش ـــــ رنڈی جائے گی راؤ صاحب کے بستر پر تو مجھے خوشی کس بات کی! ارے بھڑوا ہوں کیا میں؟ ہاہا! راؤ صاحب بڑا اکڑ منسٹر ہے مگر بات صاف ہے، اُس کا مال پانی الگ اور ہمارا سب سے الگ۔'' بڑا صاحب خلافِ معمول چڑ گیا تھا۔

زفیرہ ایک دم گھبرا گئی کہ سارا کھیل بگڑنے جا رہا تھا۔ اُس نے پھر سے لہجہ خوشامدانہ کر لیا۔

''میں نے کب کہا کہ آپ کی خدمت الگ سے نہیں ہو گی ـــــ ایسی لڑکی بھیجوں گی کہ ہر چیز ڈاؤن کر دے گی ـــــ شوگر بھی اور بلڈ پریشر بھی۔''

''بے بی! بہت ہو گیا مذاق ـــــ مجھے کوئی اور نہیں چاہیے ـــــ سن لیا ناں! مجھے لبراڈار بننا ہے تمہارے ساتھ ـــــ تمہارا کتا ـــــ شونی۔'' بڑا صاحب پہلی بار پوری طرح اُکھڑ چکا تھا۔ اُس کے لہجے کے اکھڑ پن کے پیچھے چھپی ہوئی سفاکی کو وہ اچھی طرح سے سمجھ رہی تھی اسی لیے مجبور تھی کہ کوئی بات ایسی نہ کرے کہ جس سے وہ پوائنٹ آف نو ریٹرن پر پہنچ جائے۔

''بڑے صاحب! آپ کے لیے کتے کا جھوٹا کیوں؟ میں دس لڑکیاں بھجوا دیتی ہوں، ایک سے بڑھ کر ایک۔'' زفیرہ نے تمام دکھائی دینے والی ادائیں اپنی آواز میں سمو دیں۔

''بات سُنو زفیرہ! میرے پاس اس وقت بھی بیس لڑکیاں بیٹھی ہیں ـــــ ایک سے بڑھ کر ایک ـــــ میرے ایک اشارے کی منتظر ـــــ مگر مجھے تو چاہیے اس بستر پر، ٹھنڈے دماغ اور گرم بدن کے ساتھ رات دس بجے تک ورنہ لپیٹ لے اپنی اس مہ نور ایڈورٹائزر کو اور پیدا کرنے بیٹھ جا اپنے لیبراڈار کے کتورے۔'' بڑے صاحب کا فون بند ہو چکا تھا۔

زفیرہ احمد نے جھنجلا کر فون ایک طرف پھینکا اور ہیجان کی سی کیفیت میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ''کیسے کیسے حرامزادوں سے پالا پڑا ہے۔'' وہ رونا چاہ رہی تھی مگر رونا آ نہیں رہا تھا۔ اُس نے سامنے والی کھڑکی کے پردے ہٹا دیے۔ باہر ایک بار پھر بارش شروع ہو چکی تھی جن کے ساتھ ننھے ننھے ژالے مختلف کچی پکی جگہوں پر گولی کی سی رفتار سے گر کر مختلف نوعیت کی آوازیں پیدا کر رہے تھے کہ جیسے کوئی ماہر موسیقار فائنل ٹیک سے پہلے آرکسٹرا ترتیب دے رہا ہو۔ زفیرہ کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُسے نیم منجمد برسات میں کھڑا کر کے چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے سنگسار کیا جا رہا ہو۔ اُسے اپنے سُن ہو چکے جزوی ملبوس جسم پر پیوست ہوتی کنکریوں کا احساس عجیب سی سرشاری میں لے گیا۔ کیا لذت تھی کہ اُس کے رُواں رُواں بھر چکی اذیت کو نکال باہر پھینکے جا رہی تھی۔ چند لمحوں میں پیدا ہونے والا یہ احساس اُسے بے خودی کی کئی منازل طے کرا چکا تھا۔ پاؤں سے سر کی جانب اُٹھتی ہوئی لطف کی لہریں اُسے اپنے آپ سے بیگانہ کیے چلی جا رہی تھیں۔ لہروں میں طغیانی بڑھی تو زفیرہ کے لیے سانس کی رفتار کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اور کچھ دیر بعد ہی وہ نڈھال ہو کر واپس صوفے پر آن گری۔ سکون کی دھیمی دھیمی لہریں اب اُس کے بدن میں سر سے پاؤں کی طرف ہلکورے لینے لگی تھیں۔ غصہ، خجالت اور

بے بسی کا احساس کہیں دبے پاؤں کھسک گیا تھا اور اُن کی جگہ تسکین اور طمانیت نے لے لی تھی۔ اب تک کا منظر نامہ نئے رنگوں سے ترتیب پا کر اُس کے سامنے پھر سے ہولے ہولے کسی سکرین کی طرح سرکتا ہوا گزر رہا تھا۔ زفیرہ کو بڑے صاحب کا رویہ اب عین فطری سا لگ رہا تھا۔ اُس کی جگہ وہ خود بھی ہوتی تو انہی مطالبات پر مکالمے کی بنیاد رکھتی۔ کرنسی کے ذریعے خرید وفروخت کی بجائے سودا بارٹر ڈیل یعنی ''مال کے بدلے مال'' کی اساس پر طے پانے جا رہا تھا تو اُس میں ہار جیت یا شرمندگی کیسی۔ نہ کوئی بِک رہا تھا اور نہ ہی کوئی خرید رہا تھا بس ضرورتیں اَدل بَدل ہونے جا رہی تھیں۔

زفیرہ کے لیے ثنیعہ جیسا مہنگا سودا کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اگر کہیں کوئی سوئی اَٹکی ہوئی تھی تو وہ اُس کے بڑے صاحب جیسے بھڑوے کے نیچے لیٹنے پر کہ جو گذشتہ دس برسوں سے اِسی آس میں کئی کئی جتن کر چکا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی ایسا ہو پائے۔ ایک غیر محسوس سی کراہت جُڑی ہوئی تھی بڑے صاحب کے نام کے ساتھ۔ قطعی نا قابل برداشت۔ اُس کی تمام تر سماجی کمینگیوں اور زندگی کے ہر شعبے تک پھیلے ہوئے نفوذ واثرات کے باوجود زفیرہ بڑے صاحب کے بستر سے اِس طرح دور رہی کہ اُس سے جڑا ہوا کاروباری رشتہ بھی قائم رہا اور وہ ہر بار اُس کے جال سے پھسل کر خود کو محفوظ پانیوں میں چھپا پاتی رہی۔ لیکن اب اِس قسم کے تمام امکانات اُسے چھپانے کی بجائے اپنا منہ چھپائے پھرتے دکھائی دینے لگے تھے۔

زفیرہ نے ایک بار پُرسکون انداز میں تمام حواس کو مجتمع کر کے اِس معاملے کو جذبات کی بجائے عقلی کسوٹی پر پرکھنا چاہا۔ عجیب بات تھی کہ خود کو پُرسکون رکھنے کے کے لیے اُسے نہ تو شراب کی طلب ہو رہی تھی اور نہ ہی سگریٹ کی۔ اُس کے جسم کے ساتھ ساتھ اُس کا ذہن بھی کیمیائی توازن کی اُس سطح پر آ چکا تھا کہ جہاں کچھ دیر کے لیے جسمانی عناصر اپنی فطری تقویم میں ترتیب پا جاتے ہیں۔ اُس کے سامنے ایک جانب برسوں کی محنت سے کھڑی کی ہوئی بزنس ایمپائر تھی کہ جس نے ملک کے ستر فیصد ایڈورٹائزنگ بزنس کو اپنی گرفت میں لے کر باقی کے تیس فیصد کو گردن سے دبوچ رکھا تھا اور دوسری جانب اُس کا جسم اور جسم سے جڑی ہوئی

انانیت اور تقدیس۔ انتخاب دونوں میں سے صرف ایک کا ہی کیا جا سکتا تھا۔ زفیرہ جسمانی تقدیس کے ڈانڈے اپنی انانیت میں دیکھ رہی تھی۔ اُس نے مزید ارتکاز کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور جسمانی تقدیس کی حدود کے بارے میں سوچنا چاہا تو اُسے دوسرے لمحے ہی سب کچھ بے معنی دکھائی دینے لگا۔ اُس نے اُن ساعتوں میں جھانکنے کی کوشش کی کہ جب پہلی بار شونی نے اُس کے پاؤں چاٹے تھے۔ کس قدر کراہت آمیز تھا اُس لبراڈار کتے کی زبان کا لعاب کہ جو اُس کے پاؤں سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ کتنے دن اور کتنی بار وہ اپنے پاؤں دھوتی رہی تھی مگر کتے کی زبان کے لعاب کا احساس زفیرہ کے دونوں پاؤں سے جاتا ہی نہیں تھا۔ لیکن جب اِسی دوران ایک دن اُس کے پاؤں پر لیبراڈار کی زبان کے لعاب کی بجائے اُس کی کھردری رگڑ کا احساس بیدار ہوا تو کراہت بے چینی میں بدلتی چلی گئی تھی اور پھر کچھ دنوں کے بعد صرف بے چینی تھی، تڑپ تھی شدت کی ___ جس نے لیبراڈار کو کتے سے اُس کا شونی بنا دیا۔

زفیرہ نہایت صراحت سے جان چکی تھی کہ راؤ صاحب کی ثنیعہ کے بارے فرمائش تو محض ایک جھانسا تھی جب کہ اصل کھیل تو بڑا صاحب اُس کے حصول کا کھیل رہا تھا۔ اِس گیم کی آڑ میں اگر وہ راؤ صاحب کو خوش کر کے کوئی اور کام نکلوانا چاہتا ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے کہ جس عذاب میں وہ پھنس چکی تھی اُس سے نکلنے کے لیے مزید ہاتھ پاؤں مارنا خود کو دلدل میں دھکیلنے کے مترادف تھا۔ اور اِس کا ہلکا سا ٹریلر اُس نے پولیس رپورٹ کی صورت دیکھ لیا تھا۔

زفیرہ کو یوں محسوس ہوا کہ ایک بوڑھا لیبراڈار رال ٹپکاتی بڑی سی زبان نکالے اُس کے گرد بے آواز انداز میں چکر لگا رہا ہے۔ کراہت کی ایک لہر اُس کے پاؤں سے اُٹھی اور دماغ تک پہنچنے کے بعد بگولے کی طرح کاسہ سر میں چکرانے لگی۔ اُس کے جسم میں ٹھہرا ہوا کیمیائی توازن درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ مختلف عناصر ایک بار پھر اپنی فطری ترتیب کھونے لگے تھے۔ بوڑھے کتے کے منہ سے ٹپکنے والی رال زفیرہ کے گرد گرتے ہوئے فرش پر گول دائرہ بنائے چلی جا رہی تھی۔ شدید کراہت کا ایک دائرہ اور ہر دائرے کے اوپر کئی دائرے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے دائروں کی صورت چوبی فرش پر ٹپکی ہوئی رال پر کھردری سی تہہ بننے لگی؛ پہلے

کسی ریگ مال کی مانند، پھر چند لمحوں بعد ہی میں کتے کی زبان پر بنے ہوئے ناہموار چھلکوں کی صورت اور کچھ دیر بعد درانتی کی دندانے دار دھار کی مانند۔

اس کے ساتھ ہی زفیرہ کے پاؤں اور پنڈلیوں میں سلگنے والی بے چینی ایک ارتعاش کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔ ایسے میں اُسے اپنی ایک ہاسٹل فیلو یاد آئی کہ جو یونیورسٹی کے دور میں اپنی فیمنسٹ شناخت اور ایکٹوزازم کے لیے بہت معروف تھی۔ اُس کے نزدیک طلب کی شدت کے لمحات میں کسی بھی مرد سے جسمانی اختلاط، کتے سے ملاپ سے بڑھ کر نہیں ہوتا کہ جسے آپ پچکار کر بُلاتے ہیں، حظ اُٹھاتے ہیں اور پھر پچھواڑے پر لات مار کر بھگانے کے بعد کسی اچھے سے سینیٹائزر سے خود کو صاف کر لیتے ہیں۔

زفیرہ نے سکون کا ایک لمبا سانس لیا اور ثنیعہ کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد اُسے اپنی تمام مصروفیات منسوخ کرتے ہوئے ٹھیک رات نو بجے بھرپور طور پر تیار رہنے کو کہا۔

''مگر میم آج تو میرا انتہائی اہم شوٹ ہے ملٹی نیشنل ایڈ کا ___ باہر سے پروڈکشن ٹیم آئی ہوئی ہے۔'' ثنیعہ میڈم کے اس طرح کے فون سے پریشان ہو گئی تھی۔

''جو بھی ہے ___ وہ تم نے سنبھالنا ہے ___ اُنہیں تین دن بعد کا شیڈول دے دو ___ اور ہاں تمہیں کمپینسیٹ کیا جائے گا، تمہاری سوچ سے بھی بڑھ کر۔'' یہ کہتے ہی اُس نے فون کاٹ کر اپنے سیکریٹری سے رابطہ کر لیا۔ ''اوناسس سیلون سے ارجنٹ اپائنٹمنٹ لے لو میرے لیے ایک گھنٹے بعد کی ___ اور اُنہیں بتا دو کہ نو ایکسکیوز ___ مسز شامی کو فون کرنا ہے، اُوناسس کی اونر کو اور پھر مجھے کنفرم کرو۔''

آخر میں اُس نے ایک فون محض ری ڈائل کیا۔

''ہاں تو بڑے صاحب! کون سا آدمی توڑ کے دے رہے ہیں آپ مجھے اُن تینوں میں سے اور پہنچے گا کب میرے پاس؟'' ___ بڑے صاحب کے بولنے سے پہلے ہی زفیرہ بول پڑی تھی۔

''ایسی بھی کیا جلدی! پہلے آپ تو پہنچ لو میرے پاس۔''

''ثنیعہ ہو گی ناں دس بجے تک آپ کے پاس۔'' زفیرہ کی آواز میں اب کے صرف نخرہ

اور نخرہ باقی رہ گیا تھا۔

''ثنیعہ تو پرایا دھن ہے اُس سے ہمارا کیا لینا دینا؟''

''بہت چاہتے آپ مجھے کہ اتنا سب کچھ داؤ پر لگانے پر تُل گئے ہیں؟'' سوال اگرچہ معنی خیز تھا مگر بڑے صاحب کو کچھ کچھ ڈھارس سی ہونے لگی تھی۔

''کتنا چاہتا ہوں! اِس کا اندازہ آپ کو میرے ہاں آئے بغیر کیسے ہو سکتا ہے؟''

''لیکن خالی چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ چاہنے کی سکت اور صلاحیت بھی تو ہونی چاہئے۔'' زفیرہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے چڑانے پر آ گئی تھی یا شاید لاشعوری طور پر نفرت اور کراہت کے اُس لاک کو وہاں جانے سے پہلے کھولنا چاہ رہی تھی کہ جو اُن دونوں کے تعلق کے درمیان رویوں نے لگا رکھا تھا۔ بڑا صاحب پھر سے سٹپٹا گیا تھا۔ زفیرہ اب بھی اُسے بار بار پینترے بدلتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اِس مرحلے تک آ کر کچھ ایسا نہیں کرنا اور کہنا چاہتا تھا کہ جو زفیرہ جیسی ضدی اور خودسر عورت کو پھر سے ریورس ٹریک پر چڑھا دے۔

''آپ آیئے تو سہی، موقع تو دیجے اور پھر دیکھئے کہ ہم ڈیلنگ میں کس حد تک فیئر ہیں۔'' بڑے صاحب کے انداز میں اب لجاجت آمیز ترلا تھا، انکساری میں لپٹی ہوئی منت تھی۔

''چلیں آتے ہیں، دیکھتے ہیں، آزماتے ہیں ___ وگرنہ عرصہ گزرا، ہم تو یہ سب کچھ کہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے، بھلا بیٹھے تھے۔'' زفیرہ نخرے کی حدود سے گزر کر دلبری کے منصب پر براجمان ہونے لگی تھی۔

۞

﴿11﴾

ماہین نے نوید کو تین دن انتظار کرنے کا تو کہہ دیا مگر اُس کی بدنی ضرورت نے انتظار کی پہلی رات کو ہی اُس کے لیے عذاب بنا دیا۔ اُس کو اگر ضرورت تھی تو محض ٹیلی فون پر جنسی تسکین کی۔ یوں کسی کے ساتھ جسمانی مباشرت کا اُس کے ہاں تصور تک نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی ایسے شخص کو ملنے کے لیے ہوٹل یا اُس کی رہائش گاہ پر جا سکتی تھی کہ جس سے محض فیس بک پر شناسائی ہوئی ہو۔ ویسے بھی گھر سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے گھر آنے جانے کا ایک ایک لمحہ گھر والوں کے شمار میں رہتا تھا۔ محض دو چار منٹ کی تاخیر بھی پرسش کا باعث ہوا کرتی۔ ایسے میں اُس نے کئی بار سوچا کہ باقی لڑکیوں کی طرح وہ بھی کچھ لڑکیوں سے دوستی کر لے، ایک دوسرے کے گھر میں آئے جائے تا کہ اِس دوران اگر کسی بوائے فرائینڈ کے ساتھ ڈنڈی مارنی بھی ہو تو یوں حواس باختہ نہ پھرنا پڑے۔ مگر اُس میں ابھی تک کسی لڑکے سے تو کیا کسی لڑکی تک سے بالمشافہ دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی ہمت نہیں تھی۔

وہ نوید کی آواز اور جذبات کے اظہار کے سحر میں اس طرح جکڑی جا چکی تھی کہ اُس کی بلیک میلنگ کے باوجود جونہی اُس کی جانب سے تین دن کی مہلت عطا ہوئی، اُس کا جسم پھر سے اُسی کی آواز پر اپنے لہو کی گردش کو تسکین کی ردھم تک رسائی دینے کے واسطے تڑپنے لگا اور وہ بھول گئی کہ اُس نے جمال احسن کو رات دو بجے فون کرنے کا کہا تھا۔ جمال احسن نے دیے گئے وقت کے مطابق فون کیا تو کئی ساعتوں تک ماہین سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ کیوں اُسے فون کر رہا ہے مگر اِس سے پہلے کہ وہ دوبارہ چڑ کر فون بند کر دیتا اُسے یاد آ گیا کہ کس منصوبے کے تحت

اُس نے جمال احسن کو فون کیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ جمال احسن ایک شریف اور ذمہ دار شخص ہے لہٰذا اُسے نوید کی بلیک میلنگ کے بارے میں اعتماد لے کر کسی نہ کسی طور اِس عذاب سے چھٹکارا پائے، چاہے اُس کا قتل کیوں نہ کرانا پڑے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اگر جمال نے ساری بات سننے کے بعد انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا۔ کیا وہ ایک ایسے شخص کو اپنا ہم راز بنانے کی حماقت افورڈ کر پائے گی جو اُس کے خطرناک ارادوں کا ساتھ نہ دے رہا ہو؟

ماہین اپنے ارادے کے اخفا سے ڈر گئی۔ جمال احسن اب تک صرف اُس کی جسمانی خودلذتی کا ساتھی رہا تھا۔ اُس کا اتنے بڑے قدم میں ہم قدم رہنے کا امکان کم ہی تھا۔ ''تو پھر کیوں خود کو رسوا ہونے سے پہلے ہی ذلیل کرا لیا جائے۔ اب جو بھی کرنا ہوگا اپنے پیروں پر کرنا ہوگا۔'' ماہین کے بدن میں جاگتی ہوئی سرپھری لہریں تحفظ کے نکتے پر مرتکز ہوئیں تو اُسے ایک یقینی فیصلے تک لے آئیں۔ اب اُس کے لیے جمال سے گفتگو کرنا آسان ہو گیا تھا۔ اُس نے بس اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں کیں، کچھ اُسے مِس کرنے کا احوال کیا اور پھر سے تعلق جوڑے رہنے کا وعدہ لے کر فون بند کر دیا۔ کل شام سے طبیعت میں آیا ہوا ٹھہراؤ، رات گئے کے فیصلے کے بعد سکون میں منقلب ہو چکا تھا۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا کہ جب نہ صرف جمال احسن کی آواز سے جاگی ہوئی جسمانی سرشاریاں بھی ماند پڑنے لگی تھیں بلکہ نوید کی تمام تر کمینگی کے باوجود اُس کے بحیثیت مرد تصور سے ماہین کے سر سے پاؤں تک اُٹھنے والی بغاوتیں بھی فرد ہونے لگی تھیں۔ پوری پوری رات کسمساتے ہوئے آنکھوں میں بتا دینے والی ماہین کی پلکیں بوجھل ہونا شروع ہوئیں تو اُس نے کتنی ہی راتوں کے بعد پہلی بار موبائل فون کا رنگر آف کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اُس کے چہرے پر پھیلا ہوا سکون آنے والے دنوں میں اُس کے کئے گئے فیصلوں کی خبر دے رہا تھا۔

دوسری صبح اُس نے اُٹھتے ہی دن کا آغاز نوید کو فون سے کیا۔ خلاف توقع اُس نے پہلی ہی رنگ پر فون اٹینڈ کر لیا۔ ماہین اُس کی سحر خیزی کو اُس کا معمول سمجھی مگر اُس کی آواز کا تھکن آمیز بھاری پن اِس تاثر کو زائل کیے جا رہا تھا۔ یوں لگا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ مگر صبح سویرے ماہین کی آواز نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تصور تک نہیں کر پا رہا تھا کہ اتنی منت

زاری کے بعد تین دن کی مہلت لینے والی لڑکی یوں ہشاش باش انداز میں اُسے اگلے ہی دن طلوعِ آفتاب کے لگ بھگ فون کر گزرے گی۔ نوید کو ان حالات میں ماہین سے اچھے کی امید ہرگز نہیں تھی۔ امید و بیم کے درمیان معلق نوید جان چکا تھا کہ ماہین ایک بار پھر اُسے ملنے سے انکاری ہونے والی ہے۔ لہٰذا اگلے چند سیکنڈوں میں اُس نے فیصلہ کر لیا کہ ماہین کے انکار کے بعد اُس نے کیا حکمتِ عملی اختیار کرنی ہے۔ یہ وہ صورتحال تھی کہ جب اُس کے جسم کی تمام تر کسلمندی اور یبوسیت کچھ کر گزرنے کی توانائی میں بدل چکی تھی اور اُس کا رُواں رُواں سمعی حسیات میں ڈھل کر ماہین کی جانب سے انکار سننے کا منتظر ہو چلا تھا۔

لیکن دوسری جانب سے جو کچھ ماہین بول رہی تھی وہ اُس کی سماعت تک پہنچ پانے کے باوجود اُسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اُس کے پاس آج ہی آنے کی نوید دے رہی تھی لیکن نوید کو اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ بار بار ذہن میں ایک ہی سوال کہ یہ کہیں کچھ رابطے کا خلل تو نہیں وگرنہ ماہین نے تو تین دن بعد اِس معاملے پر بات کرنے کی مہلت مانگی تھی۔ ماہین جلدی سے اُسے اپنے آنے کا پروگرام بتا چکی تو اُس کی جانب سے کوئی ردِعمل نہ پا کر گڑبڑا کر رہ گئی۔ اُس کی توقع کے برعکس نوید بالکل خاموش تھا۔ نہ تو کسی خوشی کا اظہار اور نہ ہی کسی جنون کا بیان۔

''ماہین! کیا کہہ رہی ہو تم..... میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔''

''ارے بدھو! تم نے شاید سنا نہیں..... میں کہہ رہی ہوں کہ آج یونیورسٹی جانے کی بجائے میں سیدھی تمہارے پاس آ جاؤں گی نو بجے کے لگ بھگ اور دو بجے تک رہوں گی۔''

''واقعی!!!!_____؟؟؟؟''

''یقین نہیں آ رہا کیا؟؟؟'' ____ ماہین کی آواز میں شرارت تھی۔ ''اور ہاں سنو! کوئی ایسی ویسی شرارت نہیں چلے گی ضعیف آدمی!!!! میں شور مچا دوں گی _____ بس جلدی سے اپنے ہوٹل کا ایڈرس ٹیکسٹ کرو۔''

ماہین نے تو فون بند کر دیا مگر نوید خوش ہونے کی بجائے پریشان ہو گیا۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک ضد پر اڑی ہوئی لڑکی جس نے اُس کے پاس خلوت میں نہ آنے کی قسم اُٹھا رکھی ہو

یوں پہلے محض ہاں یا ناں میں جواب دینے کے لیے بھی تین دن کی مہلت پر بضد رہے مگر مہلت ملنے کے باوجود اگلے صبح ہی دوڑی چلی آئی۔ اُس کے دل میں کئی قسم کے وسوسے سر اُٹھانے لگے تھے۔ ماہین، جسے وہ فاختہ سمجھ بیٹھا تھا کسی لومڑی کی طرح وار کرنے کے درپے دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ اسے اپنا واہمہ سمجھ کر نظر انداز بھی کرنا چاہتا تھا مگر قرائن اُسے ایسا نہیں کرنے دے رہے تھے۔ نوید جانتا تھا کہ فون پر اُس کے ہمراہ خودلذتی کی عادت میں گرفتہ ماہین اُس سے پہلے بھی فیس بک پر کئی مردوں سے اِس قسم کا تعلق رکھ چکی تھی جن میں کئی آوارہ منش لونڈے بھی تھے۔ تو کیا ماہین نے اُسے سبق سکھانے کے واسطے اِن میں سے کسی لونڈے کو اعتماد میں لے کر کوئی خطرناک سازش تو نہیں کرنے جا رہی تھی جو اپنے وقت سے پہلے تیار ہو گئی؟

جب بہت سارے واہمے سوال بن کر اُس کے اعصاب پر سوار ہونے لگے تو نوید نے سر جھٹکا اور کسی سستے سے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کڑواہٹ پھیپھڑوں تک اُنڈیلی تو ماہین سے ملاقات ہونے یا نہ ہونے کے امکانات کے درمیان شب بھر معلق رہے شکستہ اعصاب پھر سے مربوط ہونے لگے۔ سگریٹ ختم ہونے تک وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جو بھی ہو گا، دیکھا جائے گا۔ جس قسم کی مالی مشکلات سے وہ گزر رہا تھا اُس میں اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ماہین جیسی تین چار لڑکیوں کی سکائپ پر بنی خودلذتی کی برہنہ ویڈیوز کو وہ کچھ عرصے تک کی مناسب آمدنی کا ذریعہ بنا سکے۔ ماہین کی جس طرح کی ویڈیوز وہ ریکارڈ کر چکا تھا اُن کی بنا پر اگر وہ اُسے نقد رقم نہ بھی دے سکی تو وہ اُسے جسم فروشی کے ذریعے اچھی بھلی رقم کما کر دے سکے گی۔ لیکن ایک موثر قسم کی بلیک میلنگ کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک بار اُس کے نیچے سے گزر جائے پھر چاہے فاختہ ہو یا لومڑی، اِن سب سے حساب برابر کرنا اُسے آتا تھا۔

اچانک نوید کی نگاہ موبائل فون کی اسکرین پر پڑی تو دیکھا کہ ٹیکسٹ میسج کے گیارہ نوٹیفیکیشن وہاں چمک رہے تھے۔ وہ حیران تھا کہ میسج وصولی کی ٹون اُسے کیوں سنائی نہیں دی۔ پھر خیال آیا کہ نئی کیسنگ میں اگر از کار رفتہ فون رکھا ہو تو آواز کا سنائی دینا یقینی نہیں ہوتا۔ اُس نے جلدی سے میسج کھولے تو وہ تمام کے تمام ماہین کی جانب سے تھے کہ جو اُس سے ہوٹل کا پتا مانگ رہی تھی۔ خلافِ امید ہونے والے واقعات کے آغاز نے ہی اُس پر بوکھلاہٹ طاری

کردی تھی۔نوید نے وقت دیکھا تو پونے نو ہونے والے تھے۔ایسے میں ماہین کی طرف سے ٹیکسٹ میسیجز کی بھرمار فطری تھی۔ لیکن نوید اُسے اِس اوسط سے بھی کم درجے کے ہوٹل میں نہیں ملنا چاہتا تھا۔دکھاوے کے واسطے اُس نے ایک فور اسٹار ہوٹل میں کمرہ بُک کرانے کا کرایہ بھی جوڑ رکھا تھا مگر اب ایسے میں کچھ بھی تو ممکن نہیں تھا سوائے اِس کے کہ ماہین کو اِسی ہوٹل میں بلالیا جائے۔

چند لمحات ہی میں ایک بڑے فیصلے سے گزرنے کے بعد نوید نے ماہین کو اِسی ہوٹل کا پتا واپسی ٹیکسٹ کردیا۔اب کچھ دیر اور بستر پر لیٹے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔اُس نے ہاتھ بڑھا کر لکڑی کی میز پر رکھا اپنا بیگ اُٹھایا اور اُس کی زپ کھولنے کے بعد ایک ایسا پیکٹ نکالا جس کے اندر نیلے رنگ کی چار گولیوں والا ایک بلسٹر قسم کا پتہ رکھا تھا۔نوید نے تیزی سے بلسٹر کو دبا کر ایک گولی نکالی اور بغیر پانی کے حلق سے نیچے اتار لی۔بستر سے اُٹھنے کے بعد اُس نے تپائی پر رکھی پانی کی بوتل سے دو گھونٹ پانی کے پیئے اور باتھ روم میں گھس گیا۔آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہی اُسے خود کو ہی گھن آنے لگی تھی۔بات بھی کچھ ایسی تھی کہ نہ تو وہ کئی دنوں سے نہایا تھا اور نہ ہی شیو کی تھی۔داڑھی اور مونچھوں میں سفید بالوں کی اکثریت نے اُسے اپنی عمر سے کئی برس بوڑھا کر رکھا تھا۔فوری طور پر کی گئی شیو اور نہانے کے عمل نے اُسے پھر سے اپنی اصل عمر میں لوٹا تو دیا مگر ایکدم ذہن میں اُبھرنے والی پریشانی نے اُسے پھر سے اپنی جکڑن میں لے لیا۔اب تک ماہین کو اُس نے اپنا تعارف ایک بہت بڑے بزنس مین اور انتہائی متمول شخص کے طور پر کرایا تھا مگر اب اِس حالت میں اور اِس ہوٹل میں ہوتے ہوئے وہ اُسے کیا جواب دے گا یا کیا بہانہ بنا پائے گا کہ اُس کی حیثیت کو کیا ہوا۔

کچھ دیر قبل اُس کے اندر پیدا ہونے والے حوصلے میں دراڑسی پڑنے لگی تھی۔اب سب کچھ ''جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا'' میں ملفوف ہونے والا نہیں تھا۔وہ تولیہ لپیٹ کر دوبارہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو سر میں آئے ہوئے سفید بال دھلنے کے باوجود میلے میلے سے لگ رہے تھے۔نوید نے اپنی آنکھوں میں جھانکا جہاں رات بھر کا جگراتا سرخ رنگ کی لکیروں کی صورت آنکھوں میں بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔اُس نے کئی بار سوچا کہ کمرے کو لاک کر کے کہیں

چھپ کر بیٹھ جائے یا کہیں اِدھر اُدھر ہو جائے اور پھر ماہین سے کسی ایمرجنسی کا بہانہ بنا کر ملاقات کا کوئی اور وقت طے کرے کہ جب نہ صرف وہ پورے حواس میں ہو بلکہ جنسی ملاپ میں اُسے لطف و انبساط کی اُن منازل تک لے جا سکے کہ جہاں سے خود ماہین کے واسطے لوٹ کر آنا مشکل ہو۔لیکن یہ سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا۔کمرے کے دروازے کو کوئی اُلٹی انگلی سے تیز تیز کھٹکھٹا رہا تھا۔

نوید ابھی تک پورے کپڑے بھی نہیں پہن پایا تھا۔اُس نے کرتا شلوار پہننے کی بجائے جلدی سے نیکر اور پولو شرٹ پہنی اور کمرے میں بکھرا ہوا سامان سمیٹتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔سامنے ایک قتالہ صورت لڑکی کھڑی تھی جو کسی صورت بھی ماہین نہیں لگ رہی تھی۔نوید اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔عربی اسٹائل کے لائٹ براؤن سکارف اور سر سے پاؤں تک اُسی رنگ کے عبایہ میں ملبوس گلابی رنگت کی تئیس چوبیس برس کی بھری بھری درمیانہ قد کی لڑکی کی صورت نے اُس کی گویائی تک سلب کر لی تھی۔اگرچہ لڑکی کے چہرے پر قدرے تناؤ تھا اور گھبراہٹ بھی لیکن جب اُس نے نوید کی یہ حالت دیکھی تو مسکرائے بنا رہ نہ سکی۔

''اندر نہیں بلاؤ گے مجھے نوید____ حیران کیوں ہو رہے ہو____ میں ہوں ماہین۔''

پریشان صورت نوید نے اُس کے لیے راستہ چھوڑ دیا اور وہ بے دھڑک اندر چلی آئی۔ ماہین کے چہرے پر ہلکا سا تناؤ پھر سے ابھرنے لگا تھا لیکن وہ اپنی مسلسل مسکراہٹ سے اُسے چھپائے چلی جا رہی تھی۔اُس نے کمرے میں چاروں طرف اپنی نگاہ گھمائی تو نوید جو پہلے ہی اچھی بھلی گھبراہٹ کا شکار تھا اور بھی گھبرا گیا کہ اُس کی حیثیت جان جانے کے بعد بھی کیا وہ اُس کے دبدبے کے زیر اثر رہ پائے گی یا نہیں۔لیکن عجیب بات تھی کہ کمرے کی حالت اور ہوٹل سمیت نوید کی حیثیت جان جانے کے بعد بھی ماہین کے چہرے پر کوئی ایسے آثار نہیں تھے کہ جن سے اُس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا۔ایک بہت ہی متمول ظاہر کیئے گئے شخص کی موجودہ حالت دیکھ کر بھی اُس کے چہرے پر حیرت نام کی کسی بھی چیز کا مفقود ہونا ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے وہ سب جانتی تھی کہ کون اصل میں کیا ہے۔غالباً یہی وہ احساس تھا کہ جس کے سبب نوید اُسے ایک ''عورت مار مرد'' کی بجائے محض ایک کیچوا دکھائی دینے لگا تھا۔جب کہ ماہین

کے تاثرات کے برعکس نوید کے لیے ماہین کا اتنا خوبصورت اور بظاہر کسی مالدار گھرانے سے ہونا باعث حیرت ضرور تھا۔

''مجھے بلیک میل کرنے والے اِدھر بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''____ ماہین کے چہرے کی مسکان قدم بہ قدم اعتماد کی جانب بڑھتے ہوئے نوید کو اور بھی مضطرب کیے جا رہی تھی۔ ماہین کا خیال تھا کہ اُس کے جاتے ہی نوید اپنی پوری وجاہت کے ساتھ اپنا سیاہ پھن پھیلائے اُس کی جانب جھپٹے گا اور اپنی مدھ بھری آواز سے اُسے مدہوش کرتے ہوئے کئی دنوں سے جمع کیا ہوا زہر اُس کی نس نس میں اُتار کر موت کے دروازے پر پٹخ دے گا مگر وہ تو کسی ادھ مرے کیچوے کی طرح اُس کے سامنے نڈھال ہو کر سنگل بیڈ کی سائیڈ پر بیٹھ گیا۔ ماہین نے اپنے پرس میں رکھی تیز دھار چھری پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اُسے اِس بلیک میلر پر ترس آنے لگا تھا کہ جس نے اپنی آواز میں پنہاں مردانگی سے اُس کی کئی راتیں تلذذ کی معراج آشنا کر دی تھیں۔ وہ جسے عورت کے بدن کے ایک ایک زاویے سے حظ کشید کرنے کا ہنر آتا تھا، وہ جو عورت کے بدن کے تمام رموز اپنی نگاہ میں رکھتا تھا، اب محض سر جھکائے بیٹھا، ماہین سے نگاہیں ملانے سے کترا رہا تھا۔ ''ایسے ہوتے ہیں بلیک میلر! تُف ہے بلیک میلرز پر۔'' ماہین کے وہ تمام ارادے جو یہاں آنے سے پہلے فیصلہ کن انداز میں ترتیب دیے گئے تھے، ہوا ہو چکے تھے۔

دروازے پر ہونے والی اچانک دستک نے دونوں کو گڑبڑا دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ایک ساتھ دیکھا جہاں ایک ہی سوال تھا کہ کون ہو سکتا ہے؟ ماہین نے جلدی سے حجاب کو اس طرح کھینچا کہ سوائے آنکھوں کے باقی سارا چہرہ چھپ گیا۔ نوید بیڈ سے تو اُٹھ کھڑا ہوا مگر بے چارگی سے کبھی دروازے کی طرف اور کبھی ماہین کی جانب دیکھے چلا جا رہا تھا۔ دستک تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نوید نے ایک بار پھر اُس کی جانب بے بسی سے دیکھا اور بے چارگی کے سے انداز میں دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے باہر ہوٹل کا سانڈ نما ویٹر کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس آیا۔

''یہ کیا بدمعاشی ہے باؤ جی____ کہاں سے گھیر لائے ہو اپنے سے آدھی عمر کی گشتی کو؟

ویٹر بات تو نوید سے کر رہا تھا مگر مسلسل خصیہ خراشی کرتے ہوئے اُس کی رال ٹپکاتی نگاہیں ماہین پر تھیں۔ نوید سے تو کچھ بن نہ پڑا مگر ماہین میں نجانے کہاں سے اتنی جرات آئی کہ انتہائی کھولتی ہوئی آواز میں اُسے بکواس بند کرنے کا کہہ دیا۔ یہ سنتے ہی ویٹر گھوما اور اتنے زور سے ماہین کے منہ پر چانٹا رسید کیا کہ وہ دیوار کے ساتھ جا لگی اور حجاب اس طرح کھلا کہ اسے مکمل بے حجاب کر گیا۔

''تو کر بکواس بند گشتی__ ابھی بلاتا ہوں پولیس کو اور چڑھاتا ہوں سارا تھانہ تجھ پر __اور سن میرا نام بھی طیفا کھوتا ہے__ حرامزادی تو نے مجھے بکواس نہ کرنے کا کہا ہے تو سوچ لینا کہ مجھے کھوتا کیوں کہتے ہیں، سارا تھانہ ایک طرف اور طیفے کی باری ایک طرف____ طیفے کی باری سب پے بھاری۔''

ماہین کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے مگر وہ روئی نہیں کہ اب اُس کی ایک چھوٹی سی حرکت جہاں اُس کا مستقبل تباہ کر سکتی تھی وہاں اُس کے خاندان کی عزت کو بھی برباد ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگنی تھی۔ طیفے کے ایک تھپڑ نے اُس پر جہاں اپنے بیڈ روم کی دنیا کو برہنہ کیا وہاں اُس کے محض ایک لفظ ''گشتی'' نے معاشرے میں عورت کی حرمت اور تقدیس کے پارچے اڑا کر رکھ دیے تھے۔ نوید نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''بہن چود سالے! اگر کسی گشتی کو کمرے میں لانا ہو تو ہوٹل کو ایک ہزار فالتو دینا ہوتا ہے اور تم یونہی مفتا لگانے کے لیے کہیں سے صاف ستھرا مال اُڑا لائے۔ مجھے تو کسی سکول کالج کی شوقین لگتی ہے۔ اِس کے تو پندرہ سو لگیں گے اور وہ بھی ایک گھنٹے کے____ ورنہ مجھے باری لگانے دو اور دو ہزار لے لو چڑیا کے۔'' طیفے کی نگاہیں ماہین کے بدن میں کھبی جا رہی تھیں۔

نوید نے جلدی سے پندرہ سو روپے طیفے کو دیے اور وہ ماہین کے بدن میں نگاہوں سے سوراخ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ نوید نے دروازہ بند کیا اور پھر سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُسے ماہین سے نگاہیں ملانا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کی بجائے کہ ماہین کو نوید پر غصہ آتا وہ اُس کے بیٹھنے کے انداز پر پگھلتی چلی گئی۔ وہ شاید اُس کا بگڑ چکے معاملے کو نمٹانے کا انداز تھا یا اُس کی نگہبانی مردانگی کی بجائے رقم کی ادائیگی سے کرنے کا ڈھنگ کہ اُس کے بدن میں اُسی انداز میں مستی کی لہریں سی

جا گنیں لگیں کہ جیسے فون پر اُس کی آواز سن کر بیدار ہوا کرتی تھیں۔ طیفے کا بولا گیا ایک ہی لفظ ''گشتی'' اُسے تنفر کی بجائے تلذذ کی دنیا میں گھسیٹے جا رہا تھا۔ اِسی کیفیت میں وہ کنفیوژ سی ہونے لگی کہ یہ لہریں حسب سابق اُس کے بدن کی گہرائیوں سے اُٹھ رہی ہیں یا بائیں گال سے کہ جہاں طیفے کھوتے کا تھپڑ پڑا تھا۔ مگر کہیں کوئی مردانگی کی ضرب ضرور تھی کہ جس نے نوید کو اُس کے انجام تک پہنچانے کا مشن کہیں راستے میں چھوڑ دیا۔ مگر اب وہ اِس ہیجوے کو اپنے وصال کی تپش سے بھسم کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ اُسے نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرنے پر تُل چکی تو خود ہی اُٹھ کر دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔

دو مرد، دو چہرے، دو جسم اور دو رویے آپس میں خلط ملط ہو رہے تھے۔ کہیں طیفا حاوی اور کہیں نوید۔ ماہین نے آنکھیں بند کر لیں، طیفے کا تھپڑ اُس کے جسم میں وہاں وہاں آگ سلگا چکا تھا کہ جہاں جہاں ابھی نہ تو جمال احسن کی آواز پہنچ پائی تھی اور نہ ہی نوید کے اطوار۔ اُس ایک تھپڑ اور زبان سے اُگلی گئی مغلظات نے ماہین کی نسوانی تہذیب، تقدیس اور علمیت کو ایک ایسی روٹی کی طرح تنور میں لگا کر مسام مسام پکنے اور کڑ کنے کے لیے چھوڑ دیا تھا جو وقت پر اتار لی جائے تو لذتوں کو پچھاڑ کر رکھ دے۔ ماہین کو نہیں معلوم کہ وہ جس کی گود میں گری وہ نوید تھا کہ طیفا کھوتا۔ ایسی کیفیت میں نہ تو نام کوئی اہمیت رکھتے ہیں اور نہ ہی صورتیں اور اطوار، بس یہ پہچان باقی رہ جاتی ہے کہ عورت کون ہے اور مرد کون۔

مگر یہ تخصیص نوید پر آ کر دھری کی دھری رہ گئی۔ ماہین نے اپنا آپ کسے سونپا، وہ بھی نہیں جان پا رہی تھی لیکن مخالف سمت میں موجود جسم میں سوائے کپکپی کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ نوید نے نیم برہنہ ہو چکی ماہین کو ایک طرف دھکیلا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ لڑکی ماہین ہے یا کوئی اور بس ایک دھڑ کا سا تھا کہ ابھی کچھ ہو گا، ابھی کچھ ہو گا۔ اُس کے ذہن میں ایک بھونچال سا تمام سوچوں کو تلپھٹ کیے جا رہا تھا کہ یہ لڑکی جو اُسے کل رات تک ملنے سے بھی انکاری تھی، کیسے ایک دم لمحہ بھر میں یوں اُس کے روبرو نیم برہنہ ہو کر دادِ نفس کی طلبیدہ ہو گئی۔ یقیناً اُس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اُسے اپنے اندر پھیل چکی ٹُبر سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ سردی تھی کہ جسم و جاں میں گھر کیے جا رہی تھی۔ ایک نوخیز لڑکی پر شہوانی غلبہ پانے

کی خواہش میں کھائی گئی ٹیبلٹ شاید اپنا اثر کھو چکی تھی۔ ماہین نے اُس کے ''اٹیک'' سے قبل خود ''ایڈوانس'' کر کے اُس کے حواس کو پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔ اِس وار گیم میں پھر سے واپس آنے کے لیے نوید نے تیزی سے اپنا بیگ کھولا اور نیلے رنگ کی گولیوں کے پیکٹ سے ایک اور گولی نکال کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چپکے سے نگل لی۔ لیکن اِس کے باوجود اُسے کسی پل چین نہیں پڑ رہا تھا۔ پسینے سے شرابور پیشانی پونچھتے ہوئے وہ کبھی بیڈ پر بیٹھ جاتا اور کبھی کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتا۔

ماہین حیران تھی کہ یہی وہ شخص ہے کہ جو سکائپ پر اُس کے جسم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سارا سارا دن قصیدے پڑھتا رہتا تھا اور اب اُسی جسم کو چھونا تو کیا دیکھنے تک کا روادار نہیں۔ وہ جو ملاقات پر اُسے لذتوں کے نئے جہانوں تک رسائی کی نوید دیا کرتا تھا، اب پہلی والی کائنات تک کے سفر سے آنکھیں چرائے جا رہا ہے۔ کون ہے یہ شخص؟ یہ نوید تو نہیں ہو سکتا!!!___ ماہین اب ایک اور فیصلے تک پہنچ چکی تھی۔ فوری طور پر ہوٹل کے کمرے سے نکل جانے کا فیصلہ۔ لیکن اِس سے قبل کہ وہ اپنے نیم برہنہ جسم کو دوبارہ ملبوس کر پاتی، کمرے میں ٹہلتا ہوا نوید اچانک اپنا دل تھام کر بیڈ پر بیٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہیں گر گیا۔ اُس کی ادھ کھلی پتھرائی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مر چکا ہے۔

ماہین نے خوف کے مارے چیخنا چاہا مگر آواز اُس کے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ اُس نے اپنی زندگی میں کسی انسان کو یوں پل بھر میں مرتے پہلی بار دیکھا تھا۔ جب وہ اِس کمرے میں داخل ہوئی تھی تو ایک جیتا جاگتا انسان اُس کے لیے خوف کی علامت تھا مگر اب وہی انسان لاش میں بدل کر خوف ناک ترین ہو چکا تھا۔ اِس سے پہلے کہ کمرے میں کوئی آئے اور پولیس کو خبر کرے وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اِس ارادے کے تحت وہ جتنی تیزی سے خود کو ملبوس کرنے کی کوشش کرتی گھبراہٹ میں کسی دوسری جگہ سے اُس سے زیادہ غیر ملبوس ہو جاتی۔

ٹک ٹک ٹک ___ دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی منحوس آواز نے جہاں کمرے کے ماحول میں ارتعاش پیدا کر دیا وہیں پہلے سے انتہائی خوفزدہ ماہین کے ہاتھ پاؤں پھلا

دیے۔ ٹک ٹکا ٹک ٹک ٹکا ٹک ایک بار پھر ہوئی تو ماہین کا بدن کانپنے لگا۔ موبائل فون کی اسکرین پر چمکتا ہوا وقت بتا رہا تھا کہ وہ ایک گھنٹہ آگے جا چکا ہے۔ ''یقیناً یہ وہی حرامی ہوگا! طیفا کھوتا۔'' ماہین کے ذہن میں اُس کا خیال آتے ہی خوف کی ایک لہر اُس کی ایڑیوں سے اُٹھی اور ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی ہورے بدن میں پھیل گئی۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کہاں جائے۔ وہاں آنے کے بعد پہلی بار اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ''کیوں آئی تھی وہ ہوٹل میں ـــــ اپنی زندگی بھی برباد کی اور اپنے والدین کی بھی۔''

اتنے میں باہر سے ہینڈل گھومنے کی آواز آئی اور اندر سے لاک کیا ہوا دروازہ اپنے آپ ہی کھلتا چلا گیا۔ وہ طیفا ہی تھا، طیفا کھوتا جس کے ہاتھ میں ڈپلیکیٹ چابیوں کا گچھا اور چہرے پر مکمل کمینگی چھائی ہوئی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کمرے کے ماحول نے اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی کمینگی کو اِس طرح حیرت میں بدلا کہ آنکھیں بھی خود بخود پھیلتی چلی گئیں۔ اب کے وہ گرجا ضرور مگر اپنی آواز کو دباتے ہوئے تاکہ وہ باہر نہ جا سکے۔

''مار دیا گشتی تو نے اُسے ـــــ پھانسی چڑھے گی اب تو۔''

''میں نے نہیں مارا اُسے، خود بخود ہی مر گیا۔'' ماہین اپنی گھٹی ہوئی آواز میں بدستور کپکپی میں مبتلا تھی۔ طیفے نے آگے بڑھ کر نوید کی ناک کے دونوں نتھنوں کو دبا کر دیکھا، کلائی کو چھوا اور پھر اُسے کہنی تک اُٹھا کر چھوڑ دیا جو دھب سے واپس بستر پر گر گئی۔

''مان لیتا ہوں کہ تو نے اِسے نہیں مارا مگر سچ یہ ہے کہ تیری جوانی نے اسے مار دیا ہے۔''

''مگر اُس نے تو مجھے چھوا تک نہیں!!! ـــــ'' آنسو تھے کہ ماہین کی آنکھوں سے رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے جب کہ طیفے کی نگاہیں بار بار اُس کے جسم کے برہنہ اعضاء پر ٹکنے کی بجائے پھسلتی پھر رہی تھیں۔

''یہ تو مر گیا مگر مجھے تمہارے پھانسی لگنے کا افسوس رہے گا۔'' طیفے نے آگے بڑھ کر نوید کی لاش کو بغلوں کے اندر بازو ڈال کر اُٹھایا اور اِس طرح کرسی پر بٹھا دیا کہ جیسے وہیں بیٹھے بیٹھے اُس نے آخری سانس لی ہو۔ لاش کی گردن اس طرح ڈھلکی کہ اُس کی ادھ کھلی آنکھیں سامنے سنگل بیڈ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''خدا کے لیے مجھے جانے دو ـــــ میں نہیں مرنا چاہتی ـــــ پلیز!! پلیز!!! اِسے میں نے نہیں مارا ـــــ اِسے میں نے نہیں مارا۔'' ماہین نے بلکتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے پاؤں پر رکھ دیے۔ طیفے کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ ہو چکی تھیں۔ اُس نے ماہین کو کندھوں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا اور اُسی بیڈ پر گرا دیا جہاں چند لمحے پہلے نوید کی لاش پڑی تھی۔

''گشتیوں کی جگہ پاؤں نہیں ـــــ بستر ہوتا ہے۔''

ماہین اب اپنے آپ کو بچانے کے لیے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی تھی۔

''بات ہے نصیب کی ـــــ تو اُس کے نصیب میں نہیں تھی کہ جو تجھے پیسے دے کر یہاں لایا تھا ـــــ تو ہے میرے نصیب میں کہ سب کچھ مجھے دے گی تو پھر باہر جائے گی ـــــ میرے سامنے ہاتھ نہ جوڑ ـــــ میں تیرا مقدر ہوں ـــــ اُتار یہ سب کچھ۔'' طیفے نے ایک جھٹکے سے اُس کے بدن سے لپٹا ہوا لباس اُتار کر پھینک دیا۔

''نہیں خدا کے لیے نہیں ـــــ جو تم مجھے سمجھ رہے ہو، میں وہ نہیں ـــــ مجھے تو آج تک کسی مرد نے چھوا تک نہیں، مجھے برباد نہیں کرو، جانے دو مجھے!!!'' ـــــ ماہین بستر پر پڑی اپنی برہنگی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''واہ! کسی مرد نے نہیں چھوا تو اِس لیے کہ میں نے چھونا تھا تمہیں ـــــ میرے نصیب کو اور کون چھو سکتا تھا ـــــ میں تیرا نصیب اور تو میرا نصیب۔'' ـــــ طیفے نے اب مزید تاخیر کیے بغیر اپنے نصیب کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

لگ بھگ دو گھنٹے کے بعد طیفے نے ماہین کو ہوٹل کے گودام سے متصل عقبی دروازے سے باہر نکالا تو اُس کے لیے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا دوبھر ہو رہا تھا۔ اُس نے ماہین کے جسم کو برتا نہیں بلکہ کچل کے رکھ دیا تھا۔ آتے ہوئے اُس نے نہ صرف اُس کے موبائل سمیت سبھی قیمتی چیزیں پرس سے نکال لی تھیں بلکہ اتنی نقدی بھی نہ چھوڑی کہ وہ گھر جاتے ہوئے رکشے کا کرایہ تک ادا کر سکے۔

۞

﴿۱۲﴾

دانش سعید لاہور میں شاید ابھی کچھ دن اور قیام بڑھا لیتا مگر حکمران جماعت کے بہت بڑے عہدیدار کے بلاوے پر اُسے اگلے ہی روز اسلام آباد واپس آنا پڑا کہ جہاں خوش بختی ایک پیدا کیے گئے موقع کی صورت اُس کی منتظر تھی۔ پارٹی کے مرکزی دفتر میں ہونے والی ملاقات میں دانش سعید کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ اُس کی جانب سے معروف برانڈ کی اسپورٹس کار کی درآمد کی اجازت کے سلسلے میں چار برس پہلے دی گئی درخواست پر اجازت عطا کی جا سکتی ہے اگر ایک بہت بڑی رقم کسی فرنٹ مین کے ذریعے پارٹی فنڈ میں جمع کرا دی جائے۔ وعدہ کیا گیا کہ یہ رقم وہ براہ راست وزیر تجارت کو دیتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں درآمدی لائسنس لے سکے گا۔ ہوسکتا ہے اِس درآمدی اجازت نامے کو عطا کئے جانے کے موقع پر وزیر اعظم خود بھی موجود ہوں لیکن یہ اُسی صورت ممکن ہو گا کہ جب درآمد کئے جانے والے آئیٹم کی موثر تشہیر کی جا چکی ہو اور اُس کا ملک و قوم کے بہترین مفاد میں ہونا مسلمہ حقیقت کے طور پر لوگوں کے ذہنوں میں بٹھایا جا چکا ہو۔

دانش سعید اِس ڈیل کو شاید وہیں کا وہیں منظور کر لیتا اگر ایک چھوٹا سا واہمہ اُس کے ذہن میں کھلبلی مچائے بیٹھ نہ جاتا۔ سبھی جانتے تھے کہ تقریباً آٹھ ماہ بعد ملک میں عام انتخابات ہونے والے تھے اور اس سلسلے میں حکمران جماعت سمیت ہر پارٹی کو اپنے اکاؤنٹ میں زیادہ سے زیادہ رقم چاہیئے تھی اور یہ رقوم دیگر ذرائع کے علاوہ عام طور پر امپورٹرز اور ایکسپورٹرز کے رُکے ہوئے اجازت ناموں کی منظوری کی صورت اکٹھی کی جاتی ہے۔ دانش سعید کو اس رقم کی ادائیگی پر کوئی اعتراض نہیں تھا بس اُسے اتنی یقین دہانی چاہیئے تھی کہ پارٹی کی حکومت جانے سے پہلے اُس کی سب سے بڑی درآمدی کھیپ ملک میں آ چکی ہو گی۔ دانش سعید کی مطلوبہ یقین دہانی کے جواب میں اُس کے انکم ٹیکس کے معاملات کی تین بڑی فائلیں اُس کے سامنے رکھ دی گئیں کہ جن کی بنا پر اُس کے جملہ کاروباری اثاثے ٹیکس نادہندگی کے زمرے میں ضبط کر لیے جاتے۔ دانش سعید نے کل تک کی مہلت مانگ لی مگر اُسے آج شام تک کا موقع دیا گیا کیونکہ کامرس منسٹر اب بھی اِسی بات پر اڑے ہوئے تھے کہ درآمدی کھیپ کی الیکشن سے پہلے آمد کو یقینی بنانا دانش سعید ہی کی ذمہ داری تھی نہ کہ حکومت کی۔

اِن دنوں تو دانش سعید ویسے بھی شبیر اور کاشف کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا تھا۔ ایک عرصے کے بعد نجانے کیوں اُسے جہاں بھی فرصت کے چند لمحات میسر آتے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شبیر اور کاشف کے مضطرب ہیولوں کے حصار میں آ جاتا۔ رات کی تنہائی کے وہ لمحات جنہیں وہ اپنے بزنس کی ترویج یا اپنی ذات تک رسائی کے لیے مختص کر چکا تھا، وہ اب شاکا اور کاشی کی غلاظت بھری زندگیوں کی نذر ہونے لگے تھے۔ اُس نے کئی بار کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنے کا سوچا مگر پھر خیال آتا کہ جو معاملات اُس وقت تک اُس کی اپنی قوت ارادی کے دسترس میں تھے، اُنہیں کسی اور سے سانجھا کر کے وہ اپنی ذہنی صحت پر سوالیہ نشان نہیں لگوانا چاہتا تھا۔ ایسی کسی ملاقات کی معمولی سی بھنک بھی اُس کی اپنی کمپنیوں میں موجود کئی مہم جو ڈائریکٹرز کو اپنی آستینوں سے خنجر نکالنے کا موقع دے سکتی تھی۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ گاڑی سگنل سبز ہوتے ہی دھیرے سے ایف الیون کی جانب رواں ہو چکی تھی۔

وہ رات کہ جس کے آخری پہر کالے اور کاشی کو وحشیانہ جنسی تشدد کا سامنا بطور سزا کرنا پڑا، شاکے اور کاشی کی وی آئی پی ہوٹل میں آخری رات تھی۔ گو کہ کالے کی نسبت کاشی پر نسبتاً کم جنسی تشدد ہوا تھا مگر وہ پھر بھی انسانی برداشت سے کہیں زیادہ تھا۔ کاشی اگر اب بھی اپنے

قدموں پر کھڑا تھا تو اپنے سابقہ تجربے کے سبب کہ بپھرے ہوئے سانڈ نما گاہکوں کے گروپ سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔ وی آئی پی ہوٹل سے فرار ہونے میں انہیں کوئی دقت نہ ہوئی۔ شاید ہوٹل کا ڈیوٹی مینیجر شاکے کی سادہ لوحی اور کاشی سے کیئے گئے سلوک کے سبب توقع ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ اُسے یوں جل دے جائیں گے۔ کالے کی کراہوں کی آڑ میں صبح ہونے سے پہلے ہی اُن دونوں کا وہاں سے کھسک جانا دوپہر کے وقت تک انتظامیہ اور مالک کے علم میں آیا بھی سہی تو اُن کے پیچھے بھاگنے اور تلاش کرنے کی زیادہ کوشش نہ کی گئی اور معاملہ ایک روٹین کے طور پر ''مُنڈا جاسوس کمپنی'' کو سونپ دیا گیا جس کے کرتا دھرتا مناسب سی اجرت کے عوض بھاگے ہوئے لڑکوں کو پل بھر میں ڈھونڈ نکالتے تھے۔ اُن کا نیٹ ورک بہت زیادہ پھیلا ہوا اور انتظامی لحاظ سے موثر کارکردگی کی شہرت رکھتا تھا۔ اُن کے سورس روم سروس کے لیے رکھے جانے والے لڑکوں سے لے کر اُن تمام طبقات میں موجود تھے جو کسی نہ کسی طور لونڈے بازی سے متعلق یا اِس کا شغف رکھتے تھے۔ لیکن کاشف نہ صرف اِس نیٹ ورک سے آگاہ تھا بلکہ اِس کے لیے کام بھی کرتا رہا تھا۔ لہٰذا وی آئی ہوٹل سے بھاگتے ہوئے وہ اِس علاقے کے مُنڈا جاسوس کو مناسب سے زیادہ رشوت دینا نہیں بھولا تھا کہ جب وہ اُن کے بارے میں کوائف نیٹ ورک میں پھیلائے تو اُن کی شکل صورت اور ظاہری حلیے کے بالکل برعکس رپورٹ کرے۔ نقد رقم کے ساتھ ساتھ اُس نے شاکے کا گھُٹ بھرنے کی بھی خواہش کی، جو پوری کر دی گئی۔ اب اُن کی اگلی منزل بادامی باغ لاہور کا جنرل بس سٹینڈ تھا۔ کاشف کی معلومات یہاں بھی کام آئیں اور انہیں ایک ایسے ہوٹل نما سرائے میں کام مل گیا جہاں کا ماحول قدرے کم تناؤ میں تھا۔ یہاں آنے والے گاہک زیادہ تر قبائلی علاقوں سے چرس، افیون اور ہیروئن کے سپلائی دینے والے کھیپئے ہوتے۔ ایک طویل سفر سے یہاں پہنچنے کے بعد جونہی وہ سپلائی کے کام سے فارغ ہوتے، اُن کی پہلی خواہش یہی ہوتی کہ کوئی انہیں تازہ دم کرے۔ یہاں کے لڑکوں نے بھی اُنہیں زیادہ سے زیادہ خوش کرنے کے وہ تمام چلن سیکھ رکھے تھے کہ جن کی انہیں کسی بھی طور طلب ہو سکتی تھی۔ انعام و اکرام میں اُن کی دریا دلی لڑکوں کو وہ سب کچھ خوشی خوشی

سہہ جانے پر آمادہ کیے رکھتی کہ جس کا عام حالات میں تصور بھی محال تھا۔

لیکن چند ماہ کے بعد اُن دونوں کے لیے ایسی صورت خرابی کی پیدا ہوئی جو اُنہیں ایک بار پھر فرار کے راستے پر لے آئی۔ کم و بیش یہی حالات اگلے تین برسوں تک اُن کی راہ میں حائل رہے۔ چند ماہ کے بعد ہر ہوٹل میں کوئی نہ کوئی ایسی اسچویشن پیدا ہو ہی جاتی کہ جس کے بعد اُن کا وہاں رہنا ناممکنات میں سے ہو جاتا۔ اِس دوران کئی ہوٹل بدلے گئے تو کئی مُنڈا جاسوسوں سے بھی واسطہ پڑا کہ جن کے تقاضے بنیے کے اُدھار کی طرح پورے ہونے کو ہی نہیں آتے تھے۔ جتنے ہوٹلوں سے وہ فرار ہوئے اتنے ہی پرائیویٹ وارنٹ گرفتاری اُن مُنڈا جاسوسوں کے پاس بڑھتے چلے گئے۔ ہفتے میں کئی کئی بار نہ صرف اُن کی بلکہ اُن کے ملنے والوں کی مفت خدمت کے علاوہ نقد رقم کی ادائیگی اور ہوٹلوں سے کھانے کے تقاضے الگ۔

اب شاکا اور کاشی خود بھی اچھے بھلے تکڑے ہو چکے تھے۔ سولہ برس کی عمر میں مَسیں مکمل بھیگ جانے کے بعد داڑھی مونچھوں کے بال اُترنا شروع ہو چکے تھے۔ ہڈیاں اور عضلات مضبوط ہونے کے بعد اُن کے کئی پرانے گاہک اگر اُن سے کنی کترانے لگے تھے تو کئی نئے جو اِس عمر کے شیدائی تھے اُن کے لیے قطار میں کھڑے رہنا شروع ہو گئے۔ لیکن مجموعی طور پر اب ہوٹلوں میں روم سروس اُن کے لیے ایک ایسا گورکھ دھندہ بن چکی تھی کہ جس میں سے کچھ کما کر پس انداز کر لینا ممکنات میں نہیں رہا تھا۔ پھر بھی برے دنوں کے لیے کچھ نہ کچھ بچا رکھنے کی غرض سے انہوں نے ایک ہر دم خوفزدہ رہنے والے پکی عمر کے کریانہ فروش سے اچھا تعلق بنا لیا۔ وہ ہفتے دو ہفتے میں ایک آدھ بار لوگوں سے چھپ چھپا کر ہر اُس ہوٹل میں پہنچتا کہ جہاں وہ دونوں موجود ہوتے۔ بس تھوڑی سی دل پشوری اور پھر اُسی طرح منہ سر لپیٹ کر یہ جا وہ جا۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے بھی اُس کی دکان پر جانا شروع کر دیا۔ بندہ ہر لحاظ سے مخلص، ڈرپوک اور علاقے میں اچھی شہرت کا معلوم ہوا تو اُن دونوں نے اب تک کی جتنی جوڑی ہوئی رقم تھی اُس کے حوالے کر دی۔ بعد میں معمول یہ بنا کہ ہفتہ دس دن کے بعد مُنڈا جاسوسوں کی لوٹ کھسوٹ سے جو بھی بچ رہتا وہ کریانے والے چاچے کے پاس جمع کرا کر رسید لے لی

جاتی۔

مُنڈا جاسوسوں نے مسلسل بلیک میلنگ اور حرامگی سے جان عذاب کر دی تو شا کا اور کاشی کے لیے لاہور یا اس کے مضافات میں رہنا دوبھر ہو گیا۔ یہ جاسوس تعداد میں زیادہ نہیں بس دو ہی تھے کہ جنہیں شا کے اور کاشی کی شناختی اصلیت معلوم تھی وگرنہ دوسرے جاسوسوں کے پاس جو معلومات تھیں وہ انہی کی دی ہوئی تھیں جو اُن کے ظاہر سے لگا نہیں کھاتی تھیں۔ اُن دونوں میں سے بھی ایک افضل نام کا مسٹنڈا ضرورت سے زیادہ کائیاں اور لالچی تھا۔ پولیس کی سپیشل برانچ سے برخواست شدہ یہ حوالدار، چوبیس گھنٹے اُن کے پیچھے پڑا رہتا۔ اِسی کے کارن دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب یا تو راولپنڈی میں ڈیرے ڈالے جائیں یا پھر پشاور میں کہ جہاں احتیاط سے کام کیا جائے تو باقی کی زندگی مُنڈا جاسوسوں سے نجات ملی رہے گی۔

لاہور چھوڑنے کا فیصلہ ہو گیا تو دونوں چھپتے چھپاتے چاچے کریانے والے کے پاس اُس سے اپنی امانت واپس لینے پہنچے۔ چاچا پہلے تو واپسی رقم کے تقاضے پر حیران ہوا مگر پھر ایک گھنٹے کی مہلت لے لی تا کہ بندوبست کر سکے۔ ایک گھنٹہ اِدھر اُدھر گزار کر وہ دوبارہ چاچے کے پاس پہنچے تو وہ اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ رقم کتنی تھی اور کیا ہو چکی تھی اِس کے حساب کا نہ تو دونوں فریقین کے پاس وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ اصل مسئلہ وہاں سے کھسکنے کا تھا۔ رقم کی تھیلی کاشف نے اپنی شلوار کے اندر لٹکا کر اُسے ازار بند سے باندھ لیا اور تیزی سے چاچے کی دکان کا عقبی راستہ لیا کہ جو ایک چھوٹے سے پارک سے گزر کر رکشہ اسٹینڈ کی طرف جا نکلتا تھا۔ جیسے وہ جانے کے لیے مڑے چاچے نے اُنہیں روک لیا۔

"لگتا ہے تم یہ شہر چھوڑے جا رہے ہو!!!" ___ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔

"نہیں نہیں ___ ہم تو یہیں ہیں، بس چھوٹی سی ضرورت آن پڑی تھی۔" اب کے کاشف بول اُٹھا۔ چاچے نے ایک سرد آہ بھری اور اپنی دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔

"چلو مان لیتا ہوں کہ تم کہیں نہیں جا رہے مگر یہ ضرور مان لو کہ تم مجھے آزما رہے تھے کہ یہ

چوتیا تمہاری امانت تمہیں واپس کرتا ہے کہ نہیں۔"

اِس سے پہلے کہ کاشف اُسے کوئی جواب دیتا شبیر نے اُس کا بازو پکڑا اور وہاں سے کھسکنے کے لیے اُسے زور سے دبایا مگر کاشف پھر بھی بولتا رہا ___ "نہیں اُو چاچا! تم پر اعتبار تھا تو تمہارے پاس رکھے تھے۔" شبیر نے پھر اُسے عقبی گلی کی طرف دھکیلا اور ہاتھ کے اشارے سے دُکاندار کو اللہ بیلی کہتا ہوا کاشف کے ساتھ اندھیرے میں گم ہو گیا۔

گلی سے نکل کر ابھی پارک میں داخل ہو ہی رہے تھے کسی نے پیچھے سے دونوں کو گردنوں سے دبوچ لیا۔ گرفت بہت سخت تھی نتیجتاً دونوں تڑپ کر رہ گئے۔ یقیناً یہ افضل حوالدار ہی تھا کہ جس کی فولادی انگلیوں کی پکڑ اُن دونوں کے لیے نئی نہیں تھی۔ "کہاں چلے تھے اُو شا کے کاکے حوالدار افضل کو چوتیا بنا کر کہ ہمارے پاس تو ایک چوانی بھی نہیں، اب یہ کھینچو لے کر کہاں چلے ہو ___ باپ تمہارا تو کب سے یہاں کھڑا تھا تمہارے انتظار میں ___ کیا خیال ہے اُن سارے ہوٹل والوں کو ایک ساتھ نہ بُلا لوں کہ جن کا مال چوری کر کر کے بھاگتے رہے ہو؟" ___ اِس کے ساتھ ہی افضل نے بیک وقت دونوں کی گدی میں ایک ایک جھانپڑ رسید کر کے پھر سے دونوں کو گردن سے دبوچ کر اُن کے درمیان میں اِس طرح خود کو فِٹ کر لیا کہ شبیر کی گردن اُس کی دائیں کہنی میں اور کاشف کی بائیں کہنی میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ اُن دونوں کو گھسیٹ کر پارک کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جہاں اندھیرا چھا جانے کے بعد ویرانی نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

"نکالو پیسے نکالو ___ مجھے دو۔" افضل رقم کا تقاضا کرتے ہوئے بار بار دونوں کہنیوں کو اِس طرح دباتا کہ وہ سانس رک جانے کے سبب تڑپنے لگتے۔ "ہمارے پاس کچھ بھی نہیں، جو تھا تمہیں دے چکے ہیں۔" شبیر نے کوڑکی میں پھنسے ہوئے کسی چوہے کی طرح تڑپنے کے باوجود افضل کو صاف صاف جواب دے دیا۔ یہ سننا تھا کہ افضل غصے سے پاگل ہو گیا۔ کاشف کو بائیں بازو کی کونی میں جکڑ کر رکھتے ہوئے اُس نے اپنے دوسرے کلہاڑے جیسے مضبوط ہاتھ سے شا کے کو تھپڑوں پر رکھ لیا۔

''بہن چود! اپنے اُس حرامی باپ دکاندار سے جو نوٹوں کی تھیلی لے کر آ رہے ہو، وہ کہاں ہے؟ میں خوامخواہ تم لوگوں پر ترس کھاتا رہا، مجھے تھوڑا سا بھی شک ہوتا کہ تم اتنے مادر چود حرامی ہو تو پہلے دن ہی ایسی جگہ پہنچا تا جہاں باقی کی ساری زندگی پچھواڑے کی سلائی کراتے کراتے گزارنی پڑتی۔'' شبیر کو مارتے مارتے اور کاشف کو گھسیٹتے گھسیٹتے افضل کی سانس پھولنے لگی تھی۔ ماں بہن کی گالیاں اور منہ پر لگا تار تھپڑ کھاتے شبیر کو اچانک نجانے کیا ہوا کہ اُس نے دائیاں بازو اوپر اُٹھایا اور ہاتھ سیدھا اُس کی کلائی پر ڈالا۔ غصے کی شدت اور پھولی ہوئی سانس کے بیچوں بیچ افضل کی کلائی پر پڑنے والا شبیر کا ہاتھ کچھ اتنی طاقت میں تھا کہ نہ صرف افضل کا ہاتھ اُس کے منہ پر پڑنے کی بجائے وہیں رک گیا بلکہ شبیر سے اس طرح کے ردعمل کی توقع نہ ہونے نے افضل پر بس ایک آدھ لمحے کے لیے عجیب سی بوکھلاہٹ طاری کر دی۔ بوکھلاہٹ کا یہی وہ ایک آدھ لمحہ تھا جسے شبیر نے ضائع نہ ہونے دیا اور ایک ہی جھٹکے میں افضل کا بازو مروڑ کر اُسے اُس کی کمر سے لگایا اور دوسرا بازو اُس کے گلے میں بالکل اُسی کے انداز میں ڈال کر پوری وقت سے گردن کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ کٹاک کی ایک ہلکی کی آواز کے ساتھ افضل کا بھاری بھرکم جسم اپنے ہی وزن سے نیچے زمین پر گر گیا۔ وہ مر چکا تھا۔

کاشف جس کی گردن آخری وقت تک افضل کے بائیں بازو کی گرفت میں رہی تھی، اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے حیرت سے کبھی شبیر کو اور کبھی زمین پر پڑی ہوئی افضل کی لاش کو دیکھتا تھا کہ پل بھر میں یہ کیا سے کیا ہو گیا۔ خود شبیر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے اندر یہ اتنی طاقت کہاں سے آئی کہ پلک جھپکنے میں ایک سانڈ کا منکا توڑ کر رکھ دیا۔ لیکن جو کچھ ہو چکا تھا وہ حقیقت تھی۔ سولہ سترہ برس کے گبھرو شبیر عرف شا کے کو اپنی طاقت کا اندازہ ہوا تو دل چاہا کہ ابھی اُس کے پر نکلیں اور وہ اُڑ کر گگومنڈی پہنچے اور اپنی ماں اور اُس کے یار روشن کی گردنیں توڑ کے رکھ دے کہ جن کی بے غیرتی نے اُس کی زندگی تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ کا چہرہ آ گیا جس نے پیسے کمانے کے لیے باہر کے ملک میں بیٹھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ اُس کے نکاح میں بیٹھ کر اُس کی کمائی پر پلنے والی عورت اُس کی عزت اور غیرت کا پاس بھی

رکھے گی۔ شبیر کی آنکھوں میں آنسو اُتر آئے۔ اُسے قطعی ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ کس جگہ موجود ہے اور کتنا بڑا جرم کر چکا ہے۔

کاشف بھی حیرت کے بھنور سے نکلا تو پہلا خیال وہاں سے بھاگ نکلنے کا ہی تھا۔ اُس نے اندھیرے میں غور سے شبیر کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ اُسے منجمد سا دکھائی دیا۔ وہ سمجھا کہ شاید شبیر خوفزدگی کے عالم میں اپنے حواس کھو کر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ اب کیا کرنا ہے۔ ایک بار تو اُس نے بھی سوچا کہ وہ اگر شبیر کا دوست تھا تو صرف روم سروس کے دھندے کی حد تک نہ کہ قتل جیسے جرم کے کے لیے بھی کہ جس کی سزا موت تھی۔ وہ محض دوستی نبھانے کے لیے پھانسی نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ شبیر ابھی تک سکتے کی سی کیفیت میں انہی پیروں پر کھڑا تھا کہ جن پیروں پر یہاں پہنچا تھا۔ اندھیرا اتنا گھنا تھا کہ اُسے شبیر کو وہاں چھوڑ کر بھاگ جانے میں کچھ بھی تردد نہ ہوا۔

﴿۱۴﴾

زفیرہ کی گاڑی بڑے صاحب کے وسیع و عریض محل نما فارم ہاؤس کے پورچ میں جا کر رکی تو اپنی روایات کے برعکس وہ خود اُس کے استقبال کو آیا ہوا تھا۔ جونہی اُس نے گاڑی سے بایاں قدم نیچے رکھا بڑے صاحب نے آگے بڑھ کر زفیرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے اُترنے میں تعظیمی سہارا دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں پرکھا اور پھر ایک ساتھ مسکرا دیے۔ بڑا صاحب اگرچہ عمر کی ساٹھویں دہائی میں کب کا قدم رکھ چکا تھا مگر اپنی مردانہ وجاہت کے بل بوتے پر کسی بھی قتالہ کو پہلی نگاہ میں گھائل کرنے پر قدرت رکھتا تھا۔ سر کے سیاہ اور سفید بالوں کے برابر کے امتزاج نے جہاں اُس کی شخصیت کو وقار اور شائستگی دی تھی وہیں دونوں رنگوں کا یہی تناسب اُس کی گھنی بھنوؤں اور اوپر کو اُٹھی ہوئی مونچھوں میں در آیا تو دبدبہ اپنے آپ ہی جھلکنے لگا۔ زفیرہ بھی کچھ کم قیامت نہیں تھی۔ قامت اور لباس کے موزوں ترین انتخاب نے اُس کے جمال کو پری وشوں کا ہمسر بناتے ہوئے کچھ اِس طرح زیبائی عطا کی کہ بڑے صاحب کو اندر سے اپنا آپ پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ عمر اُس کی شخصیت میں کہیں بہت پیچھے شکست کھا کر ٹھہر چکی تھی تبھی تو نسائی تب و تاب اُس پر فریفتہ اور فراواں۔

زفیرہ احمد کو گاڑی سے اترتے ہی یوں لگا کہ فارم ہاؤس کے ایک ایک کونے میں دور دور تک آسمان پر رنگین پھول بکھیرتی روشنیاں نیند سے بیدار ہو چلی ہوں۔ اُس نے بڑے صاحب کے ہمراہ چلتے ہوئے حیران ہو کر یہ منظر دیکھا تو مسکرا دی جیسے کہہ رہی ہو کہ آپ کے

اندر کا بچہ ابھی بڑا نہیں ہوا۔ لیکن جونہی وہ صدر دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئی تو اِس سے بھی زیادہ حیران کر دینے والا منظر اُس کا منتظر تھا۔ ایک کشادہ ہال کے وسط میں نشست گاہ اِس طرح ترتیب دی گئی تھی کہ اُس کے سامنے دائیں اور بائیں سفید شیفون کے باریک لبادوں میں جزوی طور پر ملبوس حسینائیں نیم دائرے کی شکل میں گول چبوتروں پر بیٹھی سُر منڈل چھیڑ رہی تھیں اور صدر دروازے سے نشست گاہ تک کے راستے میں دونوں طرف اُن پر خوشبوئیں بکھیرنے کے لیے برابر برابر وقفوں میں سات سیاہ فام مرد اور گلاب کی پنکھڑی ایسی رنگت والی سات حسینائیں کھڑی کی گئی تھیں جن کے خوبصورت جسموں کو ملبوس اِس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ کہیں اُن کی سندرتا گہنا نہ جائے۔

زفیرہ احمد کا چہرہ ایک لمحے کے لیے متغیر ہوا مگر اِس کے باوجود وہ ایک شان بے نیازی سے چلتی ہوئی وسطی نشست گاہ تک پہنچی جہاں ایک حسین لڑکی اور وجیہہ نوجوان ایک نیم دائرے کی شکل کے دیوان نما کے سامنے بازو پھیلائے اُنہیں رونق افروز کرانے کے منتظر تھے۔ آرام دہ ترین دو نشستی دیوان کو ہلکے سے نیم دائرے کی صورت اس طرح دی گئی تھی کہ اِس پر بیٹھنے والی دو شخصیات گردن کو خم دیے یا اُس پر دباؤ ڈالے بغیر نہ صرف ایک دوسرے سے گفتگو کر سکیں بلکہ سامنے کے منظر سے بھی لطف اندوز ہو سکیں۔

جونہی زفیرہ احمد اور بڑے صاحب دیوان پر براجمان ہوئے نشست گاہ کی روشنیاں اِس طرح خوابناک ہوئیں جیسے کسی دوشیزہ نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو تھوڑا سا موند لیا ہو۔ اطراف میں تیرتے خوابوں اور مدھر موسیقی نے ایک اور انگڑائی لی تو رنگین دھندلاہٹوں میں دودھیا روشنیوں نے ایک دائرے کی سی ترتیب میں رقص کے سے زاویے بنا لیے جن میں وہی سات بے لباس سیاہ فام مرد اور گلابی حسینائیں رقاص جوڑوں کی شکل میں مختلف انداز و اداؤں میں ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے جو ابھی کچھ ہی دیر پہلے استقبالی رہگزر پر عطر پاشی کے لیے موجود تھے۔

زفیرہ احمد صوفے پر بیٹھتے ہی بڑے صاحب کی طرف دیکھے بغیر نگاہیں سامنے مرکوز رکھتے ہوئے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے دل کی بات کہے بغیر رہ نہ سکی۔ ”یہ پچاس

برس پرانی فلموں کا سیٹ لگا کر کیا سمجھ لیا کہ میں آپ سے مرعوب ہو گئی؟ میں آپ کے پاس کوئی اسٹیج ڈراما دیکھنے نہیں آئی ___ یہ تماشہ تو اوپن ایئر تھیٹر کا کوئی معمولی سا پروڈیوسر بھی لگا سکتا ہے ___ ویسے بڑے صاحب! سمجھا کیا تھا یہ ایراٹک منظر نامہ ترتیب دے کر کہ چار کرائے کے ننگے لونڈے اور چار کرائے کی ننگی لونڈیاں میرے سامنے سیکس کے نام پر اوٹ پٹانگ حرکتیں کریں گے تو میرے منہ سے رال ٹپکنے لگے گی؟ کیا بڑے صاحب ___ اپنا امیج ہی برباد کر کے رکھ دیا۔"

بڑے صاحب کے چہرے کے تاثرات میں نہ تو کوئی تاثراتی تغیر اور نہ ہی کوئی تبدیلی۔ بس وہی ایک ہلکی سی مگر گہری اور گنجلک مسکراہٹ۔

"اب اُٹھیں بھی ناں یہاں سے ___ میرا تو جی متلا رہا ہے۔" زفیرہ احمد کھڑی ہوئی تو بڑا صاحب بھی کھڑا ہو گیا۔ "کوئی پرسکون جگہ نہیں ہے کیا؟" ___ زفیرہ نے سامنے والی رقاص جوڑیوں کو کچھ محسوس کرائے بغیر دھیرے سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑا صاحب اُسے ایک ایسے کمرے میں لے آیا جو نوادرات سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کشادہ اور مناسب روشنیوں سے مزین کمرے میں ہر چیز نادر و نایاب دکھائی دے رہی تھی۔ نشست و برخواست کے فرنیچر سے لے کر دروازوں کے ہینڈل، لاک اور چٹخنیوں تک سبھی کچھ اپنی اپنی الگ تاریخ لیے ہوئے لگ رہا تھا۔ کمال یہ بھی تھا کہ جو چیز جہاں رکھی گئی تھی اُس کے رکھنے کی جگہ بھی اوریجنل یا اوریجنل کی مانند تھی۔ زفیرہ نے کمرے میں موجود کسی بھی چیز میں دلچسپی لینے کی بجائے بس ایک اُچٹتی ہوئی نظر اِدھر اُدھر ڈالی اور تمسخر بھری نگاہوں کے ساتھ بڑے صاحب کو دیکھنے لگی جو کمرے میں اس انداز میں گھوم رہا تھا کہ جونہی اُس سے کسی نادر چیز کے بارے میں کچھ پوچھا جائے وہ فوراً ہی اپنی معلومات کے بل بوتے پر اُس کی قدامت ثابت کرتے ہوئے داد پا سکے۔ زفیرہ احمد کو 1965ء کی انڈین فلم "گائیڈ" کا ہیرو دیوانند یاد آ گیا جو تاریخ یا تاریخ سے جڑی ہوئی ہر شے سے نالاں ایک ایسی مست دوشیزہ وحیدہ رحمٰن کو تاریخی مقامات کی سیر کرانے پر مامور کیا گیا تھا جس کا ادھیڑ عمر شوہر اُس سے صحبت رکھنے کی بجائے کئی کئی روز پرانی غاروں کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔

بڑے صاحب کی نگاہ زفیرہ احمد کی نگاہ سے ملی تو وہ پہلی بار نگاہیں جھکانے پر مجبور ہو گیا۔ صاف دِکھ رہا تھا کہ وہ اُسے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

"بڑے صاحب!!!! جتنے حرامی دِکھتے ہو، اُتنے ہو نہیں ___ اگر کسی عذاب کو دعوت دے ہی دی تھی تو اُس کا سامنا کرنا بھی سیکھ لیا ہوتا یا کم از کم سامنا کرنے کی کوشش ہی کر لی جاتی ___ کب تک اِدھر اُدھر گھماتے رہو گے؟ اتنی بھاری قیمت پر خریدا گیا وقت یونہی میوزم کی سیر پر ضائع نہیں کیا جاتا۔" زفیرہ کے چہرے پر تمسخر کی لکیریں چڑچڑے پن میں بدلنے لگی تھیں۔ بڑے صاحب نے اب بھی کچھ کہے بغیر نہایت احترام سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بظاہر اُس کے گداز لمس کو اپنے رگ و پے میں اُتارتا ہوا ایک ایسے کمرے میں لے گیا جسے بجا طور پر خلوت گاہ کہا جا سکتا تھا۔ ایراٹک پینٹنگز اور لائٹس، شہوانی فکر کو مہمیز کرتا ہوا ڈیزائنڈ بیڈ اور باقی کا فرنیچر۔ ایک کونے میں اعلیٰ ترین برانڈز سے آراستہ بار جس کے سامنے دیگر لوازمات سے بجی ہوئی اِن بلٹ ٹرالی، دو آرام دہ کرسیاں جن کے ایک طرف پوری دیوار میں بنے ہوئے شیشے کے خصوصی شیلوز اور ان شیلوز میں سینکڑوں کی تعداد میں ترتیب سے رکھے ہوئے شراب کے ہر برانڈ کے اوریجنل گلاس۔ زفیرہ احمد کی نگاہوں میں پہلی بار تحسین کی چمک جاگی اور اُس نے ایک گہری سانس لی۔

بڑے صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بار کے سامنے رکھی ہوئی فائبر گلاس کی ایک کرسی پر زفیرہ احمد کو بٹھایا جو کسی مرد کی گود کی مانند ڈیزائن کی گئی تھی جب کہ دوسری کرسی اُس کے لیے تھی جو کسی حسینہ کی گود کی صورت ڈیزائنڈ تھی۔ بڑے صاحب نے زفیرہ کی آمد کے بعد پہلی بار اپنے لب ہلائے اور بار میں رکھی ہوئی مختلف برانڈز کی بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس کی پسند پوچھی۔ اگلے دو تین لمحات میں جب وہ کچھ نہ بتا پائی تو بڑا صاحب پھر دھیرے سے کچھ بولا۔

"آج میری پسند کی؟ ___"

زفیرہ احمد مسکرائی اور آنکھ کے اشارے سے اجازت دے دی۔ بڑے صاحب نے اپنی کرسی کی دائیں جانب ہاتھ رکھا تو کمرے میں ہلکی ہلکی موسیقی جاگ اُٹھی اور اس کے ساتھ ہی

بغلی دروازے سے دو مسکراتی ہوئی دوشیزائیں باہر نکلیں اور بار کی طرف بڑھیں جن کے دودھیا بدن پانی کے رنگ کے شیفون کے ان سِلے لباس میں جزوی طور پر ملبوس تھے۔شاید وہ جانتی تھیں کہ اُنہوں نے کون سی وہسکی سرو کرنا ہے۔انہوں نے روبوٹک انداز میں پیگ بنا کر ایک انداز دلربائی سے دونوں کو پیش کیے اور اُسی راستے سے واپس چلی گئیں کہ جس سے آئی تھیں۔

زفیرہ احمد نے بڑے صاحب سے چیئرز بھی کیا اور پہلا سپ بھی لیا مگر اُس کے بعد پیگ کو ایک طرف رکھتے ہوئے نہایت برگشتگی کے ساتھ بڑے صاحب کی طرف مڑی۔''بڑے صاحب! حد نہیں ہوگئی؟ یہ بار بار آپ میرے سامنے ننگی لونڈیاں اِس لیے لاتے ہیں کہ ثابت کرسکیں مجھ سے زیادہ جوان اور حسین لڑکیاں اتنی بڑی تعداد میں ہر وقت آپ کی بارگاہ میں خدمت کے لیے گھومتی رہتی ہیں؟ مانا کہ آپ اتنے مہان اتنے بڑے راسپوٹین ہو تو پھر میری کیا ضرورت تھی؟ کیا صرف مُہر لگانی مطلوب ہے کہ ملک کی اتنی بڑی ایڈورٹائزنگ ایمپائر کی مالکہ کو بھی اپنے بستر پر لے آئے؟ کیا ہو آپ بڑے صاحب؟ مجھے تو کوئی ذہنی مریض لگتے ہو!!!'' بات ختم کرتے کرتے زفیرہ احمد کا لہجہ اچھا بھلا کسیلا ہو چکا تھا۔

لیکن اس کے باوجود بڑے صاحب کے چہرے پر ایک ہی ڈھب کی استقبالیہ مسکراہٹ شاید کسی پکے بانڈ سے بدستور چپکی ہوئی تھی۔اُس نے اپنا گلاس اُٹھایا اور چیئرز کرنے کے سے انداز میں زفیرہ کے قریب لایا۔زفیرہ نے بھی بادل نخواستہ اپنا گلاس اُٹھا کر اُس سے ہلکا سا ٹکرایا مگر منہ سے کچھ بولنے کی بجائے ایک گھونٹ میں پیگ ختم کر کے ایک طرف رکھ دیا۔حلق سے اُترنے والی کڑواہٹ اُس کے چہرے پر پھیل چکی تھی۔بڑے صاحب نے اگرچہ اُس کی یہ بات خاص طور نوٹس کی مگر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کیا ہوا ہے،بس چپکے سے اپنی کرسی کی دائیں جانب ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔پلک جھپکتے ہی دونوں دوشیزائیں پھر سے اندر تھیں۔اِس سے پہلے کہ وہ زفیرہ احمد کا خالی پیگ بنانے کے لیے بار کاؤنٹر پر آتیں، وہ انہیں دیکھتی ہی ہذیانی انداز میں چلا اُٹھی۔

''گیٹ لاسٹ(get lost)!!''

پہلے تو وہ دونوں ایکدم گھبرا گئیں مگر بڑے صاحب کے چہرے پر لکھی تحریر دیکھتے ہی اُن کے چہرے بھی پھر سے مسکرا اُٹھے اور وہ اُسی انداز الربائی سے واپس چلی گئیں۔زفیرہ نے غصے سے چہرہ دوسری جانب کر رکھا تھا۔بڑے صاحب نے اُٹھ کر بوتل اپنے ہاتھ میں لی، پیگ بنایا اور زفیرہ احمد کے سامنے رکھ کر تعظیماً سر جھکا کر دونوں بازو اُس کے سامنے پھیلا دیے۔زفیرہ نے ایک لمبی سانس لی، بڑے صاحب کی طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پیگ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''آپ سے ایک بات کہوں!''____ بڑے صاحب کا لہجہ بدستور دھیما اور اپنایت لیے ہوئے تھا۔زفیرہ نے پیگ اُٹھا کر پھر سے ایک بڑا گھونٹ لیا اور آنکھ کے اشارے سے بات جاری رکھنے کو کہا۔

''آپ نے کبھی سوچا کہ روزانہ کتنے مرد آپ کی آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں لیکن اُن میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے اندر واقعی کوئی مرد موجود ہوتا ہے۔''

''میں نے زندگی میں کبھی مرد کو اہمیت نہیں دی۔'' زفیرہ احمد نے ایک اور گھونٹ لیا اور پیگ کو واپس رکھنے سے پہلے نجانے جی میں کیا آئی کہ پھر سے لبوں سے لگایا اور خالی کر کے رکھ دیا۔بڑے صاحب کا دل چاہا کہ وہ زفیرہ احمد کے رویوں میں پوشیدہ تضادات اور منافقتوں پر کھلکھلا کر ہنسے مگر وہ مصلحتاً مسکرانے اور اُس کا خالی پیگ اُٹھا کر اُسے وہسکی سے نئے سرے سے آشنا کرنے پر ہی اکتفا کر سکا۔

''چلیں اسی بات کو میں اپنے لحاظ سے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں____ آپ جان چکی ہو کہ میرے پاس اس وقت، اس چھت کے نیچے کتنی تعداد میں، کس درجہ خوبصورت دوشیزائیں میری پسند کے لباس میں، میرے بتائے ہوئے رویوں کے ساتھ میری من مانی کے لیے موجود ہیں، مگر میں ہوں کہ اپنا سب کچھ آپ پر نچھاور کیے جا رہا ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ نہ تو آپ کے ساتھ من مانی کر سکتا ہوں اور نہ ہی آپ اُس درجہ مجھ پر مہربان ہو سکتی ہیں____ تو پھر یہ سب کیوں؟ وہ بھی عورتیں اور آپ بھی عورت____ کبھی سوچا کہ ایسا کیا ہے آپ میں کہ جو اُن میں نہیں ہے؟''

''آپ کا پاگل پن اور کیا؟''___ جس ناز سے زفیرہ احمد نے یہ جملہ ادا کیا، وہ اُس کے باطن کی تسکین کی گواہی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

''پاگل پَن نہیں میرے حضور! اسے عورت پن کہتے ہیں___ اور یہ وہ عورت پن ہے جو آپ میں ہے مگر ان بیس پچیس لڑکیوں میں نہیں___ میرے نزدیک وہ صرف دِکھنے میں عورتیں ہیں، عورت اُن کے اندر نہیں۔'' بڑا صاحب اپنی گفتگو سے مسلسل زفیرہ احمد کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ سب مردوں کا حرامی پن ہے___ ورنہ سبھی عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں___ ایک جیسی فزیک اور ایک جیسی کیمسٹری___ بس جس کو خوار کرنا ہو اُس کے اندر ایک عورت ڈھونڈ لیتے ہیں اور عورت کے اندر عورت پن بھی۔'' بڑے صاحب کے خلاف اُس کے ذہن میں موجود غصے اور نفرت کا ردِعمل تھا یا حالات کے بھنور سے بچ نکلنے کی تگ و دو کہ زفیرہ احمد کے ہاں شراب نوشی میں سرور کے بعد مستی کی منزل سرعت سے قریب آنا شروع ہو چکی تھی جب کہ بڑے صاحب کے ہاں تو سرور ابھی صرف باتوں میں دخیل تھا، ذہن میں نہیں اُترا تھا۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں___ یہ ہیر، سسی، سوہنی، صاحباں، لیلیٰ___ یہ کیا تھیں، یہ صرف دکھنے میں عورتیں نہیں رہی ہوں گی، ان کے اندر بھی ایک توانا عورت ہو گی جس نے باہر کی عورت سے بغاوت کرتے ہوئے انہیں امر کر دیا۔''

''سب ڈھکوسلا سب بکواس۔'' زفیرہ کی زبان ہلکی ہلکی سی لڑکھڑانے لگی تھی۔ ''کیا حشر کیا تم نے اِن عورتوں کا___ زندگی تو برباد کی سُو کی، تاریخ میں بھی ہمیشہ کے لیے ایک سٹگما بنا دیا۔'' زفیرہ کچھ اور ہائپر ہوئی تو بڑے صاحب نے ڈبل پیگ بنا کر اُس کے قریب کر دیا۔

''زفیرہ میری بات سنو! ہم مردوں نے اِن عورتوں کا کوئی حشر نہیں کیا___ مرد بے چارے تو اُن عورتوں کی اندرونی عورت کی بغاوت کا ایندھن اس طرح بنے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اب تک اُن کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں___ ہیر کے ساتھ رانجھا، سسی کے ساتھ پُنوں وغیرہ وغیرہ___ actually جو عورتیں اپنی نسائی شناخت میں کسی قسم کی کنفیوژن یا شرمندگی کا شکار نہیں ہوتیں وہی بغاوت کرتی ہیں عورت کے اُس امیج سے جسے مرد نے تخلیق کر

کے اُن پر تھوپ رکھا ہوتا ہے اور بدقسمتی سے عورتوں کی غالب اکثریت نے اُسے من و عن قبول کرتے ہوئے اپنے اوپر طاری بھی کر رکھا ہے___ اور جو یہ عورتیں تمہیں اِدھر اُدھر دکھائی دے رہی ہیں یہ وہی ہیں جو مرد کے تخلیق کردہ امیج کے اندر پروان چڑھی ہیں___ ان کے اندر کوئی زفیرہ احمد نہیں جو انہیں اپنے باہر دکھائی دینے والے عورت کے مکوٹھے سے بغاوت کرنے کی بنیاد رکھ سکے۔''

زفیرہ احمد نے بڑے صاحب کی گفتگو ختم ہونے سے پہلے ہی نشے میں تر بتر ایک قہقہہ لگایا اور پیگ کو خالی کر کے اُس کی طرف اُچھالتے ہوئے بولی۔

''آپ تو آپ سے تم پر آ گئے بڑے صاحب!! اب ایک بات مجھے تم بھی بتاؤ کہ یہ بھڑوا گیری کرتے کرتے دانشوری کا شوق کب سے ہو گیا؟''___ مگر بڑا صاحب اب بھی کچھ نہیں بولا۔ بس ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ زفیرہ کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب کے اُس نے بھی باقی ماندہ ایک چوتھائی پیگ کو ایک ہی گھونٹ کیا۔

''تمہاری طرح کا ایک چوتیا تھا، نت نئی عورتوں کا رسیا ___ مگر پورا پکا نامرد___ جب اُن کا کچھ نہ بگاڑ پاتا تو ڈبے سے وائلن نکال کر بجانا شروع کر دیتا۔ اب بھلا بپھری ہوئی عورت بھی وائلن سے بہلتی ہے کیا___ لہٰذا جوتے کھاتا۔'' زفیرہ کوشش کر رہی تھی کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے صاحب سے بات کرے مگر نشے کی شدت سے آنکھیں پوری طرح کھل ہی نہیں پا رہی تھیں۔

''میں جانتا ہوں تم کیا کہنے والی ہو۔'' بڑے صاحب کے چہرے سے مسکان کا ماسک اُترنے لگا تھا۔

''کہنا وہنا کیا ہے؟___ بس میرے سامنے دانشوری کی یہ وائلن نہ بجاؤ___ رنڈیوں کے مال سے کوئی بھڑوا بڑا صاحب بن بیٹھے تو ہوتا تو بھڑوا ہی ہے___ بس وائلن بجانے والا۔ تم بھی اُٹھاؤ اپنی وائلن اور بجاؤ لیکن اُس سے پہلے مجھے میرا بندہ چاہئے ''منور'' کے لیے، اُن تینوں میں سے کوئی ایک یا وہ تینوں۔'' زفیرہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر اُس کی آنکھیں بند ہو کر سر کرسی کی پشت پر ٹِک گیا۔ بڑے صاحب کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو کر درشتگی

چھا چکی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر اپنی کرسی کی دائیں طرف اپنا ہاتھ رکھا اور ہلکے سے دبا دیا۔ پلک جھپکنے میں دونوں دوشیزائیں کمرے میں موجود تھیں اور بڑے صاحب کے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر بھی کمرے میں داخل ہوتے ہی پڑھی جا چکی تھی۔ اُن میں سے ایک آگے بڑھی اور اپنے دونوں ہاتھ آپس میں مل کر اُن کی ہتھیلیوں کو اندر کی سمت دونوں طرف سے زفیرہ کی گردن پر رکھ دیا۔ لڑکی کے ہاتھ بس ایک لمحہ کے لیے زفیرہ کی گردن سے مَس ہوئے ہوں گے کہ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ دونوں دوشیزائیں اُس کے دائیں بائیں آئیں اور اُسے سہارا دے کر کھڑا کر لیا۔ زفیرہ کے چہرے پر عجب سی سرشاری اور بے نام سی سرمستی دیکھتے ہی دیکھتے یوں ہویدا ہوئی کہ جیسے پوہ کی کہر آلود رات کے پچھلے پہر کوئی سنہری ناگن اپنی وِس کی حدت سے بے خود ہو کر جھومتی ہوئی کسی اکھڑ ناگ سے ملن کے لیے بے تاب ہو کر بار بار برف ہوئے پتھروں پر سر پٹختی پھر رہی ہو۔ اپنے آپ، اپنی طلب سے بے خبر اور اپنے اند جاگتے ہوئے سرور کی وحشت خیزی سے بیگانہ۔ اُس نے اپنے دائیں بائیں کھڑی دوشیزاؤں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور خود کو اُن کے سہارے سے الگ کرتے ہوئے یوں ہلکے ہلکے قدم اُٹھانے شروع کیے کہ جیسے بادلوں میں قدم رکھ رہی ہو۔ وہ دونوں اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے اُسے بغلی دروازے سے لے کر ایک اور کمرے میں داخل ہوئیں جو کسی بیڈ روم کے سیٹ کی طرح سجایا گیا تھا۔

بیڈ کے اوپر جہاں ریموٹ سے کنٹرول ہونے والی اسٹوڈیوز لائٹس لگی ہوئی تھیں وہاں تمام ممکن زاویوں میں جدید قسم کے گھومنے والے کیمرے بھی نصب کیے ہوئے تھے۔ بڑا صاحب اُن کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا اور کمرے کے ایک کونے میں بنے ہوئے کنٹرول پینل پر جا کر بیٹھ گیا کہ جہاں سے کیمروں اور روشنیوں کو حسب ضرورت کنٹرول کرنے کا نظام موجود تھا۔ کنٹرول پینل کے درمیان میں فکس کیے ہوئے ایک کشادہ مانیٹر پر بڑے صاحب نے بیڈ کا منظر مرکوز کرتے ہوئے اُسے کئی کیمروں کی نگاہ سے بار بار دیکھا اور پھر اُن میں سے ایک کیمرے کا زاویہ نگاہ زمین سے چار فٹ بلند رکھتے ہوئے بیڈ کے پاؤں کی جانب سے لاک کر لیا۔ اُس نے دیکھا کہ دوشیزائیں زفیرہ کے بدن سے آہستہ آہستہ لباس

الگ کرتی چلی جا رہی تھیں لیکن اِس پر برگشتہ یا متوحش ہونے کی بجائے اُس پر چھائی ہوئی کیفیت کے رنگ اور بھی گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اُسے کچھ احساس نہیں تھا کہ کمرے کی سبھی روشنیاں اُسی پر فوکس کیوں ہیں یا وہاں اُن کے علاوہ بڑا صاحب بھی نسبتاً کم روشن کونے میں بیٹھا ہوا، ایک نئے کردار کی ادائیگی سے قبل کی بے چینی کے حظ میں غلطاں کیوں ہے۔

بڑے صاحب نے تیزی سے ایک بار پھر تمام کیمروں سے جتنے شاٹ ممکن ہو سکتے تھے، لیے اور پھر ریکارڈنگ کو خودکار کی کمانڈ دیتے ہوئے ایک ہاتھ سے پینل کے ساتھ رکھے ہوئے وہسکی کے گلاس سے تسکین بھر گھونٹ لیا اور دوسرے ہاتھ سے کرسی کے بائیں بازو کو ایک مخصوص انداز میں پریس کیا تو کمرے کا ایک اور بغلی دروازہ کھلا جس میں سے دو کثرتی بدن والے سیاہ فام جوان مکمل برہنگی کو لباس بنائے باہر آئے اور بیڈ کے ساتھ کھڑی ہوئی زفیرہ کو دائیں بائیں سے بازوؤں میں لے لیا۔ اُن کے آتے ہی دونوں دوشیزائیں وہاں سے ہٹ کر بڑے صاحب کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ یوں لگا کہ سیاہ فام مردوں کی موجودگی کی خوشبو نے زفیرہ کے مشامِ ہوس کو معطر کر دیا ہو۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنا آپ نچھاور کرے تو کس پر۔ وہ حیران تھی کہ اُس کا لبراڈار شونی آج کس روپ میں، کتنے چہروں کے ساتھ اور کتنی باہیں پھیلا کر اُسے رجھانے چلا آیا ہے۔ شونی کی کھردری زبان کے لمس کا تصور کرتے ہی اُس کے جسم میں ہلکورے لیتی وحشت آتش فشاں ہوئی تو ملائم جلد میں اَن دیکھی دراڑیں پڑتی چلی گئیں۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب بڑے صاحب کے غصے اور نفرت سے کھولتے ہوئے ذہن میں سکون کی ننھی ننھی بوندیں واقعتاً اپنا جادو جگانا شروع کر چکی تھیں۔ اُس کے لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ اور بیڈ کے اطراف میں لگے ہوئے کیمروں کے عجیب سے تال میل نے مانیٹر کی سکرین کو سیاہ اور سفید کے ملاپ سے بکھرنے والے رنگوں کی دھنک سے سجا رکھا تھا۔

۞

﴿۱۴﴾

ماہین گھر پہنچی تو ایک نئی کہانی کے ساتھ کہ یونیورسٹی سے آتے ہوئے اُس کا رکشہ اُلٹ گیا، وہ رکشے سے باہر گری تو ایک موٹر سائیکل اُس کی ٹانگوں کے اوپر سے اِس طرح گزری کہ اندر کا گوشت چیتھڑ کر رہ گیا۔ اس دوران کچھ پتا نہ چلا کہ اُس کی کتابیں کدھر گئیں یا موبائل فون اور پرس کون لے گیا۔ بہر حال کچھ لوگوں نے اُسے ایک قریبی کلینک سے اینٹی ٹیٹنس انجیکشن لگوا کر گھر روانہ کر دیا۔ گھر کے باقی افراد نے تو ماہین کی کہانی کو اُسی طرح مان لیا مگر اُس کی ماں کے ماتھے پر کچھ ایسی سلوٹیں اُبھر آئی تھیں جن میں تشکیک کے ساتھ ساتھ تفکر بھی شامل تھا۔ اُس نے ہلدی کا لیپ کرنے کی غرض سے اُس کے جسم کا متاثرہ حصہ دیکھنے کی کوشش کی مگر ماہین نے اپنے اوپر کچھ کچھ بشاشت طاری کرتے ہوئے ہلدی کا لیپ لگوانے سے اس شرط پر جان چھڑوالی کی پیناڈول کھانے سے اگر فرق نہ پڑا تو پھر ہلدی ضرور لگوالے گی۔ لیکن اس کے باوجود اُسے ہلدی ملا گرم دودھ کا گلاس پینا ہی پڑا۔

مگر جونہی گھر کے افراد ادھر اُدھر ہوئے اور وہ اپنی کمرے میں پہنچی تو کافی دیر سے رُکا ہوا آنسوؤں کا سیلاب ایک دم بہہ نکلا۔ اب تک ہو چکی عزت کی پامالی اُن اندیشوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی کہ جو آنے والے لمحات میں اُس کے پورے خاندان کی بربادی کا پیغام لیے اُس کی جانب تیزی سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ کل رات سے آج صبح کے لمحات تک اُسے اپنی فہم و دانش پر کس قدر زعم تھا۔ کیا کیا سوچ رکھا تھا کہ اُس نے کیسے اور کس طرح سے وہ نوید کے ارادوں کو ناکام بنائے گی۔ لیکن اُس کی موت نے جہاں اُس کے

ارادوں کو ناکام بنایا وہیں طیفے جیسے دو ٹکے کے بدمعاش سے اُس کی عصمت پامال کرانے کے بعد اُسے نوید کی قاتلہ کے طور پر زمانے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ وہ چیخنا چاہتی تھی کہ کسی طور اب تک اپنے اندر دفن ہو چکے کرب کو باہر نکالے مگر یہ چیخنا اُس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ اُس کی پہلی چیخ جو طیفے کے غلیظ اور بدبودار ہاتھ کے منہ پر داب دیے جانے کے سبب حلق سے باہر نہیں نکل پائی تھی اب بھی اُس کے خاندانی پندار کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ اُس کا بند کمرہ جس کی درزوں میں بھی وہ کپڑا پھنسا کر ساؤنڈ پروف کیے رہتی تھی اب نہ تو اُس کی چیخوں کا متحمل ہو سکتا تھا اور نہ ہی سانس لینے میں سہولت کا باعث۔ ماہین کا پورا وجود کہیں اُس کے حلقوم میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ ایک شدید کراہت کا احساس تھا کہ اُبکائیوں سے بھی رو کے نہیں رک پا رہا تھا۔

ماہین کو اپنے جسم سے طیفے کے میلے اور مسلسل پسینہ بہاتے جسم کی بدبو سے چھٹکارا ملنا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد اگرچہ وہ دوبار نہا چکی تھی مگر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے طیفے کا میل سے اَٹا ہوا وجود اُس کے بدن سے چپک کر رہ گیا ہو۔ اُس نے طیفے کو مسل مسل کر اپنے بدن سے اتارنا چاہا مگر کہیں وہ ناخنوں کی کھرچن کی صورت، کہیں ہونٹوں میں دبا کر مسلنے کی صورت اور کہیں دانتوں سے کاٹنے کی صورت اُس کے بدن کو داغدار کیے ہوئے تھا۔ اُس کے ہونٹوں اور گالوں پر طیفے کے پیلے دانتوں سے بہتا ہوا لعابِ دہن جہاں ماہین کے لیے ابھی تک ایک خشک ہو چکی ناگوار بو کی باقیات کے طور پر چمٹا ہوا تھا وہاں اُسے اپنے جسم کے نہاں حصوں میں طیفے کی اُنڈیلی ہوئی گندگی بھی مسلسل گھن کے احساس کا ایسا منبع بن چکی تھی کہ جس سے ناگوار حمل کے ٹھہرنے کے امکانات، وسوسے اور اندیشے جڑے ہوئے تھے۔

ایک اور عذاب وہ تصورات تھے جو نوید کی لاش کی دستیابی سے اب تک کی صورتحال کی ہولناکی اور اُس کے نتائج کی مختلف صورتیں، مضمرات اور تعبیریں گھما گھما کر اُس کے سامنے لا رہے تھے۔ لیکن لمحۂ موجود میں سب سے بڑا عذاب اُس احساس سے جان چھڑانے کا تھا کہ جو طیفے کے غلیظ ہیولے کی طرح اُس کے ذہن میں گھس کر جسم کے روئیں روئیں سے چمٹا ہوا

تھا۔ نجانے کیوں ماہین کو ایک تشفی سی تھی کہ اُس کے باکرہ پن کی بلی لے کر طیفا اب پولیس کے روبرو اُس کی نشاندہی نوید کی قاتلہ کے طور پر نہیں کرے گا اور نہ ہی وہاں اُس کی موجودگی کے بارے میں زبان کھولے گا۔ ماہین کو یہ گماں اِس لیے بھی تھا کہ اُس سے مستقبل میں تعلقات رکھنے کی نیت سے طیفے نے اُس کے شناختی کارڈ کی کاپی اپنے پاس اس دھمکی کے ساتھ رکھ لی تھی کہ اُسے انکار کی صورت میں پھانسی کا پھندہ اُس کی گردن سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔

کیا کیا خواب نہیں دیکھے تھے ماہین نے اُس شخص کے لیے جو اُس کے پھولوں سے سجے مہکتے مستانے حجلہ عروسی میں داخل ہو کر پہلی بار اُس کے بدن کے دروازے پر دستک دے گا مگر اِن خوابوں کو تعبیر ملی بھی تو کیا ملی کہ ایک لاش کی موجودگی میں ہیبت اور کراہت سے گندھے ہوئے شخص نے جبراً اُس کی اُن آرزوؤں کو کچل کر رکھ دیا کہ جن کا دوسری بار پورا ہونا ایک عورت کی زندگی میں اُس طور کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی نجانے کیوں مندمل ہوتی خراشوں، بتدریج کم ہوتی ہوئی ٹیسوں اور لحظہ لحظہ اُترتی ورم کے ساتھ ہی تذلیل کا وہ کرب بھی اپنے آپ ڈھلتا چلا گیا جو اُس کے جسم کی خلافِ رضا دراندازی سے وجود میں آیا تھا۔ اُسے عجیب سا خیال آیا کہ ایک جنس کے جسم کا دوسری جنس کے جسم پر مکاشفہ کب عصمت دری کے زمرے میں گردانا جاتا ہے۔ اس کا عمومی جواب تو یہی ہونا چاہئے کہ جب ایسا دونوں میں سی کسی ایک جنس کی رضا یا قبولیت کے خلاف ہونا پایا جائے۔ لیکن کبھی کبھی رضا کا نہ ہونا عصمت دری نہیں بھی ہو سکتا خاص طور پر کہ جب یہ مکاشفہ دونوں کے درمیان ہی ایسا راز بن کر رہ جائے جو کبھی کسی پر ظاہر نہ ہو یا جب اِس مکاشفے کے دوران ہی جبر کا ابتدائی عنصر فریق ثانی کی رضا میں بدل جائے۔

ماہین کے دکھتے جسم اور کھولتے ذہن کی عمومیت کی طرف پیش رفت نے ہی اُس پر ظاہر کیا کہ اپنے اِس پہلے جنسی تصادم کا تو کوئی گواہ ایسا نہیں کہ جس کے سبب یہ واقعہ تذلیل کے زمرے میں آئے۔ وہاں تو محض ایک لاش تھی اور دو فرد اور دونوں افراد میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ جو اِس کا تمسخر اُڑا کر عام لوگوں میں اُس کی سبکی کا سامان کرتا پھرے۔ ''تو کیا جبر تذلیل نہیں؟'' جبر تذلیل اُس وقت ہی کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ شروع سے لے کر آخر تک نہ

صرف پایا جائے بلکہ لوگوں تک پہنچ کر رسوائی کا باعث بھی ہو۔ مگر اُس کے معاملے میں تو کچھ بھی ایسا نہیں تھا۔ اُسے یاد آیا کہ نوید کے کم ہمتی کے رویہ کو دیکھ کر اُسے طیفے کا باعمل ہونا کہیں دل میں جگہ بنانے لگا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ طیفے کی جبریہ مہم جوئی اگرچہ آغاز میں انتہائی ناپسندیدہ، اذیت ناک اور قابل نفرت رہی تھی مگر آخری مراحل تک آتے آتے کچھ ایسی بھی خلافِ منشا نہیں رہی تھی۔ کافی سے زیادہ لمحات ایسے بھی گزرے کہ جب اُس کے میلے جسم پر بہتے پسینے کی بو نہ صرف نتھنوں کو اچھی لگنے لگی بلکہ اُس کی اُن حسیات کو مہمیز کرنے لگی کہ جو جبر اور نفرت کے تاثر تلے خوابیدہ ہو چلے تھے۔

طبیعت میں ٹھہراؤ کے آتے آتے ماہین آج صبح کے واقعے کی جزیات کھنگالنے بیٹھی تو اُس کے ذہن پر اب تک چھایا ہوا شدید صدمے کا تاثر اور سارے دن کا بھاری پن کافور ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ذلت اور رسوائی کا شدید احساس کہ جس نے اُسے دن بھر ادھ موا کیے رکھا پھر سے کچھ یوں عمومیت میں منقلب ہونے لگا تھا جیسے بند آنکھوں سے دیکھا گیا کوئی خواب جو بیداری میں اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ کوئی شہادت، کوئی گواہی ہی نہیں، نہ تو چشم دید اور نہ ہی سنی سنائی۔ ''کچھ ہوا'' تبھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شاہد ہو۔ جب کسی نے کچھ دیکھا نہیں تو کچھ ہوا ہی نہیں۔

ماہین کو اپنے ذہن سے عصمت دری جیسی سماجی کالک پونچھنے کا جواز ملا تو اُسے اپنے جسم سے ہونے والی کراہت کا احساس بھی ماند پڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک نئی تاب کے ساتھ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو خشک ہوئے تو وہ ساری امنگیں پھر سے بیدار ہونے لگیں کہ جو نارمل زندگی کے تقاضوں سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن سماج کی جکڑ بندی میں آئے ہوئے شعور کو ابھی کچھ اور تشفی نما جواز چاہئے تھے۔ ''کیا کوئی ایسا مرد جو کسی عورت کی خلوت میں اگرچہ جبراً دراندازی کا مرتکب ہوا ہو مگر اُسے تلذذ کی ہر ممکن معراج تک پہنچانے کا اہل پایا گیا، اُس مرد سے بہتر نہیں کہ جو رجوع تو عورت کی منشا سے کرے مگر اُس سارے عمل کو اپنی کم ہمتی اور نااہلی سے مکدر بنا کر رکھ دے؟'' ماہین نے اِس سوال کا جواب ہر زاویے سے نہ صرف اپنے آپ سے کیا بلکہ اپنے جسم، اپنے جذبات اور اپنے ذہن سے کیا لیکن ہر بار اُسے، ہر چوکھٹ سے

اِس کا جواب اثبات میں ملا۔

شام ڈھلی تو وہ ایک نئی تب وتاب اور بھر پور اعتماد کے ساتھ گھر والوں کے سامنے آئی۔کل تک کی ایک سُکڑی سہمی لڑکی میں جوانی کے بنیادی اجزائے بالیدگی تو ویسے ہی تھے کہ جیسے ہوا کرتے تھے مگر آج اُس کے سہمے پن میں بھی ایک عجیب سی اُٹھان تھی، خود اعتمادی کی اُٹھان۔آج اُس نے ایک کم ہمت شخص کو ایک عورت کے لیے جان دیتے ہوئے دیکھا اور دوسرے دیدہ دلیر کو خود اُسی عورت کی جان لیتے ہوئے۔ایک چوری کرنے آیا تھا مگر بے ہنری اور اناڑی پن کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھا۔دوسرا قزاق تھا، چلتر اور اپنے کام میں بے رحمی کی حد تک یکتا، لہذا اُسے مار کر چلتا بنا۔لیکن کیا عجب کھیل ہے عورت اور مرد کے باہمی تعامل کا کہ عورت کو اپنے اوپر جان نچھاور کرنے والا اتنا یاد نہیں آتا کہ جتنا اُس کی جان لینے والا۔زندگی نے اپنی تمام گتھیاں آج اِس سہمی سمٹی سی لڑکی کے سامنے کھول کر رکھ دی تھیں۔وجہ کوئی بھی رہی ہو مگر ایک تفاخر ماہین کے بدن کے لوچ اور گردن کے عضلات کی اُٹھان میں در آیا تھا۔شاید اُس کے لیے یہی احساس کیا کم تھا کہ اُس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد واقعی اِس قابل تھا کہ اُس جیسی آتش فشاں لڑکی کے لاوے اور اُس کے بہاؤ کو اپنی انگلیوں پر نچا سکے۔یوں رات گئے تک وہ بھول چکی تھی کہ اُس کے دن کا آغاز اُس کے چاہنے والے کی موت کے ساتھ ہوا تھا۔اگر اُسے یاد تھا تو بس وہی میلا بدن، وہی پسینے کی بو، وہی اکھڑ لہجہ، وہی گالیاں دیتی زبان اور وہی سانڈ ایسا کسرتی بدن جو پھر کہیں سے اُس کی شب کی خلوتوں کا دخیل ہو۔کیسی کایا کلپ تھی کہ ماہین ایسی نفیس اور مہذب لڑکی کو طیفے کھوتے کے منہ سے اپنے لیے گشتی اور حرامزادی ایسا تخاطب بھی بھلا لگنے لگا تھا۔

مگر یہ سب کچھ اُس وقت دھرا کا دھرا رہ گیا کہ جب رات کے آخری پہر اُن کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا نہیں بلکہ دھڑ دھڑایا گیا اور اُس کے بعد مسلح پولیس والوں کا جتھا کسی کے گھر میں داخل ہونے کے تمام قانونی لوازمات کو روندتا ہوا نہ صرف اُس کے گھر میں داخل ہوا بلکہ سب گھر والوں کے سامنے ماہین کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا پولیس گاڑی میں یہ جا وہ جا۔خوف کے پیدا کردہ سکوت اور حالات کے جوں کا توں رہنے کو غیرت سمجھنے والے ماہین کے مڈل

کلاسیے والدین نے سماجی تذلیل کے خوف سے آنکھیں موند لیں اور حلقوم سی لیے مبادا اُن کے منہ سے نکلی ہوئی کوئی چیخ کوئی پکار سماجی سکوت خراشی کا باعث ہو کر اُن کی عزت کو داغدار نہ کر دے۔اُن میں تو گھر میں یوں دندنا کر گھسنے والوں سے یہ تک پوچھنے کی ہمت نہیں تھی کہ وہ کس تھانے سے آئے ہیں اور اُن کی جوان بیٹی کو کس جرم کی پاداش میں یوں اُٹھا کر لے جا رہے ہیں۔وہ تو اُن سے یہ تک نہ پوچھ پائے کہ ملکی قانون کے تحت رات کے اِس وقت کسی عورت کو گرفتار کرنے کے لیے لیڈیز پولیس کے ساتھ ساتھ کچھ دیگر قانونی تقاضوں کا بھرم بھی رکھنا پڑتا ہے۔انہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کسی عورت کو رات کے وقت تھانے کی حوالات یا پولیس کی تحویل میں رکھنا غیر قانونی ہی نہیں قابل مواخذہ بھی ہے۔اُن کے نزدیک اگر کچھ مقدم تھا، اہم ترین تھا تو محض یہ کہ کوئی دیکھ نہ لے یا کوئی سُن نہ لے۔بیٹی کی قربانی اگر رات کے اندھیرے میں خاندان کے پندار کو سلامت رکھتی ہے تو سودا کچھ ایسا بھی مہنگا نہیں تھا۔اگرچہ ریڈنگ پارٹی کے انچارج سب انسپکٹر نے جاتے جاتے ماہین کے والد کو بتا دیا کہ وہ کون سے تھانے سے آئے ہیں اور اُن کی بیٹی پر کس کے قتل کا الزام ہے مگر اُس نے گویا سُنا ہی نہیں یوں کہ جیسے اِس نام کی کوئی لڑکی کبھی اُس کی ولدیت میں رہی ہی نہ تھی۔بات یہ بھی نہیں تھی کہ پولیس والوں کو ماہین کے خاندان سے کوئی ہمدردی تھی بلکہ سب انسپکٹر نے محض اس واسطے اُس کے کانوں میں یہ اطلاع ڈالی تھی کہ وہ تھانے پہنچ کر کچی کاروائی ہی میں کوئی مک مکا کر لے اور بیٹی کو واپس لے آئے مگر وہ جانتے ہوئے بھی نہیں جانتا تھا کہ اِس سماجی طبقے کی لڑکیاں گھر سے چاہے جس طور بھی رخصت ہوں، اُن کی زندہ واپسی اِس لیے ممکن نہیں ہوتی کہ باپ کی چوکھٹ پر اُن کا واپسیں قدم پڑتے ہی خاندانی وقار کا خود ساختہ قلعہ زمیں بوس ہو جاتا ہے۔

اِس اچانک افتاد میں ماہین سمجھ ہی نہ پائی کہ اُس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔رات کی تاریکی میں منہ پر باندھ دیے گئے دوپٹے اور پے در پے پڑنے والے مختلف اوزان اور کئی اقسام کی شدت کے تھپڑوں نے اُس کے ہوش گم کر دیے۔گھر سے تھانے تک کا سفر کسی ڈربے کا سا سفر لگا جس میں اتنا شبہ ضرور تھا کہ اُسے نوید کے قتل میں دھر لیا گیا ہے مگر جب تھانہ پہنچنے پر

اُسے ایس ایچ او کے کمرے میں لے جا کر ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا تو اُسے یقین ہو گیا کہ طیفے کھوتے نے اُسے گرفتار کرادیا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود دل میں کہیں کوئی خانہ ایسا ضرور تھا کہ جس میں طیفے سے اُلفت کا بیج ابھی تک سانس لیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ایس ایچ او اپنے ڈیل ڈول اور چہرے مہرے سے کوئی بھلا آدمی ہو سکتا تھا اگر اُس کی بڑھی ہوئی شیو اور باہر کو اُبلی ہوئی آنکھیں ایک سمجھ میں نہ آنے والی ناگوار بو کا پس منظر ساتھ لیے کمرے میں نمایاں نہ ہو رہی ہوتیں۔ شاید کسی سریع الاثر نشے میں ہونے کے سبب اُس کی شخصیت سے دہشت سے زیادہ وحشت کا تاثر جھلک رہا تھا۔ ماہین کو وہاں لے کر آنے والا سب انسپکٹر اگرچہ کمرے سے واپس جا چکا تھا مگر ایس ایچ او کی مسلسل کھلی ہوئی مردنی آلود آنکھیں ماہین پر یوں مرتکز تھیں کہ جیسے کوئی مردہ اپنی کھلی رہ چکی آنکھوں سے نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ماہین کو اُس کی آنکھیں نوید کی اُس لاش کی آنکھوں کی مانند لگیں کہ جنہیں اپنے اوپر مرکوز دیکھتے ہوئے اُس نے باکرہ دوشیزہ سے عورت بننے تک کے مراحل طے کیے تھے۔ اُسے اپنے آپ سے خوفزدہ کرتا ہوا خوف کہیں دم توڑنے لگا تو پولیس کا تمام تر دبدبہ اور ایس ایچ او کے چہرے سے ٹپکتی وحشت سبھی اپنے آپ میں تحلیل ہوتے چلے گئے۔ ماہین نے نیم مردہ آنکھوں سے گھورتے ہوئے ایس ایچ او کو دیکھنے کی بجائے اپنی نگاہیں زمین میں گاڑ لیں۔ اُسے احساس ہو چکا تھا کہ بچ نکلنے کی مہم جوئی کی اگر کوئی مہلت ہو سکتی ہے تو بس یہی ہے۔ اُس کا ذہن ایک بار پھر اُسی انداز میں کام کرنے لگا تھا کہ جیسے ایک رات قبل نوید سے جان چھڑانے کی منصوبہ بندی میں چہار جانب گھوم گیا تھا۔ وہ خود اپنی ذات کی اِس صلاحیت پر حیران تھی کہ دوسری لڑکیوں کے رویے کے برعکس وہ جب جب جس قدر شدید بحرانی کیفیت سے دوچار ہوئی وہ اُتنی ہی زیادہ خود اعتماد ہوتی چلی گئی۔ ایک رات قبل شاید اُس کے لیے تھانے میں اِس طرح لائے جانے کا تصور تک روح فرسا ہو سکتا تھا لیکن آج، اِس وقت وہ کسی بھی الزام، کسی بھی تشدد اور کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔

دوسری جانب کرسی پر نیم دراز ایس ایچ او اگرچہ خود کسی ڈرگ کے زیر اثر تھا مگر پھر بھی

اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک معصوم اور بھلی سی صورت والی سہمی سکڑی لڑکی ایک گھٹیا اور بدنام ترین ہوٹل میں ہونے والی قتل کی واردات میں ملوث ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ہوٹل کے کمرے سے ملنے والی لاش پر کچھ ایسے آثار نہیں تھے کہ جس سے فوری طور پر قتل کا معمہ حل ہو سکتا مگر ہوٹل کے اسٹاف سے ملنے والی شہادتوں اور مقتول کے موبائل فون پر کالز کے ریکارڈ سے جس لڑکی کا وہاں آنا اور مقتول سے رابطے میں ہونا ثابت ہوا تھا وہ اِس وقت اُس کے سامنے موجود تھی۔

''کب سے کر رہی ہے یہ دھندہ؟'' ــــــ ایس ایچ او کی زبان سوکھ کر اکڑنے کے سبب لفظوں کو درست طور پر ادا نہیں کر پا رہی تھی۔ ماہین نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی سر کو اوپر اُٹھایا۔ اُس کی نگاہیں بدستور اپنے پاؤں پر رہیں۔

''گڑی چود ــــــ بتائے گی نہیں کس طرح اور کس چیز سے مارا ہے اپنے یار کو؟'' ایس ایچ او کی زبان کچھ کچھ تر ہوئی تو اُس نے کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اُٹھ نہیں پایا نتیجتاً اُس کی آنکھیں کچھ اور اُبل کر باہر کو نکل آئیں۔ ''حرام زادیاں ــــــ دھندہ کرتے کرتے پھر بندے مارنے پر آ جاتی ہیں اور پھر پھائے لگ کر سِدھی دوزخ میں کنجریاں!!!'' ــــــ ایس ایچ او کا منہ رال سے بھر گیا مگر ماہین نے زبان کھولنے کی بجائے نگاہ نیچی کیے رکھی۔

''تکیہ منہ پر رکھ کر مارا ہے ناں؟ بتا دے بتا دے ــــــ پیار سے پوچھ رہا ہوں ــــــ ورنہ، ورنہ جو ہونا ہے ناں تیرے ساتھ ــــــ تو مر کر بھی عورت ذات کو مَت دیتی پھرے گی کہ رستم ایس ایچ او کے تھانے پر قسمت لے جائے تو جھوٹ نہیں بولنا ــــــ سب بک دینا ــــــ ورنہ جیتے جی ٹٹی کرنے کو ترس جاؤ گی۔''

ماہین اب بھی خاموش رہی۔ ایس ایچ او نے اپنا ہر حربہ اور ہر دا بار ائیگاں جاتے دیکھا تو جوش میں آنے کی بجائے کچھ دیر کے لیے مکمل سکتے کی سی کیفیت میں چلا گیا جیسے مراقبے کے ذریعے اپنی پوری توانائی مجتمع کر کے کوئی کاری وار کرنے والا ہو۔ رستم کی اِس طویل خاموشی نے ایک بار تو ماہین کو بری طرح سے لرزا کر رکھ دیا۔ انجانے خوف کی شدت اُس پر غلبہ پانے لگی تھی مگر جلد ہی اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پورے اعتماد کے ساتھ انہی قدموں پھر سے

کھڑی ہوگئی۔ رستم نے بھی ماہین کواپنی جگہ قائم دیکھا تو ایک بار گڑ بڑایا ضرور کہ آخر یہ لڑکی ہے کیا بلا؟ مگر جب کچھ نہ سمجھ پایا تو میز پر رکھی کال بیل کو دبا دیا۔ محرر جماہیاں لیتا ہوا اُس کے سامنے یوں کھڑ ہوگیا کہ جیسے اُسے دل ہی دل میں گالیاں دے رہا ہو۔ ایس ایچ او نے مخصوص انداز میں اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کوئی بھی نئیں آیا جناب اِس کے پیچھے ___ نہ تو کوئی بندہ اور نہ ہی کوئی ٹیلی فون، نہ ہی کوئی ایم این اے اور نہ ایم پی اے ___ کونسلر تک نے منہ نہیں دکھایا ___ اسکول ماسٹر تو اس کا باپ ہے، بس پنج وقتا نمازی ___ اِس کا تو آگا پیچھا ہی چٹ ہے۔''

''ووئے کیا بکتے ہو ___ آگا پیچھا ہی تو کام کا ہے اِس کا۔'' رستم کی باہر کو اُبلی ہوئی نیم مردہ آنکھیں واپس اپنی جگہ پر آئیں تو اُن میں زندگی بھی لوٹ آئی۔ اب تو وہ خود بھی پوری جولانی میں آ کر دہکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

''ووئے اِسے میرے فارم ہاؤس پر پہنچا دو ایویں دس منٹاں میں ___ اور ہاں اِس گشتوڑی کی ابھی گرفتاری نہیں ڈالنی ___ کوئی کتا بلا آ بھی جائے تو بس ایک ہی بیان کہ ہم نے اِس کو دیکھا تک نہیں۔ ہاں ایک بات اور! پوسٹ مارٹم والے ڈاکٹر نے لاش کے اندر سے جو نمونے لیے ہیں، انہیں ابھی لیبارٹری نہیں بھیجنا ___ سمجھ گئے ناں! میں نہیں چاہتا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ٹائم پر آئے اور درست بھی آئے۔''

۞

﴿۱۵﴾

کاشف پارک کی دوسری جانب بنے ہوئے کارپوریشن کے رکشہ اسٹینڈ پر پہنچا تو ایک دم خیال آیا کہ اُسے تو کچھ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے جانا کہاں تھا۔ اسلام آباد یا پشاور۔ یہ بھی ابھی طے نہیں ہوا تھا کہ بس سے یا ٹرین سے۔ اِس کے ساتھ ہی اُسے احساس ہوا کہ پس انداز کی ہوئی ساری کی ساری رقم تو اُسی کے پاس رہ گئی تھی۔ اب اگر شبیر کہیں جانا بھی چاہے تو کہیں نہیں جا سکے گا۔ شبیر نے یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ اُس نے ساری رقم اُڑا لی اور اب دھوکہ دے کر بھاگ چکا ہے۔ کاشف کے پاس اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ خود کو اپنی اِس خود غرضی پر لعنت ملامت کرے۔ افضل کا قتل تو شبیر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ ہوا سب اچانک بلا کسی نیت یا تیاری کے ہوا۔ تو ایسے میں صرف شبیر کو وہ کیسے قصوروار ٹھہرا سکتا ہے۔ شبیر کی جگہ اگر اُسے افضل کا کھلا ہوا ہاتھ ملتا تو شاید وہ اُس کے ہاتھوں مارا جاتا۔ احساس ندامت سے کاشف زمین میں گڑ کر رہ گیا۔ وہ جلدی سے واپس جائے وقوعہ پر پہنچا تو افضل کی لاش کے گرد کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ پولیس کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی مگر وہ ابھی نہیں پہنچی تھی۔ کاشف کچھ دیر تک لاش کے گرد حلقہ بنائے لوگوں میں شامل رہا لیکن اچھے خاصے ہجوم میں اُسے شبیر کہیں دکھائی نہیں دیا۔

کاشف بوجھل دل اور بھاری قدموں کے ساتھ واپس رکشہ اسٹینڈ پہنچا تو کسی نے پیچھے سے اُس کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے مڑا تو دیکھا کہ اُس کا ایک پرانا گاہک وہاں کھڑا تھا۔ کاشف کو اُس کا نام تو یاد نہیں رہا تھا مگر چہرہ اُس حوالے سے شناسا لگا تو وہ

مسکرا دیا۔ وہ ایک آٹو والا تھا جو ہفتے بھر کی تھکن اُتارنے گذشتہ کئی مہینوں سے صرف اُسی کے پاس آیا کرتا تھا۔ وہ شاید آج کی شام کاشف کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ مگر کاشف تو آج کے واقعے کے نتیجے میں ہونے والی دل گرفتگی کے ہاتھوں اُکتایا ہوا اور اُس کی پہلی ترجیح شبیر کو ڈھونڈنا تھا۔ سُو اُس نے معذرت کرلی۔ آٹو والے نے اُس کا نخرہ جان کر ڈبل فیس کی آفر کی تو کاشف نے اُسے جھڑک دیا۔ کیسا گھٹیا لونڈے باز ہے کہ جسے مجبوری اور نخرے میں فرق کرنے اور فرق رکھنے کی تمیز ہی نہیں۔

اپنے اِس ناشناس قدردان سے جان چھوٹی تو کاشف سڑک پار کر کے میکڈونلڈ کی ایک برانچ کے باہر رکھی ہوئی بینچ پر جا بیٹھا جہاں بچے داخلے کے راستے پر موجود مسخرے کے ساتھ تصویریں بنوا رہے تھے جب کہ مرد حضرات اپنی مختلف الہئیت وشکل خواتین کے ہمراہ یا تو ریستوران میں داخل ہو رہے تھے یا باہر نکل رہے تھے۔ کاشف کو عورتوں کی اِس قدر بھیڑ سے کراہت ہونے لگی۔ ایک دم کہیں سے چڑچڑا پن اُس کے اندر سے نکلا اور اُس کے حواس کو جکڑ بیٹھا۔

''کیسی حیلہ باز اور حیلہ جو مخلوق ہے یہ کہ جس نے اپنی تمام بدصورتیوں کے ہوتے ہوئے بھی مردوں کی زندگی کے ارفع ترین وقت کو اپنی اداؤں میں اُلجھا کر برباد کر رکھا ہے۔ اللہ کی پھٹکار کہ جن کے سبب دنیا میں فساد ہی فساد ہے۔'' عورتوں سے نفرت آمیز کراہت کے سبھی ممکنہ تاثرات اُس کے چہرے پر یوں ثبت ہوئے کہ بہ آسانی پڑھے جا سکتے تھے۔

اتنے میں ایک اور شخص اُس کے ساتھ ہی بینچ پر آ کر بیٹھ گیا۔

''بہت نفرت ہے عورت سے؟''

''ہاں بہت.... دل چاہتا ہے کہ چُن چُن کر مار دوں۔'' کاشف نے عالمِ استغراق میں بات کہہ تو دی مگر پھر فوراً ہی چونک کر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھا___ وہ شبیر تھا جو اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے چلا جا رہا تھا۔ بالکل پرسکون اور مطمئن۔ کچھ دیر پہلے کی کوئی انہونی اُس کے چہرے یا جسمانی زبان سے آشکار نہیں ہو رہی تھی۔ کاشف کی جان میں جان تو آنا ہی تھی لیکن چند لمحے پہلے کا احساسِ ندامت اور چڑچڑا پن بھی کہیں جاتا

رہا۔ اب وہ ایک نارمل اور پرسکون نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ آس پاس عورتوں کی بہتات بھی اب اُسے ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ شبیر کے چہرے پر پھیلی ہوئی طمانیت اب کسی اور ڈھب سے اُسے گڑبڑائے چلی جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ ایک معمولی جسم فروش لڑکا، مفعولیت میں جسم سونپنے کی ریاضت سے گزر کر آج جان لینے کا ہنر سیکھ چکا تھا۔ یہ وارادت جہاں شبیر کے ہاں خود اعتمادی کا پودا ہرا بھرا کر گئی وہاں کاشف پے اِس کا اثر اس کے برعکس ہونے لگا تھا۔ کاشف، جو آج سے پہلے اپنے سابقہ تجربات کی بنا پر اپنے آپ کو شبیر سے برتر خیال کرتا تھا، آج کے واقعے کے بعد اپنے آپ ہی ذہنی طور پر شبیر کی نفسیاتی برتری قبول کر چکا تھا۔ مگر خوش دلی سے نہیں۔ وہ اُس سے مرعوب تو تھا مگر کہیں کوئی نفرت کا پودا اُس کے اندر کی زمین میں جڑیں نکالنے لگا تھا۔ یہ بات مگر شبیر نے بھی کسی اور طور سے محسوس کی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کاشی اُس سے آنکھیں کیوں نہیں ملا رہا۔

''تم مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔'' شبیر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ ساری رقم تمہارے پاس تھی۔'' کاشف خاموش رہا۔ اُس کی نگاہیں اب بھی مسخرے کی حرکتوں پر تھیں۔

''اگر میں اُس حرامی کی جیبیں نہ ٹٹولتا تو مجھے یہ دو سو دس روپے بھی ہاتھ نہیں آنے تھے۔'' شبیر نے جیب سے رقم نکال کر کاشف کو دکھائی۔ ''ہم اِس سے کئی دنوں تک مزے سے کھا پی سکتے ہیں۔''

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں، ڈر کر بھاگا تھا مگر جیسے ہی احساس ہوا کہ ساری رقم میرے پاس ہے تو اُسی وقت واپس گیا مگر تم وہاں نہیں تھے۔ رش چونکہ مسلسل بڑھتا چلا جا رہا تھا اس لیے میں وہاں سے کھسک آیا۔'' کاشف نے اَب کے آنکھیں نیچی کیے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''صفائی دینے کی ضرورت نہیں میرے یار___ چلو اُٹھو اندر چلو آج میکڈونلڈ کا برگر کھاتے ہیں۔'' شبیر نے کاشی کے کندھے پر ہاتھ مارا اور کھڑا ہو گیا۔ کاشی بھی اگرچہ اُس کے پیچھے اُٹھ کھڑا ہوا مگر وہ ابھی تک حیران تھا کہ اتنے بڑے واقعے کے بعد بھی شبیر کیا واقعی

پریشان نہیں یا ایسا ہونا محض دکھاوا تھا۔

شبیر نے آج اپنے معمول سے زیادہ کھایا جب کہ کاشی کی بھوک مر چلی تھی۔ ریستوران میں موجود عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد سے کاشی کا جی پھر سے اُوبھنے لگا تھا۔ جہاں تک اور جدھر نظر جاتی وہاں تک عورتیں ہی عورتیں۔ ٹماٹر کی چٹنی سے اپنی لبڑی ہوئی انگلیاں زبان سے چاٹتے ہوئے وہ کسی چھپکلی کی طرح دکھائی دے رہی تھیں جو بار بار اپنی زبان منہ سے باہر نکال کر مچھر اُچک رہی ہوتی ہیں۔ اِس سے پہلے کہ اُسے اُبکائی آتی وہ اپنا برگر ادھورا چھوڑ کر باہر نکل آیا اور پھر اُسی بینچ پر بیٹھ کر شبیر کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد شبیر بھی اُس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک دونوں خاموش رہے کچھ اِس کیفیت میں کہ جیسے ایک دوسرے سے بہت سی باتیں سانجھی کرنا چاہتے ہوں مگر کرنے سے جھجک رہے ہوں۔ عجیب سی اجنبیت در آئی تھی دونوں میں کہ وہ ایک دوسرے کے دل کا حال جانتے ہوئے بھی اُس پر بات نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

''کہاں جانا ہے؟'' ___ اتنی طویل خاموشی سے کاشف گھبراہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔

''کہیں بھی نہیں۔'' ___ شبیر نے لاپرواہی سے کندھے اُچکا دیے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ مجھے بھی پھانسی لگوانی ہے کیا؟'' ___ کاشف کے لیے شبیر کا جواب اور لہجہ دونوں ناقابل فہم تھے۔

''پھانسی کیوں؟ ہمیں کس نے دیکھا ہے کچھ کرتے ہوئے۔'' شبیر کچھ زیادہ ہی خود اعتماد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم کیوں بھول رہے ہو کہ وہ مُنڈا جاسوس پہلے خفیہ پولیس کا ملازم رہا ہوا تھا ___ آج اگر ہمیں کسی نے نہیں دیکھا تو کل تک باقی کے مُنڈا جاسوس پولیس لے کر ضرور ہم تک پہنچ جائیں گے۔ وہ کھوج لگائیں گے کہ آخری بار وہ کس کس لڑکے سے ملا تھا اور کتنا مال بٹورا تھا ___ پھر اُس کے بعد پولیس کا ہاتھ ہماری گردن پر۔'' کاشی نے کوشش کی کہ بولتے ہوئے اپنی آواز نیچی رکھے۔

''کاشی تم اچھے سے جانتے ہو کہ وہ حرامی کیسا پلسیا رہا ہو گا؟ اکیلا شکار کرتا اور اکیلا ہی کھاتا تھا۔ تم نے دیکھا کہ اتنے لمبے عرصے میں اُس نے اپنے بہت ہی قریبی مُنڈا جاسوس کو بھی

خبر نہیں ہونے دی کہ اُس کا تعلق کس کس سے لڑکے سے رہا اور اُس سے اُس نے کتنا مال کھایا؟ لہذا تسلی رکھو اُس کے پیٹی بھائی ہم تک نہیں پہنچنے والے۔ اور ہاں فرض کیا کہ اُس کے کسی قریبی ساتھی کو اُس کے سارے معاملات کا علم تھا بھی تو پولیس سب سے پہلے اُن لڑکوں پر شک کرے گی جو اس واقعے کے بعد شہر چھوڑ کر باہر نکل گئے ہوں گے۔ یہاں موجود لڑکوں کو کسی نے نہیں پوچھنا۔'' شبیر نے آج شام کے واقعے کے بعد پہلی بار کھل کر بات کی۔ اُسے کاشف کا رویہ عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ نہ تو وہ صورتحال کو سمجھ رہا تھا اور نہ ہی سمجھنے پر آمادہ تھا۔ خوامخواہ کی ضد میں اُس کی سوئی وہیں صبح کو بنائے گئے پشاور یا راولپنڈی کے پروگرام پر اٹکی ہوئی تھی۔

''شاکے! تم بھی بھول رہے ہو کہ افضل کا ایک قریبی ساتھی بھی تھا۔ اُسی کی طرح کا حرامی اور کائیاں مُنڈا جاسوس۔ وہ کتنے عرصے تک ہماری جان عذاب کیے رہا۔ ہم اِدھر رہیں یا نہ رہیں، وہ ہم تک ضرور پہنچے گا۔'' کاشف کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔

''اُسے میں کیسے بھول سکتا ہوں ___ اُس حرامی نے میرا جو حشر کیا تھا وہ مرتے دم تک بھلانے والا نہیں۔ لیکن اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ اِس شہر لاہور میں سینکڑوں لڑکے فٹ پاتھ سے لے کر فائیو اسٹار ہوٹلوں تک اپنی اپنی خوبیوں کے بل بوتے پر جسم فروشی کا دھندہ کرتے ہیں اور اُسی حساب سے مال کماتے ہیں۔ افضل ہو یا اُس کا ساتھی مُنڈا جاسوس اُس وقت تک ہمارا شکار کرتے ہیں کہ جب تک ہم اُن کا شکار بنے رہتے ہیں۔ ایک دنیا ان لاری اڈوں اور ریلوے اسٹیشن کے ہوٹلوں سے اوپر بھی ہے جہاں کوئی مُنڈا جاسوس تو نہیں ہوتا مگر وہاں نیٹ ورک ہوتے ہیں، ہر ایک نیٹ ورک کے اوپر ایک اور بڑا نیٹ ورک۔ اب اُٹھو یہاں سے کھسکو ___ اب ہم اپنا نیٹ ورک بنائیں گے اِسی شہر میں ___ ان تمام گھٹیا ہوٹلوں سے بہت اوپر، اِن بہن چود مُنڈا جاسوسوں کی پہنچ سے بھی دور ___ پھر میں دیکھتا ہوں کہ کون ہم تک پہنچ پاتا ہے۔'' کاشف تو پہلے ہی ذہنی طور پر شبیر کے زیر اثر آ چکا تھا لہذا بلا چوں چرا وہ کسی مسمرائز ہوئے شخص کی طرح اُٹھا اور اُس کے پیچھے چل دیا۔

''روکو! روکو! یہیں روکو ___ کار کی عقبی نشست پر آنکھیں موندے لیٹے ہوئے دانش سعید نے اچانک بیدار ہو کر ڈرائیور پر چلانا شروع کر دیا۔ ڈرائیور نے ایک دم بریک

لگائے تو گاڑی کے ٹائروں کی چرچراہٹ دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔قرب جوار کے لوگوں پریشان ہوکر گاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔مگر اِس سب سے لاتعلق دانش سعید کی نظریں گاڑی سے باہر کسی کو تلاش کر رہی تھیں لیکن ڈرائیور جو پہلے ہی اِس قسم کی ہنگامی بریکوں کا عادی ہو چکا تھا، خاموشی سے نئے احکامات کا منتظر تھا۔ پیچھے سے آنے والی گاڑیوں نے چند لمحے تو توقف کیا مگر پھر ہارن بجنا شروع ہو گئے۔اِدھر اُدھر اطراف سے موٹر سائیکل، سائیکل اور چھوٹی گاڑیاں تو گزر رہی تھیں لیکن بڑی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کا صبر جواب دیے چلا جا رہا تھا۔

''صاحب! میں گاڑی سائیڈ پر لگالوں؟''

''آں ں ں ___ یوں کرو تم مجھے یہیں اُترنے دو اور گاڑی کہیں بھی پارک کرلو۔'' اِس سے پہلے کہ ڈرائیور نیچے اُتر کر اُس کے لیے دروازہ کھولتا دانش سعید گاڑی سے اترا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا سڑک پار کرنے کے بعد دوسری طرف بنی ہوئی کمرشل عمارتوں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔اُس کی نگاہیں اب بھی متلاشی اور کسی کو دیکھنے کے لیے سرگرداں دکھائی دیتی تھیں مگر اِس دوران بوٹ پالش کرنے والے لڑکوں، بھیک کی آڑ میں جوانی کی سودے بازی پر اُکسانے والی بھکارنوں، جھریوں بھرے ہاتھ پھیلائے بوڑھوں اور ازار بند بیچنے کے بہانے جیب تراشی کرنے والے مُسٹنڈوں نے اُس کے گرد چکر کاٹ کاٹ کر اُسے چکرا کر رکھ دیا۔وہ وہاں سے ہٹ کر ایک رنگریز کی دوکان کے ساتھ کھڑا ہو گیا کہ جہاں خواتین کے دوپٹے رنگے جانے کے بعد سوکھنے کے لیے چھاؤں میں پھیلائے جا رہے تھے۔رنگریز کے گرد مکھیوں کی طرح بھنبھناتی عورتوں نے اِس طرح بیک وقت بولنے اور اُسے مختلف نوعیت کی ہدایات ایک ساتھ دینے کی قسم اُٹھا رکھی تھی کہ آوازیں اپنی شناخت کھو کر محض شور کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔لیکن اس کے باوجود یہ شور دانش سعید کے چہرے پر کوئی ناگواری پیدا کرنے میں ناکام چلا آ رہا تھا۔وہاں اگر کوئی تاثرات تھے تو صرف کسی کو تلاش کرنے کے۔کسی کو ڈھونڈنے کے۔

اِسی مقام پر لکشمی چوک سے میو ہسپتال کی جانب جاتے ہوئے ایک پرانی عمارت ہوا کرتی تھی کہ جس کے اُکھڑ چکے پلستر کے بیچوں بیچ ایک ٹکڑا کہیں اُنکا رہ گیا تھا اُس کا نام

''من موہن مینشن'' یاد دلانے کے لیے۔مُنڈا جاسوس افضل کے قتل کے بعد شبیر اور کاشف نے اپنی آزاد زندگی کا آغاز اِسی بلڈنگ کی دوسری منزل پر بنے ہوئے کوئی درجن بھر تنگ و تاریک اور سیلن زدہ کمروں میں سے ایک کمرہ کرایہ پر لے کر کیا تھا۔وہ بلڈنگ اب وہاں موجود نہیں تھی اور نہ ہی تیقن سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ اُس کی جگہ کون سی عمارت تعمیر ہو کر عمارتوں کے اِس قدر پھیلے ہوئے جنگل کا حصہ بن چکی ہے۔وہاں کھڑے کھڑے دانش سعید کو پسینہ آنے لگا تھا۔اِس دوران ہاتھوں میں چھوٹا سا بوتل دان اُٹھا کر اُن میں رکھی تیل کی شیشیاں کھنکھاتے دو چار مالشی بھی اشارے کنائے میں اُس سے پوچھ گئے کہ صاحب لڑکی چاہیے یا لڑکا اور اگر یہ دونوں نہیں تو خالص اور جینوئن ہیجڑا بھی دستیاب تھا مگر کچھ مہنگا۔دانش سعید اِن آفرز کے جواب میں خاموش ہی رہا بس ذرا جگہ بدل لی۔اُس کی تلاش آج بھی رائیگاں جاتی محسوس ہو رہی تھی۔کتنا عرصہ ہوا وہ جب بھی یہاں سے گزرتا یونہی کئی کئی گھنٹے ''من موہن مینشن'' نام کی اُس عمارت کو ڈھونڈتا، اُس کے مکینوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا، وہ راستے بھالتا جہاں اُسے کسی کے قدموں کے جاگتے ہوئے نشان مل سکیں مگر جب کوئی بھی شناسائی کی نگاہ میں نہ اُترتا تو مایوس واپس چلا جاتا۔

''صاحب جی! ایک بات کہوں ___ میں تو پہلے ہی جان گیا کہ آپ تو اپنی صورت سے بنے بنائے نواب ہو۔(آہستہ سے) میرے پاس نوابی شوق کا بھی ٹھیک ٹھاک بندوبست ہے، آپ ایک بار ہاں تو کرو، ایسا خوش کروں گا، ایسا خوش کروں گا کہ آپ پھر کہیں اِدھر اُدھر دیکھو گے بھی نہیں!! کیوں کوئی سیمپل ٹیسٹ کرا نہ دوں؟''

دانش سعید کا چہرہ دن کی روشنی میں بھی پیلا پڑ گیا۔اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس مالشیے سے کیا کہے۔سُو وہاں سے کھسکنے ہی میں عافیت جانی۔اُس کی نظریں اب اپنی کار کو تلاش کر رہی تھیں کہ کہاں پارک ہوئی۔

۞

﴾۱۶﴿

زفیرہ احمد نیند سے بیدار ہوئی تو وہ اپنے فارم ہاؤس کے بیڈروم میں تھی۔ اگرچہ اُس کا سر قدرے بھاری بھاری تھا مگر بدن اِس قدر ہلکا پھلکا کہ ابھی تک ایک انجانے سرور میں لپٹا ہوا ، اپنی لطافتوں میں شاداں اور شانت۔ کتنی ہی دیر تک آنکھیں موندے بار بار انگڑائیاں لیتے ہوئے اپنے گھٹنوں کو سینے سے لگا کر پھر سے پھیلاتی رہی جیسے بدن کی تسکین کو بستر کی نرمی اور ملائمت میں سمونا چاہ رہی ہو۔ جسم میں در آئی آلس اور اُس کی کسمساہٹ دور ہوئی تو اُس نے پھر سے پوری آنکھیں کھول لیں۔ اب کے شعور دھیمے ہوتے ہوئے سرور پر غالب آنے لگا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی کمرے کی چھت اور دیواروں کو تکتے رہنے کے بعد وہ اچانک ہڑ بڑائی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ چکا تھا۔

''میں تو بڑے صاحب کے فارم ہاؤس گئی ہوئی تھی تو پھر یہاں اپنے گھر کیسے پہنچی؟

''اپنے ہی کمرے میں ہونے کا اعتماد متزلزل ہونے لگا تو زفیرہ نے جلدی سے اُٹھ کر کھڑکی کے بلائنڈز ایک جانب ہٹا دیے۔ وہ اُس کا اپنا ہی گھر تھا۔ ''مگر میں یہاں پہنچی کیسے؟'' اُس نے غیر شعوری طور پر اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا ___ وہ حسب عادت صرف انڈر گارمنٹس میں تھی۔ حیرت تو اُسے اس بات پر تھی کہ یہ انڈر گارمنٹس بھی اُس کے اپنے تھے لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ جس لباس میں وہ بڑے صاحب کے ہاں گئی تھی ، یہ اُسی کے نیچے پہنے گئے تھے یا اُس نے کسی وقت بعد میں پہنے ہیں۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہاں جاتے ہوئے اُس نے کون سا لباس پہنا تھا۔ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے کہیں بھی کوئی اُترا ہوا لباس

دکھائی نہیں دیا۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں وہ سر جھکائے صوفے پر بیٹھ گئی۔ معاً اُسے اپنے موبائل فون کا خیال آیا۔ اُس نے لپک کر بستر کو اوپر نیچے کر ڈالا مگر موبائل کہیں بھی نہیں تھا۔ نہ بستر پر اور نہ ہی بستر کے نیچے۔ وہ اُسی حالت میں اپنے بغلی اسٹڈی روم کی طرف گئی۔ سامنے صوفے پر اُس کا اُترا ہوا لباس بکھرا ہوا تھا۔ اُسے یاد آ گیا کہ یہی وہ لباس تھا جسے پہن کر وہ بڑے صاحب سے ملاقات کے لیے گئی تھی۔

''تو پھر یہ یہاں کیسے اُتارا گیا؟'' ___ زفیرہ کے ذہن میں بڑے صاحب سے ملاقات کی جو آخری یاد اُبھرنا شروع ہوئی وہ ایک وسیع و عریض بیڈروم کے کونے میں بنائی گئی بار میں بیٹھ کر وہسکی سے شغل کرنے کی تھی۔ اُس کے بعد کیا ہوا، اُسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیران ہی نہیں انتہائی پریشان ہوتی چلی جا رہی تھی کہ کہاں بڑے صاحب کا فارم ہاؤس اور کہاں یہ مونال سے بھی اوپر مارگلہ کی پہاڑیوں کی آغوش میں اُس کا خفیہ ٹھکانا۔ اُس کے ذہن میں سب سے بڑی کنفیوژن یہ تھی کہ آیا یہاں تک وہ خود پہنچی یا کوئی اُسے چھوڑ گیا۔

''لیکن یہاں مجھے کون چھوڑ کر جا سکتا ہے کیونکہ بڑے صاحب کو تو اِس جگہ کا اتنی جزیات سے علم ہی نہیں ___ تو کیا بڑے صاحب کو میرے اِس خفیہ ٹھکانے کا بھی پوری تفصیل سے علم ہے۔'' زفیرہ کو خجالت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہسکی کے دو چار پیگ سے وہ اِس قدر اُلٹ سکتی ہے کہ اُس کا حافظہ ہی اُس کا ساتھ دینے سے انکاری ہو جائے۔ ایک شرمندگی سی تھی کہ شراب پی کر آؤٹ ہو جانے کے بعد کون اُسے یہاں پہنچا گیا کیونکہ اگر وہ اپنے حواس میں نہیں رہی تھی تو یہاں تک گاڑی چلا کر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ بڑے صاحب کے فارم ہاؤس پہنچنے کے بعد تو اُس نے اپنا ڈرائیور اور گاڑی بھی اِس ہدایت کے ساتھ آفس بھجوا دی تھی کہ واپسی پر اُسے بُلا لیا جائے گا۔

''تو کس نے بُلایا ڈرائیور کو ___ میں نے تو نہیں بلایا اور نہ ہی وہ ڈرائیور میرے اِس گھر کا پتا جانتا تھا ___ تو کیا میں خود چلا کر آئی گاڑی؟ جب کہ گاڑی تو میرے پاس ہی نہیں تھی۔'' ذہن میں اُٹھنے والے سوالوں کی بوچھاڑ نے زفیرہ احمد کو جھنجلا کر رکھ دیا۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ بڑے صاحب کے پاس جاتے ہوئے وہ اُس

کے جسمانی شراکت کے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے ہر طرح سے تیار ہو کر گئی تھی۔''

''تو کیا وہاں ایسا کچھ ہوا؟ اگر ہوا تو اُسے یاد کیوں نہیں۔'' اُس نے اپنا برا ہٹا کر اپنے جسم کو ٹٹولا، اِدھر اُدھر جلد پر کوئی نشان دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ بھی تو ایسا نہ تھا کہ جو بڑے صاحب کے ساتھ اُس کی جسمانی سانجھ کی گواہی بن سکتا۔ ایک ہلکا سا اطمینان کا جھونکا اُس کے پاس سے آ کر گزر گیا۔ ''لیکن بڑا صاحب تو ایسی کسی سانجھ کے قابل ہی نہیں کہ جو فریق مخالف کے جسم پر تو کیا، اُس کے ذہن تک میں کوئی نقش باقی رکھ سکے۔'' اچانک زفیرہ کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ باہر پورچ یا ڈرائیو ایریا میں دیکھ لیا جائے کہ کوئی گاڑی موجود ہے کہ نہیں۔ وہ یکا یک اُٹھی تو اُس کا پاؤں ہلکا سا مُڑ گیا۔ درد کی ایک لہر جہاں اُس کے ٹخنے میں بجلی کی طرح کوندی وہاں بدن کے نہاں حصے میں شدید اینٹھن کا احساس ہوا۔ وہ پھر سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''یقیناً ایسا کچھ ہوا ہے ___ تو کیا بڑے صاحب کی اہلیت کے متعلق اُس تک پہنچنے والی ساری خبریں غلط تھیں۔'' زفیرہ کی آنکھیں اندرونی کرب سے بھر آئیں۔ اُسے شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ اُس کے سامنے آنے والے پے در پے بحرانوں کا ذمہ دار کوئی اور نہیں، صرف اُس کی حد سے بڑھی ہوئی غیر ضروری خود اعتمادی ہے۔ اب کے وہ آہستہ سے اُٹھی اور اسٹڈی روم کی اُس کھڑکی کا پردہ اُٹھا دیا کہ جو پورچ اور ڈرائیو وے کی طرف کھلتی تھی۔ حیرت کا ایک اور جھٹکا اُس کی اپنی گاڑی کی صورت وہاں موجود تھا۔

''نجانے میرا ڈرائیور مجھے کس حالت میں یہاں لے کر آیا ہوگا؟ لیکن اُسے یہاں کا پتا کیسے معلوم ہوا ___ یہ تو میرے علاوہ صرف میرے سینئر ڈرائیور کو معلوم ہے اور وہ تو آج ڈیوٹی پر ہی نہیں۔'' اِن سب سوالوں نے زفیرہ احمد کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کے ساتھ ہوا کیا ہے اور اب اُسے کیا کرنا چاہیے؟''

اتنے میں اُس کی نگاہ شونی پر پڑی جو اُس سے خاصا پرے اسٹڈی میں داخلے کے مین دروازے کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں اگلی ٹانگیں آگے پھیلائے اور ٹھوڑی چوبی فرش پر ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھا ہوا تھا۔ زفیرہ کو شونی کے اس انداز پر بہت پیار آیا کہ کتنا سمجھدار

ہے وہ، اُلجھاؤ کے اِس ماحول میں اُسے قطعی ڈسٹرب نہیں کر رہا تھا۔ اُس نے پچکارتے ہوئے جھک کر شونی پر اپنا التفات ظاہر کیا مگر وہ اُٹھا اور زفیرہ کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے نکل کر اپنی مخصوص جگہ کی طرف چلا گیا۔ زفیرہ شونی کے اِس رویے پر حیران تھی۔ ماضی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ اس طور کسی اجنبی رویے کا مظاہرہ کرتا۔ اپنی باڈی لینگوئج سے وہ خاصا تھکا ہوا اور اُچاٹ سا دکھائی دے رہا تھا۔ شونی کو اس طرح لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ کر زفیرہ کے ذہن سے اب تک کی ساری باتیں، سارے سوالات کہیں اِدھر اُدھر بکھر گئے اور وہ اُس کے پیچھے ہو لی۔

مگر ابھی دو چار قدم ہی اُٹھے ہوں گے کہ موبائل فون کی گھنٹی نے اُس کو وہیں پر روک لیا۔ زفیرہ نے آواز کی سمت تلاش کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ اُس کے اسٹڈی ٹیبل پر پڑے ہوئے ہینڈ بیگ سے آ رہی ہے۔ ''یہ بیگ یہاں کہاں سے آ گیا اور اب تک مجھے دکھائی کیوں نہیں دیا؟'' زفیرہ کا ذہن شونی سے ہٹ کر پھر سے اُسی صورتحال میں اُلجھ گیا کہ جس کا سامنا اُسے کچھ دیر قبل تھا۔ ہینڈ بیگ تک پہنچنے اور اُس میں سے موبائل فون نکالنے میں اُس نے کچھ زیادہ دیر نہ لگائی۔ اسکرین پر وہی نام چمک رہا تھا جو زفیرہ کو اِس وقت سب سے زیادہ مطلوب تھا ___ ''بڑا صاحب''۔ اُس نے کال ریسیو کرنے میں لحہ بھر بھی تعامل نہ کیا۔

''کیسا محسوس کر رہی ہو زفیرہ احمد؟''

''کیا مطلب؟ ___ میں پاگل ہو رہی ہوں ___ کون لایا مجھے؟ ___ کیسی پہنچی میں یہاں پر؟ مجھے کچھ یاد نہیں اور میں تمہارے فارم ہاؤس سے اِدھر اپنے اُس گھر میں پہنچ چکی ہوں جس کی تجھے خبر ہی نہیں کہ کہاں واقع ہے، کس جگہ پر ہے؟ یہ سب کیا ہے؟ مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ یہ سب کیا ہے؟ کون مجھے میری گاڑی میں یہاں چھوڑ گیا ہے؟'' ___ زفیرہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔

''پلیز تہذیب ___ شائستگی!!! مجھے بن پئے ''تو'' کہلوانے کی عادت نہیں زفیرہ احمد اور میرا خیال ہے تم اِس بات کا دھیان رکھو گی۔'' بڑے صاحب کے لہجے میں اتنی سفاکی تھی کہ زفیرہ چاہتے ہوئے بھی اُسے وہ جواب نہ دے سکی کہ جو اُس کی زبان پر آیا ہوا تھا۔ کچھ دیر دونوں طرف خاموشی رہی۔

''تم میرے پاس کب آئی تھیں؟''

''بارہ کو___ آئی مین(I mean) بارہ فروری کو!! مگر کیوں؟''

''اپنے موبائل پر آج کی ڈیٹ دیکھو!!!''___ بڑے صاحب نے اُسی سفاکی سے حکم دیا۔زفیرہ نے فون پر تاریخ دیکھی۔

''چودہ فروری___ اُوہ میرے خدا___ مجھے تمہارے پاس آئے ہوئے دودن ہو چکے ہیں اور مجھے اِس کا احساس نہیں۔آخر کیا کیا ہے تم نے میرے ساتھ؟''___ زفیرہ احمد تقریباً چیخ پڑی تھی۔

''تم نے پھر مجھے تو کہہ کر پکارا؟''___ بڑے صاحب کا لہجہ سفاک تر ہو چکا تھا۔

''میں پوچھتی ہوں کیا کیا ہے تم نے میرے ساتھ___ جواب دو مجھے!!! کیا ہوا ہے پورے دودن میرے ساتھ؟''___ زفیرہ احمد کی آواز غصے کی شدت سے پھٹ کر رہ گئی تھی۔

''بکواس نہیں کرو میری جان___ تمہارے ہینڈ بیگ میں ایک یو ایس بی رکھی ہوگی، اُسے اپنی LED میں لگاؤ اور پھر خود ہی دیکھ لو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔'' بڑے صاحب کا سفاکیت لیے ہوئے لہجہ غیر فطری طور پر نرمی اختیار کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔اِس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے فون بند ہو گیا۔زفیرہ نے اپنا ہینڈ بیگ کھنگالنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں کی۔واقعی اُس میں ایک یو ایس بی رکھی تھی۔تجسس کی انتہا تک پہنچی ہوئی زفیرہ احمد نے اسٹڈی روم کی LED آن کرنے میں کچھ بھی توقف نہ کیا اور پچپن انچ کی اسکرین کے روشن ہوتے ہی یو ایس بی ساکٹ میں ٹھونس دی۔

تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔'' بڑے صاحب کا سفاکیت لیے ہوئے لہجہ غیر فطری طور پر نرمی اختیار کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔اِس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے فون بند ہو گیا۔زفیرہ نے اپنا ہینڈ بیگ کھنگالنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں کی۔واقعی اُس میں ایک یو ایس بی رکھی تھی۔تجسس کی انتہا تک پہنچی ہوئی زفیرہ احمد نے اسٹڈی روم میں رکھا سسٹم آن کرنے میں کچھ بھی توقف نہ کیا اور پچپن انچ کے مانیٹر کے روشن ہوتے ہی یو ایس بی ساکٹ میں ٹھونس دی۔LED

اسکرین پر موجود منظر زفیرہ احمد کا خون خشک کر دینے کے لیے کافی تھا۔وہ اُسی بیڈ پر برہنہ حالت میں موجود تھی کہ جو آخری بار اُس کی یادداشت میں رہ گیا تھا۔وہ دو وحشی ساخت کے نیگروز کے ساتھ اِس طرح حالتِ مجامعت میں تھی کہ جیسے وہ دونوں بیک وقت اُس کے محبوب رہے ہوں۔جس قدر جنسی وحشت کا مظاہرہ اُن دونوں کی جانب سے کیا جا رہا تھا اُس سے کئی گنا زیادہ التفات اور گرم جوشی خود اُس کی جانب سے تھی۔اپنی طرف سے بےشرمی کی انتہا دیکھ کر زفیرہ کی آنکھیں اوپر کو نہیں اُٹھ رہی تھیں۔حیرت تو یہ بھی تھی کہ وہ کسی ڈرگ یا کسی میڈیسن کے زیر اثر بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ وہ سب کچھ اُس کی ایما اور خواہش پر کیا جا رہا ہو۔اگر اسے محض اداکاری بھی کہا جاتا تو اِس کی ہدایت کار وہ خود لگ رہی تھی۔

زفیرہ کے بدن کا خون جم کے رہ گیا مگر سر سیفٹی والو کے بغیر ایک ایسا پریشر ککر جو پھٹنے کے قریب آ چکا ہو۔اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔آنکھوں سے آنسو نہیں بلکہ آگ کے شرارے بہہ نکلے۔کاروبار بچاتے بچاتے وہ اپنے آپ کو بھی داؤ پر لگا بیٹھی تھی۔زندگی بھر کی محنت سے کھڑی کی گئی ایڈورٹائزنگ ایمپائر سمیت اُس کی عزت، دولت، شہرت، ساکھ اور مستقبل سبھی کچھ ایک یو ایس بی میں بند ہو چکا تھا۔زفیرہ احمد کی حد سے زیادہ خود اعتمادی نے اُسے مکمل طور پر بربادی کے دہانے پر پہنچا دیا تھا کہ جہاں سے بچ نکلنے کا نہ کوئی راستہ اور نہ ہی کوئی پگڈنڈی۔مگر اِس کے باوجود وہ ابھی تک اپنی بقا کی جنگ لڑتی چلی آ رہی زفیرہ احمد ذہنی طور پر ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔انتہائی کرب کے ان لمحات میں بھی اُس کا ذہن بار بار ایک ہی سوال کے جواب کی جستجو میں تھا کہ یہ سب ہوا بھی تو کیسے ہوا؟ اگر اُسے شراب ہی میں کچھ ملا کر پلا دیا گیا تھا تو وہ بستر پر ہونے والی روداد کے دوران ہوش میں کیوں تھی اور اگر ہوش میں تھی تو اُسے یہ سب کچھ یاد کیوں نہیں؟

یکا یک ایک اور سوال اُس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا کہ بڑے صاحب نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ اگر اُسے اُس کا جسم ہی چاہئے تھا تو وہ خود اُس کے پاس چل کر جا چکی تھی۔اُس نے ثنیعہ کی خواہش کسی اور کے لیے کی تو اُس کی تعمیل بھی کر دی گئی تو پھر یہ سب کیوں؟ کیا بڑے صاحب کو اِس کے سوا بھی کچھ چاہیے؟ اگر چاہیے تھا تو اُس کا بھی برملا اظہار

ہوتا۔ لیکن ایسی گھٹیا حرکت !! اِس کا تو تصور بھی نہیں کا جا سکتا تھا کہ کوئی ایسا شخص جس کی نہ صرف مقتدر لوگوں بلکہ اقتدار کے راستوں تک من چاہی رسائی ہو، کیا وہ بھی کسی عورت کے ساتھ اِس طرح کا سلوک کر سکتا ہے۔ مانا کہ وہ انڈر ورلڈ کی بااثر ترین شخصیات میں سے ایک ہے مگر اُس دنیا کے بھی کچھ اَن لکھے اصول ہوتے ہیں، کچھ دکھائی نہ دینے والے ضابطے ہوتے ہیں کہ جن پر کاربند رہتے ہوئے جرم کا نظام چلتا ہے مگر بڑے صاحب نے تو اُس کے معاملے میں سبھی کچھ پس پشت ڈال دیا۔ آخر کون سی ایسی رنجش تھی کہ جس کے سبب اتنا بھیانک کھیل کھیلا گیا؟

ثنیعہ کا نام ذہن میں آیا تو زفیرہ خود بھی اُس کی خیریت کے بارے میں گڑ بڑا کر رہ گئی۔ اُس نے جلدی سے اپنے موبائل فون میں مسڈ کالز چیک کیں مگر وہاں دیگر درجنوں کالز کا ریکارڈ تو تھا مگر ثنیعہ کی جانب سے کوئی کال نہیں تھی۔ ''کہیں وہ بھی تو میرے جیسے حالات کا شکار نہیں ہوگئی؟ وگرنہ کیسے ممکن تھا کہ دو دن گزرنے کے بعد بھی اُس کی جانب سے کوئی کال موصول نہ ہوتی؟'' ــــــ

زفیرہ نے کالز انڈیکس سے ثنیعہ کا نمبر نکالا اور اُسے ملانے لگی ہی تھی کہ بڑے صاحب کی طرف سے آنے والی کال نے پہلے گھنٹی بجادی۔ اسکرین پر بڑے صاحب کا نام دیکھتے ہی زفیرہ کا پورا جسم غصے کی شدت سے کپکپانے لگا۔ اُس کا دل چاہا کہ اُس شیطان کا جسم تو کیا اُس کی روح تک کو فون کے اندر سے نکال کر ریزہ ریزہ کر دے مگر یہ اُسی وقت ممکن تھا کہ جب وہ اُس کے سامنے ہوتا۔ سرِدست تو اپنے آپ کو سنبھالنا اور دشمن کے روبرو کمزور نہ دِکھنا ہی عقلمندی بھی تھی اور بہادری بھی۔ سُو زفیرہ احمد نے خاصی حد تک اپنے کو سنبھال لیا۔

''کیا حال ہیں جانِ من !! وہ یو ایس بی مِلی ؟'' ــــــ بڑے صاحب کی آواز میں عیاری کی کھنک اور حرامی پن کا لوچ، دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

''جی مِلی ــــــ اور میں نے دیکھ بھی لی'' ــــــ زفیرہ احمد کی آواز میں خطرناک حد تک ٹھہراؤ آ چکا تھا کہ جس کے سبب بڑے صاحب کی ساری توقعات، سارے اندازے چوپٹ ہو کر رہ گئے اور کچھ دیر کے لیے تو اُس سے بولا بھی نہ گیا۔

''دیکھ بھی لی؟'' ــــــ اب کے بڑے صاحب کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش آ چکا تھا۔

''جی دیکھ لی اور داد دیتی ہوں کہ آپ ایک اچھے فلم ڈائریکٹر ہو سکتے ہیں بشرطیکہ کچھ گُر میری جیسی خادمہ سے بھی سیکھ لیں ــــــ اور ہاں یہ مووی بنانے کی ضرورت کیوں پڑی سرکار!! ہم تو ویسے بھی آپ کی مٹھی میں، ویسے بھی آپ کے نوکر!!'' ــــــ اپنے اندر در آئے اعتماد، حوصلے اور غصے کو دبا لینے کی قدرت پر تو خود زفیرہ بھی حیران ہو رہی تھی۔ ایسا تو اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک بہت بڑا شخصی بحران اُس کے اندر اِس طرح کی جرات مندی کا وصف پیدا کر دے گا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اُس کا اعتماد سے بھرپور ایک ایک لفظ نہ صرف برچھی کی طرح بڑے صاحب کے دل میں اُتر رہا ہے بلکہ اُس نے جس قسم کا ردعمل زفیرہ احمد کی جانب سے سوچ رکھا تھا، اُس کی بجائے اُس کے برعکس صورت حال کا سامنا کرنا کس قدر روح فرسا رہا ہوگا۔ بڑے صاحب کی جانب سے بار بار کی خاموشی اور بولنے پر ہلکی سے کپکپاہٹ زفیرہ کے حوصلے اور اعتماد کو مزید بڑھاوا دے رہی تھی۔

''تم کہاں ہماری نوکر اور کب ہماری مُٹھی میں؟''

''بڑے صاحب! موقع تو دیا ہوتا، پرکھا تو ہوتا، جانا تو ہوتا ــــــ لگتا ہے کہ آپ کو اب ہماری ضرورت نہیں رہی جو یوں چلے ہیں ہماری تصویروں سے دل بہلانے!!'' بڑے صاحب کی طرف سے خاموشی رہی تو زفیرہ احمد نے ایک اور پینترہ بدلا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے۔''

''آپ نے بلایا تو ہمیں اپنے لیے تھا پھر غیروں کے حوالے کیوں کر دیا؟''

''میں نے کب بلایا تھا اپنے لیے؟ ــــــ جس جسم کو کتوں کے چاٹنے کی لَت لگی ہو اُسے تو کتوں کے لیے بلایا جاتا ہے، لہٰذا میں نے بھی کتوں کے لیے بلوایا اور انہی کے آگے ڈال دیا۔'' بڑے صاحب کی بات اب کے زفیرہ کو برچھی کی طرح لگی اور روح میں پیوست ہوتی چلی گئی۔ برداشت، عدم برداشت کی تفریق نہ رہی تو حوصلہ جواب دینے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ مقام سود وزیاں سے گزر جاتی، ایک بار پھر برداشت کا دامن ہاتھ میں آ گیا اور وہ شانت ہوتی چلی گئی۔

''کتے کہاں تھے بڑے صاحب!! وہ تو گدھے تھے__ لگتا ہے کہ صاحب سے بڑا صاحب بن کر آپ کو کتے اور گدھے کی تمیز باقی نہیں رہی__ خیر بتلایئے مجھے کون سی ڈرگ ،کس وقت اور کس چیز میں ملا کر پلائی یا کھلائی تھی۔''

''چھوڑو اِس بات کو__ یہ بتاؤ کہ تھی کیسی__ کیا کمال چیز کہ آدمی ہوش میں نہ ہوتے ہوئے بھی ہوش میں ہو اور جب ہوش میں آئے تو کچھ یاد بھی نہ ہو۔'' بڑے صاحب کا طویل قہقہہ اپنی فطری طوالت کے بعد معدوم ہوا تو زفیرہ ایک نیا سوال سونتے وہاں موجود تھی۔

''مجھ پر محض تجربہ مطلوب تھا یا ایجنڈے میں ابھی کچھ اور بھی ہے؟''

''اتنی اُتاولی ابھی سے؟ ابھی تو صرف مووی بنی ہے، اس کی نمائش کا تو انتظار کرو__ اتنی بڑی ایڈورٹائزنگ امپائر ''مہ نور'' کی اونر زفیرہ احمد کے حسین جسم کی جنسی شدت اور وحشت کی نمائش ہے، کم از کم عالمی سرکٹ میں تو ہونی چاہیے۔ دنیا تو دیکھے کہ زیرو فگر ماڈلز کی فگر بیچنے والی کی خود کی فگر کیا ہے اور کیسا کیسا حشر بپا کرتی ہے اپنی راتوں کو رنگین بنانے کے لیے۔''

''بھڑوا ہونا ایک پیشہ نہیں بلکہ ذہنیت ہے__ state of mind__ بھڑوا جتنی دولت کما لے، جس منصب تک بھی جا پہنچے مگر رہتا بھڑوا ہی ہے، عورت کے جسم کو بیچ کر تسکین حاصل کرنے کی جبلت اُس کے جینز سے جاتی ہی نہیں۔ تو بھی پانچ پانچ روپے کی بھڑواگیری کرتے کرتے اب اربوں کھربوں کی دلالی کرنے لگا ہے مگر مردانگی کی تہمت کو کہیں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ ہمت تھی تو خود آتا میرے بستر پر مگر یہ تیرا نصیب کہاں! مجھے ترس آتا ہے تم پر__ کتنے بدنصیب ہو تم کہ عورت کا جسم بیچتے بیچتے بڑا صاحب تو بن گئے مگر عورت کا جسم تمہارے نصیب ہی میں نہیں رہا__ تمہارے نصیب میں تو یہ گدھے لکھ دیے گئے ہیں کہ جنہیں دیکھ دیکھ کر تم اپنی محرومیوں کا ماتم کرتے رہتے ہو۔ تم اب بھی خالی ہاتھ پھر سے ایک عورت کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہو۔ بول رے بھڑوے!!! اَب تجھے کیا چاہیے؟''__ برداشت کا دامن زفیرہ احمد کے ہاتھوں سے مکمل طور پر چھوٹ چکا تھا۔

دوسری جانب سے بڑے صاحب کا ایک بلند آہنگ قہقہہ زفیرہ احمد کے ردِعمل کو اور شہ دے گیا۔ ''بولو ناں کیا قیمت لگائی ہے اپنی اوقات کی اَب کہ جب غیرت، ضمیر اور انسانیت

تو پہلے ہی بیچ چکے؟''

''قیمت تو اب لگے گی تمہاری اوقات کی زفیرہ احمد__ بہت پرانے کھاتے کھلیں گے لین دین اور حساب کتاب کے__ وہ بھی کہ جو تمہیں شاید یاد بھی نہ ہوں اور یاد رکھنا!! اِن کی ادائیگی کراتے کراتے تمہارے بدن پر کپڑے بھی رہنے دیے تو میرا نام بدل دینا۔'' بڑے صاحب کا لہجہ پھر سے سفاک تر ہو چلا تھا۔

''کپڑے تو میں خود ہی اُتار چکی__ اب مزید تم کیا اُتارو گے؟''

''ابھی وہ والے کپڑے نہیں اُترے، جب وہ والے کپڑے اُتریں گے تو تم یہ والے کپڑے پہن کر بھی خود کو ننگی لگو گی__ میں تمہارا جسم ہی نہیں، تمہاری روح تک کو برہنہ کر دوں گا۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟''__ زفیرہ روہانسی ہو چکی تھی۔

''کچھ زیادہ نہیں!! مہ نور ایڈورٹائزنگ کے صرف اکاون فیصد شیئر۔''

''ہرگز نہیں!! تم پاگل تو نہیں ہو چکے۔'' زفیرہ حیرت اور غصے کی شدت سے چیخ پڑی۔

''پاگل میں نہیں ہوا، پاگل تم ہو جاؤ گی جب تمہاری پہلی ویڈیو یوٹیوب پر اَپ لوڈ ہو گی۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے__ میں تمہاری جان لے لوں گی حرامزادے!!''__ جواب میں بڑے صاحب کا ایک بار پھر قہقہہ جس میں اب سفاکیت کی بجائے تمسخر گھلا ہوا تھا۔

''چلیں__ جب جان لو گی تو دیکھیں گے__ فی الحال آج رات آٹھ بجے یوٹیوب پر اپنی پہلی ویڈیو دیکھ لینا، لنک بھیج دوں گا۔''

''نہیں بڑے صاحب!! تم ایسا نہیں کرو گے__ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔'' زفیرہ کا لہجہ اچانک سے بدل کر منت اور لجاجت پر آ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے آج رات آٹھ بجے تک سوچ لو!!''

''نہیں آج نہیں__ کل رات آٹھ بجے تک پلیز!!!''

۞

﴾17﴿

ماہین کو ایس ایچ اُو کے فارم ہاؤس پر پہنچانے کے بعد اُس کے بیڈ روم تک سامنے کے راستے کی بجائے ٹارچر سیل سے گزار کر اِس طرح لے جایا گیا کہ وہاں تک جاتے جاتے اُس میں کسی قسم کی مدافعت کی سکت باقی نہ رہے۔ بیرک نما کمرے کی سیاہ روغن سے پینٹ کی گئی دیواروں پر سُرخ رنگ سے بنی ہوئی وحشیانہ تشدد کی بڑی بڑی پوسٹر نما تصویریں دل دہلا دینے کے لیے کافی تھیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ عجیب وغریب اشکال کے آلاتِ تشدد کو اس طرح نمائش کے لیے رکھا گیا تھا کہ سخت گیر ترین مجرم کا بھی پتہ پانی ہو جائے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ماہین نے اِس ماحول کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں لیا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک اوزار اور ایک ایک تصویر کو اُس وقت تک غور سے دیکھتی رہتی کہ جب تک ایک اکھڑ سا کانسٹیبل اُسے بازو سے پکڑ کر آگے کو نہ دھکیل دیتا۔

''نہ دیکھ غور سے اِن کو___ یہ جو ایس ایچ اُو ہے ناں!! بڑا ای کوئی حرام دا ہے، تیرے سارے چاہ پورے کر دے گا تے فیر تیری وی اِک تصویر ایتھے ٹنگی ہوئے گی___ ایس دیوار تے، ایس جگہ!!'' ___ کانسٹیبل نے چڑ کر ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن ماہین نے اُس کی کسی بات کا نوٹس نہ لیا اور اپنی مرضی سے چلتی ہوئی بیڈ روم تک پہنچی جہاں ایس ایچ اُو رستم پہلے سے پہنچ کر اپنی وردی اُتار رہا تھا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر نہ تو کانسٹیبل جھجکا اور نہ ہی رستم نے کسی قسم کی پردہ داری کا تردد کرنا مناسب سمجھا۔

''سیر سور کرادی ہے ناں بچی کو!!'' رستم نے پتلون اُتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے

استفساریہ انداز میں کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

''جی سرکار کرا تو دی ہے لیکن ہے بہت شوقین کُھلے پُولے کی___ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی رہی ہے___ اگر اجازت دیں تو اس کا تھوڑا بہتا شوق پورا کرا کے پھر ناں لے آؤں؟''

''اُو بھڑوی کے___ میں مر گیا ہوں کیا جو تو شوق پورا کرائے گا___ جا دفعہ ہو جا۔''

کانسٹیبل کے جاتے ہی رستم نے ایک طرف سر جھکائے کھڑی ماہین کو بالوں سے پکڑا اور یکے بعد دیگر چار پانچ تھپڑ اتنے زور سے اُس کے چہرے پر ٹکائے کہ جہاں نچلا ہونٹ پھٹنے کے سبب خون رِسنا شروع ہوا وہیں درد کی شدت سے آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اِس استقبالیہ مدارت کے بعد رستم کا خیال تھا کہ وہ خوف زدہ ہو کر روئے گی، چلائے گی لیکن اِس اچانک پڑنے والی اُفتاد سے قطع نظر نہ تو وہ خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی رو اور چلا رہی تھی۔

''اب تو اِس میں کوئی شک ہی نہیں کہ اُس بھڑوی کے پُتر کا قتل تو نے کیا ہے۔'' رستم نے ماہین کے بالوں کو بل دے کر اِس طرح زور سے پیچھے کی طرف کھینچا کہ گردن مُڑنے کے سبب اُس کا چہرہ اُبھر کر رستم کے چہرے کے برابر آ گیا۔ ''تو بہت ڈھیٹ ہے ناں تو میں بھی بڑا خبیث ہوں___ تجھے درد نہیں ہوتا اور مجھے دُکھ نہیں ہوتا___ اب دیکھتے ہیں کہ تجھے درد پہلے ہوتا ہے یا مجھے دُکھ پہلے ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر اُس نے دائیں ہاتھ سے ایک بار پھر اتنے زناٹے دار تھپڑ ماہین کے چہرے پر جڑے کہ اُس کے متورم گالوں کی سُرخی میں انگلیوں کے نشان نقش ہو کر رہ گئے۔

اِس سے پہلے کہ خود پر اُتری ہوئی وحشت کے زیرِ اثر وہ کچھ اور تشدد کرتا، ماہین نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے پوری طاقت سے اُس کی دائیں کلائی کو ہاتھ کے جوڑ کے قریب سے پکڑ لیا۔ رستم کا ہاتھ اُس کے گال سے ذرا سے فاصلے پر رُک کر تھر تھرانے لگا۔ ہاتھ کیا رُکا اُس کی سرخ آنکھیں بھی باہر کو اُبل آئیں۔ رستم کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک لڑکی اِس طرح اُس کا ہاتھ روک کر اُس کی دہشت کا پاجامہ اُتار سکتی ہے۔ حد سے بڑھا ہوا غصہ انسانی بدن سے طاقت کو کیسے نچوڑتا ہے، اِس کی عملی تصویر اُس وقت رُستم کے بگڑے ہوئے چہرے اور کپکپاتے بدن کی صورت میں سامنے آتی چلی جا رہی تھی۔ جونہی رستم کی کلائی کا دَم ٹوٹا، ماہین

نے اُسے ایک جھٹکے سے ہی موڑ کر نیچے کو جھکایا اور رستم کو دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا۔

''کیوں مار رہے ہو مجھے؟ کیا کسی بات سے انکار کیا ہے میں نے جو مجھے مار رہے ہو یا صرف عادت ہوگئی ہے مارنے کی؟ مجھے پتا ہے کہ تم نے میرے ساتھ کیا کرنا ہے ___ تو جو تم نے کرنا ہے کرو ___ یوں مارو تو نہیں۔'' یہ کہہ کر ماہین نے یوں سرعت سے اپنا لباس اپنے بدن سے علیحدہ کیا کہ جیسے کوئی ناروا بوجھ ہو، کوئی ملامت ہو کسی گناہ کی، کوئی علامت ہو کسی عذاب کی کہ جس کے ہوتے ہوئے وہ یونہی تشدد کا شکار ہوتی رہے گی۔

''لو! میں نے آسانیاں پیدا کر دی ہیں تمہارے لیے ___ آؤ اب تم بتاؤ کہ کیا کرنا ہے، کہاں کرنا ہے۔'' رُستم پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی ماہین کے چہرے اور کبھی بدن کو دیکھے چلا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں شہوت کی بجائے سراسیمگی اُتر آئی تھی جب کہ ماہین کسی آسیب کے شکنجے میں آئی ہوئی دکھائی دے رہی تھی کہ جس کے ہوتے ہوئے نہ تو اُسے کوئی اندیشہ درپیش اور نہ ہی کسی خطرے کا سامنا۔ وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی بستر پر بیٹھی تو وہاں نیم دراز رُستم قدرے پیچھے کھسک گیا۔ ماہین کو وہ نوید کی طرح لگا۔ بزدل، کمزور اور کھسیانہ۔ محض ہاتھ اُٹھا کر اپنی مردانگی بگھارنے والا۔

اچانک خون کی دو بوندیں اُس کی دائیں چھاتی پر آن گریں۔ رستم کی آنکھوں میں اُتری ہوئی سراسیمگی خوف میں بدل گئی۔ اُس نے دیکھا کہ تھپڑوں کی ضربات سے ماہین کی دائیں کان کی بالی نے اُس کی لو کو چیر دیا تھا۔ ٹپکنے والی بوندوں کے علاوہ بھی ایک اور بوند وہاں ٹپکنے کو موجود تھی۔ لیکن ماہین اب بھی کسی ہپناٹائزڈ ذہن کے جامد وجود کی مانند رستم کو اِس طرح اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی کہ جیسے اُس کے نزدیک اپنے جسم کی اہمیت ہی نہ رہی ہو۔ انتہائے خوف کی یہ وہ منزل تھی کہ جہاں خوف، خوف نہیں رہتا اور وجود کی پامالی، تذلیل سے ماورا ہو جاتی ہے۔ رُستم کچھ دیر تک ماہین کی طرف دیکھتا رہا مگر جب اُس نے بھی رُستم کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ تک نہ جھپکی تو وہ تیزی سے بیڈ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نامعلوم ڈرگ کا اینٹی کلائمکس یا نشے کا وہ تروڑ جو کافی دیر بعد شروع ہوتا تھا، خوف کی اِس کیفیت میں اس طرح مہمیز ہوا کہ رُستم کو اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس کی زبان خشک ہوئی تو وہ اُسے بار بار ہونٹوں پر

پھیرنے لگا۔

''اب معلوم ہوا کہ تو کیسے مارتی ہوگی اپنے یاروں کو ___ حرامزادی تو تو بنی بنائی قاتلہ ہے ___ اب دیکھ کیسے پہنچاتا ہوں میں تمہیں پھانسی کے پھٹے پر۔'' اگرچہ رُستم کی خشک زبان لڑکھڑا رہی تھی مگر اُسے پانی تک پینے کا یارا نہ تھا۔ اپنی پتلون ڈھونڈتے ہوئے اُس نے بار بار کانسٹیبل کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ ''اِلیاس!!! اُو الیاسے!!! اِدھر مر ___ بھین یک! جب بھی دیکھو پنکی میں رہتا ہے ___ الیاس!!!'' ___ اِلیاس کانسٹیبل کمرے میں تو آیا مگر آیا اپنی مرضی سے۔

''اُو بھین یکا!! تو نے پھر افیم کی کِنی لگائی ہوئی ہے ___ ڈیوٹی کی بھی پرواہ نہیں اور نہ ہی افسر کی پرواہ ہے کہ معطل کر کے لائن حاضر کرا دے گا ___ اُو بھڑوی کے مجھے کیا دیکھتا ہے؟ لے جا اپنی اِس بھین کو اور کرا کے آ اِس کا شوق پورا ___ اور خیال کرنا کوئی داغ دوغ نہ لگے اِس کے جُثے پر، خوامخواہ میڈیکل میں پھسوڑی ہو جائے گی۔ مُنشی سے کہنا کہ صاحب نے تفتیش کر لی ہے ___ ڈال دے بے شک اب اِس کی گرفتاری کاغذوں میں مگر کل صبح دس بجے کے بعد کی ___ اور ہاں پہلی ضمنی میں خود لکھوں گا تھانے آ کر ___ اب چل دفع ہو جا اور لے جا اِس بھڑوی کو بھی۔''

اِلیاس کانسٹیبل نے ماہین کو صبح دس بجے کیا لے جانا تھا، وہ اُسے دوپہر ایک بجے لے کر گیا مگر ایس ایچ اُو کے حکم کے مطابق اُس کی گرفتاری صبح دس بجے ریلوے اسٹیشن کی ڈالی گئی کہ جہاں مخبر کی اطلاع کے مطابق وہ بوجہ خوفِ گرفتاری کسی دوسرے شہر میں رشتہ داروں کے ہاں چھپنے کے لیے فرار ہو رہی تھی۔ دو بجے کے قریب ایس ایچ اُو بھی تھانے پہنچ گیا مگر اُس کے لیے یہ خبر خاصی اطمینان بخش ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان کن بھی تھی کہ بھرے پُرے گھر سے گرفتار کر کے لائے جانے کے باوجود رات سے اب تک کوئی بھی اُس لڑکی کے بارے میں پوچھنے نہیں آیا تھا۔ ایسا تو طوائفوں کے معاملے میں بھی نہیں ہوتا کہ جن کے تھانے لائے جانے تک کے عرصے میں آدھی حکومت اور آدھا شہر اُنہیں رہا کرانے کی سفارشیں لیے دوڑ رہا ہوتا ہے۔ یہ کیسی لڑکی ہے کہ کوئی اُس کا ولی وارث بننے کو تیار نہیں۔

''کیوں حیران ہوتے ہو صاحب! ہمارے معاشرے کی یہ مڈل کلاس بہت بے رحم ہوتی ہے۔ یہ اپنی عزت اور غیرت پر اپنی اولاد تک قربان کر دیتے ہیں، بس آپ یوں سمجھ لو کہ یہ لڑکی اپنے خاندان کے لیے مر چکی ہے۔ اَب اس کے پیچھے کوئی نہیں آنے والا۔ یہ بات میں ایویں نہیں کہہ رہا بلکہ اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔'' تھانے میں موجود ایک ریٹائرڈ سب انسپکٹر غلام دستگیر چپکے سے اُٹھا اور رُستم کے پاس جا کر اُس کے کسی ماتحت بزرگ کی طرح اُسے سمجھانے لگا۔

غلام دستگیر اپنے زمانے میں تفتیش کا ماہر اور پکی ضمنی لکھنے کا بادشاہ کہلاتا تھا مگر اب اُس کی گزر اوقات ایس ایچ اُو سے ملنے والی بخشش پر تھی کہ جو اُسے زیرِ تفتیش مقدمات کی ضمنیاں لکھ کر عطا کی جاتی تھی۔ عموماً یہ ضمنیاں ایس ایچ اُو کی جانب سے لکھی جاتی تھیں جو اپنی مصروفیات کے سبب اِن پر صرف اپنے دستخط کرنے کی زحمت اُٹھاتا تھا۔

''تو ٹھیک ہے پھر لکھ لو پہلی ضمنی ہی میں اِس کا اقبالی بیان۔'' رُستم لاپرواہی سے سگریٹ کی ڈبیا کو میز پر گھمانے لگا۔

''پہلی ضمنی ہی میں اقبالی بیان؟ سوچ لو سرکار! کہیں سے کوئی ولی وارث نکل آیا تو پھر؟''

''اُو تم ہو کیا؟ پہلے خود ہی بکواس کرتے ہو کہ کوئی ولی وارث نہیں آئے گا اور پھر ہی خود ہی بھونکتے ہو کہ کوئی آ گیا تو پھر؟ جاؤ تم دفع ہو جاؤ ___ میں کوئی دوسرا ہیلپر رکھ لوں گا۔'' رُستم ایک دم بھڑک اُٹھا تھا۔

''سرکار! میں نے کونسی غلط بات کی ہے؟ ایک پرسنٹ کا دھیان تو رکھنا ہی پڑتا ہے ناں۔'' غلام دستگیر منمنایا۔

''تم بتی بنالو اپنے ایک پرسنٹ کی اور لکھو اُس کا اقبالی بیان۔''

''جو حکم سرکار ___ لیکن ایک عرض میری بھی مان لیں ___ لڑکی کو حوالات سے نکلوا کر اِدھر سامنے بٹھا لیں بیان کے لیے تاکہ کل کو قسم اُٹھانے جوگے ہوں کہ بیان بقائمی ہوش و حواس دیا گیا ہے۔'' غلام دستگیر نے ہاتھ جوڑ لیے تھے۔

''اُو میرے سامنے نہ لاؤ اِس بھڑوی کو ___ خود ہی سامنے بٹھا کر لکھ لو۔'' رُستم اب بھی

اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''سرکار! میری منت مان لیں ___ بس ایویں دو منٹ کے لیے سامنے بٹھا لیں ___ آخر کو مجسٹریٹ کے سامنے بھی پیش کرنا ہوگا جوڈیشل ریمانڈ کے لیے۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، دو منٹ کے لیے لاؤ اور پھر بٹھاؤ ڈالے میں مجسٹریٹ کے پاس لے جانے کے لیے۔'' رُستم سگریٹ سلگا کر کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ماہین کو حوالات سے نکال کر ایس ایچ اُو کے کمرے میں لے آیا گیا۔ مگر رُستم بدستور باہر کی جانب دیکھتا رہا۔

''سرکار! ایک نظر لڑکی کو دیکھ تو لیں!'' ___ غلام دستگیر نے ایک بار پھر منت کی۔

''یار دیکھا ہوا تو ہے، اب اور کیا دیکھوں گا ___ تم اپنا کام کرو۔''

''سرکار بس ایک نظر!!''

''دستگیرے! میں تم سے بڑا تنگ ہوں ___ دکھاؤ کون سی اپنی ماں بھین دکھانی ہے؟''

جونہی رُستم نے اپنا چہرہ لڑکی کی طرف کیا وہ توانہی قدموں حیرت اور پریشانی سے گڑ کر رہ گیا۔ لڑکی کا چہرہ ہی نہیں بلکہ پورا جسم بری طرح مسلا اور روندا ہوا تھا۔ چہرہ متورم ہونے سے وہ پہچانی بھی نہیں جا رہی تھی۔ جہاں جہاں سے بدن کھلا تھا وہیں وہیں دانتوں سے کاٹے جانے کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے۔ رُستم چکرا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اُوئے دستگیر! اُوئے مُنشی! اُو کالے ___ بُلاؤ اُس بھڑوے اِلیاسے کو میرے پاس۔ کیا حال کر دیا ہے اُس نے لڑکی کا؟ کیسے پیش کروں گا اِسے اِس حالت میں مجسٹریٹ کے پاس۔'' اتنے میں اَلیاسا کانسٹیبل کمرے میں داخل ہوا تو رُستم جتنی مغلظات اُسے ایک ہی سانس میں سُنا سکتا تھا سُنائیں اور پھر اُسے گریبان سے پکڑ کر دو چار تھپڑ بھی جڑ دیے۔

''اُوئے بھڑوی کے دَلے! میں نے تم پر احسان کیا اور تم میری نوکری کے پیچھے پڑ گئے۔ کیا حشر کیا ہے اس لڑکی کا ___ اتنی بے غیرتی! اُوئے خبیث کے پُتر! تم انسان ہو کہ جانور ___ ایسا سلوک تو جانور بھی نہیں کرتے۔''

''صاحب جی! میں نے اکیلے نے کچھ نہیں کیا ___ وہ تینوں کنجر بھی وہاں آ گئے تھے اپنا

حصہ لینے۔ انہوں نے کیا ہے یہ سب کچھ۔'' اب کے الیاس نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔

''وہ تینوں کون؟'' غصے کی شدت سے رُستم ہانپنے لگا تھا۔

''وہی رمضان، کالا اور شادا ___ آئیس کا نشہ کر کے ٹُن تھے، دھمکی لگا رہے تھے کہ اُن کو شامل نہ کیا گیا تو آپ کی مخبری کر دیں گے اُوپر۔'' اُن تینوں کا نام سُن کر نجانے کیوں رُستم ڈھیلا پڑ گیا لیکن ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا۔

''اُوئے اُن کی یہ مجال، بہت جانتا ہوں اُن کو ___ کر دیں میری مخبری ___ اوپر والے حصہ نہیں لیتے کیا؟ لیکن میں نے مال تمہیں سونپا تھا، تمہیں خیال کرنا چاہیے تھا کہ اِسے صبح کو مجسٹریٹ کے پاس بھی پیش کرنا ہے۔''

''اُو صاحب جی!! آپ تو مائی باپ ہو ___ سب جانتے ہو کہ ایسا مال روز روز کہاں ملتا ہے، میری تو مَت ماری گئی تھی ___ کوئی ہوش ہی نہیں رہا۔''

''اِلیاسے! تیرے ہوش تو میں ابھی ٹھیک کرتا ہوں ___ پہلے مجھے اپنی نوکری بچا لینے دے۔ جلدی کر، جلدی سے بلا منشی کو ___ اور دستگیر تو چل مدعا غائب کر ___ لے جا اس لڑکی کو پھر سے میرے فارم ہاؤس پر کسی پرائیویٹ سواری میں اور میرے آنے تک وہیں رہنا۔'' اتنے میں مُنشی کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

''اُو مُنشی ___ میرے وِیر! لڑکی گرفتاری تو نہیں ڈالی ابھی پکے کاغذوں میں؟''

''جی سرکار گرفتاری تو ڈال دی ہے۔''

''اُو بھین یکا ___ تو بھی میری نوکری کے دُوالے ہو گیا ___ کچھ کر، کچھ کر!! ورنہ پورا تھانہ برخواست سمجھ۔''

''سرکار! گرفتاری تو پکے کاغذوں میں ہے مگر رجسٹر دو نمبر ہے ___ آپ فکر نہ کرو، ابھی پھاڑ کے پھینک دیتا ہوں۔'' مُنشی اپنی ہنرمندی پر داد طلب نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

''اُو پھاڑ نہیں صرف بلکہ پھاڑ کے جلا بھی دے ___ بلکہ رُوڑ دے نالی میں۔''

۞

﴿۱۸﴾

''من موہن مینشن'' میں قیام کے دنوں میں شبیر اور کاشف کے شخصی تضادات کھل کر سامنے آنے لگے۔ مُنڈا جاسوس افضل کے قتل کے بعد اگر شبیر اب تک کے ماضی سے دامن چھڑانے کی کوشش میں ضرورت سے زیادہ خود اعتماد اور شاہ خرچ ہو گیا تو کاشف انتہائی چڑچڑا ہوتے ہوتے اپنے خول میں بند ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کام پر جانے کی بجائے زیادہ وقت بلڈنگ کے سیلن زدہ کمرے ہی میں گزارتا۔ وہ اکثر لنڈا بازار جا کر مختلف اسٹائل کے کپڑے خرید لاتا اور پھر کئی کئی دن کئی کئی سوانگ بھرتا رہتا۔ ایک بار لنڈا بازار سے ہی قدرے بڑا آئینہ خرید لایا اور پھر جب بھی موقع ملتا تو اُس کے سامنے کھڑے ہو کر مختلف اداکاروں کے مشہور فلمی ڈائیلاگ انہیں کے انداز میں بولتا رہتا۔ ایک روز وہ کچھ رنگ اور ایک برش بھی خرید لایا اور کمرے کی دیواروں پر مختلف چہرے بنانے کی مشق کرنے لگا۔ کسی بھی اُستاد کے نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے ہاتھ میں کمال کی پختگی تھی۔ اُس نے شبیر کو بتایا کہ بچپن ہی سے ڈرائینگ میں اُس کا ہاتھ صاف تھا لیکن پہلی بار باتھ روم میں اپنے والد کا چہرہ بنانے پر جس قدر مار پڑی اُس کی ساری ڈرائینگ ہوا ہو گئی۔

وہ اکثر سینما گھروں کے باہر کھڑے ہو کر اُن بڑی بڑی ہورڈنگز کو غور سے تکتا رہتا کہ جن پر فلمی اداکاروں کی قد آدم تصویریں بنی ہوئی ہوتیں۔ لکشمی چوک کے نواح میں واقع سینما گھروں میں اگر جمعہ کو کسی نئی فلم نے لگنا ہوتا تو ہورڈنگز بنانے والے آرٹسٹ منگل بدھ سے ہی سینما کے پچھواڑے بیٹھ کر یہ تصاویر بنانا شروع کر دیتے۔ اُن دنوں کاشف شبیر کے ساتھ کام پر

جانے کی بجائے سارا دن اُن آرٹسٹوں کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ اُس کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح اُسے بھی فلمی بورڈ بنانے کا کام مل جائے مگر ایک دو اُستادوں نے اُس سے بھی اُستادی کی اور اُس سے کتنے ہی دن ''چھوٹے'' کا کام لینے اور کئی بار اُسی پر اپنی جنسی تھکن اُتارنے کے باوجود اتنا موقع بھی نہ دیا کہ وہ برش کو رنگ میں ڈوبا دے کر کینوس ہی سے چھُ کر سکے۔

جب تک اُن کی پس انداز کی ہوئی رقم چلتی رہی، شبیر کے ماتھے پر بل نہ آیا لیکن اب خالی جیب ہونے پر بھی کاشف جب ہفتے میں کئی کئی دن کام پر جانے کی بجائے اِدھر اُدھر وقت ضائع کرنے لگا تو شبیر چڑ گیا۔ اُس کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ اپنا جسم بیچ کر اپنے ساتھ ساتھ کاشف کا بھی پیٹ بھرے۔ اِس پر اُن دونوں کے درمیان کئی بار جھگڑا بھی ہوا مگر کاشف نے شبیر کی توقع کے برعکس پوری ڈھٹائی کی اور کسی بات کا اثر نہ لیا۔ وہ اپنی مرضی کرتا اور ہر اُس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیتا کہ جس پر اُس کا ذہن تیار نہ ہو رہا ہو۔ افضل کے قتل کے بعد شبیر نے اپنا نیٹ ورک بنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ بھی کاشف کی کاہلی کی نذر ہو گیا۔ لیکن ایک روز نہ چاہتے ہوئے بھی کاشف سے کچھ ایسا سرزد ہو گیا کہ جس نے اُن دونوں کو پھر سے ایک دوسرے سے نتھی کر کے، ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔

اُن دنوں روز روز کی بک بک جھک جھک کے بعد کاشف نے اپنے کام میں ایک نئی طرح نکالی تھی۔ وہ اُردو بازار سے داتا دربار کے بس اسٹاپ تک کے علاقے سے کسی مسافر نما شوقین کو پھانستا اور پھر اُسے بلال گنج کے عقبی میدان کے کسی ویران گوشے میں لے جاتا جہاں شبیر بھی اُس کی مدد کو پہنچ جاتا۔ ایک اگر اُس کے گلے میں نائلون کی ڈوری ڈالتا تو دوسرا خنجر نکال کر اُس کے سینے پر رکھ دیتا۔ جونہی وہ شخص اپنی جیبیں اُن کے سامنے خالی کرتا وہ دونوں باری باری اُس سے بدفعلی کرنے کے بعد لات مار کر بھگا دیتے۔ کچھ دن تو یہ کام کامیابی سے چلا لیکن ایک دن ایک ایسا شخص اُن کے ہتھے چڑھ گیا جو بٹوے میں لگی تصویر کے مطابق پولیس میں حوالدار تھا۔ بٹوا نکال کر دینے تک تو اُس نے کوئی احتجاج نہ کیا لیکن جونہی انہوں نے اُسے شلوار اُتارنے کو کہا اُس نے ایک دم پلٹا کھایا اور شبیر کو اِس طرح قابو کیا کہ خنجر اُس کے ہاتھ

سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ اُس کے گلے میں ڈوری کاشف نے ڈال رکھی تھی۔ اِس صورتحال میں نجانے کب کاشف نے غیر ارادی طور پر نائلون کی ڈوری کو بل دے کر ایسا جھٹکا لگایا کہ حوالدار کی گردن ٹوٹ کر ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ وہیں نیچے گر گیا۔ کاشف کے ہاتھوں کسی پولیس والے کا اِس طرح قتل ہو جانا جہاں شبیر کے لیے حیرت کا باعث تھا وہاں کاشف کے لیے بھی حیران کُن۔ نہ تو اُسے اپنے ہاتھوں کے دم خم پر یقین آ رہا تھا اور نہ ہی اپنے اندر کسی خاص صلاحیت کا احساس۔ کیا کسی جیتے جاگتے انسان کو اتنی سہولت سے بھی قتل کیا جا سکتا ہے کہ جیسے کسی چڑیا کو غلیل سے کوئی کنکر مار کر مار دینا۔

اِس واردات کا نتیجہ یہ نکلا کہ افضل کے قتل کے بعد شبیر کے مقابل کاشف کے ذہن میں در آنے والا احساسِ کمتری کہیں اپنی موت آپ مر گیا۔ شبیر کے سامنے ثانوی حیثیت میں رہنا اُسے کبھی گوارا نہیں رہا تھا لیکن اب وہ شبیر کے سامنے پھر سے پورے قد کاٹھ کے ساتھ کھڑا ہو سکتا تھا۔ اِس کے برعکس شبیر نے کبھی اُسے اپنے مقابل سمجھا ہی نہیں تھا اور نہ ہی اُس کے ذہن میں کبھی ایسا خیال آیا تھا۔ شاید یہ کاشف کا رویہ تھا کہ جس کے سبب وہ ایک بار پھر کوئی نیٹ ورک تو نہ بنا سکے لیکن اپنے اِس دو رکنی گروہ کو خاصی حد تک فعال کر لیا جس میں نہ تو کوئی باس تھا اور نہ ہی کوئی کارکن۔ بس ایک اَن دیکھا معاہدہ تھا جسے دونوں نے قبول کر لیا۔ اب جو بھی اُن کے ہتھے چڑھتا، جان تبھی بچ پاتی اگر وہ اِن کے احکامات بلا چوں چرا مان لیتا لیکن ایسے خوش نصیب بہت کم ہوا کرتے تھے۔

اِسی ایک ہی انداز میں کیے گئے قتل جب تیس سے زیادہ ہو چکے تو اخبارات نے بھی ہلکا پھلکا نوٹس لینا شروع کیا لیکن محض آئے روز لاہور کے مخصوص پارکوں میں سے ملنے والی لاوارث نشائیوں کی لاشوں کی حد تک۔ پولیس بھی تفتیش سے جان چھڑانے کے لیے انہیں نشائی لیبل کرتی اور لاشوں کو عام طور پر کچھ عرصے کے لیے سرکاری سرد خانے میں رکھوا کر اخبار میں تصویر شائع کرائی جاتی پھر کہیں جا کر وارثان میں سے کوئی ڈھونڈتا ڈھانڈتا آ ہی جاتا۔ بصورت دیگر اُنہیں لاوارثوں کے قبرستان میں امانتاً دفن کر دیا جاتا۔ اِس طرح نہ تو کوئی شور شرابا تھا اور نہ کہیں کوئی واویلا۔ مگر اِن وارداتوں کے تسلسل نے ایک سر پھرے نو تعینات شدہ ایس

پی انویسٹی گیشن ضمیر حیات کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ لاوارث لاشیں چونکہ لاہور کے تین تھانوں کی حدود سے مل رہی تھیں اس لیے تفتیش کو آگے بڑھانا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔ ایس پی نے اب تک درج ہو چکی ایف آئی آرز، پوسٹ مارٹم رپورٹس اور بعد از شناخت مقتولین کے کوائف یکجا کیے تو خاصی پریشان کن صورت حال اُس کے سامنے تھی۔

مقتولین زیادہ تر پولیس میں کانسٹیبل، ہیڈ کانسٹیبل یا اسکول ٹیچر تھے جو لاہور کے مضافاتی علاقوں کے رہائشی ہونے کے ناتے لاہور یا اُس کے نواحی اضلاع میں تعینات چلے آ رہے تھے۔ سب کے سب اپنے گھروں میں ہفتہ دو ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کے بعد واپس نوکری پر جاتے ہوئے کسی نہ کسی حوالے سے داتا صاحب سلام کرنے لاہور آئے اور وہاں جانے سے پہلے یا بعد میں اِن اندھی وارداتوں کا شکار ہوئے۔ مقتول پولیس ملازمین کے قریبی دوستوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ چھ چھ ماہ تک چھٹی نہ ملنے کے سبب نہ صرف ہم جنس پرستی کی طرف مائل ہو چکے تھے بلکہ چھٹی پر آنے کے بعد بھی بیویوں کی طرف کسی قسم کا کوئی میلان یا التفات رکھنے سے قاصر رہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ یہ بھی ظاہر کرتی تھیں کہ قتل سے پہلے کچھ مقتولین کے ساتھ خلاف وضع فطری فعل تو ہوا مگر رضا سے نہیں بلکہ انتہائی متشددانہ انداز میں۔ مگر اس تحقیق نما تفتیش کے دوران مقتولین کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس تک جا پہنچی۔ اگرچہ مقتولین کی کمتر سماجی حیثیت کے سبب نہ تو میڈیا میں کوئی واویلا تھا اور نہ ہی افسرانِ بالا کا دباؤ مگر ایس پی ضمیر حیات کے اپنے ضمیر کے لیے یہ ایک ایسا چیلنج تھا جسے پورا کیے بغیر اُس کی طبع قرار میں نہیں آ سکتی تھی۔ اپنے ضمیر کا چیلنج اُس کے واسطے کسی صحافیانہ واویلے یا افسران کے ناروا دباؤ سے زیادہ شدید تھا۔

اِس جستجو میں پہلے تو اُس نے اُن مخصوص پارکوں میں سفید پارچات میں ملبوس اپنے اعتماد کے پولیس ملازمین شب و روز متعین کیے رکھے مگر اِس کے باوجود جب اِس دوران تین قتل اور ہو گئے تو ایس پی ضمیر حیات نے اپنی حکمت عملی بدل لی۔ اُس نے اِن پارکوں کے قریب جتنے بھی بس یا ویگن اسٹاپ تھے وہاں مقتولین کی عمر کے ایسے پولیس ملازمین تعینات کر دیے جو اپنی ظاہری ہئیت اور حرکات و سکنات سے ہم جنسیت کی جانب رجحان رکھنے والے

دکھائی دیتے تھے۔ ہفتہ بھر تو عام تام سے مخنثوں اور مفعولوں نے اُن کی طرف توجہ کیے رکھی جن میں سے چند ایک کو زیرِ تفتیش بھی رکھا گیا مگر لاحاصل۔ آخر نویں دن سول سیکرٹریٹ کے سامنے ناصر پارک میں ڈیوٹی پر متعین مگر عام سے کپڑوں میں ملبوس ہیڈ کانسٹیبل سے ایک لڑکے نے سلسلہ جنبانی شروع تو کیا مگر زیادہ کھلا نہیں کہ خاصی حد تک محتاط تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اُسے بتایا کہ وہ سول سیکریٹریٹ میں ایک حکم کی نقل لینے ساہیوال سے آیا ہے لیکن خوار ہو کر رہ گیا ہے کیونکہ کلرک روزانہ کل پر ٹال دیتے ہیں۔ لڑکے نے اُس سے ہمدردی کی اور اگلے روز ملاقات کا وقت دیا مگر ناصر باغ کی بجائے بلال گنج مارکیٹ کے عقبی پارک میں۔ یہ لڑکا کاشف عرف کاشی تھا۔

تمام کڑیاں مل چکی تھیں مگر ضمیر حیات کا اندازہ غلط ہو گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہی ایک لڑکا ہوگا، اِس لیے جونہی کاشف پارک میں پہنچا اُسے انتہائی محتاط انداز میں حراست میں لے لیا گیا لیکن جونہی اُسی کی زبانی اُس کے اشارے کے منتظر شریک کار کی وہیں قریب ہی موجودگی کا علم ہوا تو شبیر کو بھی دھر لیا گیا۔ دونوں نے پولیس کے سامنے تمام وارداتوں کا اقرار کرنے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ چھ سات برس کی مفعولیت کی زندگی میں بے شمار لوگوں سے راہ و رسم کے بعد اتنا تو وہ جان چکے تھے کہ اگر پولیس کے سامنے کیے ہوئے اقبال جرم سے بعد ازاں مکر لیا جائے تو پھر وہ بیان اقبالی بیان نہیں رہتا اور نہ ہی اُسے عدالت میں ثابت کیا جا سکتا ہے۔ پھر ایسے میں کیا فائدہ پولیس کے چھتر کھانے کا۔ لہٰذا سیدھے سبھاؤ جو جو ضمیر حیات کیمرے کے سامنے پوچھتا گیا وہ فرفر بتاتے چلے گئے اور بعد ازاں مقتولین کے جتنے بٹوے، گھڑیاں اور دیگر شناختی اشیاء اُن کے پاس موجود رہ گئی تھیں، وہ بھی از خود پیش کر دیں۔

شبیر عرف شاکا اور کاشف عرف کاشی کو اب سیریَل کلنگ کے ملزمان کے طور پر تینتالیس مقتولین کے قتل کے مقدمات کا سامنا تھا۔ سولہ سترہ برس کے دو لڑکے جب ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں کھڑکاتے ہوئے جیل کی گاڑی سے اُتر کر عدالتوں کے برامدوں میں سے گزرتے تو میڈیا کے علاوہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتی۔ قتل کے تینتالیس مقدمات کے یہ ملزمان اِس واسطے بھی لاہور میں دہشت کی علامت

بن کر سامنے آئے تھے کہ یہ لاہور کی تاریخ میں سیریئل کلنگ کی سب سے بڑی واردات تھی۔ بظاہر اُن کے معصوم چہرے دیکھ کر کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے نہایت بے دردی سے ایک ہی انداز میں تینتالیس لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا ہو گا۔

عوامی تشدد اور احتجاج کے اندیشے کے پیشِ نظر سیشن کورٹ کی بجائے ڈسٹرکٹ جیل میں قائم کی گئی عدالت میں ہونے والی یہ ٹرائل اِس لحاظ سے عجیب تھی کہ جس میں نہ تو قاتل معاشی طور پر اِس قابل تھے کہ وہ کوئی ڈھنگ کا وکیل مقرر کر سکتے اور نہ ہی مقتولین کی جانب سے مقدمات کی پیروی میں کوئی اِس قدر سنجیدہ تھا کہ ڈسٹرکٹ پبلک پراسیکیوٹر کی معاونت کے واسطے کوئی ماہر وکیل پیش کر سکتا۔ اکثر مقتولین کی بیوگان اپنے دو دو تین تین چار چار بچوں کی کفالت کے اندیشوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے مقتول شوہروں کے جیٹھ یا دیوروں سے عقدِ ثانی کرنے کے بعد جہاں اپنے سابقہ شوہروں کے خونِ ناحق سے لاتعلق ہو چکی تھیں وہاں اُن کے نئے شوہر بھی اپنی محدود آمدنی کے سبب اِس قابل نہیں رہے تھے دور دراز کے قصبات سے مقدمات کی پیروی کے لیے ہر پیشی پر لاہور آتے۔ اِس لیے مقدمات کو عدالت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ لہٰذا جہاں مقتولین کی جانب سے عدالت نے ضابطے کے تحت سرکاری خرچ پر وکیل کا بندوبست یقینی بنایا وہیں سرکاری وکیل کو بھی بار بار تنبیہہ کی کہ وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا کرے۔

عدالتوں سے زیادہ کون باخبر ہو گا کہ لاوارث سیشن مقدمات کی سماعت قانونی کسمپرسی اور ضابطے کی بے حسی کا عجیب مظاہر ہوتی ہے کہ جس میں کوئی بھی ڈھنگ کا وکیل اِس لیے وکیل مقرر ہونا نہیں چاہتا کہ سرکار کی جانب سے طے کی گئی فیس نہ صرف شرمناک حد تک قلیل ہوتی ہے بلکہ مانگے ملتی بھی نہیں۔ ایسے میں اگر کوئی ملزم کی جانب سے وکیل مقرر ہونا چاہے تو سمجھ لیں کہ یا تو اُسے استغاثہ کی جانب سے چائے پانی کی پیشکش کی جا چکی ہے یا وہ خود اِس قدر گیا گزرا ہے کہ اِس بہانے اپنا نام دفعہ 302 جیسے اہم مقدمات کی پیروی کے زمرے میں مشہور کرنا چاہتا ہے۔ مگر معاملہ جو بھی ہو، ایسی صورتوں میں وہ اپنے اناڑی پن سے ملزم کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ چونکہ اِن مقدمات میں چشم دید

شہادت کی عدم موجودگی میں محض واقعاتی شہادت کی بنا پر ملزمان کو سزائے موت دینا قانوناً ممکن نہیں تھا اِس لیے اُن دونوں کو واقعاتی شہادت کی بنا پر تمام مقدمات میں تینتالیس بار عمر قید کی سزا سُنا دی گئی جو یکے بعد دیگرے کی بجائے بیک وقت شروع ہونا تھی۔

سزا سنائے جانے کے بعد شام سے پہلے پہلے شبیر عرف شا کا اور کاشف عرف کاشی کو سزا یافتہ مجرموں کی حیثیت سے ڈسٹرکٹ جیل سے سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا جہاں اُن کے ''استقبال'' کی پوری پوری تیاری کی جا چکی تھی۔ گو کہ ڈسٹرکٹ جیل میں بھی جب کسی بااثر حوالاتی کا اُن پر دل آ جاتا تھا تو اُنہیں شب بسری کے واسطے اُس کی بیرک میں شفٹ کر دیا جاتا تھا مگر اُس وقت کچے حوالاتی ہونے کے سبب احتیاط برتی جاتی کہ مقدمہ زیرِ سماعت ہونے کے باعث کسی پیشی پر بھی کسی کے خلاف کچھ بھی بک سکتے تھے۔ مگر سزا یافتہ ہو جانے کے باعث اب قید کاٹے بغیر اُن کا جیل سے باہر نکلنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اب تو جو بھی ہونا تھا جیل میں ہونا تھا۔ دو پیشہ ور مفعول لڑکوں کے تینتالیس قتل کرنے کی دھاک اگرچہ اکثر چھوٹے موٹے مجرموں کے دلوں پر بیٹھ چکی تھی اور وہ اُنہیں ایک نظر دیکھنے کے خواہاں بھی تھے مگر اُن کی آمد کے منتظر سنٹرل جیل میں مقید کچھ ایسے زور آور قیدی بھی تھے کہ جو اُن کی قاتلانہ صلاحیتوں سے قطع نظر اُن کی مفعولیت کے شعبے میں ہُنر وری کے نادیدہ قدردان ہو چکے تھے۔

شبیر اور کاشف بھی جان چکے تھے کہ جیلوں کے انتظامی امور نصابی طور پر عموماً جیل کے افسران کے پاس ہوتے ہیں جن کی ماتحتی میں کئی چھوٹے افسر اور اُن کے نیچے کتنے ہی اہلکار ہوتے ہیں مگر حقیقی طور پر کسی بھی جیل کی ایڈمنسٹریشن وہاں پر قید بااثر شخصیات کے پاس ہوتی ہے۔ اِن بااثر شخصیات میں نامی گرامی گینگسٹر، انڈر ورلڈ کے ڈان، جرائم کا بہت بڑا نیٹ ورک چلانے والے پیشہ ور قاتل، دہشت گرد تنظیموں کے بدنام ترین عہدیدار اور مذہبی سیاست کرنے والی سیاسی جماعتوں کے متشدد دھڑوں کے کرتا دھرتا شامل ہوتے ہیں۔ جرم کا کوئی نہ کوئی حوالہ رکھنے والے اِن خطرناک ترین قیدیوں کا نہ صرف جیل میں پورا نیٹ ورک موجود ہوتا ہے بلکہ اُس کا مستقل اور مسلسل رابطہ جیل کے باہر کے نیٹ ورک سے بھی ہمیشہ اُستوار رہتا ہے۔ ان قیدیوں کو جیل میں کسی سہولت کی کمیابی یا عدم دستیابی کا سامنا نہیں

ہوتا۔ جیل کی کینٹین، کچن، ہسپتال، بیرکس اور مشقت خانوں تک کے انتظامی معاملات اِن کی منشا سے طے پاتے ہیں۔ کس جیل میں کون سا افسر کون سی پوسٹ پر تعینات ہو، کس بیرک کے لیے کون سا عملہ اور جیل کا چیف چکر کس کو لگایا جائے جیسے امور میں بھی اِن طاقت ور ہستیوں کا دخل موجود رہتا ہے۔ اِن قیدیوں پر جیل کا کوئی ضابطہ لاگو نہیں ہوتا بلکہ جیلیں اُن کے بنائے گئے ضابطوں کے تحت چلتی ہیں۔ اُن کے ماتھے پر پڑا ہوا ہلکا سا بَل جیل میں دکھائی دینے والے امن امان کو پلک جھپکنے میں تہہ و بالا کر سکتا ہے۔ اکثر اوقات جیل سے باہر کی دنیا کے بڑے بڑے انتظامی افسر اور حکومتی زعما امور جہاں بانی میں سہولتوں کے سلسلے میں مشکل کشائی کے طلب گار ہو کر ان مقید شخصیات کی منت اور خوشامد کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ جب چاہیں جیلوں میں فساد برپا کرا دیں اور جب مناسب خیال کریں دیواروں میں بھی اُن دیکھے دروازے بنا لیں۔ اُن کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔

روک ٹوک کے لیے جیلوں میں اور بھی بہت سی خلق خدا موجود ہوتی ہے کہ جس کا اِس متوازی نظام بالا سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ یہ وہ قیدی ہوتے ہیں جو قدرت و اختیار کے پاس سے بھی گزرنے کی سکت نہیں رکھتے لہذا جیل کے تمام تر اصول اور ضابطوں کا نفاذ اُن پر نہ صرف بہ آسانی کیا جاتا ہے بلکہ نصابی حاکمیت کا دبدبہ اور کروفر قائم رکھنے کے واسطے گاہے بگاہے ہر قسم کے تشدد کا سامنا بھی اُنہی کو کرایا جاتا ہے۔ اِن میں سے بھی جو لوگ موقع محل کے مطابق مال پانی خرچ کر سکتے ہیں اُنہیں کسی حد تک زندہ رہنے اور مرضی سے سانس لینے کی آزادی عطا کر دی جاتی ہے۔ باقی رہا چھان بورا تو اُس کے نصیب میں بار بار پستے رہنا ہی ہوتا ہے۔ اچھے بھلے ہٹے کٹے جیل کے ہسپتال کا بستر خرید کر اٹھلاتے رہتے ہیں جب کہ دمے، تپ دق اور جلدی بیماریوں کے بوڑھے مریض مئی جون کی گرمی میں بھی تندور پر روٹیاں لگانے کی مشقت میں جتے رہتے ہیں۔

اِن سے الگ ایک اور دنیا ''مُنڈا'' اور ''زنانہ'' بیرکوں کے نام سے بھی آباد ہوتی ہے۔ مُنڈا بیرک میں نصابی طور طریقوں کے مطابق نابالغ مجرمان کو رکھا جاتا ہے جب کہ زنانہ بیرک میں سزا یافتہ خواتین کو۔ جس ضلع میں ڈسٹرکٹ اور سنٹرل جیل علیحدہ سے نہیں ہوتیں وہاں

انڈر ٹرائل اور سزا یافتہ دونوں قسم کے نابالغان ملزم اور مجرم ایک ہی جیل میں مگر علیحدہ علیحدہ بیرکوں میں رکھے جاتے ہیں۔ یہی طریقہ خواتین ملزمان اور مجرمان کے لیے بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ نابالغ قیدی دن کو عموماً اپنی بیرکوں یا مشقت کے ٹھکانوں میں رکھے جاتے ہیں مگر اُن کی رات کس زور آور قیدی کے پاس گزرے گی، اِس کا فیصلہ اُن کی صورت، رنگت اور عمر کی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ نابالغ قیدی جتنی چھوٹی عمر کا ہو گا وہ اُتنا ہی زیادہ مشقت میں ہوگا۔ نامور اسکولز کے بورڈنگ ہاؤسز کی مانند کہ جہاں سینئر کلاسز کے طالب علم اپنے جونیئرز کو الگ جنسی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں اور ہوسٹل کے ملازمین الگ۔ مُنڈا بیرک میں بھی نسبتاً بڑی عمر کا نابالغ اپنا غصہ اور جنسی بھڑاس اپنے سے چھوٹی عمر کے نابالغ پر اُتارتا ہے جب کہ وہ دونوں کہیں نہ کہیں پھر سے ایک جیسی حیثیت میں ضرور آئے رہتے ہیں۔ کبھی کسی زور آور کے پاس اور کبھی کسی جیل ملازم کے پاس۔ مُنڈا بیرک میں بھی کچھ بڑی عمر کے نابالغ ''چودھریوں'' نے اُن کی آمد کا سُن کر اُنہیں اجتماعی سلامی دینے کا پروگرام ترتیب رکھا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ تینتالیس قتل کرنے والے یہ مفعول آخر کتنا دم خم اور کتنا لطف رکھتے ہیں جو مقتول یوں قتل ہونے کے لیے اُن کی طرف کھنچے چلے جاتے رہے ہیں۔

سنٹرل جیل کے بڑے گیٹ سے ملحقہ بغلی کمرے میں ہونے والی برہنہ تلاشی، قیدی نمبر الاٹ کیے جانے کے بعد کی تصاویر، دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کے پوروں کے نقش لیے جانے کے عمل اور ضابطے کی دیگر کاروائی کے بعد اُنہیں سزا یافتگان کی مُنڈا بیرک میں پہنچانے کا سفر آغاز ہوا جہاں اُن کا شدت سے انتظار کیے جانے کی خبریں بڑے گیٹ سے داخل ہونے کے بعد سے ہی تمسخر کے سے انداز میں مسلسل اُن تک پہنچائی جا رہی تھیں۔ ڈسٹرکٹ جیل میں تقریباً ایک سال گزار کر یہاں قدم رکھنے والے شاکا اور کاشی اِس انتظار اور اُس کی شدت دونوں کے مفہوم سے بخوبی آشنا ہو چکے تھے۔ اِس لیے دونوں اِسی کوشش میں تھے کہ کسی طور بھی سراسیمہ یا گھبرائے ہوئے دِکھنے کی بجائے پُر اعتماد اور نڈر دکھائی دیں۔ لیکن بیرک میں موجود تمیں نابالغ قیدیوں میں سے زیادہ تر سترہ اٹھارہ برس کے لگ بھگ تگڑے جوان اور شکلوں ہی سے چھٹے ہوئے لگ رہے تھے۔ اُن پر نہ تو شاکا اور کاشی کے

تینتالیس قتل کی وارداتوں کا کوئی دبدبہ تھا اور نہ ہی اِس بات کا خوف کہ جس قسم کا اجتماعی استقبال وہ کرنے جا رہے تھے، اُس پر انہیں مزاحمت کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔

مُنڈا بیرک کے مکینوں کو اِس خبر کا بھی علم تھا کہ ٹھیک تین دن کے بعد کاشی اٹھارہ برس کا ہو کر بالغ قیدیوں کی بیرک میں شفٹ کر دیا جائے گا اور اِسی طرح اگلے دو ماہ اور دس دن کے بعد شاکا بھی اُن کا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ اِس لیے مُنڈا بیرک کے سترہ بدمعاش ترین قیدیوں کا جتھا کسی صورت بھی آج کا کام کل پر نہیں رکھنا چاہ رہا تھا کیونکہ اُن کی اِس بیرک میں آمد پر خود اُن کا استقبال اِسی انداز میں ہوا تھا۔ کمال روایت تھی جیل کی کہ آج کے استقبالی اور استقبال کا ''شکار'' دونوں آنے والے کل میں ایک ہی گروہ کے ساتھی بن کر کسی نئے قیدی کے استقبال کا انتظار کرنے لگتے۔ شاکا اور کاشی نے بیرک کے دروازے کی سلاخوں کے پیچھے موجود چہروں کے تاثرات سے ہی بھانپ لیا کہ نہ تو یہاں اُن کا دبدبہ کام میں آنے والا ہے اور نہ ہی اُن کی خود اعتمادی بیرک کے مکینوں کے ارادوں کو ناکام کر سکے گی۔ انہیں وہاں تک لانے والے وارڈن نے بیرک کے دروازے کا قفل کھول کر انہیں اندر دھکیل دیا۔ اِس طرح دھکیلے جانے پر جہاں شاکا اور کاشی کا رعب پل بھر میں خاک ہو گیا وہاں سامنے موجود چہروں پر پھیلا ہوا تمسخر بھی گہرا ہو چلا تھا۔ اُن دونوں نے گھبرا کر بیک وقت گردنیں پیچھے کو گھمائیں تو وارڈن بھی دوبارہ قفل لگاتے ہوئے اُن کے آنے والے وقت پر پُراسرار انداز میں مسکرا رہا تھا۔

۞

﴿۱۹﴾

بڑا صاحب اگلی شام آٹھ بجے تک کی مہلت دینے پر تو آمادہ ہو گیا تھا مگر زفیرہ احمد کو یہ مدت بھی انتہائی کم دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے اُفتاد کو وقتی طور پر ٹالنے اور اِس دوران اُس کا کوئی حل ڈھونڈنے کے لیے مہلت تو لے لی تھی مگر نہ تو اُس کے پاس کوئی سبیل اور نہ ہی بڑے صاحب کو کسی متبادل مکالمے تک لانے کے لیے کوئی تاویل۔ موبائل فون میں موجود رابطہ نمبروں کو اُس نے کئی بار پڑھ لیا، جتنے تعارفی کارڈ کیٹلاگ میں محفوظ تھے، سب دیکھ لیے مگر کوئی ایک بھی نام ایسا سامنے نہ آیا جس پر نہ صرف اعتماد کیا جا سکتا ہو بلکہ وہ مشکل کی اِس گھڑی میں توقعات پر بھی پورا اُترتا ہو۔

پچھلے دو گھنٹوں سے یزدانی ملک کے چار فون آ چکے تھے۔ مبشر رضا کی گمشدگی سے متعلق پولیس رپورٹ کے بعد جس قسم کی سراسیمگی کا اُسے اندیشہ تھا، ''مہ نور'' کے حریف اُسے خوب پھیلا چکے تھے۔ یہ سراسیمگی اُس وقت کاروباری غیر یقینی میں بدل گئی کہ جب پورے دو دنوں تک زفیرہ احمد نہ تو فون پر رابطے میں تھی اور نہ ہی دفتر میں موجود رہی۔ لہٰذا گذشتہ دو دنوں میں ''مہ نور'' کے ہیڈ آفس سے جس نوعیت کی روح فرسا خبریں آنے کا امکان ہو سکتا تھا، وہ سب کی سب آ چکی تھیں۔ جن کلائنٹس کی اشتہاری مہم مبشر رضا کی عدم موجودگی کے باعث موخر ہوتی چلی آ رہی تھیں، اُن کی اکثریت نے نہ صرف اپنے معاہدے منسوخ کر دیے بلکہ کئی ایک نے تو ہرجانے کی ادائیگی کا نوٹس بھی بھجوا دیا۔ گماں اِس سے بھی زیادہ خرابی کا اب بھی موجود تھا کہ جس کے بعد کمپنی کا کاروباری وجود خطرے میں پڑنے والا تھا۔

زفیرہ نے اپنے سامنے موجود دونوں صورتوں پر غور کیا۔ دونوں صورتوں میں اُس کے لیے سوائے تباہی کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر وہ ''مہ نور'' کے کروڑوں روپے کی مالیت کے اکاون فیصد شیئر بڑے صاحب کی بلیک میلنگ کی نذر نہیں کرتی تو جہاں وڈیوز انٹرنیٹ پر اپ لوڈ ہونے کی صورت میں اُس کی عزت کا جنازہ نکلتا وہیں اُس کی برسوں کی محنت سے بنائی گئی مضبوط ترین ایڈورٹائزنگ کمپنی کا بھی دیوالیہ ہونا یقینی تھا کہ جس کے پاس نہ تو مبشر رضا جیسے تخلیق کار موجود رہے تھے اور نہ ہی کاروباری حریفوں کی جانب سے کسی صاف ستھرے اور اصولوں پر مبنی مسابقت کا ماحول دستیاب رہا تھا۔ میدان اب خالد رومی جیسے سیہ کار اور بے اصول حریفوں کے ہاتھوں میں آتا جا رہا تھا جن کے ہاں اُس کے لیے کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔

اور اگر وہ ''مہ نور'' کے اکاون فیصد حصص بڑے صاحب کو مفت میں منتقل کرنے کے بعد کمپنی کی چیف ایگزیکٹوشپ اور انتظام و انصرام سے دستبردار ہو جاتی ہے تو اِس کیا ضمانت تھی کہ وہ گھٹیا انسان اسی پر اکتفا کر جائے گا اور بعد ازاں اُنچاس فیصد حصص بٹورنے کے لیے بھی اُسے اُن وڈیوز کی بنا پر مزید بلیک میل نہیں کیا جائے گا۔ صاف ظاہر تھا کہ اکاون فیصد حصص کا مطالبہ بھی اُسے کمپنی کی چیف ایگزیکٹوشپ سے ہٹانے کے لیے کیا گیا تھا اور اِس عہدے سے ہٹنے کا مطلب ہی ایڈورٹائزنگ کی دنیا سے نکل جانے کا پروانہ اور تمام تر کاروباری ساکھ کی تباہی تھا۔ زفیرہ احمد دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے کافی دیر سے بہت کچھ سوچتے ہوئے فرش پر لگی ٹائلز کو خالی آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔ جس قسم کے حالات کا اُسے اب سامنا تھا اُن کے ہوتے ہوئے کمپنی کی کلائنٹیج اور بزنس کہیں ثانوی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اب اگر کوئی گنجھل تھی تو بس اپنی بقا کی حد تک کہ کیسے جیا جائے، کیسے سانس لیا جائے اور کیسے لوگوں کے سامنے سر اٹھا کر چلا جائے۔

''کتنی آسانی سے میں خود ہی اِس مافیا کی بلیک میلنگ کے کبھی نہ ختم ہونے والے چکر میں پھنس چکی ہوں۔ کبھی نہیں سوچا تھا کہ کمپنی کے بزنس کو بچانے کی کوشش میں پوری کمپنی سے ہی ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے۔''

جیسے ہی اُس نے سر کو اُٹھایا تو اپنے سامنے فرش پر رکھی ہوئی دو چمکتی آنکھیں دیکھ کر اُسے ایک دم حیرت کا جھٹکا لگا مگر فوراً ہی جان گئی کہ وہ شونی تھا جو کمرے میں اندھیرا ہو جانے کے باوجود ایک کونے میں ٹھوڑی فرش پر ٹکائے اُسے یاسیت سے تکے جا رہا تھا۔ شاید وہ اِس امید میں تھا کہ کب اُس کی مالکن اُس کی طرف متوجہ ہو اور وہ کمرے میں بھاگے دوڑے اور مستیاں کرے۔ لیکن شونی کو دیکھنے کے باوجود زفیرہ نے اُس کی طرف توجہ نہ کی اور اُٹھ کر محض کمرے کی دھیمی لائٹس جلانے پر ہی اکتفا کیا۔ شونی زفیرہ کے اس درجہ اغماض برتے جانے کو سہہ نہ پایا اور گردن جھکائے پاؤں پر پاؤں رکھتا ہوا اِدھر اُدھر ہو گیا۔ اُسے اپنی مہربان دوست کا دکھ تو سمجھ میں آ رہا تھا مگر اُس کی جانب سے روا رکھا گیا عدم التفات نہیں۔ زفیرہ سے دوستی کے تعلق میں وہ اپنے تئیں شاید دلجوئی کرنے کا خواہاں تھا مگر اُسی دوست کی بے توجہی نے اُسے تڑپا دیا تھا۔ شونی نہیں جانتا تھا کہ اُس کی دوست جس قسم کی الجھنوں میں گرفتہ ہے وہاں التفات، توجہ اور دلجوئی اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔ ماحول کی اُس جکڑن اور حالات کی اُس گنجھل میں اگر زفیرہ کے نزدیک کچھ اہم رہ گیا تھا تو صرف اپنی سماجی، معاشی اور جسمانی بقا کا کوئی راستہ، کوئی دروازہ، چاہے وہ کوئی چور دروازہ ہی کیوں ناں ہو۔

زفیرہ احمد بے دھیانی میں چلتی ہوئی اپنی بار تک پہنچی، جو بھی وہسکی سامنے دکھائی دی اُسے اُٹھایا، کھولا اور اپنا جام بھر لیا۔ تین چار گھونٹ تیزی سے حلق سے نیچے اُترے تو اضمحلال ٹھہراؤ میں بدلنے لگا لیکن یہ ٹھہراؤ ذہنی تھا جسے جام کے تیزی سے خالی ہونے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ تیسرے پیگ کے بعد کہیں یہ خیال ذہن میں اٹک کر رہ گیا کہ وہ اتنی دیر تک کیوں وہسکی کے بغیر اپنی ہی سوچوں میں خوامخواہ ہلکان ہوتی رہی۔ اِس خیال کو ذہن سے نکالنے میں چوتھے اور پانچویں پیگ کو بھی سرعت سے خالی ہونا پڑا۔ اب کے بدن میں حدت کا احساس جاگا تو دل چاہا کہ فروری کے وسط کی اِس اوائل شب میں وہ رخصت ہوتی ہوئی خنکی سے اپنے جسم کی ٹکور کرے۔ زفیرہ نے اپنے بدن کو نائٹ گاؤن میں لپیٹا اور خود ہی بوتل اور گلاس اُٹھائے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ شونی تیزی سے کہیں اُس کی پنڈلیوں سے مَس ہوتا ہوا، اُس سے پہلے باہر پہنچ کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ دور کھڑے گن مین اور خانساماں نے

کھنکارتے ہوئے اپنی اپنی مستعد موجودگی کا احساس دلایا۔ خانساماں نے زفیرہ کو لان میں رکھی کرسیوں کی طرف جاتے دیکھا تو ممکنہ احکامات کی تعمیل کے لیے تیزی سے ایک طرف مگر خاصا دور نسبتاً روشن جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

باہر زفیرہ کی توقع سے زیادہ سردی تھی مگر پھر بھی اُسے بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کا دل چاہا کہ کچھ دیر چہل قدمی کرے مگر خالی ہو چکے جام نے اُسے کرسی پر بٹھا دیا۔ نیا پیگ بنا تو اُس سے اُٹھا نہ گیا۔ ایک سکون سا تھا جو کئی گھنٹوں کی ذہنی اذیت اور خلفشار کے بعد اُسے اندر پھیلتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اُس نے ٹانگیں اُٹھا کر میز پر پھیلا دیں۔ شونی اپنی تیزی سے ہلتی ہوئی زبان منہ سے نکال کر اُس کی کرسی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس کی اوپر کو اُٹھی ہوئی دُم بھی اُسی رفتار سے ہلے جا رہی تھی۔ اپنی اِس کیفیت کے سبب وہ مسلسل اضطراب میں دکھائی دے رہا تھا۔

زفیرہ احمد کو لان میں بیٹھا دیکھ کر گن مین داخلی دروازے کی اندرونی جانب پوزیشن سنبھال کر کھڑا ہو گیا جب کہ خانساماں دہکتے انگاروں سے بھری ہوئی ایک بڑی سی انگیٹھی اُٹھا کر اُس کے قریب لے آیا۔ خانساماں کو انگیٹھی اپنے قریب لاتے دیکھ کر زفیرہ نے اُسے قدرے پرے رکھنا کا اشارہ کیا اور آنکھیں موند لیں لیکن پھر بھی کسی کی موجودگی کے احساس سے آنکھیں کھلیں تو خانساماں انگیٹھی میں سوختہ ہونے کے لیے خشک لکڑیاں ڈالنے کے بعد سر جھکائے ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ غالباً وہ کھانے کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا مگر نایاب ہو چکے سکوں پرور تخلیے میں اُسے خانساماں کی یہ مداخلت بہت بری لگی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ ڈانٹ ڈپٹ کرتی، اُسے احساس ہوا کہ یہاں لائے جانے کے بعد کے دو دنوں میں اگر اُس نے کچھ نہیں کھایا تو ایسے میں بیچارے خانساماں کی پریشانی فطری تھی۔ اُس نے خانساماں کو کچھ بھی بنانے کا اشارہ تو کر دیا مگر ابھی تک حیرت میں تھی کہ کچھ بھی نہ کھانے کے باوجود اُسے ابھی تک بھوک کیوں نہیں۔

''نجانے کیا کچھ کیا گیا ہے میرے جسم کے ساتھ ــــــ کون کون سی ڈرگز استعمال ہوئی ہیں مجھ پر؟'' ـــ جسم کا خیال آتے ہی اُسے ٹانگوں میں نسبتاً زیادہ سردی کا احساس

ہوا۔ لیکن جونہی اُس کی نگاہ وہاں پڑی تو دیکھا کہ ٹانگیں میز پر رکھنے کے سبب گاؤن وہاں سے کھسک کر اس طرح نیچے لٹکا ہوا تھا کہ زیریں بدن رانوں تک کھل کر برہنہ ہو رہا تھا۔ اُس نے ٹانگیں میز سے اُتار کر گاؤن کے دونوں پلوؤں کو آپس میں جوڑ دیا۔

''تو کیا مجھے خانساماں اِس حالت میں دیکھتا رہا ہوگا؟'' ــــــ زفیرہ نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور ذہن میں برپا ہونے والی کڑواہٹ کو حلق سے نیچے اُتار لیا۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے اس سے بھی زیادہ برہنہ حالت میں دیکھتا رہا ہو۔'' زفیرہ نے چند لمحے پہلے کے سکون میں در آنے والی اضطراب کی دراڑوں کو دبانے کی کوشش میں پھر سے آنکھیں موند لیں مگر دماغ نئے سرے سے خلفشار کی نذر ہونے لگا تھا۔

''کیا ہوتی ہے برہنگی؟ کیا ہوتا ہے برہنہ ہونے سے؟ کیا کبھی کسی کو یاد بھی رہتا ہے کہ اُس نے کس کس کو کتنا اور کہاں برہنہ دیکھا تھا؟ لوگ شادیوں کے کئی کئی سال بعد علیحدہ ہو کر نئے سرے سے کہیں اور شادیاں کر لیتے ہیں اور پھر سالہا سال تک ایک دوسرے کا برہنہ جسم زیرِ تصرف رکھنے والوں کو آمنے سامنے آنے پر بھی یاد نہیں رہتا کہ کس کا جسم کیسا تھا یا اُس میں سے اُس نے کتنا لطف کشید کیا ـــ تو پھر وہ کیوں خوفزدہ ہے بڑے صاحب کی بلیک میلنگ سے؟ کون سی قیامت آ جائے گی اگر اُس کی ویڈیوز نیٹ پر آ جاتی ہیں ــــــ بس دو چار دنوں کا شور شرابہ ــــــ سوشل میڈیا اور سوشل سرکلز میں واہیات قسم کے کمنٹس، لعن طعن، بے ہودہ الزامات، سماجی بائیکاٹ اور پھر کسی کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ اُس کا جسم کیسا تھا یا حالتِ مجامعت میں وہ کس قدر رہنر یاب تھی۔''

زفیرہ کو خیال آ رہا تھا کہ بھول جانا بھی کتنی بڑی نعمت ہے انسان کے لیے ـــ اُسے یاد آیا کہ چند ماہ پہلے ملک کی سب سے معروف فلمی ہیروئن کی اِسی قسم کی ویڈیوز نیٹ پر اَپ لوڈ کی گئی تھیں اور پھر کس قدر تہلکہ مچا تھا مگر اب کسی کو یاد بھی نہیں اور وہ بدستور ایک عزت ماب عورت کی حیثیت سے نہ صرف ٹی وی پروگرامز میں آتی ہے بلکہ سماجی تقریبات میں شرکت بھی کرتی ہے۔ اُسے اُن سیاستدانوں کی تصویر ذہن میں بنتی ہوئی محسوس ہوئی جن کی جنسی سرگرمیوں کی نہ صرف ویڈیوز موجود تھیں بلکہ اُن پر کتابیں بھی لکھی گئیں مگر وہ پہلے کی طرح

زندگی کی تمام کیفیات سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں اور سیاسی مناصب و جاہ سے بھی۔ اس کے مقابل اُسے راولپنڈی کی وہ لڑکیاں یاد آئیں جن کی جنسی شدت انہیں اپنے ٹین ایجرز بوائے فرینڈز کے ہمراہ شہر میں جگہ جگہ بنے ہوئے نیٹ کیفے کے کیبنز میں لے گئی اور پھر وہاں لگے ہوئے خفیہ کیمروں سے بنائی گئی اپنی ویڈیوز کے ذریعے نیٹ کیفے کے مالکان کی بلیک میلنگ کا شکار ہوئیں اور یوں آخر کار خودکشیوں کی نذر ہو گئیں۔

''خودکشی تو بزدلی تھی ___ تو کیوں کی ہو گی انہوں نے خودکشی ___ شاید اس وجہ سے کہ وہ ابھی ٹین ایجر تھیں اور زندگی کی سیڑھی پر شعوری قدم رکھنا چاہ رہی تھیں مگر اُس سے پہلے ہی اُن کا مستقبل تاریک ہو گیا ___ لیکن نہیں، مستقبل تو سبھی کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے ___ تو پھر کیا تھا وہ کہ جس کے سبب وہ خودکشی پر مجبور ہوئیں ___ میرے خیال میں گھر والوں کی لعن طعن یا والدین کی بدنامی کا خوف انہیں جان دینے پر مجبور کرتا رہا ہو گا ___ کیسا احساس ہو گا، کیا کیفیت ہو گی کہ والدین اور بہن بھائیوں کے سُتے ہوئے چہروں کا سامنا کرنے کی نسبت موت کا سامنا کرنا آسان دکھائی دیتا ہو گا ___ تو میں کیوں ناں خودکشی کر لوں ___ ساری مشکلیں، سارے مسائل زندگی کی ڈور ٹوٹتے ہی ختم ہو جائیں گے۔''

زفیرہ احمد کے سامنے اپنے مرحوم والد کا چہرہ گھوم گیا کہ جس نے ''مہ نور'' کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ اسے اپنے خون پسینے سے سینچ کر نہ صرف عزت کمائی بلکہ نام کمایا۔ اُسے یاد آیا کہ دنیا کی بہترین یونیورسٹی سے اُسے اعلیٰ تعلیم دلا کر اُس کے باپ نے ایک ہی بات کی تھی کہ بیٹا میرا کوئی بیٹا نہیں! کوئی اور بیٹی نہیں، صرف تم ہو اور تم نے مہ نور کو ملک کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی ہی نہیں سب سے بڑا ادارہ بنا کر میرے خوابوں کو تعبیر دلانی ہے اور دیکھنا! مجھے کبھی کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دینا۔

زفیرہ نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ ''بابا! میں نے جو بھی کیا کمپنی کے لیے کیا مگر مجھ سے راستے کے انتخاب میں غلطی ہو گئی جس کا کفارہ میں اپنی جان دے کر کروں گی ___ لیکن کیا میرے مرنے کی صورت میں یہ کفارہ ادا ہو پائے گا؟ ___ ہرگز نہیں ___ تو پھر کیا ہو گا مہ نور ایڈورٹائزنگ کا ___ وہ تو میرے مرنے پر بھی میرے حریفوں کے ہاتھوں برباد ہو کر رہے

گی ___ تنکا تنکا بکھر جائے گا اُس کا ___ تو پھر کیا ہو؟ اگر مہ نور کی قسمت میں یوں بھی برباد ہونا لکھا ہے تو پھر کیوں ناں حریفوں کی سازشوں کا مقابلہ مرنے کی بجائے جی کر کیا جائے؟ کیوں ناں اُسے مار دیا جائے جو میرے مرنے کا سامان کیے پھرتا ہے۔''

اس خیال کے آتے ہی زفیرہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سردی میں کافی دیر تک بیٹھے رہنے کے سبب اُس کا اکڑا ہوا جسم اُٹھتے ہی کپکپانے لگا تھا۔ اُسے کرسی سے اُٹھتا دیکھ کر شونی بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور تمام تر خفگی بھلا کر اُس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ زفیرہ نے جھک کر اُس کی کمر کو سہلایا تو وہ اُس کے قدموں میں لیٹ کر زبان سے اُس کے پاؤں چاٹنے لگا۔ شونی کی زبان کے کھردرے لمس نے اُس کے برف ہو چکے بدن میں اک آگ کی لکیر سی دوڑا دی۔ بدن کے سرد ہو چکے احساسات تمازت کی طرف آنے لگے تو ذہن میں ہو چکی یکسوئی کے باوجود سوالات کا انبوہ اپنی جگہ بنانے لگا۔ بڑے صاحب کا قتل وہ خود کرے یا کسی پیشہ ور قاتل کو کرائے پر لے؟ لیکن پیشہ ور یا کرائے کے قاتل کا کیا بھروسا کہ کل کو سب کچھ بتا دے کہ کس کے کہنے پر کس کا قتل کیا۔ زفیرہ کو یقین تھا کہ بڑے صاحب جیسے بھڑوے جو زندگی میں بظاہر ناقابلِ تسخیر دکھائی دیتے ہیں مرنے پر اُن کے جنازے میں چار لوگ بھی شرکت نہیں ہوتے اور نہ ہی اُن کی باقیات کی کوئی سنبھال کرنے والا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ پوائنٹ ایک فیصد کی گنجائش بھی رکھنے کو تیار نہیں تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ بڑے صاحب کو اس طرح مارے کہ کسی طرح بھی اُس پر شبہ نہ کیا جا سکے۔

کمرے میں جاتے ہوئے ابھی وہ راستے ہی میں تھی کہ اُس کے فون کا رنگر بجنے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل پھسلی اور نیچے جا گری۔ بوتل سنبھالتے سنبھالتے گلاس بھی ہاتھوں سے پھسل گیا۔ فون کی اسکرین بتا رہی تھی کہ فون اُس کے بدترین حریف خالد رومی کا تھا مگر کمرے کے اندر جاتے جاتے فون بند ہو چکا تھا۔ کیا عذاب تھا کہ محض ایک نام نے اُس کے سارے سرور کو غارت کر کے رکھ دیا تھا۔ پورے بدن میں ایک دم اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔

''کیوں کیا ہو گا اس حرامزادے نے آج مجھے فون؟ کیا پھر کوئی دھمکی؟ کوئی ترغیب یا

پھر کوئی سازش؟ کیا مجھے اُسے ریسپانس یا کال بیک کرنی چاہیے؟'' ___ زفیرہ کو اپنے دونوں سوالوں کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ اُس نے فون کو صوفے پر پھینکا اور پینے کے سلسلے کو پھر سے سرور کی سطح تک لانے کے لیے بار کی طرف جانے ہی لگی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنا دوبارہ شروع ہو گئی۔ اب بھی دوسری جانب خالد رومی ہی تھا۔ زفیرہ نے فون اٹینڈ نہ کرنے کا فیصلہ ہوتے ہوئے بھی نہ صرف فون اٹینڈ کر لیا بلکہ اُس کے بولنے سے پہلے ہی انتہائی اطمینان بھرے لہجے میں خود بول پڑی۔ یہ لہجہ اُس ماحول کے اثرات سے قطعی لگا نہیں کھا رہا تھا کہ جس کا وہ اِس وقت سامنا کر رہی تھی۔

''کیا پھر کہیں تھوکنے کے لیے فون کیا ہے میرے پیارے بزنس رائیول؟''

''اُوہو ___ ہرگز نہیں دوست! میں مرے ہوؤں کو نہیں مارتا ___ میرا مقابلہ زندہ لوگوں سے ہوتا ہے، اُن لوگوں سے جو میرے سامنے کھڑے ہوں، اُن سے نہیں کہ جو حالات کی بھگدڑ میں کچلے گئے ہوں۔'' خالد رومی کے تاسف بھرے لہجے سے تمسخر صاف جھانک رہا تھا۔

''لگتا ہے تم اِن دنوں خواب دیکھنے لگے ہو۔'' زفیرہ کے لہجے کا اعتماد پھر سے ٹوٹنے لگا تھا۔

''چھوڑو زفیرہ! کون سی دنیا میں رہتی ہو تم کہ خبریں چھپالو گی ___ سب جانتے ہیں کہ بربادی نے مہ نور کے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے ___ نہ تو تمھارے پاس بزنس رہا ہے اور نہ ہی عزت ___ وہ ملازم کہ جن کے کام سے مہ نور کا نام تھا، جاب کے لیے اُدھر اُدھر رابطے کرتے پھر رہے ہیں، رہی سہی کسر ہرجانے کے وہ دعویٰ جات پوری کر دیں گے کہ جو تم پر آج کل میں درجنوں کے حساب سے دائر ہونے والے ہیں۔''

''بزنس کم ہونے سے عزت کم نہیں ہوتی مائی ڈیر خالد رومی!! میں سازشوں کا مقابلہ کرنا جانتی ہوں۔'' زفیرہ بدستور اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''مانتا ہوں کہ بزنس کم ہونے سے عزت کم نہیں ہوتی مگر اُس کمپنی کے ملازم بھی صبح دفتر آنے سے پہلے ہزار بار سوچتے ہیں کہ جس کی چیف ایگزیکٹو کی راتیں بدنام زمانہ لوگوں کے

بستر پر گزرتی ہوں ___ کیسی عزت ڈیمانڈ کرتی ہو زفیرہ!! ذرا سنو تو سہی باہر تم پر کیسی تھو تھو ہو رہی ہے۔''

''شٹ اَپ ___ تم پھر سے بُل شِٹ پر اُتر آئے ہو۔''

''میں نہیں اُترا حضور! آپ نے خود ہی اپنے اوپر مل لیا ہے۔'' طنز، تشنیع اور تمسخر، کیا کچھ نہیں تھا اُس کے لفظوں میں۔

''کیا دیکھا ہے تم نے میرا کہ یوں بکواس کیے چلے جا رہے ہو؟'' زفیرہ اب اپنا غصہ سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

''دیکھا تو نہیں، ابھی محض سنا ہے ___ لیکن اپنی شہرت کا خیال کرو محترمہ! تمھاری وجہ سے ایڈورٹائزنگ کے شعبے کی طرف انگلیاں اُٹھنے لگی ہیں، اور ہاں کبھی دماغ میں ایسا فتور اُٹھا ہوا ہو تو میری طرف چلی آنا، مجال ہے جو بیڈ کی بیڈ شیٹ کو بھی خبر ہو جائے۔'' یہ کہتے ہوئے خالد رومی نے قہقہہ لگایا اور فون بند کر دیا۔

اِس آخری جملے پر زفیرہ احمد کا کھول اُٹھنا قطعی فطری تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ ابھی جائے اور جا کر اُس کا منہ نوچ لے یا خود ہی کال کر کے اُس کی ماں بہن ایک کر دے مگر اُسے یہ سب کچھ لا حاصل سی حرکت لگا۔ اصل میں تو ضرورت بڑے صاحب کا منہ نوچنے کی تھی کہ جس نے ایک بار پھر اُس کے اعتماد کو دھوکہ دیتے ہوئے طے شدہ مہلت کا عرصہ ختم ہونے سے پہلے ہی ویڈیوز نیٹ پر اپ لوڈ کر دی تھیں۔ اُسے چاروں طرف سے اپنے اوپر اُٹھی ہوئی انگلیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ہر شخص اُسی پر تھوتھو کیے جا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ دفتر کے ہر کیبن میں رکھے ہوئے مانیٹر پر اُسی کی ویڈیوز چل رہی تھیں لیکن کیبن خالی پڑے ہوئے تھے۔ تمام عملہ دفتر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ زفیرہ نے طیش میں اپنے ہی بال نوچنے شروع کر دیے۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے، کس سے مدد لے اور کس راستے پر چلے کہ جو اُسے بارہ فروری کی شب سے پہلے کی حیثیت میں بحال کر سکے۔

لیکن جب اُسے کچھ سجھائی نہ دیا تو اُس نے بڑے صاحب کو فون کر ڈالا۔

''اچھی بات کہ تم مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی کسی فیصلے پر پہنچ گئیں ___ اسے کہتے

ہیں good decision power___ ''

''بڑے صاحب! پھر میرے ساتھ دھوکہ___ پھر میرے اعتماد کی ایسی کی تیسی، اب آپ کیا توقع کرتے ہیں مجھ سے کہ میں کوئی فیصلہ کروں گی، فیصلہ تو اس بار بھی آپ نے کرلیا اور مجھے ذلیل وخوار کردیا۔''

''کیا بات کر رہی ہو! کون سا دھوکہ کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ؟'' بڑے صاحب کے ماتھے کے بل اُس کی آواز میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔

''آپ نے مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی ویڈیوز اَپ لوڈ کر دی ہیں، کیا یہ دھوکہ نہیں ہے میرے ساتھ؟''___ زفیرہ کی روہانسی آواز میں خوف در آیا تھا۔

''بکواس ہے یہ___ ویڈیوز اَپ لوڈ ہونی ہوئیں تو کل رات آٹھ بجے کے بعد ہوں گی اور وہ بھی تب کہ اگر تم نے کوئی اُلٹا سیدھا فیصلہ کیا تو، ابھی نہیں___ اطمینان رکھو۔''

''اگر ایسا نہیں تو پھر یہ لوگ کیا باتیں کرنے لگے ہیں کہ میں کن کن کے ساتھ کہاں کہاں راتیں گزارتی ہوں؟''___ نہ چاہتے ہوئے بھی زفیرہ کے لہجے میں تلخی اُتر آئی تھی۔

''سنو میڈم! میرا دماغ خراب نہیں کرو___ تم نے کتا رکھا تو وہی رکھا لیبراڈار جو تمہاری ضرورت کے لیے موزوں ترین تھا___ مگر ڈرائیور رکھا تو وہ رکھا جو اپنی مالکن کے تمام راز بھرے کے ایک گلاس پر اُگل دیتا ہے۔ دو رات قبل وہ تمہیں کہاں لے گیا اور پھر کس حالت میں کہاں چھوڑ گیا، اگر خود ہی لوگوں کو بتاتا پھرے تو اِس میں بڑے صاحب کا کیا قصور۔ اور ہاں! اب مجھے فون کرنا تو کوئی فیصلہ کرنے کے بعد___ میرے پاس تمہاری بک بک سننے کے لیے کوئی وقت نہیں۔''

بڑے صاحب کا فون بند ہو چکا تھا مگر زفیرہ کی خشک ہو چکی آنکھیں ایکدم پانی سے بھر گئیں۔ اُس ایک لمحے میں وہ پہلے بری طرح ٹوٹی اور پھر ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا ڈرائیور بھی اُس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کر سکتا ہے؟ کس کس موقع پر کیا کیا مدد نہیں کی تھی اُس کی مگر اُسی نے اُس کو یوں رسوا کر دیا۔ گھڑی پل میں تنہا ہو جانے کے احساس نے اُسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ باہر کے دشمنوں سے ایک طویل اعصابی جنگ کی تیاری

کر رہی تھی مگر گھر کے اندر لگی نقب کے خلاف مزاحمت کا بھی حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ زفیرہ کا دل چاہا کہ دراز سے اپنا ریوالور نکالے اور گولیاں اپنے اِس بھیجے میں اُتار لے جس کے غلط فیصلوں نے اُس سے جینے کا حق چھین لیا تھا۔

گالوں پر بہتے آنسوؤں کو دونوں ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے وہ مسمرائیز انداز میں اُٹھی اور بار کے کاؤنٹر کی دراز سے ریوالور نکال کر اُس کا چیمبر چیک کرنے لگی۔ چیمبر میں تین گولیاں تھیں۔ اُس نے نہایت مہارت سے چیمبر کو تین چار بار گھمایا اور ریوالور کی نال کو کنپٹی پر رکھتے ہوئے آخری بار اپنے اطراف میں دیکھا۔ ابھی وہ آنکھیں بند کر ہی رہی تھی کہ اُس کی نگاہ دراز میں رکھے ہوئے ایک وزٹنگ کارڈ پر پڑی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے کارڈ اُٹھا لیا۔ یہ کارڈ ایک برس پہلے اُسے ملک کے وزیر داخلہ نے ایک تقریب میں پیش کیا تھا سرگوشی میں کی گئی تخلیے کی ملاقات کی خواہش کے ساتھ کہ جسے اُس نے اپنی معروف دل شکن مسکراہٹ کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا۔

زندگی کی سرحد سے ماورا ہوتے ہوئے اِن لمحات میں کارڈ پر لکھا ہوا نام اُسے واپس زندگی کی طرف بلا رہا تھا۔ زفیرہ احمد نے ریوالور بار کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اُسے نہایت شدت سے سگریٹ کی طلب ہونے لگی تھی۔

۞

﴿۲۰﴾

رستم کے فارم ہاؤس پر ماہین کو آئے ہوئے دو دن ہو چلے تھے مگر رستم کا کہیں اُتا پتا نہیں تھا۔ دستگیر الگ سے پریشان تھا کہ رستم جیسے بدفطرت اور کینہ پرور پولیس انسپکٹر نے اُسے اُس وقت تک ماہین کے پاس رہنے کو کہا تھا کہ جب تک وہ خود وہاں نہ آ جائے۔ اُس کی پریشانی اِس لیے بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ نہ تو اُس کے پاس پہننے کا کوئی اضافی لباس تھا اور نہ ہی کھانے پینے کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے کوئی معقول رقم۔ وہ تو ایک شریف النفس اور چند سال قبل ریٹائر ہو چکا پولیس کا سب انسپکٹر تھا جو اپنی آمدنی بڑھانے کے واسطے ایک دو تھانوں میں جا کر بدمست اور نااہل انسپکٹروں کی جانب سے لکھی جانے والی تفتیشی ضمنیاں لکھا کرتا۔ یوں وہاں سے ملنے والا معاوضہ اُس کے دو بچوں کے تعلیمی اخراجات میں سہولت کا باعث ہوتا جو اُس کی تاخیر سے ہونے والی شادی کے سبب اُس وقت پیدا ہوئے جب اُس کی عمر پینتالیس چھیالیس برس ہو چلی تھی۔

غلام دستگیر کو اپنے ماتحت رہ چکے پولیس ملازمین کی یوں ماتحتی کرتے ہوئے کئی بار ندامت کا احساس ہوتا مگر ایک احساسِ تفاخر بھی تھا کہ اُس نے کبھی رشوت یا حرام کی کمائی کو اپنے اثاثوں کا حصہ نہیں بنایا تھا۔ غلام دستگیر اچھی طرح جانتا تھا کہ تھانے کے محرر کی جانب سے اُسے ادا ہونے والی رقم بھی اُس رشوت کی آمدنی سے ادا ہوتی ہے جو عملے میں تقسیم سے قبل تھانے کے اخراجات چلانے کے لیے علیحدہ نکال رکھی جاتی ہے مگر اُس کے تئیں وہ اپنی آمدن اپنی محنت کے سبب حلال کر کے لیتا ہے، اِس لیے دستگیر کو کچھ غرض نہیں تھی کہ وہ کسی حلال

ذریعے سے آئی تھی یا حرام ذریعے سے۔

رستم ہو یا تھانے کا دیگر عملہ سبھی کسی نہ کسی حیثیت میں اُس کے ماتحت رہے ہوئے تھے۔ دستگیر خود تو سب انسپکٹر کے طور پر ریٹائر ہو گیا مگر اُس کی ماتحتی میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر کی پوسٹ سے نوکری کا آغاز کرنے والا رستم آؤٹ آف ٹرن پروموشن لے کر اُس سے پہلے انسپکٹر ہو گیا تھا لیکن اِس کے باوجود اُس کے ہاں اپنے سابقہ اَفسر کے لیے اگر کوئی دید تھی یا کوئی لحاظ تھا تو بس اتنا کہ اُسے ''ضمنی نویسی'' کی نجی نوکری سے نکالا نہیں تھا مگر ہر لمحہ اُس کی تذلیل اور آئے روز کی بے توقیری سے توقع رکھتا تھا کہ غلام دستگیر خود ہی آنا ترک کر دے گا لیکن اُس کی اپنی مجبوریاں کہ پھر بھی وہ آئے چلا جا رہا تھا۔ اِس لیے میلے ہو چکے کپڑوں اور جیب میں قلیل مقدار میں رہ گئی نقدی کے باوجود وہ رستم کے فارم ہاؤس سے چلے جانے جیسی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔

طرفہ عالم یہ بھی تھا کہ ماہین جسے اِن حالات میں سب سے زیادہ مضطرب و نالاں ہونا چاہیے تھا، وہی سب سے زیادہ مطمئن سب سے بڑھ کر پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اُسے نہ تو یہ احساس کہ وہ کن حالات سے گزر رہی ہے نہ ہی اِس ادراک کی کوئی صورت کہ اُسے آنے والے دنوں میں کس قدر بدترین حالات سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ اگرچہ اُس پر کیے گیے تشدد کے نشانات مندمل نہیں ہوئے تھے، محض سوجن ہی اُتری تھی مگر اِس کے باوجود وہ اِس طرح لاتعلق سی دکھائی دے رہی تھی کہ جیسے جو کچھ اُس کے ساتھ ہوا، وہ تو ہونا ہی تھا اور اگر کچھ اور بھی ہونا ہے تو وہ بھی ہو کر رہے گا۔ غلام دستگیر جیسے ماہر اور کائیاں تفتیشی کو بھی کو یوں لگ رہا تھا کہ اپنے چہرے مہرے کی تمام تر معصومیت کے باوجود وہ کوئی چلتر اور ڈھیٹ قسم کی لڑکی ہے جسے اِس قدر وحشیانہ جنسی تشدد بھی نہ تو لرزا سکا ہے اور نہ ہی اُس کا کچھ بگاڑ سکا ہے۔ کبھی کبھی اُسے شبہ ضرور ہوتا تھا کہ شاید یہ کوئی ایسی لڑکی ہو کہ جس کی تربیت میں بچپن سے ہی صبر، قناعت اور ہر قسم کے حالات سے سمجھوتہ کیے رکھنا اِس طرح گوندھ دیے گئے ہوں کہ موجودہ عذاب سے گزرتے ہوئے بھی اُس کی بے بسی کسی کرب میں بدلنے کی بجائے لاتعلقی کی شکل اختیار کر چکی ہو!! مگر ماہین کا عادی مجرموں جیسا رویہ دیکھ کر وہ خود ہی یہ شبہ رد کرنے پر مجبور ہو جاتا اور سر

جھٹک کر ایک بار پھر سے اُس کے بارے میں کسی نئے زاویے سے سوچنا شروع کر دیتا۔

غلام دستگیر کو لاحق اندیشوں میں سب سے زیادہ اندیشہ رستم کے نجی ٹارچر سیل میں خدمات پر مامور اُن تینوں وحشیوں رمضان، کالا اور شیدا سے تھا کہ جنہوں نے دو شب قبل ماہین کو رگید کر اُس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ اگرچہ دو راتوں سے رستم نے یہاں کا رخ نہیں کیا تھا مگر پھر بھی ایذا رسانی کے لیے بھجوائے جانے والے زیرِ تفتیش ملزمان کا سلسلہ رکا نہیں تھا۔ یہ تینوں وحشی سرِ شام مختلف قسم کی منشیات سے اپنے آپ کو تشدد کی نت نئی اختراعات نافذ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیتے تھے اور پھر کہیں نصف شب کے قریب جب اُن کی طبع، انسان کی تہذیبی سطح سے معکوس تجاوز کر چکی ہوتی تو وہ کسی ایک یا کئی ایک ملزمان پر اکٹھے پل پڑتے۔ اُن کا تشدد اِس قدر روح فرسا ہوتا تھا کہ زیرِ زمین بنائے گئے ٹارچر سیل کے ساؤنڈ پروف ہونے کے باوجود انسانی جسم کے روئیں روئیں سے نکلتی چیخیں اس کی چھت پر بنے ہوئے کمروں پر کپکپی طاری کر دیتیں۔ انسانی جسم پر مختلف قسم کے تشدد کے بھیانک تجربات کرتے ہوئے وہ سائنسدانوں کے ایسے گروپ کی مانند دکھائی دیتے کہ جو سر جوڑے انسانی جسم کے ایذا برداشت کرنے کی انتہائی حد کی کھوج میں مصروف ہوں۔ وہ اِن بدنصیبوں کے جسموں کو اس طرح اندر سے اُدھیڑتے کہ باہر سے نشاں تک نہ ہوتا۔ اُن کی گُھجی مار ملزموں کے اندرونی اعضاء کو اِس طرح دھندولتی کہ وہ پل بھر میں ناکارہ ہو کر اُلٹا بدن پر بوجھ بن جاتے۔

الیاسا اگرچہ ان کا انچارج تھا اور تشدد کے بعد معلومات اُگلوانا اُسی کا کام ہوا کرتا مگر اکثر اوقات اُن تینوں کی متشددانہ جنونیت سے گھبرا کر وہ بھی سیل سے باہر نکل آتا۔ غلام دستگیر کے لیے بھی یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ پولیس کی ملازمت میں اُسے ایسے بہت سے جنونی اَفسروں سے واسطہ رہا تھا مگر رُستم کے اِن لاڈلوں کی وحشت کا تقابل ماضی کے کسی ایسے کردار سے کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ کانوں میں خنجر کی طرح گھونپی جا رہی چیخیں سننا بھی کچھ ایسا عذاب تھا کہ وہ اوپر کے کمرے میں ہوتے ہوئے بھی اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔ لیکن اس کے باوجود ماہین کے لیے نہ تو اِن چیخوں پر کان دھرنا کچھ ایسا عذابناک تھا اور نہ ہی یہاں کسی اذیت کا باعث۔ وہ جانتی

تھی کہ اُسے نوید کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے مگر اُس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں تک نہیں تھی۔ ماہین کو یقین تھا کہ اُس کے گھر والے اُس کی صفائی دینے کے لیے تھانہ کچہری آنے کی سماجی، معاشی اور اخلاقی جرات نہیں رکھتے اِس لیے نہ تو اُس کے چہرے پر امید کی رمق تھی اور نہ ہی توقع کی روشنی۔ شاید وہ اپنے خاندانی پس منظر کے سامنے ہتھیار پھینک کر اپنے آپ ہی زندگی سے لاتعلق ہو کر ایک اور زندگی میں قدم رکھ چکی تھی۔ زندگی سے لاتعلق ہو کر زندگی کرنا اُس نے سُنا اور پڑھا تو نہیں تھا مگر اب اسے جھیلنے کے لیے پوری قامت کے ساتھ کھڑی ہو چکی تھی۔

غلام دستگیر نے رستم کے انتظار میں دو دن گزارنے کے بعد جہاں کھانے پینے کے لیے کچھ رقم کا بندوبست کر لیا وہاں تھانے میں محرر کو پیغام بھجوا کر ماہین کے لیے ایک جوڑا کپڑوں کا بھی انتظام ہو گیا مگر اُس کی اصل آزمائش ابھی تک سر پر لٹکتی تلوار کی مانند موجود تھی۔ وہ ہر وقت اِسی سوچ میں غلطاں رہتا کہ ماہین کو کس طرح رستم کے آنے تک الیاسے اور اُس کے تین وحشیوں کی دستبرد سے محفوظ رکھا جا سکے۔ کیونکہ رات کا تیسرا پہر شروع ہوتے ہی جب وہ تھکن سے چور ہو کر ٹارچر سیل سے باہر آتے تو اُن کا اپنا جسم نشہ ٹوٹنے کے بعد کی کیفیت سے گزر رہا ہوتا کہ جسے سابقہ پوزیشن پر واپس لانے کے لیے اُنہیں مزید نشے کی بھی ضرورت ہوتی اور جنس کے راہیں جسمانی تسکین کی بھی۔ ایسے میں مارکیٹ سے کوئی مخنث یا کوئی پیشہ ور لڑکا پکڑ کر لانے کی بجائے اگر اُسی چھت کے نیچے ماہین جیسی لڑکی موجود ہو تو اُس کے حصول کے لیے بپھرے ہوئے وحشی کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اِس کیفیت میں وہ اگر اپنے آقا و مربی رستم ایس ایچ اُو کو اوپر شکایت لگانے کی دھمکی دے سکتے ہیں تو غلام دستگیر کو راستے سے ہٹانے کے لیے کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ غلام دستگیر کی الیاس سے بھی نہیں بنتی تھی مگر ماضی میں اُس کا ڈرائیور کانسٹیبل ہونے کے ناتے وہ دستگیر سے آمنے سامنے کم ہی الجھتا تھا مگر اُس کی عدم موجودگی میں اُس کی ماں بہن سے ہر قسم کا ناجائز رشتہ جوڑنے سے باز بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود سابقہ تعلقات کے پس منظر کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے غلام دستگیر نے جہاں آتے ہی اپنے طور پر الیاس کا منت ترلا شروع کر دیا تھا وہاں اُس پر واضح بھی کر دیا کہ رستم اَب رمضان لوگوں کو تو

کچھ نہیں کہے گا لیکن اگر ماہین کے لیے کوئی مسئلہ ہوا تو وہ اُسے نہیں چھوڑنے والا۔ الیاسا خود بھی یہ بات جانتا تھا کہ رستم اُسے بس اپنا ایک بے ضرر سا ماتحت سمجھتا ہے مگر اس کے برعکس رمضان، کالے اور شیدے سے اندر واندری اُن کے باغیانہ رویے کے سبب خائف رہنے لگا ہے۔ اگرچہ وہ تینوں وحشی رستم کے سیہ کرتوتوں کے ساتھی تھے مگر اُن کے پاس کھود ینے کو وہ کچھ نہیں تھا کہ جو رستم ایس ایچ اُو کے پاس تھا۔ گو کہ الیاسے نے بھی ممکنہ برے وقت کے لیے رستم کے خلاف کافی مضبوط قسم کے ثبوت جوڑ رکھے تھے لیکن رستم بھی ابھی اُڑتی چڑیا کے پر اگر گنتا نہیں تھا تو اُن پر نگاہ ضرور رکھتا تھا لہذا اُس نے الیاس کو جکڑ رکھنے کے لیے اتنا کچھ اکٹھا کر رکھا تھا کہ وہ اُس کے خلاف زبان کھولنا بھی چاہے تو پہلے ہزار بار سوچے۔ اِسی سبب الیاسا اپنے تمام تر حرامی پن کے باوجود دل سے نہیں چاہتا تھا کہ ماہین اب پھر اُن وحشیوں کے ہاتھ لگے۔ اِسی پیش بندی میں اُس نے گذشتہ دو راتوں سے نہ صرف اپنے لیے بلکہ رمضان، کالے اور شیدے کی دل پشوری کے لیے بھی کچھ مناسب بندوبست کر رکھا تھا مگر وہ تینوں پھر بھی ماہین کے کمرے کی طرف جانے کے لیے بار بار رسے تڑواتے رہے لیکن الیاس اور دستگیر کے منت ترلے کے سبب کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن جب تیسری شب بھی رُستم وہاں نہ آیا تو غلام دستگیر کی ہمت جواب دینے لگی۔ الیاس کے رویے سے بھی یوں ظاہر ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش میں ہے۔ اُس نے دن کو موقع دیکھ کر ایک بار پھر الیاس کو کریدنے کی کوشش کی تو اتنا معلوم ہو سکا کہ ضلع کا پولیس کپتان (ایس ایس پی) مقامی ایم پی اے کی شکایت پر اچانک تبدیل کر دیا گیا ہے اور اُس کی جگہ نئے ضلعی آفیسر نے چارج سنبھال لیا ہے۔ نیا ایس ایس پی سر پھرا، بے دید، بدلحاظ اور بدتمیز ہونے کے سبب ایمانداری کی روایتی شہرت رکھتا تھا۔ اُس نے آتے ہی اچانک تھانوں پر چھاپے مارنے کے ساتھ ساتھ صبح شام کھلی کچہریاں لگانا شروع کر دیں۔ موقع پر ملازمین کے لیے فوری سزاؤں کا سلسلہ شروع ہوا تو تھانوں پر بھی اُتھل پُتھل ہونے لگی۔ لوگوں کو یقین ہو چلا تھا کہ رستم ایس ایچ اُو بھی آج کل میں لائین حاضر ہوا سو ہوا۔

رستم ایس ایچ او تو نجانے اُس روز لائین حاضر ہوا یا نہیں لیکن مغرب کے لگ بھگ رمضان، شیدا اور کالا اچانک اپنے سونے والے کمرے سے آنکھیں ملتے ہوئے نکلے اور تقریباً

دوڑتے ہوئے مین گیٹ کو اندر سے لگا تالا کھول کر باہر ہو چکے ملگجے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے الیاس بھی اُس انداز میں گھبرایا ہوا کہیں عقب سے نکلا اور اپنی شلوار سنبھالتا ہوا باہر کی جانب لپکا۔ وہ شاید پاخانے میں تھا۔ مین گیٹ سے کچھ فاصلے پر زمین سے ایک فٹ اونچے بنائے گئے کچے تھڑے پر مونڈھا ڈالے بیٹھا غلام دستگیر بھی سراسیمہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے لیے اچنبھا تھا کہ اِن وحشیوں کا ٹولہ بھی یوں کسی سے خوف زدہ ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا مگر پھر بھی تجسس کے مارے تیز تیز قدم اُٹھا کر مین گیٹ کی طرف جاتے ہوئے الیاس کو راستے ہی میں جا لیا۔

''کچھ بتاؤ گے نہیں کہ ہوا کیا ہے؟''

''نئے کپتان صاحب کو اِس جگہ کی مخبری ہو گئی ہے اور بس ابھی کچھ دیر میں یہاں چھاپا پڑنے والا ہے۔'' الیاس کا سانس اچھا خاصا پھولا ہوا تھا۔ ''ایس ایچ اُو تو گیا اَب بھین کے بھاڑ میں لیکن تو میں بھی اگر بچ جائیں تو بڑی بات۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ دستگیر کے ہاتھ سے چھڑایا اور یہ جا وہ جا۔ اِس صورتحال میں غلام دستگیر کی اپنی حالت پتلی ہونے لگی تھی۔ ساری عمر کی نیک نامی برباد ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی فارم ہاؤس میں موجودگی کا کوئی قانونی جواز نہیں تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا تھا ناں کہ وہ رستم ایس ایچ اُو کی تفتیشی ضمنیاں لکھا کرتا ہے تو جواز یہ بھی انتہائی غلط، بلکہ بالکل ہی غیر قانونی جس کی پولیس رولز میں میں گنجائش تک نہیں۔

پہلے تو اُس نے سوچا کہ وہ بھی گیٹ کی طرف بھاگے اور جتنا جلدی ہو سکے نکل لے مگر پھر خیال آیا کہ ماہین کو بھی ساتھ نہ لے جانا انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہو گی۔ ایک اکیلی لڑکی کیا کرے گی، کہاں جائے گی۔ مگر پھر خیال آیا کہ وہ تو قتل کے کیس کی ملزمہ ہے جسے اُس کے اپنے گھر سے گھر والوں کے سامنے گرفتار کیا گیا ہے تو ایسی ملزمہ کو لے کر وہ جائے گا کہاں؟ اگرچہ وہ اُس کی بیٹیوں کی عمر کی تھی مگر پھر بھی اپنے گھر لے جائے تو گھر والوں کی طرف سے عذاب کھڑا کیے جانے کا امکان اور اگر کہیں باہر کسی اور جگہ رہنے کا بندوبست کرا بھی دے تو کسی کا کیا اعتبار۔ ہر شخص جوان لڑکی کی شلوار اُتارنے کو ہر وقت تیار۔ تو پھر کیا کیا

جائے؟ دستگیر ابھی اسی مخمصے میں تھا کہ ایک اور خیال اُس کے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔

''ابھی ماہین کی گرفتاری تو نہیں ڈالی گئی تو کیوں ناں اُسے اُس کے اپنے گھر پہنچا کر خود اپنے گھر کی راہ لی جائے؟'' بات تو ٹھیک تھی مگر پھر خیال آیا کہ نئے ایس ایس پی کے خوف سے اگر تھانے میں لڑکی کی گرفتاری ڈال جا چکی ہوئی تو ایسے میں کیا ہوگا؟ لڑکی خوامخواہ تھانے سے مفرور تصور ہو کر ایک اور عذاب میں پھنس جائے گی۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' ___ درپیش صورت حال نے غلام دستگیر کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی لیکن اِس کے باوجود اُس کے ذہن میں یہی تجویز چکرائے جا رہی تھی کہ مفروری کی قیمت پر بھی ماہین کا اپنے گھر چلے جانا اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بہتر ہے۔ چونکہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا اِس لیے وہ ماؤف ذہن کے ساتھ اُٹھا اور ماہین کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ہر چیز سے بے خبر نہایت سکون سے رنگلے پائیوں والی چارپائی پر بے باکانہ انداز میں بیٹھ کر ایک کونے میں کھوکھا نما میز پر رکھے پرانے ماڈل کے کلر ٹیلی وژن سیٹ پر کسی مقبول ڈراما سیریئل کی کوئی قسط دیکھ رہی تھی۔ غلام دستگیر کے کمرے میں آنے کا اُس نے کوئی نوٹس نہ لیا اور بدستور انہماک سے ٹیلی وژن سیٹ کی اسکرین پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی۔ اُس کے بیٹھنے کے انداز سے قطعی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ صرف تین دن قبل وہ اِسی جگہ، اِسی مکان میں بدترین اجتماعی جنسی تشدد کا شکار ہو چکی ہے۔ ماہین کو بے باکانہ انداز میں بیٹھے دیکھ کر غلام دستگیر نے نگاہیں جھکا لیں اور ہلکی سی آواز میں تیزی سے گلا صاف کیا۔

ماہین نے پھر بھی توجہ نہ کی تو وہ تیزی سے اُس کے سامنے آیا اور جلدی جلدی تمام صورتحال سے آگاہ کرنے کے بعد اُسے فوراً چادر اوڑھنے کو کہا تاکہ گھر سے نکلا جا سکے۔ غلام دستگیر نے ماہین کو واضح طور پر بتا دیا تھا کہ فارم ہاؤس سے سب لوگوں کے بھاگ جانے کے بعد اب وہ اُسے اُس کے گھر چھوڑنے جا رہا ہے مگر حیران کن طور پر ماہین نے وہاں سے کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا۔ اپنے گھر تو کسی قیمت پر نہیں۔ غلام دستگیر بری طرح جھنجلا چکا تھا۔ اُس نے سوچا کہ لڑکی جائے بھاڑ میں اور وہ خود یہاں سے نکلے کیونکہ اب وقت نہیں رہا تھا اُس کے نخرے سہنے اور بد دماغی برداشت کرنے کا۔ وہ اب قطعی طور پر طے کر چکا تھا کہ ماہین

ایک جنسی جنونی ہے جس کے نزدیک حیوانیت کی راہ ہی دراصل زندگی کو اپنے ڈھب سے جینے کی راہ ہے۔ اُسے پھر سے یقین ہو چلا تھا کہ نوید کا قتل واقعی اسی لڑکی نے کیا ہوگا جس کی معصوم شکل نجانے اور کتنے لوگوں کو اُن کی زندگیوں سے محروم کرنے کی تاک میں ہے۔ اُسے اپنی ملازمت کے زمانے میں ایسی کئی مجرم عورتوں سے واسطہ پڑ چکا تھا کہ جو ہر قیمت پر اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے والدین اور بہن بھائی تو کیا اپنی اولاد تک کی جان لینے سے گریز نہیں کرتیں۔ غلام دستگیر کے نزدیک ماہین نہ صرف تشدد سے لذت کشید کرتی تھی بلکہ اپنے جسم کی بے وجہ نمائش سے خود نمائش کاری کے نفسیاتی عارضے میں مبتلا دکھائی دے رہی تھی۔ غلام دستگیر کے اِس تمام تر کھولاؤ اور اضطراب کے باوجود ماہین بدستور ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ڈرامے سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر سے ماہین کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں اُس کی رگ رگ میں موجود چلتر اور ڈھٹائی کے برعکس صرف سادہ سی معصومیت کا راج تھا۔ دستگیر کو ایک بار پھر اپنی فیصلہ ساز سوچ پر ندامت سی ہونے لگی تھی۔ اُسے لگا کہ ایک طویل مدت تک سنگین جرائم کی وارداتوں کا تفتیشی افسر رہنے کے سبب اُسے ہر شخص مجرم دکھائی دینے لگا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اُس کے پاؤں کسی نہ دِکھنے والے تعلق میں بندھ کر رہ گئے۔ وہ کمرے سے فوراً نکل بھاگنا چاہتا تھا لیکن اُس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر ماہین کی منتیں کیں کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اگر قسمت اُسے بچ نکلنے کا موقع دے رہی ہے تو وہ موقع سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھا رہی۔ لیکن ماہین ٹس سے مَس تک نہیں ہوئی۔ غلام دستگیر کو یوں لگا کہ اسی اثنا میں نیا کپتان کمرے میں داخل ہوگا اور پھر اُس کے سر تھوپ دیے گئے الزامات اور چہرے پر مَل دی گئی لعنت ملامت کی کالک کے بعد سزا کے طور پر اُسے اُس کی پنشن سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ اِس صورتحال کا تصور کر کے ہی اُسے جھرجھری آ گئی۔

اِس سے قبل کہ غلام دستگیر کچھ اور سوچتا، کمرے میں اچانک کالا داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی وحشت دیکھ کر غلام دستگیر بھی بوکھلا گیا۔ چھ فٹ سے بھی نکلتے ہوئے قد پر کسی بڑے تربوز کی طرح رکھا ہوا سیاہ چہرہ، سُرخ آنکھیں، نیچے کو لٹکے ہوئے موٹے موٹے سیاہ ہونٹ جن کے اندر سے جھانکتے ہوئے پیلے دانت اُسے بغیر کسی اضافی کوشش کے وحشت

ناک بنائے چلے جا رہے۔ کمرے میں داخل ہونے کے انداز سے وہ بپھرا ہوا لگ رہا تھا جیسے بہت کچھ داؤ پر لگا کر پھر سے وہاں پہنچا ہو۔ اُس کی نگاہیں ماہین پر ٹکی ہوئی تھیں اِس احساس سے یکسر عاری کہ وہاں غلام دستگیر بھی موجود تھا کہ جو کبھی اُس کا ایس ایچ اُو ہوا کرتا تھا۔

کالے کی کمرے میں وحشیانہ آمد نے نجانے ماہین کو کیسے خبر کر دی کہ وہ اپنا انہماک چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کالے کو دیکھ کر پہلے تو اُس کا چہرہ متغیر ہوا مگر اُسی آن میں ہی متبسم ہو گیا کہ جیسے وہ اُس کی منتظر رہی ہو۔ غلام دستگیر کے لیے یہ سب کچھ انوکھا اور حیران کر دینے والا تھا مگر جونہی اُسے صورتحال کا ادراک ہوا وہ بھانپ گیا کہ کالا وہاں کس ارادے سے پہنچا ہے۔ ماہین کو اب نئے حالات کا شکار ہونے سے بچا پانا تقریباً ناممکن ہو چلا تھا۔ پھر بھی اُس نے اپنی سی کوشش کی ۔اس سے پہلے کہ کالا لپک کر ماہین تک پہنچتا وہ کالے کے سامنے آ گیا۔ کالے نے اُس سے نگاہیں ملائے بغیر ہلکی سے جھکائی دے کر آگے نکلنا چاہا مگر دستگیر کو شاید اِس کا اندازہ تھا، وہ بھی اُس طرح اُسی سمت آگے ہو گیا۔ کالے نے اب بھی اُس سے نگاہیں ملائے بغیر اپنی بائیں کہنی ذرا سی اوپر کو اُٹھائی جو دستگیر کے سینے کو درمیان میں دباتی ہوئی ٹھوڑی سے جا ٹکرائی ۔وہ اِس چوٹ سے سنبھلا ہی تھا کہ اُسی لمحے کالے کا بائیاں پاؤں جوتے سمیت دستگیر کے بائیں پاؤں کو کچلتا ہوا چلا گیا۔ اب کے سنبھلنا مشکل تھا لہٰذا دستگیر فرش پر گر گیا۔

کالے نے آگے بڑھ کر ماہین کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ کے پنجے میں مضبوطی سے جکڑا اور اُسے ننگے پاؤں کھینچتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ غلام دستگیر نے اُٹھنے کی بہت کوشش کی مگر نہ اُٹھ سکا لیکن کالے کے ساتھ کھنچی چلی جا رہی ماہین کے چہرے کے آخری تاثرات اُس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے جہاں نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ ہی اندیشے، وسوسے، پریشانی یا مزاحمت۔ غلام دستگیر کو یوں لگا کہ جیسے کوئی دلہن اپنی رضا اور رغبت کے ساتھ کشاں کشاں اپنے دولہا کے ساتھ رخصت ہو رہی ہو۔ ''کیسی عورت ہے یہ؟ کیا کوئی عورت ماہین جیسی بھی ہو سکتی ہے؟'' ماہین کے رویے کے سامنے غلام دستگیر کا بطور تفتیشی پولیس آفیسر تیس سال کا تجربہ بھی دھرے کا دھرا رہ گیا۔ وہ خود بھی اپنے سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

کالا ماہین کو لے کر فارم ہاؤس کے صدر دروازے سے باہر نکلا اور وہاں موجود ایک موٹر

رکشا کی پچھلی سیٹ پر اُسے بٹھانے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رکشا اسٹارٹ ہوا اور پھر کچے راستے پر ہچکولے کھاتا ہوا یہ جا وہ جا۔ نجانے کالے کو کیسے یقین تھا کہ ماہین رکشے کی سواری کے دوران نہ تو کہیں اتر کر بھاگنے کی کوشش کرے گی اور نہ ہی چیخ چلا کر کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارے گی۔ شاید جس سوال کا جواب غلام دستگیر کے عمر بھر کے تفتیشی تجربے کے پاس نہیں تھا وہ کالے کے محض ایک رات کے جسمانی تجربے کے پاس موجود تھا۔

۞

﴿۲۱﴾

شاکا اور کاشی کے مُنڈا بیرک میں دھکیلے جاتے ہی سترہ کے جتھے نے اُنہیں اپنے گھیرے میں لے لیا جب کہ اُنہیں بیرک میں بند کرنے والا سنتری دبی دبی ہنسی ہنستا ہوا واپس جا چکا تھا۔ سترہ قیدیوں کا جتھا حلقے کی صورت اُن دونوں کے گھر گھومتے گھامتے ہوئے جوں جوں تنگ ہوتا جا رہا تھا توں توں کاشی اور شاکا کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اُنہیں خوف اُس فعل کا نہیں تھا کہ جو اُن کے ساتھ ہونے جا رہا تھا، اُنہیں خوف اُس طریقہ کار سے تھا کہ جو اُس سلسلے میں اُن کے خلاف روا رکھا جانا تھا۔ جنسی اختلاط اگر محبت کی پیش رفت میں اور از راہ اُلفت ہو تو وجہ تسکین ہونے کے سبب تفاخر اور انبساط کا باعث سمجھا جاتا ہے لیکن اگر وہی فعل فریق مخالف کی رضا کے برعکس اور جبراً تکمیل تک پہنچے تو مدخولہ فریق کے لیے تذلیل اور رسوائی کا موجب قرار پاتا ہے۔ ایک عرصہ سے مفعولیت کو بارضا و رغبت خود پیشہ بنا چکے ان لڑکوں کو بھی اسی تذلیل کا غم کھائے جا رہا تھا کہ جو اجتماعی جسمانی تجاوز کے زمرے میں اُن کا نصیب ہو چکی تھی۔ ویسے بھی اجتماعی جنسی دراندازی مذلت، تحقیر اور تشدد کے معنی میں اسی لیے لی جاتی ہے کہ اس میں ایک ہجوم کو شامل رکھا جاتا ہے وگرنہ تنہائی اور پردے میں کیا جانے والا یہی فعل نہ تو اہانت سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی ذلالت۔

دیکھتے ہی دیکھتے شاکا اور کاشی کے گھر دگھیرا اور تنگ ہوا اور پھر نجانے کب اُن کے پہنے ہوئے کپڑے چیتھڑے بن کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ سترہ کا جتھا اُن کے اتنا قریب آ چکا تھا کہ محاصرے میں آئے ہوئے دونوں لڑکے اُن کی چٹتوں اور جسمانی چھیڑ چھاڑ کی زد میں

تھے۔ اگر وہ اُن سے بچ نکلنے کی کوشش میں اپنے بدن کو چراتے تو وہ اُن پر تھوکتے۔ عجیب سی تحقیر کا سامنا تھا اُن دونوں کو کہ جس کی مذلت کے روبرو اجتماعی زیادتی کا عذاب بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اُن دونوں نے سترہ کے اِس جتھے کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ اُن کے ساتھ جو بھی کرنا ہے کر لیا جائے مگر اِس طرح تھوکا نہ جائے۔

''اُو بھین یکو!! ترتالی بندے پھڑ کاتے ہو اور وہ بھی بے گناہ مگر اب تھوکے جانے سے ڈرتے ہو___ بچو! ابھی تو تمہارے منہ پر تھوک رہے ہیں___ پیشاب کی باری ابھی نہیں آئی جو ہم نے صبح سے روکا ہوا ہے۔'' سترہ میں سے ایک چوہدری مُنڈا جتھے میں سے آگے نکل کر اکڑ کر بولا اور باقی سارے کے سارے ہنس پڑے۔

''چوہدری جی___ آکڑ تاں ویکھو اناں کی___ تھوک سے ڈرتے ہیں___ اب کوئی اِن سے پوچھے کہ ساری زندگی تھوک ہی کی تو کمائی کھائی ہے مگر پھر بھی تھوک سے ڈرتے ہیں۔'' ایک اور چوہدری مُنڈا اغراتے ہوئے بولا۔ ''کیوں جی چوہدری جی! ویسے بھی تو یہ لبڑ کر تھوکم تھوک ہوئے پڑے ہیں تو پھر کیوں ناں ڈرامے کی پہلی قسط کے طور پر اِن دونوں کا آپس میں تماشہ دیکھا جائے۔''

''بات تو ٹھیک ہے___ اب تھوکے ہوئے کو ہم کیوں چاٹیں___ پہلے اِن کا آپس میں تماشا دیکھ لیں___ پھر ہم بھی میدان میں اور یہ چوتیے بھی میدان میں۔'' چوہدری مُنڈے نے چھٹتے ہی فیصلہ سُنا دیا اور پھر دائیں لات کھینچ کر شاکے کے چوتڑوں پر اِس طرح رسید کی کہ وہ منہ کے بل زمین پر جا گرا۔

اس سے پہلے کہ مُنڈے چوہدری کے حکم کی تعمیل کرانے کے لیے کچھ اور تشدد آزمایا جاتا اچانک بیرک کا تالا کھلنے اور ایل دراز کے کھینچے جانے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ آواز سنتے ہی سترہ کے جتھے کا محاصرہ بھی ٹوٹ گیا۔ سب نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو تو چھوٹا جیلر دو سنتریوں کے ساتھ بیرک میں داخل ہو رہا تھا جبکہ دو سنتری دوبارہ جلدی سے بند کر دیے گئے گیٹ کے باہر موجود تھے۔ چھوٹے جیلر کی نگاہ برہنہ حالت میں فرش پر پڑے ہوئے شبیر اور اُس پر جھکے ہوئے کاشف پر پڑی جن کا پورا وجود بے تحاشہ لعاب دہن سے لتھڑا ہوا تھا۔ چھوٹا جیلر ایک

لمحے میں تاڑ گیا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ستر ہ کے جتھے کے خلاف کسی قسم کی کوئی کاروائی کرنے سے ہچکچا رہا تھا کیونکہ مُنڈا بیرک ہی تو آمدنی کا وہ ذریعہ تھی کہ جس سے افسروں کے گھروں میں آسودگی تھی۔ پھر بھی اُس نے نمائشی طور پر جتھے کے کچھ لڑکوں کے پچھواڑے پر بید رسید کیے اور پھر مصنوعی خفگی کے اظہار میں کڑ کا دھڑ کا کرتا ہوا شبیر عرف شا کا اور کاشف عرف کاشی کو اُسی برہنہ حالت میں بیرک سے باہر نکال کر لے گیا۔ ستر ہ کا جتھا پہلے تو دم سادھے حیران رہا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ جب اُن کا ایسا استقبال ہوا تھا تو انہیں بچانے کوئی نہیں آیا تھا لہٰذا اب یہ امتیازی سلوک کیوں۔ جتھے سمیت بیرک کا ہر ایک مُنڈا اپنی اہمیت اور جیل اسٹاف کی بے بسی دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اِس لیے جونہی بیرک کے دروازے کو دوبارہ تالا لگا دیا گیا تو انہوں نے شدید ترین نعرہ بازی کرتے ہوئے جیلر کی ماں بہن کی توصیف میں بھرپور قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ شا کے اور کاشی جیسے شکار کے ہاتھ سے یوں نکل جانے کا انہیں صرف تاسف اور صدمہ ہی نہیں بلکہ غصہ تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس طرح بدل چکے حالات میں اس کا اظہار کریں تو کیونکر کریں۔

شا کے اور کاشی کے لیے یہ زندگی کے بدترین لمحات تھے۔ انہیں اپنی تقدیر پر پہلی بار رونا آ رہا تھا کہ اس سے پہلے اس قدر بے بسی، اِس قدر تذلیل کبھی نہیں سہی تھی مگر آنسو تھے کہ آنکھوں سے باہر آنے کی بجائے کہیں اندر مسلسل چھید کرتے ہوئے اپنا راستہ بنانے کی کوششوں میں تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر پھر بھی چلے جا رہے تھے۔ خاصی دیر تک چلنے کے بعد جب شبیر کے دائیں کولہے کی چوٹ نے شدید درد کے باعث الگ سے تھرتھل مچالی تو لنگڑا کر چلتا ہوا شا کا ایکدم نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ اُسے یوں بیٹھا دیکھ کر چھوٹا جیلر اور تینوں سنتری بھی وہیں رک گئے۔ چھوٹے جیلر نے شا کے کو ایک موٹی سی مخلوط گالی دی اور اُٹھ کھڑا ہونے کو کہا۔ شبیر ابھی کراہتا ہوا اُٹھ ہی رہا تھا کہ دو تین سوٹیاں زَپ زَپ کرتی ہوئی اُس کی رانوں پر اِس قدر زور سے پڑیں کہ اُس کے حلق سے نکلنے والی چیخ روکے بھی نہ روکی جا سکی۔ اِس سے پہلے کہ چھوٹے جیلر کی طرف دی جانے والی گالیوں میں ہاتھ میں پکڑی اسٹک کی مزید ضربات شامل ہوتیں، شبیر جلدی سے کھڑا تو ہو گیا مگر سیدھے ہو کر چلنا اُس کے

بس سے باہر تھا۔

''تم دونوں کے وَٹ تو میں نے نکالنے تھے مگر خوش قسمت ہو جو بچ گئے اور اوپر سے بُلاوا آ گیا ___ ورنہ ترتالی بندے مارنے کا حساب تو میں نے چکانا تھا __ اِس لیے یہ جو دو چار تمہارے چوتڑوں پر پڑی ہیں، انہیں تبرک سمجھ کر قبول کر لو۔'' چلتے چلتے اب کے چھوٹا جیلر رُکا، کاشف کی طرف غور سے دیکھا اور پھر اُسے بازو سے پکڑ کر کان پکڑنے کو کہا۔ کاشف اِس اچانک پڑنے والی اُفتاد یا شاید اپنی برہنگی کے سبب ہچکچایا تو دو سنتریوں نے آگے بڑھ کر اُسے خود ہی مرغا بنا دیا۔ ابھی اُس نے کان پکڑے ہی تھے کہ پچھواڑے پر پڑنے والی چھوٹے جیلر کی اسٹک کی پے در پے ضربات نے اُسے درد سے کراہتے ہوئے کان چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ''چلو اتنا ہی کافی ہے اِس بھین کے یار کے لیے ___ اب پتہ نہیں کب دوبارہ ہاتھ آتے ہیں ہمارے!!''

دو برہنہ اور تین وردی والے افراد پر مشتمل یہ چھوٹا سا قافلہ کچھ دیر اور اِدھر اُدھر سے ہوتا ہوا جیل کے اُس حصے تک پہنچا کہ جہاں جیل کے اسٹاف کا گزر بھی پوری چھان بین کے بعد ہوتا تھا۔ اِس حصے کی نگرانی بڑے جیلر کے چہیتے اور باعتماد اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل عمر دراز کے ذمہ تھی۔ اِس حصے میں بیرکس کی بجائے چھوٹے چھوٹے کوارٹر نما کمروں کی قطار تھی کہ جن کے سامنے کے حصے کو آہنی سلاخوں سے محفوظ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ آہنی سلاخوں کی اِس باڑ سے باہر تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلے پر پھر ایک اور آہنی باڑ تھی جس کے ایک کونے پر دروازہ اور دروازے کے باہر چیک پوسٹ سی بنی ہوئی تھی جہاں جیل کا سب سے بہتر اسٹاف متعین تھا۔ جیل کا یہ عملہ اپنی خصوصی حیثیت اور سفارشی قدر و منزلت کے باعث نوری مخلوق سمجھا جاتا تھا جو کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ باڑ کے اندر بنے ہوئے اِن کمروں میں حزب اختلاف کے سیاسی لیڈر، بددیانت بیوروکریٹس، انڈر ورلڈ مافیا کے کرتا دھرتا اور دہشت گردی کی وارداتوں کا نیٹ ورک چلانے والے بااثر افراد کو رکھا جاتا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے اُنہیں نہ صرف سی کلاس قیدی بطور مشقتی دستیاب تھے بلکہ وہ سب سہولیات بھی میسر تھیں کہ آزاد دنیا میں جن کا محض تصور کیا جا سکتا ہے۔

چھوٹا جیلر شبیر اور کاشف کو لے کر جیل کے خاص حصے کی بیرونی آہنی باڑ کے ایک کونے پر بنی ہوئی چیک پوسٹ پر پہنچا تو اُسے وہاں روک لیا گیا۔ وہاں موجود عملے کو لاکھ بتایا کہ اُس کا کام صرف اِن دو قیدیوں کو مُنڈا بیرک سے یہاں تک پہنچانا تھا مگر وہ لوگ بضد تھے کہ عمر دراز صاحب کا حکم ہے کہ دونوں لڑکے صرف اُسی کے حوالے کیے جائیں۔ چھوٹا جیلر اگر چہ عمر دراز کی طرح اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہی تھا مگر تھا اُس سے کہیں سینئر لیکن چوکی پر موجود عملے کی ضد کے سامنے زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ذرا سی آکڑ بازی میں نقصان عمر دراز کا نہیں بلکہ اُسی کا ہونا تھا۔

اتنی دیر میں آہنی باڑ کے اندر بنے ہوئے کمروں میں سے ایک کمرے سے عمر دراز باہر نکل کر آتا دکھائی دیا۔ شاید اُسے اطلاع کر دی گئی تھی۔ وہ چوکی پہنچا تو چھوٹے جیلر سے دعا سلام کی بجائے اپنے اسٹاف کی طرف استفساریہ نگاہوں سے دیکھنے لگا لیکن کسی اور کے کچھ بتانے سے پہلے چھوٹے جیلر نے شاکا اور کاشی کو کندھوں سے پکڑ کر عمر دراز کے سامنے کر دیا۔ عمر دراز نے دونوں لڑکوں کو برہنہ حالت میں دیکھا تو پہلے حیران ہوا مگر پھر زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ''اوئے انہیں کس حالت میں لیے پھرتے ہو___ تم نے تو کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی؟''

''وقت پر پہنچ گیا ورنہ پوری مُنڈا بیرک انہیں پھیتی پھیتی کرنے پر تُلی ہوئی تھی ___ اور اِن کے کپڑے بھی اُنہوں نے پھاڑے ہیں__ تم اِن کی وصولی لو اور میری جان چھوڑو۔''

''ٹھہرو میری جان ! میں اِن کا ملاحظہ تو کر لوں__ طبی ملاحظہ !! تمہارا کیا اعتبار، فروٹ تم نے کھایا ہو اور نام مُنڈا بیرک والوں کا لگا دو۔ عمر دراز نے چھوٹے جیلر کو آنکھ ماری اور پھر اُن کے زیریں بدن کو غور سے دیکھتا ہوا باری باری شبیر اور کاشف کے گرد گھوم گیا۔

''کوئی خاص بات تو ہے اِن بھین کے یاروں میں کہ زمانہ قتل ہونے کو تیار پھرتا ہے۔'' عمر دراز نے کاشف کے سرین کو اسٹک سے دباتے ہوئے کہا۔ ''ذرا طنطنہ تو دیکھو اِن حرامیوں کا !! جیسے اصیل کُکڑ کے چوزے ڈربے سے باہر نکلتے ہی گردن کو ٹیڑھا کر کے اوپر اُٹھا لیتے

ہیں۔''

''یار عمر دراز ! کاغذ پے گھگی مار اور مجھے فارغ کر !!''___ چھوٹے جیلر نے عمر دراز کی بک بک سے تنگ آ کر دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔

''کمال ہے یار ! تم انہیں دینے کے لیے اُتاولے ہو اور اُدھر اندر رحمت خان اِنہیں لینے کے لیے اُتاولا__ شام سے کئی بار پوچھ چکا ہے__ میں تو کہتا ہوں آج رَج کے اِن کی زیارت کر لو ورنہ آج کے بعد اِن کا پچھواڑا تو کیا، اِن کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ویزا لگوانا پڑے گا۔'' عمر دراز چھوٹے جیلر کو پھر سے آنکھ مار کر دانت نکوسنے لگا۔

رحمت خان کا نام سُن کر جہاں شبیر اور کاشف نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں سوالیہ مگر معنی خیز انداز میں جھانکا وہاں یہ نام سُنتے ہی چھوٹا جیلر دم سادھ کر رہ گیا۔ کچھ دیر سے اُس کے چہرے پر آئے ہوئے بیزاری اور اُکتاہٹ کے تاثرات بھی یوں غائب ہوئے کہ جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر چیک پوسٹ کے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ عمر دراز کی گفتگو اور چھوٹے جیلر کے رویے نے شبیر اور کاشف پر دو باتیں واضح کر دی تھیں۔ اولاً اُنہیں کسی رحمت خان نامی شخص کے حوالے کیا جا رہا ہے اور ثانیاً وہ جو بھی ہے اُس کے سامنے نہ تو جیل کے کسی افسر کی کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی کسی قیدی کی۔

جیل کی سُپر پاور کی تحویل میں جانے کے احساس نے ایک دم اُن کی کچلی ہوئی خود اعتمادی کو جہاں پھر سے بحال کر دیا وہاں مسام مسام میں سرایت کر چکے خوف، اندیشے اور وسوسوں کو بھی پسینہ بنا کر ایک ہی آن میں باہر نکال کر بہا دیا۔ اب اگر اُن کے ذہن میں کوئی کلبلاہٹ چل رہی تھی تو بس یہی کہ رحمت خان کون ہے؟ رحمت خان کیا ہے؟ رحمت خان کیسا ہے؟ رحمت خان نے انہیں اپنی تحویل میں لے کر تحفظ فراہم کیا ہے یا وہ کسی اور عذاب کی جانب دھکیلے جا رہے ہیں؟ ایک دوسرے کے ذہنوں میں اُٹھنے والے ایک جیسے سوالات اور چہروں پر در آنے والی فکر کی ہلکی سی پرچھائیں نے اُنہیں غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کے قریب کیا تو شبیر نے کاشف کے ہاتھ کی انگلیوں کو اپنی مٹھی میں دبا کر بے فکر ہو جانے کی ڈھارس بندھائی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں حیران ہو رہے تھے کہ یہ کیسا نام تھا کہ جس کے

محض ایک بار لیے جانے کے بعد نہ تو اُن کے دل میں اپنی برہنگی کا احساس باقی رہا تھا اور نہ ہی اُس ذلت اور تحقیر کی اذیت کی چبھن کہ جس کا سامنا اُنہیں کچھ دیر پہلے تک انتہائی شدت سے تھا۔ اصیل ککڑ کے چوزوں کی ٹیڑھی گردنیں کچھ اور بھی ٹیڑھی ہو چلی تھیں۔

شبیر اور کاشف کو کچھ دیر مزید چیک پوسٹ پر روکے رکھا گیا کہ جب تک جیل کے اسٹور سے اُن کے لیے نئے کپڑے منگوا کر اُنہیں پہنا نہیں دیے گئے۔ اتنی دیر کی سرعام برہنہ پریڈ نے اُن کے اندر سے ننگے پن کی سماجی خجالت کے احساس کو کہیں کھرچ کر پھینک دیا تھا اور اتنے سارے لوگوں کے سامنے دواڑھائی گھنٹے ننگا رہنے کے بعد لباس انہیں محض تکلف سجھائی دے رہا تھا کہ جس کی ضرورت صرف موسموں کی شدت ہی میں محسوس کی جانی بنتی تھی۔ اُنہیں لباس ملا تو عمر دراز نے چھوٹے جیلر کو بھی جانے کی اجازت دی کہ جسے اُس نے محض اپنی انا کی تسکین اور ذلیل کرنے کے لیے روکے رکھا تھا۔ اس دورانیے میں شبیر اور کاشف دونوں اپنے آپ کو اگرچہ سزا یافتہ قیدی سمجھنے کی بجائے جیل، قید اور سماج سے برتر حیثیت کے افراد جاننے لگے تھے لیکن ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اُنہیں یہ مراعات اُن کی مفعولیت میں ہنروری کے سبب کسی چاہنے والے کی عطا کے طور پر ملی ہیں یا تینتالیس افراد کے قاتلین کے طور اس لیے ملی ہے کہ کوئی اُن سے اس سے بھی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔ بہر معاملہ جو بھی تھا ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ اُن دونوں کو اک نئی ڈھارس کی نوید دیتا چلا جا رہا تھا۔ عمر دراز جیسے منہ زور اور طوطا چشم اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے روبرو بھی اُن کے چہروں پر مسکراہٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ تبھی جب اُنہوں نے رحمت خان کے نام سے پہچانے جانی والی کوٹھڑی کے احاطے میں قدم رکھا، اُن کی وہ تمام تھکن جو زندگی کو تلاش کرنے کے عرصے میں اُن پر لادی جاتی رہی، کہیں چوکھٹ کے باہر رکھی رہ گئی۔

رحمت خان کی وی آئی پی کوٹھڑی کیا تھی، پانچ کمروں پر مشتمل چھوٹا سا بنگلہ تھا جو تین کوٹھڑیوں کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ اِن تینوں کوٹھڑیوں کے سامنے اور عقب میں چھوڑ دیے گئے احاطے بھی آپس میں جڑ کر کسی اچھے خاصے لان کا منظر پیش کر رہے تھے کہ جس کے تین اطراف میں پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اچھے بھلے قد آور ہو چکے کچھ پھلدار پودے بھی

تھے جو شاید رحمت خان سے پہلے کے مکینوں نے باغبانی کے شوق کی تسکین میں لگائے تھے۔ شبیر اور کاشف کو سب سے پہلے بنی ہوئی کوٹھڑی میں جانے کو کہا گیا لیکن وہ دونوں جھجک رہے تھے۔ اُنہوں نے چشمِ تصور میں رحمت خان کا اپنی اپنی وضع کا خاکہ بنا رکھا تھا مگر جو چیز دونوں کے تصوراتی خاکوں میں مشترک تھی وہ اُس کی شخصیت سے منسوب رعب اور دبدبہ تھا کہ جس کے سامنے جیل والے بھی سر جھکائے ہوئے تھے۔ اُن دونوں کا ہچکچاتا دیکھ کر عمر دراز خوشامدانہ انداز میں آگے بڑھا اور کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اُنہیں نہایت ادب سے اندر جانے کو کہا۔ وہ دنوں ششدر تھے کہ عمر دراز کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی چیک پوسٹ پر تو وہ اُن کے چوتڑوں پر بید بازی کرتے ہوئے اُن کا مذاق اُڑا رہا تھا مگر رحمت خان کے احاطے میں داخل ہوتے ہی اُس کی کیسی کایا کلپ ہوئی کہ چھوٹے جیلر کی وردی میں ہوتے ہوئے بھی سزا یافتہ قیدیوں کی خوشامد کیے جا رہا تھا۔ عمر دراز کے اِس رویے نے اُن کے دل پر رحمت خان کی پہلے سے بیٹھی ہوئی دھاک کا وزن اور بھی بڑھا دیا۔

کوٹھڑی میں داخل ہونے سے پہلے اُن کا خیال تھا کہ وہاں ایک اونچی سی کرسی رکھی ہو گی جس پر رحمت خان اپنی رعب دار شخصیت کے ساتھ براجمان ہو گا اور اُس کے دائیں بائیں جیل کے ملازمین سمیت بہت سے خطرناک قیدی نہایت احترام کے ساتھ ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے مگر اندر جا کر معلوم ہوا کہ وہاں تو کچھ بھی ایسا نہ تھا۔ نہ ہی کوئی اونچی کرسی اور نہ ہی کوئی ہاتھ باندھے احترام سے کھڑے جیل کے ملازمین اور خطرناک قیدی۔ بلکہ فرشی نشست کے انداز میں سجا ہوا ایک خوبصورت کمرہ جس کے فرش پر نہایت دبیز قالین بچھا ہوا اور قالین پر دیواروں کے ساتھ ساتھ چاروں طرف بچھے ہوئے دیدہ زیب میٹرس اور گاؤ تکیے۔ اگرچہ کمرہ خالی تھا اور وہاں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی مگر وہاں ایئر کنڈیشنر چلنے کے سبب خاصی خنکی ہو رہی تھی۔ کمرے کی اندرونی سجاوٹ کے باعث شبیر اور کاشف کو یوں لگا کہ جیسے وہ کسی عرب شیخ کے ڈرائینگ روم یا کسی قبائلی سردار کے حجرے میں آ گئے ہوں۔ انہوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا دیے۔ اب کی بار قسمت نے عجیب انداز میں پلٹا کھایا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ دونوں وہاں کھڑے رہے لیکن جب کوئی بھی وہاں کافی

دیر تک نہ آیا تو وہ دروازے کے نزدیک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

''باہر تو وہ جیلر بتا رہا تھا کہ رحمت خان بار بار ہمارا پوچھ رہا ہے مگر اب جب ہم آ چکے ہیں تو ہمیں یہاں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔'' شبیر نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کاشف کے کان میں سرگوشی کی مگر وہ چپ رہا۔ کاشف کے کان مسلسل باہر کے ماحول کی سُن گُن پر لگے ہوئے تھے کہ جہاں مختلف نوعیت کی آوازیں آپس میں مل کر اِس طرح ایک ہو چکی تھیں کہ کسی ایک کو علیحدہ سے شناخت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

''یہ ہم سے کیا چاہتا ہوگا؟'' ــــ شبیر نے ایک بار پھر کاشف کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہم سے کوئی کیا چاہ سکتا ہے؟ ایک ہی تو ہُنر آتا ہے ہمیں لوگوں کے نیچے لیٹنے کا ــ اور کونسی جائیدادیں ہیں ہماری؟'' ــــ کاشف نے سڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''رحمت خان کو کونسی کمی ہوگی ہم جیسوں کی؟ ہمیں کون سے پھُمن لگے ہوئے ہیں؟'' شبیر اب بھی سرگوشی ہی کیے چلا جا رہا تھا۔ ''بات یقیناً کچھ اور ہے۔''

''اور کوئی بات نہیں ــ تسلی رکھ ــ یہ جو تر تالی قتل ہمارے پیٹے پڑے ہوئے ہیں ناں، یہ پھُمن ہی تو ہیں ــ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ اِس کام میں وہی کماتا ہے جس کا نام چڑھا ہوا ہو، باقی تو سب کچھ ایک جیسا۔ لوگ نام پر پاگل ہوتے ہیں کہ فلاں فلمی اداکارہ ہے، فلاں اَفسر ہے، فلاں اسٹیج ڈانسر ہے، فلاں اتنے بڑے خاندان کی اور فلاں کی دھی بھین اور بیوی ہے ــ جس طرح عورتوں کی شکل صورت نہیں بلکہ نام، نام اور نام ہی بکتا ہے اِسی طرح ہم ایسوں کا بھی صرف نام بکتا ہے ــ بس یاد رکھ ہمارے تر تالی قتل بھی کوئی انسانوں کے قتل نہیں، یہ تر تالی دروازے ہیں قسمت کے جو ہم نے کھولے ہیں ــ اب ہم سو پچاس میں شلوار اُتار دینے والے چھوکرے نہیں بلکہ تر تالی بندے مار کے بھی پھانسی کے پھٹے کو اُلٹا دینے والے ہیرو ہیں ــ اب ہم نہیں بکیں گے، یہ تر تالی قتل بکیں گے ــ بس ہمیں بیچنے کا طریقہ آنا چاہیے۔'' کاشف شدتِ جذبات میں اُٹھ کر سیدھا بیٹھ گیا۔

شبیر بھی تکیے کی ٹیک چھوڑ، سیدھا ہو بیٹھا۔ اُس نے سر جھکایا ہوا تھا اور بظاہر یوں لگتا تھا

کہ اُس نے کاشف کی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اب کے اُس کے کان کسی آہٹ پر اور نظریں دروازے کی طرف تھیں۔ کاشف آنکھوں ہی آنکھوں میں شبیر سے اپنی بات کی تائید چاہ رہا تھا مگر وہ اُس سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ کاشف کو حیرت ہو رہی تھی کہ شبیر کا یہ رویہ اُس کے عمومی رویے کے برعکس تھا۔ عام طور پر وہ دو ہی رویے رکھتا تھا۔ ہاں یا ناں۔ اُس کے پاس تیسرا رویہ یعنی مصلحت میں کوئی بھی منافقانہ چلن تو نام کو نہیں تھا اور نہ ہی اُسے کبھی سکوت یا خاموشی سے کوئی غرض رہی تھی۔ اتنے میں ایک کھٹکا سا ہوا، دروازہ کھلا اور ایک مشقتی کھانے کی ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ دونوں اُسے دیکھ کر عاجزی سے کھڑے ہو گئے مگر اُلٹا اُس کے چہرے پر اِن دونوں کے لیے عاجزی اور احترام کا تاثر تو تھا مگر جبر اور ناگواری کی ہلکی سی پرچھائیوں کے ساتھ۔ اُس نے کوئی بات کیے بغیر نیچے قالین پر دسترخوان بچھایا اور کھانے کے برتن لگانے لگا۔ پلاؤ کی بڑی سی ڈش کے علاوہ دو ڈونگے سالن کے بھی تھے جن کے ساتھ رومال میں لپٹی چپاتیاں اور ایک رکابی میں کچھ میٹھا بھی رکھا ہوا تھا۔ کھانے سے اُٹھتی ہوئی اشتہا انگیز مہک نے اُن کی شبیر اور کاشف کو یہ احساس کچھ زیادہ شدت سے دلا دیا کہ وہ آج صبح سے بھوکے ہیں۔ صبح بھی ڈسٹرکٹ جیل میں اِس لیے کچھ نہیں کھایا سکا تھا کہ مقدمہ کا فیصلہ سنائے جانے کے اضطراب نے بھوک نام کی جبلت کو اندیشوں تلے دبا دیا تھا۔

کھانا دسترخوان پر لگائے جانے کے باوجود شا کا اور کاشی دونوں کھڑے تھے۔ انہیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کھانا اُن کے لیے بھیجا گیا ہے۔ مشقتی نے شاید اُن کے چہرے پڑھ لیے تھے تبھی جاتے جاتے واپس آیا اور نہایت دھیمے لہجے میں ادب سے بولا ــــ ''آپ بیٹھیں، کھانا کھائیں، پانی وہ سامنے کولر میں رکھا ہے اور لیٹرین کا دروازہ اسی کمرے میں وہ کونے میں ہے۔ اور ہاں کمرے کو اندر سے کنڈی لگا کر رکھنی ہے، اگر میں یعنی جمال دین کھٹکاؤں تو کھولنا ہے ورنہ نہیں اور اگر تمہیں، آپ کو کوئی مسئلہ ہو تو یہ سامنے والے گول بٹن کو دبا دینا ہے، میں آ جاؤں گا۔''

شبیر اور کاشف ششدر ہوئے جمال دین کو دیکھے چلے جا رہے تھے جو بات مکمل کرنے کے بعد وہاں رکا نہیں اور پھر سے اُنہیں دروازہ اندر سے بند رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر

نکلنے ہی لگا تھا کہ شبیر نے ایک دم اُسے اِس انداز میں آواز دی کہ جیسے کچھ بہت اہم پوچھنا رہ گیا تھا۔

''چاچا___!!''

جمال دین مشقتی اب کے چہرے پر ناگواری کے واضح تاثرات لیے کمرے میں واپس آیا۔ اُس کا چہرہ مکمل طور پر سوال بنا ہوا تھا۔

''چاچا___ یہ رحمت خان کب آئے گا؟''___ شبیر نے گولہ پھینکنے کے سے انداز میں سوال داغ دیا۔

سوال سنتے ہی جمال دین کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ''خان کا نام نہیں لیتے___ وہ بڑا خان ہے، خانِ اعظم___ خانِ اعظم بولتے ہیں اُسے۔'' جمال دین کی گفتگو بھی سرگوشی میں بدل چکی تھی اِس خوف سے کہ شاید کہیں رحمت خان اُسے دیکھ اور سُن نہ رہا ہو۔ ''اور ہاں! خان اعظم خود نہیں آتا، اُس کے پاس پیش ہونا پڑتا ہے___ ایک بات اور بھی سُن لو آپ دونوں! خان اعظم کا نہ تو ٹائم کا پتا ہے اور نہ ہی موڈ کا___ اُس کے واسطے چوبیس گھنٹے تیار رہنا پڑتا ہے، چاہے تو ابھی بلا لے اور نہ چاہے تو مہینہ نہ بلائے، سمجھ لیا ناں!!''

جمال دین مشقتی جاتے جاتے ایک بار پھر رُکا___ ''اب ایک بات اور آخری! آئندہ مجھے چاچا نہیں کہنا، ! یہاں کوئی کسی کا رشتہ دار نہیں ہے۔ آپ لوگ شا کا اور کاشی ہو اور میں جمال دین___ بس اِس کے علاوہ کوئی کچھ بھی نہیں۔''

جمال دین کے جاتے ہی کاشف نے جھٹ سے اندر سے کنڈی لگائی اور دھپ سے میٹرس پر گر گیا جب کہ شبیر بدستور کھڑا کسی گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔ رحمت خان سے ملنے کی غیر یقینی میں اُسے اپنا مستقبل بھی معلق دکھائی دینے لگا تھا۔ چند لمحے پہلے جاگنے والی بھوک کی شدت پھر سے وسوسوں میں دبنے چلی تھی۔ کون ہے رحمت خان؟ اُن سے کیا چاہتا ہے رحمت خان؟ کب ملے گا رحمت خان؟۔

۞

﴿۲۲﴾

یکے بعد دیگرے پیئے گئے تین سگریٹوں کی نکوٹین اور وہسکی کے دو پیگز کی الکحل نے زفیرہ احمد کو وقتی طور پر پھر سے سوچنے، سمجھنے اور زندگی کے معاملات کی طرف پلٹنے کی راہ پر لگا دیا تھا۔ خودکشی کرنے کی عملی تدبیر تو کیا اُس کا خیال تک اُس کے ذہن میں باقی نہیں رہا تھا۔ اُس نے تیسرا پیگ بنا کر وفاقی حکومت کے بااثر ترین وزیر کا وزیٹنگ کارڈ اُٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں موبائل فون لے کر اُس کا نمبر ڈائل کرنے کے لیے کارڈ پر دیے گئے نمبر پڑھنے لگی مگر وہاں تو کوئی نمبر بھی نہ تو موبائل فون کا تھا اور نہ ہی رہائش کا بلکہ سبھی اُس کے آفس کے تھے۔ اُس کے اندر آئی ہوئی ساری توانائی اِسی ایک جھٹکے میں نچڑ گئی۔ فون اور کارڈ دونوں ہاتھوں سے گرے تو انہیں اُٹھانے کی بجائے اُس نے جھکے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ سر کے بال لاکھ تراشیدہ سہی مگر وہ بھی دونوں طرف سے نیچے کی جانب لٹکے ہوئے تھے۔ شراب اور سگریٹ بھی اپنے تمام تر اثرات کے باوجود زفیرہ احمد کو مزید سہارا دینے سے قاصر دکھائی دے رہے تھے۔

کافی دیر تک یونہی سر جھکائے رہنے کے بعد اُس نے ایک طرف رکھا ہوا پیگ اُٹھانے کے لیے آنکھیں کھولیں، پیگ اُٹھایا اور ایک بڑا سا گھونٹ لے کر واپس رکھنے ہی لگی تھی کہ ایک بار پھر اُس کی نگاہ وفاقی وزیر کے وزیٹنگ کارڈ پر پڑی جو اب کے اُلٹا ہوا پڑا تھا۔ اُس کی پشت پر بال پوائنٹ سے لکھا ہوا ایک موبائل فون نمبر صاف پڑھا جا رہا تھا۔ اُس نے جھٹ سے کارڈ اُٹھ لیا۔ اُسے اب یاد آ رہا تھا کہ کارڈ دیتے ہوئے وفاقی وزیر نے نہ صرف اُس کی پشت پر یہ نمبر لکھا بلکہ یہاں تک کہا تھا کہ یہ اُس کا خاص نمبر ہے جو صرف اُسی کے پاس ہر وقت موجود ہوتا

ہے۔ ٹوٹتی ہوئی سکت زفیرہ کے جسم میں پھر سے لوٹ آئی۔ اُسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اُس نے وزیر صاحب سے کیا بات کرنی ہے مگر اُس نے نمبر ڈائل کرنے میں لحظہ بھر توقف بھی نہ کیا۔ تین بار رنگ ہونے کے دوران بھی وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ وہ اُس زفیرہ احمد کی تلاش میں سرگرداں تھی کہ جو اپنے طنطنے اور طمطراق سے مخاطب کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا کرتی تھی مگر آج وہ خود بوکھلائی ہوئی تھی کہ اگر وزیر نے فون اٹینڈ کر بھی لیا تو وہ کیا بات کرے گی۔ بڑے صاحب کی کمینگی اور دفتری سازشوں نے زفیرہ احمد کو اُس کی فطری خود اعتمادی سے محروم کر دیا تھا۔

"جی فرمائیے! چنگیزی بول رہا ہوں۔" وفاقی وزیر نے فون اٹینڈ کر لیا تھا۔

"چنگیزی صاحب میں زفیرا احمد بول رہی ہوں ___ منور ایڈورٹائزرز کی سی ای اُو۔"

"ارے!!! زفیرہ احمد ___ اتنا بڑا نام، اتنی بڑی شخصیت اور ہمیں فون!! اسے کہتے ہیں خدا کی قدرت!!" ___ چنگیزی کی آواز کی کھنک میں خوشی کے ساتھ ساتھ بے تابی بھی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

"آپ نے میرا اجنبی فون کیسے اٹینڈ کر لیا؟" ___ زفیرہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ در آئی تھی۔

"ارے میڈم اجنبی کیسے؟ اس فون پر نمبر ہی کتنے ہیں ___ زیادہ سے زیادہ پچاس! اور یہ نمبر میں اجنبیوں کو دیتا ہی نہیں، یہ نمبر صرف انہیں کے پاس جو میرے دل کے پاس اور جو میرے دل کے پاس اُن میں ایک آپ کی ذات شریف بھی۔ تو پھر کیوں ناں اٹینڈ کرتا آپ کا فون؟ مگر آپ نے تو اپنا نمبر دینے سے معذرت کر لی تھی۔" چنگیزی کی آواز میں شوخی اب تک قائم تھی۔

"آپ شرمندہ نہ کریں ___ مجھے پہچان ہی نہیں تھی کہ کون میرے ساتھ مخلص ہے اور کون نہیں۔" زفیرہ احمد کے لہجے میں گھمبیرتا آ رہی تھی۔

"تھی کیا؟ اب آ چکی کیا یہ پہچان؟" چنگیزی چلبلا ہوتے ہوتے یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ زفیرہ کوئی بات کرتی وہ خود ہی بول پڑا۔

"آپ یہ بتائیے، کام کیا ہے مجھ سے آپ کو میڈم زفیرہ احمد؟"

"کام؟ کام تو کوئی نہیں ___ بس ایک چھوٹی سی پرابلم تھی۔" زفیرہ ذہنی طور پر اچھی خاصی منتشر ہو چلی تھی۔

"ارے میڈم! یہی پرابلم ہی تو کام ہوتا ہے ___ جب کہیں پرابلم ہوتی ہے، کسی ایک کا کام نکلتا ہے اور دوسرے کا کام بنتا ہے۔" چنگیزی کھلکھلا دیا۔ "تو پھر بتاؤ ناں! کیا ہے پرابلم؟"

"فون پر بتانا میرے لیے مشکل ہو جائے گا ___ میں آپ کے پاس آنا چاہتی ہوں۔"

"تو کل رات آ جاؤ ناں گیارہ بجے! میں ویسے بھی ناسٹیلجک ہو رہا ہوں ___ دو سال ہو گئے ہیں تمہیں دیکھے ہوئے۔" چنگیزی شاید سرور کے دوسرے درجے میں تھا اس لیے آپ سے تم پر آنے میں کچھ زیادہ تاخیر نہ کی۔

"کل دن میں نہ آ جاؤں آپ کے آفس!" زفیرہ رُک رُک کر بول رہی تھی۔

"میڈم! دن میں آپ کا میرے آفس آنا میرے لیے پرابلم پیدا کرے گا کیونکہ دن اور دفتر دونوں پرابلم پیدا کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور اس کے برعکس رات اور بستر دونوں پرابلم نکالنے کے لیے ___ اب میں کیا چریا ہوں کوئی کہ آپ کا پرابلم نکالتے نکالتے اپنے لیے پرابلم کھڑا کر لوں۔" آخری لفظوں تک آتے آتے چنگیزی صاحب کا لہجہ اچھا بھلا تلخ ہو گیا تھا۔ "آنا ہو تو کل رات گیارہ بجے چلی آنا ___ اور یہ بھی تمہاری آج کی صورت کے لیے نہیں، اُس پرانی فوٹو کے واسطے کہ جواب تک آنکھوں میں پھنسی ہوئی ہے۔"

زفیرہ احمد کا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر رو دے لیکن اپنے آپ کو مجتمع کیے رکھا کہ بکھرے ہوئے ہونے کا تاثر نہیں دینا چاہتی تھی۔ "کیا یہ آج گیارہ بجے نہیں ہو سکتا؟ بہت پریشانی تھی۔"

"میڈم! میرے پاس رات کو آنا ہو تو پریشان صورت کے ساتھ کبھی نہ آنا ___ میرے پاس بہت سی پریشان صورت والی بیٹھی ہوئی ہیں اپنے اپنے گھروں میں ___ مجھے تو ہنستی مسکراتی شکل والی عورت چاہیے ہوتی ہے، روتی بسورتی نہیں۔"

"چنگیزی صاحب! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" زفیرہ احمد نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

''وہی! جو اُس روز تمہیں ہو گیا تھا۔'' چنگیزی نے اُسی لہجے میں اِس طرح جواب دیا کہ جیسے نقل اُتار رہا ہو۔ ''دیکھو بی بی! جتنا وقت میں کسی حسین ترین لڑکی کو بستر پر دیتا ہوں اُس سے زیادہ تمہیں فون پر دے چکا ہوں___ لے ہاتھ جوڑتا ہوں، اب اور میرا وقت برباد نہ کر اور وینیو لکھ لے___ 40 پرائما لیک___ آج رات گیارہ بجے آ جانا، اگر موڈ میں ہوا تو مل لوں گا ورنہ کل رات تمہاری پکی اور دیکھ! رونا دھونا نہیں___ عورت کو روتا دیکھ کر مجھ پر ویاگرا کی ڈبل ڈوز بھی اثر نہیں کرتی۔''

چنگیزی نے تو فون بند کر دیا مگر زفیرہ احمد اپنے سیل فون کو ابھی تک کان سے لگائے گم سُم بیٹھی تھی کسی مومی مجسمے کی مانند۔ اُس کے ذہن میں چنگیزی سے کی ہوئی کوئی بات بھی باقی نہیں رہی تھی سوائے اُس کی بتائی ہوئی موجودہ لوکیشن کے جو بار بار کسی ہتھوڑے کی طرح اُس کے اعصاب کو پے در پے ضربات سے کچلے جا رہی تھی___ 40 پرائما لیک!!___ 40 پرائما لیک!!!___ 40 پرائما لیک!!!۔ زفیرہ کو اپنی سماعت پر شک ہو رہا تھا کہ کہیں اُس نے کچھ غلط تو نہیں سُن لیا لیکن جو اُس نے سُنا وہ یہی تھا۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا

یہ ایڈرس بھلا وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ یہ تو راول جھیل کے کنارے بڑے صاحب کے فارم ہاؤس کا ایڈرس تھا۔ ''تو کیا اِس وقت ملکی حکومت کا سب سے طاقتور وفاقی وزیر'' بڑے صاحب'' جیسے بھڑوے کے فارم ہاؤس پر اپنے دن بھر کے پرابلمز کا حل ڈھونڈ رہا تھا۔ زفیرہ احمد کے حواس جواب دینے لگے تھے۔ کس کے پاس جائے اور کس سے بڑے صاحب کے خلاف دادرسی چاہے کہ جس نے نہ صرف اُس کی زندگی بلکہ عمر بھر کی معاشی اور معاشرتی مشقت کو پل بھر میں برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ کیا کوئی پوچھنے والا تھا اُس بلیک میلر سے کہ جس نے نجانے کتنی معصوم زندگیوں کو دھوکے سے اُجاڑنے کے بعد اپنے جال میں تڑپنے کے لیے گرفتہ کر رکھا تھا۔ کیا پورے ملک میں کوئی ایک بھی ایسا شخص یا ادارہ نہیں کہ جس سے پورے تیقن کے ساتھ انصاف کی توقع کی جا سکے۔ مگر کہیں سے بھی کوئی اُمید کی کرن یا دادرسی کا راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ زفیرہ احمد کے پاس سردست اپنی بے بسی پر آنسو بہانے کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا مگر صدمے کی انتہا یہ ہوئی کہ آنسوؤں نے بھی بہنے سے انکار کر رکھا تھا۔ تمام حسیات جو

دل کا بوجھ ہلکا کرنے میں ہمیشہ معاون رہتی ہیں، بے حس ہو کر سرد ہو چلی تھیں۔ اب حالت یہ تھی کہ ذہن تو تھا مگر سوچ کا اُبھرنا مفقود، دل بھی تھا مگر اُس کی دھڑکن کا سنائی دینا ناپید، زندگی کے آثار بھی تھے مگر زندہ رہنے کی خواہش پھر سے مر چکی تھی۔ چنگیزی کی صورت میں پیدا ہونے والی جینے کی آخری اُمید بھی اِس طرح ٹوٹی کہ ہر سو کرچیاں ہی رہ گئیں، ذہن و وجود کا سالم رہنا تصورات میں بھی ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر ایسے عالم میں سیلولر فون کی گھنٹی نے پراگندگی کو ایک عجیب سی صوتی ترتیب میں بدلنے کی اپنی سی کوشش کی۔

زفیرہ احمد یہ فون اٹینڈ نہ کر پاتی اگر یہ بڑے صاحب کا نہ ہوتا۔

''اب کُتیا کو کون سمجھائے کہ اِس شہر کا ہر بڑا آدمی میری طرح کا بڑا صاحب بنا پھرتا ہے۔ کون سا حاکم، مُلا اور قاضی ہے جس کو شراب اور شباب نہیں چاہیے؟ عمر گزار دی تم نے گشتیوں کی صحبت اور اُن کی کمائی کھانے میں مگر دعویٰ پھر بھی پارسائی کا___ مہ نور ایڈورٹائزرز کہیں کوئی ایک رات میں اور فرشتوں کی مدد سے کھڑی نہیں ہو گئی تھی۔ اس میں بھی نجانے کتنی ماڈلز کی عصمتوں کے سودے شامل رہے ہوں گے۔ اور اب بھی میں تمہیں تمہارے گھر سے بُلا کر نہیں لایا تھا بلکہ تمہاری کاروباری ضرورتوں نے تمہیں میرے بستر کا راستہ دکھایا تھا۔ سُپر ماڈل ثنیعہ کو بھی راؤ صاحب کی گود میں کس نے بٹھایا تھا؟ کیا میں نے بٹھایا؟ کیا میرے کام رُکے ہوئے تھے؟ مبشر رضا کیا مجھے چاہیے تھا؟ اب بھڑوا میں ہوا یا بھڑوی تم ہوئی؟ میں نے آج کی تمہاری ساری گفتگو سنی ہے___ یہ جس منسٹر چنگیزی سے تم میرے خلاف مدد مانگنے آج رات گیارہ بجے جا رہی ہو وہ اِس وقت بھی میرے فارم ہاؤس پر راجہ اندر بنا بیٹھا ہے۔ صرف چنگیزی ہی نہیں بلکہ آدھی کابینہ روز رات کو میرے پاس ہوتی ہے۔ جو لوکیشن چنگیزی نے تمہیں ملاقات کے لیے بتائی ہے اُسے ایک بار پھر غور سے دیکھ لینا، یہ وہی جگہ ہے جہاں میرے پالتو کتوں نے تم سے دو دو ہاتھ کیے تھے۔ یہاں دن کو حکومت جس کی بھی ہو، رات کو ہم جیسوں کی ہوتی ہے۔ دن کو سیکریٹریٹ سجتا ہے اور رات کو فارم ہاؤسز___ دن کو فائلیں ایک میز سے دوسری میز گھومتی ہیں اور رات بھر مست اندام لڑکیاں ایک گود سے دوسری گود بدلتی رہتی ہیں___ دن کو لگنے والی دیہاڑیاں بھی رات کو طے پاتی ہیں اور صبح کون سے اخبار میں کس قسم کی

اور کتنے حاشیے کی خبر شائع ہو گی، یہ سب کچھ یہاں رات کو ہی ہماری منشا کے صحافیوں کو عطا ہونے والے لفافوں کے حجم اور شراب کی بوتل کے برانڈ پر منحصر ہوتا ہے __ کس چینل کا پرائم ٹائم کس سیاسی لیڈر کا بھرکس نکالے گا، یہ سودا بھی خاص خاص اینکرز کے ساتھ رات ہی کو طے پا جاتا ہے۔ ہیوی انڈسٹری کے این اُو سی، نئے چینلز کے لائسنس، بیوروکریسی میں اکھاڑ پچھاڑ، غیر ملکی دورے، غیر ملکی معاہدے، روپے کا اُتار چڑھاؤ، امپورٹ اور ایکسپورٹ کی شارٹ ٹرم پالیسیاں اور پرمٹ، غیر ملکی ڈپلومیٹس سے خفیہ ملاقاتیں، کِک بیکس کی آمدنی کو محفوظ مقامات تک پہنچانا، قسمیں، وعدے اور پھر قسمیں، یہ سبھی معاملات یہیں میرے پاس اور میرے جیسے دو چار لوگوں کے فارم ہاؤسز میں طے پاتے ہیں۔ کیسی گدھی عورت ہو تم! تمام عمر بھڑوا گیری کرتے رہنے کے باوجود بھی مسلسل جوتے کھاتی چلی آ رہی ہو۔ سمجھنے کے باوجود نہیں سمجھتی ہو کہ جب تک یہاں کاغذ کی جگہ لڑکی اور قلم میں سیاہی کی جگہ شراب استعمال نہ ہو، کام ہی نہیں ہوتا۔'' بڑا صاحب کھولتے ہوئے لہجے میں ایک طویل گفتگو کے بعد زفیرہ احمد کا ردِ عمل جاننے کے لیے رُکا مگر زفیرہ کا ذہن تو ماؤف اور زبان گنگ ہو چکی تھی۔

''اور ہاں! چنگیزی سے ضرور مل لینا __ ہو سکتا ہے تمہارے بچے کھچے حسن کے جلووں سے متاثر ہو کر وہ مجھے عمر بھر کے لیے جیل بھجوا دے، آخر کو وہ اتنا بڑا وزیر ہے ناں!'' بڑے صاحب نے طنزیہ انداز میں ایک طویل قہقہہ لگایا اور پھر وفورِ کھانسی سے کھانستا چلا گیا۔ ''اے بے وقوف عورت! لگتا ہے کہ عورتوں کی اکثریت کی طرح تمہاری ذہنی عمر بھی بیس بائیس برس کی عمر میں ایک ہی جگہ ساکت ہو چکی ہے۔ تمہاری جیسی عورتوں میں جسمانی عمر تو بڑھتی رہتی ہے مگر ذہنی نہیں اور پھر تمہارے قبیل کی عورتیں ستر برس کی ہو کر میں بھی اپنے آپ کو بیس برس کا ہی سمجھتی ہیں کہ زمانہ جن کی چاہت میں اب بھی پاگل ہوا پھرتا ہو گا۔ اِس حقیقت کا ادراک ہی نہیں ہوتا کہ پُلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر چکا ہے __ چنگیزی نے اگر دو برس پہلے تمہیں اپنا وزیٹنگ کارڈ پکڑا دیا تھا تو وہ تمہیں دیکھ کر نہیں بلکہ تم سے جڑا ہوا گلمیر دیکھ کر اور اِس امکان کے تحت کہ تم کتنی ماڈل لڑکیاں مارکیٹ سے اُچک کر اُس کے بستر تک پہنچا سکتی ہو __ اور ہاں! یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب وہ میرے مریدوں میں شامل نہیں تھا __ اب تو وہ میرا

بالکا ہے، اُسے کیا ضرورت ہے تم جیسی چڑیلوں کو منہ لگانے کی __ تم سے تو وہ تمہاری سپر ماڈل ثنیعہ ہی زیادہ سمجھ دار نکلی، تین راتوں کے لیے تم نے راؤ صاحب کے پاس بھیجا تھا لیکن اب تو اُس کی صبحیں، اُس کی شامیں سبھی راؤ صاحب کے لیے ہیں __ اور راؤ صاحب کو تو تم جانتی ہو ناں، آج کل تو راؤ صاحب ہی حکومت ہے اور اگر راؤ صاحب حکومت ہے تو سمجھ لو کہ ثنیعہ حکومت ہے۔'' بڑے صاحب نے آخری جملہ اِس طرح زہریلے لہجے میں بولا کہ جیسے فون کی دوسری جانب کوئی انسان نہیں بلکہ کوبرا پھنکار رہا ہو۔

''اور ہاں! ایک بات اور بھی سُن لو! تمہاری اِس گھٹیا اور فضول حرکت کے باوجود میں تمہیں کل رات آٹھ بجے تک دی گئی رعایت جوں کی توں باقی رکھ رہا ہوں تاکہ کل کلاں جب تم مہ نو رائیڈ ورٹائزرز کی چیف ایگزیکٹو کی کرسی سے اُٹھا کر کسی فُٹ پاتھ پر پھینک دی جاؤ تو یہ نہ کہہ سکو کہ تمہیں کچھ اور اُلٹی سیدھی حرکتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جی بھر کر جس جس کا بستر گھومنا ہو گھوم پھر کر دیکھ لو __ ویسے بھی کل رات آٹھ بجے آخری فیصلہ تو میرا ہی ہو گا ناں۔''

اتنے طویل فون کو زفیرہ احمد نے صرف کانوں سے نہیں بلکہ پورے جسم کے تمام اعصاب اور حسیات کو حِسِ سماعت میں متشکل کر کے سُنا۔ بول اِس لیے نہ سکی کہ اُس کی قوت گویائی سلب نہ ہوتے ہوئے بھی سلب ہو چکی محسوس ہو رہی تھی۔ جواب کوئی اِس لیے نہ دیا کہ اتنی ذلت آمیز گفتگو کے ہوتے ہوئے نہ تو اُس کے پاس کچھ جواب دینے کو تھا اور نہ ہی کچھ جواب بنا پانے کو۔ نجانے کیوں آج پہلی بار اُسے بڑے صاحب کی ہر بات سچ اور صرف سچ لگ رہی تھی۔ اتنی دیر تک ملامت اور صرف ملامت کو سہا تو احساس ہوا کہ غلطی تو واقعی اُسی سے ہوئی تھی۔ پاور پلے کی دنیا میں قدم رکھ کر بھی اُس نے نہ تو پاور پلے کی جزیات کو سمجھا اور نہ ہی طاقت کے اِس ننگے ملاکھڑے میں طاقت کو طاقت کے طور پر پرکھا۔ بے اصولی، بداخلاقی اور لوٹ کھسوٹ کی تفہیم کے واسطے تہذیب اور اخلاقیات کے حوالے ڈھونڈتے رہنے کے جتن کیے اور بھلا بیٹھی کہ حربیت کی اپنی لغت اور اپنے حربیاتی تقاضے۔

زفیرہ احمد کسی ملامتی صوفی کی مانند ابھی اور اہانت کی خواہاں تھی۔ مذلت کے سبب اُس کی شکستہ اَنا کا مزید ریزہ ریزہ ہونا کسی سکون بخش مرہم کا سا احساس پیدا کیے جا رہا تھا۔ اُسے

خیال آیا کہ ذات سے جڑی ہوئی اشیاء اور خودی و خودداری پر انحصار کی گئی حیات کا سالم اور ثبوتا ہونا کس قدر عذاب کا باعث ہوتا ہے۔ ذات اور ذات کے حوالوں کی یہی شکستگی اور اَنا کا ہردم کچل کر ملیا میٹ ہوتے رہنا کتنا سرور آگیں ہوتا ہے۔ ''ہونا'' ہمیشہ سرخروئی اور بلندی دُرجات کے زمرے میں نہیں آتا، کبھی کبھار ''نہ ہونا'' بھی نجات کا استعارہ اور رفعت آشنا ہوتا ہے۔ زفیرہ احمد کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ نفس کی نفس کُشی اگرچہ آساں نہیں مگر کس قدر آسانیاں پیدا کرتی ہے۔ اُسے اپنے ''ہونے'' سے کراہت ہونے لگی تو اُس کے کان سے لگا ہوا موبائل فون ہاتھ سے چھوٹ کر گود میں آن گرا۔ اُسی طرح جیسے آخری ڈھارس سمجھ لیا گیا سب سے با اختیار وفاقی وزیر بارک چنگیزی چند لمحے پہلے اُس کی اُمیدوں کی فہرست سے گر گیا تھا۔

حتمی طور پر بے آسرا اور یقینی طور پر ناامید ہو جانے کی اِس کیفیت نے اُس کے اندر بقا کی تمام مر چکی خواہشوں کو پھر سے زندہ کرنے کی بنیاد رکھنا شروع کر دی تھی کہ جیسے موت کے خلاف آخری معرکے کے لیے انسانی جسم میں ہارمونز پیدا کرنے والی وہ غدودیں بھی متحرک ہونے لگتی ہیں کہ جنہیں غیر موثر ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہوتا ہے۔ زفیرہ کو لگا کہ اُس کی آنکھوں میں روشنی اور ذہن میں سوچنے کی صلاحیت بیدار ہونے لگی ہے۔ جسم میں سردی کا احساس پیدا ہوا تو پیٹ میں بھوک کا کھنچاؤ بھی جاگ اُٹھا۔ اُس نے دیکھا کہ شونی فرش سے تھوتھنی اُٹھا کر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے گرد ہولے ہولے چکر لگانے لگا۔ شونی کی آنکھوں میں بھی معدوم ہوئی چمک لوٹنے لگی تھی۔ زفیرہ نے کے ہونٹوں پر نجانے کہاں سے ایک مسکراہٹ در آئی جسے دیکھتے ہی شونی ایک عجیب سی خوشی سے اُچھلا اور اُس کے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ زفیرہ نے اپنا اَدھ بچا پیگ شونی کی طرف بڑھا دیا مگر وہ اُس کو چکھنے کی بجائے اپنی لمبی اور کھردری زبان جبڑوں سے باہر نکال کر اُس کے دودھیا پاؤں کے تلوے چاٹنے لگا۔ زندگی اور زندہ ہونے کا پیغام زفیرہ کے پاؤں کے تلووں سے سرسراتا ہوا اُس کے جسم کے ہر انگ کی طرف پوری شدت سے بڑھنے لگا۔

۞

﴿۲۳﴾

کالا رکشے کو جنونی انداز میں چلاتا ہوا فارم ہاؤس سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع کچی آبادی کے ایک ایسے مکان کے سامنے جا رُکا جو باقی آبادی سے قدرے الگ تھلگ تھا۔ رکشہ رُکتے ہی دو کواڑ والے دروازے کا ایک کواڑ ترچھا سا ہو کر کھلا مگر اندر سے کسی نے باہر کی جانب جھانکنے کی کوشش نہیں کی لیکن ماہین کو ایسا محسوس ہوا کہ گھر کے صحن میں زیادہ روشنی نہ ہونے کے باوجود بند کواڑ کی درز سے کوئی نسوانی آنکھ باہر کا منظر دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کالا رکشہ بند کر کے فوری طور پر نیچے اُترا اور کچھ بولے بِنا ماہین کے نیچے اُترنے کا انتظار کرنے لگا۔ ماہین کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ کالے کے رکشے سے اُترنے کا مقصد منزل پر پہنچ پانے کا اشارہ تھا۔ وہ بدستور حیران آنکھوں اور بے تاثر چہرے کے ساتھ رکشے سے باہر کا منظر تکے جا رہی تھی۔ کالے نے چند لمحے تو نہایت اُکتاول آمیز بیزاری کے ساتھ خصیہ خراشی کرنے میں گزارنے کی کوشش کی مگر جب اِس کے باوجود بھی ماہین کو خود سے بے خبر پایا تو اُس کی ماں بہن کو مشترکہ طور پر ایک موٹی سی ننگی گالی دیتے ہوئے رکشے سے نیچے اُترنے کا دبکا لگا دیا۔ اِن دو چار دنوں میں گالی نام کی کوئی چیز ماہین کے واسطے نہ تو حیرت کی بات رہی تھی اور نہ ہی ذلت کی۔ لہٰذا اتنی ثقیل گالی پر بھی وہ کسی قسم کی ناگواریت ظاہر کرنے کی بجائے والہانہ انداز میں رکشے سے اُتر کر کالے کی طرف لپکی مگر کالے نے اُسے اَدھ کھلے دروازے کی طرف دھکا دے دیا۔ دھکا دیے جانے کے سبب ماہین کا سر دروازے کے کواڑ سے جا ٹکرایا۔ شاید ماہین کے دل میں کہیں سے یہ خیال اُبھرا ہو کہ جب وہ کالے کے کہنے موجب دروازے کی جانب بڑھی جا

رہی تھی تو پھر اُسے دھکا کیوں دیا گیا مگر بظاہر کالے کے لیے اُس کے لبوں پہ کھیلتی دھیمی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں موجود اشتہا میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ ان چند دنوں میں اُس کے اندر کیسے راسخ ہوا کہ کولہو کے گرد گھومتے بیل کو اُس کی سبک خرامی کے باوجود مسلسل چابک مارتے رہنا کیوں ضروری ہوتا ہے۔

کواڑوں کے پیچھے چھپ کر باہر دیکھتی ہوئی عورت نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ تو ماہین پر ڈالی ہی لی تھی مگر کالے کے سامنے آتے ہی اُس کے سُتے ہوئے چہرے پر چھوٹی چھوٹی آنکھیں مسلسل اُسی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں کہ جن میں دہشت کے ساتھ ساتھ خوفزدگی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔ چالیس کی حدوں کو چھوتی ہوئی کلثوم چند برس پہلے تک ضرور قبول صورت رہی ہوگی مگر جسم میں آئرن اور کیلشیم کی کمی کے سبب چہرے پر پڑنے والے سیاہی میل دھبے صاف بتا رہے تھے اُسے اپنی جوانی میں کم خوراکی کے ساتھ ساتھ کتنی زیادہ تعداد میں اسقاطِ حمل کا سامنا رہا ہوگا۔

کچی بستی کے اِس نیم پکے گھر میں کالا یوں دندنا کر داخل ہوا کہ جیسے وہ اُس کا اپنا گھر رہا ہو۔ ایک ہاتھ سے اگرچہ اُس نے ماہین کو بازو سے پکڑ رکھا تھا مگر اندر داخل ہوتے ہی دوسرے ہاتھ سے ایک چانٹا کلثوم کو جڑ دیا۔ اِس سے پہلے کہ کھلے منہ اور کھلی آنکھوں والی کلثوم کالے سے کچھ پوچھ پاتی وہ خود ہی غصے سے کھولتا ہوا بولا ـــــ ''اُو بدمعاش عورت کب تک مجھے گھورتی رہے گی؟ کوئی کمرہ بھی خالی رکھا ہے یا نہیں؟''

''سارا گھر خالی پڑا ہے سرکار آپ کے واسطے ــــ کسی کی کیا مجال کہ آپ کے ہوتے ہوئے کوئی اِدھر پاؤں بھی رکھے!!'' ــــ کلثوم چانٹے کی تعمیل میں خوشامد پر اُتر آئی تھی۔ مگر کالا کلثوم کی سُنی کو اَن سُنی کرتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے کی طرف اِس طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑھتا گیا کہ ماہین اُس کے پیچھے پیچھے گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ کالے کو یوں لڑکی کے ساتھ اُتاول میں اندر جاتا دیکھ کر کلثوم کے چہرے پر کمینگی آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند برس پیشتر کالا اِسی طرح گھر میں داخل ہوتے ہی آؤ دیکھتا نہ تاؤ اور اُسے اندر گھسیٹ لے جا کر وحشت کی اُن بلندیوں تک لے جاتا کہ جہاں پھر سے کبھی جانا بس خواہش ہی رہی۔ کلثوم کا

دل بھر آیا تو آنکھوں کے کنارے بھی نم آلود ہونے لگے مگر جانتے ہوئے کہ اِس کا جواب کیا آئے گا، اُس نے دل میں چھپی حسرت کو زبان دینے کے لیے پھر سے کالے کو آواز دی کہ صاحب جی! کچھ کھا پی لیں ـــــ میں نے کھانا بنا رکھا ہے۔'' کالے نے کمرے میں داخل ہو چکے ہونے کے باوجود کلثوم کی پیشکش کا جواب انتہائی ننگی گالی کی صورت دیا اور کھٹاک سے کُنڈی لگا لی۔ گالی کا اثر کلثوم پر بھی اُلٹا ہوا۔ وہ اِس طرح کھلکھلا کر ہنس دی کہ آنسو پلکوں سے نکل کر گالوں پر بہنے لگے۔ اُس نے دید بھر کر بند دروازے کو دیکھا اور آنسوؤں کو پونچھنے کی بجائے گالوں پر بہتے رہنے دیا۔

شام کے آخری لمحات میں کمرے میں گھسنے والے کالے نے کہیں آدھی رات کے لگ بھگ کنڈی کھولی اور بازو والے کمرے میں کھلی آنکھوں کے ساتھ لیٹی ہوئی کلثوم کو ایک بار پھر مغلظات کی زبان میں کھانا اندر کمرے میں پہنچانے کا حکم دے کر واپس کمرے میں چلا گیا۔ جس قدر جلد ممکن تھا کلثوم نے اتنی ہی جلدی میں کھانا کمرے میں پہنچا تو دیا مگر گالیوں کی ایک نئی قسط پھر بھی اُس کی آمد کی منتظر تھی۔ کچھ دیر تک جاری رہنے والی اِک نئی بک بک کے بعد کُنڈی پھر سے لگا دی گئی۔ شب بھر جاگ رہی کلثوم کے جگراتے میں کالے جیسے وحشی انسان سے خوف کا عنصر یقیناً شامل تھا مگر اتنا نہیں کہ جتنا اُس کی وحشت میں مضمر بے رحمانہ برتاؤ سے پیدا ہو چکا التفات جو کسی بھی عورت سے بھلایا جانا شاید ہی ممکن ہو۔

کالا زمانہ ٔ قدیم کے کسی حملہ آور لشکر کے سپہ سالار کی طرح مروج مردانگی کا ایک ایسا مکمل پیکج تھا جس میں بے رحمی اور بربریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مفتوحہ علاقوں میں اپنے مخالفین کی سر بریدہ لاشوں کے درمیان لہو ٹپکاتی تلواروں کے سائے میں مقتولین کی خواتین سے جبریہ جنسی عمل میں پنہاں لذت گیری بھی فاتحین کے اذہان میں اسی نوعیت کے جنسی رویوں کو جنم دیتی ہے کہ جس سے اُس کی گرفت میں آئی ہوئی عورت اُس کے سراپے سے محسوس ہونے والی تمام تر ابتدائی نفرت اور کراہت کے باوجود بعد ازاں صرف اور صرف اُسی سے لذت کشی کی خواہاں ہو کر رہ جاتی ہے۔ جنسی عمل میں تشدد، غلاظت اور انتہا درجے کی بربریت کا روا رکھنا عمومی نفسانی رویوں کے برعکس متشدد فریق کے لیے تو انتہائی لذت خیز ہوتا

ہی ہے لیکن کمال حیرت کہ اِس انوکھی لذت آفرینی میں حد درجہ حظ ''شکار'' فریق کشید کرتا ہے، شکاری نہیں۔

اکثر اوقات جنسی سرور انگیزی کی جستجو میں اِس درجہ کمال کی لذت آشنائی مرد اور عورت کے درمیان باہمی جھکاؤ کے اُن تمام وضع شدہ معیارات کو اُلٹا پُلٹا کر رکھ دیتی ہے کہ جو صدیوں سے جوں کے توں چلے آ رہے ہوتے ہیں۔ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا کہ اِس قدر بُری وضع، اِتنی گھٹیا زبان، اتنے بے ہودہ رویے، عمر کے اتنے زیادہ تفاوت اور واضح طور پر کمتر سماجی حیثیت کا کوئی غلیظ مرد اِس قدر حسین و جمیل، مہذب و دانا، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل رشک حسب نسب کی حامل لڑکی کو اِس طرح بھی اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے کہ اُس کے جسم اور منہ سے اُٹھنے والی بوُ اُسے بو ہی نہ لگے، اُس کی گالیاں اُس کے کانوں میں رس گھولیں، اُس کا تشدد اُس کے لیے راحت کا سامان ہو اور اُس کا بے ہودہ رویہ اُسے اُس کی اطاعت پر اُکسائے۔ وہ موجود نہ ہو تو زندگی بے لطف و بے مزہ اور اگر ہو تو روح کے ساتھ ساتھ بدن بھی اُس سے اُس کے تجاوز کی بھیک مانگے۔ یہ عقدہ کچھ اور نہیں اِس کے سوا کہ اُجڈ مرد کی حاکمانہ وحشت میں مضمر بے رحمانہ جنسی برتاؤ ایک ایسے التفات کی بنیاد رکھتا ہے کہ جس کا بھلایا جانا شاید ہی کسی عورت کے واسطے ممکن ہو۔ اور یہی حال اُس وقت کلثوم کا تھا۔

نجانے رات کا کونسا پہر تھا کہ کلثوم کی آنکھ لگی مگر ابھی لگی ہی تھی کہ کالے نے اُسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے اُٹھا کھڑا کیا۔ وہ کلثوم سے کچھ کہہ رہا تھا مگر اُسے صرف کالے کی غراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ ایسی غراہٹ کے جس کے کھردرے پن میں خاصی حد تک ملائمت در آئی تھی۔ شاید کلثوم کے چہرے پر اپنی باتوں کا ردِعمل نہ پا کر اب کے کالے نے اُسے گردن سے پکڑ کر جھنجوڑا تو اُسے اپنی گردن کا منکا ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا مگر ٹوٹا نہیں البتہ کالے کی آواز اب صاف سُنائی دے رہی تھی، غراہٹ سمیت۔

''میں جا رہا ہوں کچھ دیر کے لیے ضروری کام ___ اور خبردار! اِس لڑکی کے اوپر کسی پرندے کا سایہ بھی نہ پڑے ورنہ تیری بوٹیاں تو کتے اور کوے کھائیں گے ___ سُن لیا ناں حرامزادی!! ہاں ایک بات اور ___ جب تک میں واپس نہ آؤں، گھر کا دروازہ نہیں کھلنا

چاہیے، نہ اندر سے اور نہ باہر سے۔''

گردن دبائے جانے کے سبب کلثوم کو بری طرح سے کھانسی چھوٹ پڑی مگر وہ پھر بھی کھانستے ہوئے کالے کے پیچھے پیچھے ڈیوڑھی تک پہنچی تا کہ دروازے کو اندر سے بند کر سکے۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر کالا اچانک واپس مڑا اور انہی قدموں کھڑے ہو کر چند لمحوں تک کلثوم کو گھورتا رہا کہ جیسے پھر سے چتاونی دے رہا ہو اپنے حکم کے حرف بحرف تعمیل کی۔ گو کہ سورج نکلنے میں ابھی کافی دیر تھی مگر صبح کا اُجالا بھی کسی حد تک اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگا تھا۔ کالے کے گھورنے کے ابتدائی دورانیے میں تو کلثوم نگاہیں نیچی کیے محض کھانستی ہی رہی مگر نجانے جی میں کیا آئی، سر اوپر کو اُٹھایا اور کالے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت کر ہی لی مگر کالے کے برعکس کلثوم کی آنکھوں میں پیار، اضطراب اور شکوے شکایتوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ کلثوم کے اُسے واپسی دیکھنے کے عمل اور انداز نے کالے کو وہاں زیادہ دیر ٹکنے نہ دیا اور وہ باہر نکلتے ہی رکشہ اسٹارٹ کر کے جدھر سے آیا تھا، اُس کی مخالف سمت نکل گیا۔

کلثوم دروازے کو اندر سے کنڈی لگانے کے بعد کافی دیر تک وہاں گم سُم کھڑی رہی۔ اُسے کل ہی کی بات لگ رہی تھی کہ جب وہ اپنے باپ کے ہمراہ تھانے میں اُن اوباش لڑکوں کے خلاف شکایت درج کرانے پہنچی تھی جو اُسے اسکول آتے جاتے ہوئے چھیڑتے تھے۔ کلثوم کے باپ نے اُسے بہت سمجھایا کہ ان لڑکوں سے کوئی مخالفت مول لینے کی بجائے بہتر تھا کہ وہ اسکول چھوڑ دے لیکن اُس نے غریب والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود اُن کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی کہ اُس کی آنکھوں میں اسکول ٹیچر بننے کا خواب روشن تھا۔ دسویں جماعت تک کی کتابوں میں اُس نے یہی پڑھ رکھا تھا کہ برائی سے ہار ماننے کی بجائے برائی کے خلاف ڈٹ جانا چاہیے لہذا وہ ڈٹ گئی اور باپ کو قائل کرنے کے بعد اسکول چھوڑنے کی بجائے اوباشوں کے خلاف تحریری درخواست لے کر تھانے جا پہنچی۔ تھانیدار سے تو آمنا سامنا ہونے کی نوبت ہی نہ آئی جب کہ تھانے کے محرر نے رپٹ درج کرنے کے لیے بھی دو ہزار مانگ لیے۔ اب بھلا ایک دیہاڑی مزدور کے پاس دو ہزار روپے کہاں سے آتے لہذا باپ بیٹی چپ سادھ کے تھانے کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ لیکن پہر دو پہر کے بعد کلثوم

سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا۔ دسویں جماعت کی پڑھائی اور اُستانی بننے کے خواب نے
جوش مارا تو اُس نے بڑے افسر کی کھلی کچہری میں پیش ہونے کی دھمکی لگا دی۔ اُس لمحے محرر نے
پہلی بار کلثوم کو غور سے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا کہ جب تک دماغ ہی دماغ میں کسی فیصلے تک نہ
پہنچ گیا۔ ''بڑی حرامی ہوتی ہے یہ چڑھتی جوانی بھی ___ اِس کو تڑکا لگا ہوا گر خودسری کا تو تخت کا
تختہ کرائے بنا رہتی نہیں۔ مجھے افسوس رہے گا لڑکی کہ اِس بار یہ کام میرے ہاتھوں ہوا۔''

کچھ دیر بعد دونوں باپ بیٹی کو شکایت درج کرانے کے بہانے تھانے کے اندر بلایا گیا
اور پھر دونوں کو الگ الگ نجی مکانات میں منتقل کرنے کے بعد ایف آئی آر کاٹ دی گئی کہ کلثوم
نام کی پیشہ ور فاحشہ لڑکی اپنے باپ کی سرپرستی میں سرِعام فحش حرکات کر کے گاہک پھانستی ہے
اور پھر اپنے گھر لے جا کر زنا کی مرتکب ہوتی ہے جسے موقع پر ہی گرفتار کر کے تھانے لے آیا گیا
اور ابھی طبی معائنے کے واسطے ہسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ پیشاب کرنے کے بہانے فرار ہو گئی
جس کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ اس دوران کلثوم کے باپ پر اِس قدر
تشدد کیا گیا کہ اُس نے ذہنی طور پر خود کو ایک فاحشہ کا باپ ہونا قبول کر لیا جب کہ کلثوم کو
چھیڑنے والے اُوباش لڑکوں کو ایف آئی آر کا مدعی بنا دیا گیا اس موقف کے ساتھ کہ کلثوم اُنہیں
سرِعام دعوتِ گناہ دیا کرتی تھی۔

کلثوم کو بدکردار لڑکی ثابت کرنے کے لیے ضروری تھا کہ طبی معائنے سے قبل نہ صرف
اُس کا باکرہ پن ختم کر دیا جائے بلکہ اس طرح کیا جائے کہ وہ طبی لحاظ سے بھی ایک عادی جسم
فروش لڑکی قرار پائے۔ اِس کا آغاز تو محرر نے اپنے نجی عقوبت خانے میں کیا مگر جب بات نہ
بنی تو اِدھر اُدھر کے تھانوں سے اپنے چار پانچ پیٹی بھائیوں کو بھی دعوت دے ڈالی مگر مطلوبہ
نتائج پھر بھی حاصل نہیں ہو پا رہے تھے۔ گذشتہ دو دنوں میں خوفزدہ ہونے کی بجائے کلثوم کا
بڑھتا ہوا جارحانہ رویہ دیکھ کر محرر کے پاؤں تلے سے زمین کھسکی جا رہی تھی۔ وہ پریشان تھا کہ
یہاں سے باہر نکلنے کے بعد اگر کلثوم نے کہیں بھی چھوٹی موٹی شکایت کر دی تو اُسے نوکری سے
ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ کلثوم کی جوانی کو سبق سکھانے میں ناکامی کے بعد اُس نے کئی بار سوچا کہ
اُسے ٹھکانے لگا دیا جائے مگر پھر خیال آتا کہ اُس کا قتل تو لاش مل جانے کی صورت میں بگڑی

ہوئی صورتحال کو مزید بھی بگاڑ سکتا ہے۔ ایسے میں تھانے پر نئی بھرتی سے تعینات کیا گیا کالا نام کا
سپاہی ڈرتے ڈرتے محرر کی مدد کو آگے بڑھا اور اُس کے مسئلے کو سمجھتے ہوئے اپنی خدمات پیش کر
دیں۔ محرر کو اُس موٹے اور بھدے نقوش اور مکمل سیاہ رنگت کے چوڑے ہاتھوں پیروں والے
دہوش نوجوان کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ بظاہر غبی دکھائی دینے والے اس دیہاتی سپاہی
میں اتنی سمجھ بوجھ اور ہنرمندی بھی ہوگی کہ لڑکی کے طبی معائنے کے وقت اُسے جسم فروشی کا عادی
ثابت کیا جا سکے۔ لیکن اس کے باوجود کالے کی خود اعتمادی کو دیکھتے ہوئے محرر نے اُسے نجی
ٹارچر سیل میں لے جا کر کلثوم کو اس وارننگ کے ساتھ اُس کے حوالے کر دیا کہ مطلوبہ مشن کی
تکمیل کے لیے کسی کے پاس بھی تین دن سے زیادہ کا وقت نہیں تھا۔

محرر نے کلثوم کو ٹارچر سیل میں رکھ تو لیا تھا مگر اُس سے زیادہ کہیں وہ خود ذہنی ٹارچر کا
سامنا کر رہا تھا۔ وقتی طور پر آنے والے طیش نے اُسے اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ کلثوم کو
سبق سکھاتے وقت ایس ایچ اُو سمیت اپنی کسی دیگر آفیسر ہی کو اعتماد میں لے لیتا۔ اِن حالات
میں اگلے تین دن تک کارروائی پر پردہ ڈالنے اور کلثوم کے بارے میں مطلوبہ نتائج کا انتظار کرنا
سوہانِ روح تھا خاص طور پر یہ کہ کالے جیسا وحشی صفت انسان کہیں اُسے جان ہی نہ مار بیٹھے
جس کے بارے میں لگتا ہی نہیں تھا کہ اس سے پہلے اُس نے کبھی کسی عورت کی شکل بھی دیکھی ہو
گی۔ محرر نے ٹارچر سیل میں قدم تو تین دن کے بعد رکھا مگر سُن گُن ہر لمحے لیتا رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو
جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ تین دن کے بعد کلثوم بظاہر تو اَدھ موئی سی پڑی تھی مگر اُس کی کسی حرکت
، کسی جنبش سے لگتا نہیں تھا کہ اِن تین دنوں میں وہ کسی ہولناک جنسی تشدد کا شکار رہی ہے۔

''لیں صاحب! پوچھ لیں اس سے کہ کب سے جسم فروشی کا دھندہ کرتی چلی آ رہی ہے؟
'' کالے نے بڑی مشکل سے اپنے افسر کے سامنے جملہ مکمل کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سُنا
یہی گیا تھا کہ اِن تین دن اور تین راتوں میں کسی نے بھی کالے کو کمرے سے باہر نکلتے نہیں
دیکھا تھا۔ بس اُس پر طاری وحشت دیکھی گئی کہ جو ابھی تک اترنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی
جب کہ لڑکی نے محرر کو کمرے میں آتا دیکھا تو نئی نویلی دلہن کی مانند شرماتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئی
۔ اُسے یاد تک نہیں رہا تھا کہ کالے سے پہلے کتنے لوگوں نے ایک آدھ دن میں اُسے جسمانی

طور پر اقبال جرم کرانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ناکام رہے تھے۔ محرر نے توقع کے برعکس کلثوم کے چہرے پر پھیلی ہوئی شادابی دیکھی تو غیر یقینی نے اُس کی آواز کو کپکپا کر رکھ دیا۔ اُس نے سوچا ہوا تھا کہ جیسے وہ کمرے میں داخل ہوگا، ایک چیختی چلاتی لڑکی اپنے نُچے ہوئے چہرے اور کچلے ہوئے جسم کے ساتھ اُس کے قدموں میں آ گرے گی اور دہائیاں دے دے کر اُسے کالے سے بچانے کے لیے منت زاری کرے گی مگر یہاں تو سب کچھ اُلٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ کلثوم نے نکھرے ہوئے چہرے پر تھکن آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور بولی کہ میرا بیان لکھ لیں ناں کہ میں یہ کام دو سالوں سے کرتی چلی آ رہی ہوں۔

محرر کو اپنی سماعت اور بصارت دونوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سر کھجاتا ہوا حیران اور پریشان وہ کمرے سے باہر آیا تو کالا دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ محرر کو دیکھتے ہی اُس نے سگریٹ بجھا کر ایک طرف پھینکا اور سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ محرر نے قریب آ کر اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''اوئے کالے! تم نے تو کمال کر دیا۔''

''صاحب جی! میں نے کیا کیا ــــ یہ تو کمال والے کا کمال ہے۔'' کالا سر جھکا کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اب بس آپ اس کی گرفتاری ڈالیں اور لیڈی ڈاکٹر سے ملاحظہ کرائیں تاکہ اس کی ضمانت ہو سکے۔'' کالا بدستور سر جھکائے ہوئے تھا۔

''واقعی ڈاکٹری ملاحظہ کرالیں؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟'' محرر ابھی تک غیر یقینی کا شکار تھا۔

''اُو صاحب جی! جم جم کراؤ ملاحظے ــــ اگر مرضی کی رپورٹ نہ ملے تو میرا نام کالے سے کالا حرامی رکھ دینا۔'' اب کے کالے نے آنکھیں اوپر اُٹھا کر پوری دھج سے کہا۔

کلثوم کو مفرور سے گرفتار ظاہر کرنے کے بعد اُس کا طبی معائنہ بھی ہو گیا اور رپورٹ میں ثابت بھی کرالیا گیا کہ وہ عادی جسم فروش ہے جو سرِ عام فحش حرکات و سکنات سے شرفاء کو ترغیبِ گناہ دیتی ہے۔ اس دوران کلثوم اور اُس کے باپ کے تعاون انگیز رویے نے جہاں محرر کے واسطے حیران کن سہولتیں پیدا کیں وہیں جرم کی کمتر نوعیت کے باعث اور پولیس کی طرف سے

کسی قسم کی مزاحمت اور مخالفت نہ ہونے کے سبب اُن دونوں باپ بیٹی کی ضمانت بھی کرالی گئی۔ لیکن یہ ضمانت محض مجسٹریٹ کی عدالت سے ہوئی تھی، کالے سیاہی کی کورٹ سے نہیں۔ اُس میں نجانے کون سا ایسا جادو تھا کہ کلثوم اُسے اپنے والدین اور اُستانی بننے کے خواب کی قیمت پر بھی چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھی۔ سُو کالے نے اُسے ایک کچی آبادی میں سرکاری زمین پر قبضے کے بعد علیحدہ سے دو کمروں کا گھر بنا کر دے دیا۔ نکاح کا مطالبہ نہ کلثوم نے کیا اور نہ ہی یہ کالے کی خواہشات میں کہیں فِٹ بیٹھتا تھا۔ یہ کلثوم ہی تھی جو فنافی المحبوب کے مدارج ایک ہی جست میں اِس طرح پار کر چکی تھی کہ جہاں اُس کے قرب کا احساس ہی محبت کو شاداں کیے رکھتا ہے۔

رفتہ رفتہ کالے نے وہاں اور لڑکیاں لانی شروع کر دیں کہ جن کے ساتھ وہ کئی کئی پہر تخلیے میں گزارتا۔ پہلے پہل ڈھکا چھپا احتجاج کرنے پر ہی جب کالے کی طرف سے گھر نکالی کا حکم صادر کر دیا گیا تو والدین کی وفات کے بعد اکیلی اور بے سہارا رہ جانے والی کلثوم نے ہر آنے والے دن میں کالے کی جانب سے نگاہِ التفات اور اپنی جانب سے بے اندازہ جسمانی طلب کے معاملات میں قناعت کے نچلے سے نچلے درجے پر مسلسل پھسلتے چلے جانا ذہنی طور پر قبول کر لیا۔ کچھ عرصہ اور گزرا تو کالے نے کلثوم کے ٹھکانے کو پہلے کبھی کبھار مگر پھر باقاعدہ طور پر رنڈی خانے میں بدل لیا کہ جہاں شروع شروع میں یار دوست اپنی اپنی دوست لڑکیوں کے ساتھ محفوظ جگہ کے بہانے آنے لگے مگر بعد ازاں کلثوم اور جب کلثوم بھی کسی کے لیے پرکشش نہ رہی تو دیگر نئی لڑکیاں اُن کی تفریحِ طبع کے لیے وہاں بلائے جانے لگیں۔ کام پیشہ ورانہ بنیادوں پر چلنا شروع ہوا تو تحفے تحائف سے آغاز ہونے والے کام میں روپے پیسے کا دخل بڑھتا چلا گیا۔ اِس کام میں کالے کے بھی وارے نیارے ہوئے تو دو کمروں کا یہ گھر جہاں کچے سے پکا ہوا وہاں ضرورت مندوں میں ''سیاہی والے اڈے'' کے نام سے مشہور بھی ہوتا چلا گیا کہ جہاں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی معاوضے پر دستیاب ہونے لگی تھی۔

کالا اگرچہ کلثوم کو تھوڑی ہی دیر میں واپس آنے کا کہہ کر گیا تھا مگر جب وہ تین دن تک واپس نہ آیا تو کلثوم کے لیے اڈے کو بند اور ماہین کو چھپا کر رکھنا محال ہو گیا۔ گھر میں پڑا ہوا سودا سلف ختم ہوا تو اُس کی خریداری الگ سے مسئلہ۔ کلثوم اِس دوران دو مرتبہ گھر سے نکل کر سودا

سلف لینے بھی گئی تو مکان کو باہر سے تالا لگا کر گئی۔ اڈے سے سپلائی ہونے والی لڑکیوں اور اُن کے متوقع خریداروں نے الگ سے چین سکون حرام کر رکھا تھا کہ ہر منٹ دو منٹ کے بعد کھٹکنے والی کنڈی اور بجنے والی گھنٹی پر یا تو کوئی نہ کوئی لڑکی آئی ہوئی ہوتی اور یا پھر کوئی اُن کا طلبگار۔ کاروبار کا بنا بنایا نیٹ ورک جامد ہو کر رہ گیا تھا۔ اُن سب کے واسطے کلثوم کے ہاں ایک ہی بہانہ تھا کہ اُس کے بیمار والدین اپنے علاج کے لیے اُس کے پاس آئے ہوئے ہیں مگر اُس کی بات پر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ تپ چڑھے ہوئے گاہک اِسے اپنی اپنی مرضی کا رنگ دے کلثوم کو مطعون کیے جا رہے تھے۔ رصورت حال اُس وقت مزید پریشان کن رخ اختیار کر گئی جب پتا چلا کہ نئے آنے والے ایس ایس پی نے نہ صرف کالے اور اُس کے ساتھی سپاہیوں کو پرائیویٹ ٹراچر سیل چلانے کے جرم میں نوکری سے برخواست کر دیا ہے بلکہ اُن کے خلاف فوجداری کاروائی کرتے ہوئے رستم ایس ایچ اُو سمیت جیل میں بھی ڈال دیا ہے۔ کلثوم کو یوں لگا کہ جیسے اُس کے سر سے چھت ہی سرک گئی ہو۔ کالا پولیس میں ملازم تھا تو یہ اڈا محفوظ و مامون چل رہا تھا مگر اب اُس کی نوکری سے چھٹی اور گرفتاری کے بعد کچھ بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

ماہین کا رویہ اِس تمام صورت حال میں سب سے سوا تھا۔ پہلا دن تو اُس نے سو کر گزارا مگر سورج کے غروب ہوتے ہی اُس کی کیفیت عجیب سی ہو چلی تھی۔ اضطراب، اضمحال اور بدن میں اندر باہر دراڑیں پڑنے اور تہ در تہ ریشے چرنے کی ناقابل برداشت اذیت۔ اُسے شدت سے کالے کی طلب ہو رہی تھی۔ ماہین کو یوں تڑپتا دیکھ کر کلثوم کو کئی برس پہلے کی اپنی کیفیت یاد آئی تو آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ چونکہ برس ہا برس اتنی کٹھنائیوں سے گزرنے کے بعد اُسے اِس قسم کی کیفیت سے نمٹنے کا ہنر آ چکا تھا اِس لیے اُس نے وہی ٹوٹکے ماہین پر بھی آزمائے جس کے بعد وہ قدرے پرسکون ہوتی چلی گئی۔ مگر رات گئے پھر وہی کیفیت۔ آنے والے دنوں میں ماہین نے کئی بار گھر سے باہر بھاگ نکلنا چاہا مگر ہر بار کلثوم نے نجانے کتنے ہی جتن کرنے کے بعد اُسے ایسا کرنے سے روکے رکھا لیکن جونہی ماہین کو کالے کی گرفتاری کا علم ہوا نہ تو کلثوم کے ٹونے ٹوٹکوں میں اثر رہا اور نہ ہی اُس کے جتن بار آور ہونے لگے۔ اب تو ہر آنے والے لمحے میں ماہین کو گھر میں سنبھال رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی اضطراب سا

اضطراب تھا کہ جو اُس کی انا تک کے بخیے اُدھیڑ چکا تھا۔

کالے کی گرفتاری اور نوکری سے فراغت کے نتیجے میں پانچ دن کی غیر حاضری نے کلثوم پر ماہین کے برعکس اثر ڈالا۔ ڈری، سہمی اور کچلی ہوئی کلثوم کے انگ انگ میں ناپید ہو چکی خود اعتمادی اپنے آپ بحال ہونے لگی تھی کہ جیسے خزاں رسیدہ شاخ میں سے کونپلیں نمو پا کر پھوٹنے لگیں۔ کالے کے خوف کا بادل چھٹا تو ماہین کی رکھوالی سے وابستہ سبھی اندیشے معدوم ہوتے چلے گئے۔ اب وہ کسی خزانے کی حفاظت پر مامور نہیں رہی تھی کہ ایک بربادشدہ کیچوے کے واسطے اپنے آپ کو جوکھم میں ڈالے رکھے۔ کلثوم کے نزدیک ماہین زیادہ سے زیادہ اُن سینکڑوں لڑکیوں کے ہجوم میں محض ایک اور لڑکی کا اضافہ تھی کہ جو کالے کی حیوانیت کے جال میں پھنس کر کسی بے بس مکڑی کی طرح تڑپ رہی تھی مگر باہر نکلنے کا راستہ پھر بھی نہیں چاہتی تھی۔

کلثوم کا اعتماد بحال ہوا تو اُسے اپنے کاروبار کا خیال آیا کہ جو پانچ دنوں میں ہی زیرو ہو چکا تھا۔ خدشہ یہ بھی تھا کہ وہ تمام لڑکیاں کہ جن کے دم سے اُس کی اڈے کی رونق تھی، یہاں گنجائش نہ پا کر کسی اور اڈے سے اپنا مستقبل نہ جوڑ چکی ہوں۔ ایسے میں فوری طور پر بند دروازے کھولنے کے لیے کلثوم نے نہایت سوچ بچار کے بعد ماہین کو پہلے پہل اپنے اُن گاہکوں سے متعارف کرانے کا فیصلہ کر لیا کہ جو حیوانیت میں کالے کا متبادل رہے ہوں۔ وہ ماہین کے خاندانی پس منظر اور کسی حد تک روداد سے باخبر تو پہلے ہو چکی تھی لہذا انتہائی مناسب تھا کہ اُس کی غیر معمولی جنسی طلب کو اپنی کمائی کے لیے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ وہ کالے سے وابستہ اپنی خوئے انتقام کی تسکین بھی کرے کہ جو اب تک کسی مناسب وقت کے انتظار میں خوابیدہ چلی آ رہی تھی۔ لیکن دھندے کو پھر سے محفوظ و مامون رکھنے کے واسطے اُسے ایک بااثر سرپرست کی ضرورت تھی مگر ایسا بااثر سرپرست جو اُسے اور اُس کے دھندے کو پولیس سے بچائے، سوائے کسی مقامی پولیس اَفسر کے اور کون ہو سکتا تھا۔

۞

﴿۲۴﴾

دس دن مزید گزر گئے مگر کاشی اور شاکا کی رحمت خان کے روبرو پیشی نہ ہو سکی۔ اگر اِس دوران صورت دکھائی دی تو صرف جمال دین مشقتی کی جو دن میں تین بار اُن کے لیے اُن کی توقع سے بھی بڑھ کر بہتر کھانا لاتا رہا۔ ایسا کھانا جو اُنہوں نے اب تک کی زندگی میں شاید ہی سُنا، دیکھا یا کھایا ہو۔ جمال دین اُن کی ہر بات سنتا تھا مگر اُس کے پاس جواب دینے کو کچھ بھی نہیں تھا خاص طور پر اِس سوال کا جواب تو قطعیت سے نہیں تھا کہ وہ کب اور کیسے رحمت خان کے حضور بلائے جائیں گے۔ اِن دس دنوں میں اُنہیں ایک بار بھی کمرے سے باہر کمپاؤنڈ میں نکلنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا لہٰذا جو کچھ بھی اُن کے لیے تھا وہ کمرے کے اندر تھا۔ ذہنی ہیجان کے ہوتے ہوئے چاہے لاکھ کرنے کے لیے کوئی کام نہ ہو، کھانا وافر اور آرام ہی آرام ہو، آلس جسم میں گوڈے گوڈے اُتری ہوئی ہو پھر بھی کسی پل چین نہیں ہوتا۔ یہی حال کچھ اُن دونوں کا تھا کہ زندگی بھر کبھی ناں دیکھی گئی ایسی راحت میں بھی مسلسل بے اطمینانی، اضطراب اور اذیت کی انتہا پر پہنچا ہوا انتظار۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اگر اُنہیں ملاقات کا موقع دیے جانے کا وقت نہیں تھا تو پھر اُنہیں یہاں لانے میں اتنی اُتاول کیوں ظاہر کی گئی۔

دسواں دن ڈھل چکا تو رات کا کھانا لانے کی بجائے جمال دین اُن کے لیے نیا لباس اور غسل کا نیا سامان لایا۔ شبیر اور کاشف کی دل کی دھڑکنیں جہاں ایک دم تیز ہو گئیں وہاں جمال دین کے چہرے پر پہلے سے زیادہ یاسیت اور نحوست کا راج صاف دکھائی دے رہا

تھا۔ وہ دونوں اُس سے رحمت خان اور رحمت خان سے ملاقات کے ماحول کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے مگر جمال دین کا رویہ انتہائی حوصلہ شکن تھا لہٰذا وہ ساری باتیں وہ سارے سوالات زبان پر آئے ہوئے ہونے کے باوجود زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔ جاتے جاتے جمال دین نے اُنہیں خان سے ملاقات ہو جانے تک کوئی بھی ایسی چیز کھانے سے سختی سے منع کیا کہ جس سے منہ سے بو آئے۔ نہانے کے بعد جسم پر کرنے کے لیے باڈی اسپرے اور لباس کے لیے مخصوص برانڈ کا پرفیوم بھی اُنہیں الگ سے دے دیا گیا تھا۔ رحمت خان سے ملاقات کے تجسس نے اُن کی بھوک ویسے بھی ختم کر کے رکھ دی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیسا شخص ہے وہ جس کے سامنے نہ تو قانون کی کوئی حیثیت تھی اور نہ ہی قانون کا نفاذ کرنے والوں کی۔ اُس کا راستہ ہر حاکم کی حاکمیت سے بالا ہو کر گزرتا تھا۔ اُن کے واسطے یہ بھی اچنبھا تھا کہ وہ کس قسم کا جرم ہوگا جو رحمت خان سے سرزد ہوا ہوگا کہ اِس قدر صاحبِ اختیار ہو کر بھی وہ جیل کی چار دیواری میں آیا ہوا ہے۔ لیکن شبیر کے ذہن میں اس کا جواب بھی تھا اور جواز بھی۔ اُس کے سامنے دو قسم کے اختیار تھے: ایک وہ قانون جس نے رحمت خان کو جیل کے دروازے کے اندر دھکیلا اور دوسرا وہ رحمت خان خود کہ جس نے جیل کو اپنی جاگیر اور جیل والوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ وہ بے اختیار پکار اُٹھا کہ طاقت ہو تو رحمت خان ایسی ہو جو گردنوں کو یوں جھکائے کہ اپنے روبرو اُٹھنے ہی نہ دے اور جو اُٹھے اُس کو توڑ دیا جائے۔

سرِشام تیار ہو جانے کے باوجود شبیر اور کاشف کو ایک طویل انتظار کے بعد رات گیارہ بجے کے لگ بھگ رحمت خان کے پاس پیش کرنے کے لیے ایک ہی کمپاؤنڈ میں واقع آخری کمرے سے پہلے کی انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ انتظار گاہ کیا تھی ایک سجی سجائی فرشی نشست گاہ کہ جس میں ایک سے بڑھ کر ایک سامان آرائش، خشک میوہ جات کی لدی پھندی رکابیاں اور تمباکو نوشی کے لیے طویل مگر بل کھائے ہوئے مرصع پائپ کی ڈھیریاں جن کے ہونٹوں میں دبانے والے سرے ریشم کی سرخ تھیلیوں میں بند حقے کی دہکتی چلم کے نیچے اڑے ہوئے۔ شبیر اور کاشف کو وہاں بیٹھتے ہوئے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ کہیں کچھ میلا نہ ہو جائے،

کہیں کوئی ترتیب بگڑ نہ جائے۔

وہاں پھر ایک انتظار اگرچہ ایک گھنٹے سے زیادہ طویل نہیں تھا مگر کاشی اور شاکا کو وہ گذشتہ دس دنوں سے زیادہ جاں گسل لگا کہ جس دوران سانس لینا تو کیا سانس لینے کی آواز بھی اُس خاموشی پر گراں گزر رہی تھی کہ جو اُس انتظار گاہ اور اُس کے اطراف میں پھیلی ہوئی تھی ۔جان لیوا، جاں طلب اور جاں بلب خاموشی۔ بارہ بجے بعد کی ساعتوں میں انتظار گاہ اور کمپاؤنڈ کے آخری کمرے کا درمیانی دروازہ کھلا اور ایک چودہ پندرہ برس کا انتہائی خوبصورت لڑکا سفید ریشم کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ بدن پر ڈالے اِس طرح مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا کہ اُس کی رنگت سے نشست گاہ کا روشن ماحول دودھیا ہو گیا۔ کاشی اور شاکا، دونوں کے چہرے بجھ کر رہ گئے۔ اُنہیں اپنی مفعولیت اور اِس میں حاصل شدہ ہنر وری پر ندامت سی ہونے لگی۔ اب سے چند لمحے پہلے تک کا وہ احساس تفاخر کہیں کرچی کرچی ہو کر رہ گیا کہ جو رحمت خان کی اُن کے لیے طلب کو مفعولیت کی اساس پر استوار کر رہا تھا۔ وہ اپنے تئیں اپنے آپ کو ہر قسم کی دشوار اور تکلیف دہ صورتحال کے لیے تیار کر کے وہاں تک پہنچے تھے مگر وہاں گل مکئی جیسے ماہتاب کی موجودگی میں اُن کی اوقات محض شرمندگی سے زیادہ نہیں تھی۔ گل مکئی میں اِس قدر جنسی کشش تھی کہ اگر وہ رحمت خان کی خلوت کا مصاحب نہ ہوتا تو شاید شاکا اور کاشی کے درمیان ہمیشہ کے لیے دوری کی بنیاد رکھی جا چکی ہوتی کہ اب وہ دونوں عمر کے اُس حصے میں داخل ہو چکے تھے کہ جہاں کرداروں کے نام وہی رہتے ہیں مگر رویے اور افعال معکوس ہو جاتے ہیں۔

گل مکئی کو دیکھتے چلے جانے سے جو سحر اُن دونوں پر طاری ہوا تھا وہ اُس کے تکلم سے سوا ہو گیا۔ وہ اُنہیں اندر کی طرف آنے کی دعوت دے رہا تھا مگر اُنہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اُن کی حیرت گل مکئی کو شرمائے لجائے چلی جا رہی تھی لیکن اس کے برعکس اُن دونوں کو اپنی کایا بدلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ جو گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا کہیں ٹھہر سا گیا تھا، شبیر اور کاشف کی سانسوں میں اٹک سا گیا تھا۔ لمحات کے ساتھ جب وہ دونوں ساکت ہو چکے تو گل مکئی مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور مسکراتے ہوئے شبیر کو کاندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ شبیر کے

جسم میں ایک آگ سی حلول کرتی چلی گئی کہ جس کا نہ تو کوئی نام تھا اور نہ ہی کوئی احساس۔ بس ایک کیفیت تھی کہ زندگی جو کہیں رُک گئی تھی پھر سے بہنے لگی تھی۔ یہ لمحہ کاشف کے لیے بہت گراں ٹھہرا۔ وہ گُل مکئی سے کندھا ہلوائے بنا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے بدن میں بھی آگ نے کچھ ایسا ویسا کیا تھا مگر حلول نہیں بلکہ سرایت ہوئی تھی۔ اِس آگ میں اُس نفرت کا شعلہ بھی کہیں سے شامل ہو گیا تھا کہ جو شبیر کے شانے میں گل مکئی کے لمس کی صورت لطافت بن کر اترا تھا۔ شبیر قصداً اُٹھنے سے ہچکچاتا رہا تو گل مکئی نے پہلے سے بھی کچھ زیادہ مسکراتے ہوئے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے اُٹھا کھڑا کیا۔ گُل مکئی کی مسکراہٹ نے تجاوز کیا تو اُس کے گالوں کے دونوں جانب بھنور سے بن گئے۔ شبیر کے اُٹھنے تک کاشف درمیانی دروازے تک تو پہنچ گیا مگر رُک گیا کہ وہاں سے آگے کی پیش رفت گُل مکئی کے بنا ممکن نہیں تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات صاف بتا رہے تھے کہ اُسے گُل مکئی کا شبیر کی جانب التفات ناگوار گزرا تھا لیکن وہ دونوں جب رحمت خان کے کمرے میں داخل ہوئے تو کاشف سب سے آخر میں تھا۔

کمپاؤنڈ کے اِس آخری کمرے میں جو شخص انتہائی قیمتی قالینوں سے بجی ہوئی فرشی نشست پر گاؤ تکیہ لگائے نیم دراز تھا وہ کسی لحاظ سے بھی رحمت خان کے اُس تصور سے لگا نہیں کھاتا تھا جو شبیر اور کاشف کے ذہن میں راسخ ہو چکا تھا۔ اپنی مستحکم شدہ ہیبت اور دبدبے کے برعکس وہ تو ایک اُدھیڑ عمر، درمیانے قد اور منحنی وجود کا کوئی شخص تھا کہ جس کے چہرے کی ہڈیاں ضرورت سے زیادہ اُبھری ہوئی تھیں جس کے سبب اُس کے گال پچک کر رہ گئے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں اُس کے بدن کے تناسب سے اور بھی چھوٹے اور پتلے مگر آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہونے کے باوجود انتہائی گہری اور چمکدار تھیں۔ چہرے پر یبوست اور اضمحلال کے باوجود اگر وہ شخص کہیں سے غیر معمولی دکھائی دیتا تھا تو صرف آنکھوں سے کہ جن کی جانب دیکھنا اور پھر دیکھتے رہنا خاصی حد تک ناممکن تھا۔

شبیر اور کاشف کے اندر داخل ہوتے وقت رحمت خان اُن دونوں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ شبیر اُس کی ہیئت پر کاشف کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا مگر برمے کی طرح اپنے وجود میں چھید

کرتی ہوئی رحمت خان کی آنکھیں اُسے سر اُٹھانے کا حوصلہ نہیں دے رہی تھیں۔ کمرے میں جاتے ہی گُل مکئی رحمت خان کے بائیں پہلو کی طرف بیٹھ گیا مگر اُن دونوں کو نہ تو بیٹھنے کو کہا گیا اور نہ ہی رحمت خان نے اُن سے کوئی بات کی۔ رحمت خان کی بے تاثر سی شخصیت نے اس کے باوجود شبیر اور کاشف کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ تسلی سے سانس تک لے سکیں۔ ابھی اُنہیں کمرے میں گئے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے ہوں گے کہ رحمت خان نے بائیں جانب ہلکی سی کروٹ لی اور نہایت متانت کے ساتھ اپنے وجود کے حجم سے کئی گنا بلند آہنگ پاد داغ دیا۔ شاید یہ اسی کا ردِعمل تھا کہ اُس کے چہرے پر اضمحلال کی جگہ سکون کی ایک لہر سی پھیلتی چلی گئی۔ شبیر اور کاشف نے شاید ایک ساتھ ہی اپنی آنکھیں ہلکی سی اوپر کو اُٹھائی ہوں گی مگر گُل مکئی اور خود رحمت خان کے چہروں پر پھیلی ہوئی غیر معمولی سنجیدگی نے اُن کی آنکھوں میں اُبھرنے والی ہنسی کی لہر کو اُبھرنے سے پہلے ہی دفن کر دیا۔ اُن کے سر پہلے سے بھی زیادہ جھک گئے اس طرح کہ اُن کی نگاہیں اُن کے قدموں پر ٹکی تھیں۔

''سر اوپر کو اُٹھاؤ اور میری آنکھوں میں دیکھو!!!''___ رحمت خان کے گلے سے نکلنے والی آواز بھی اُس کی جسامت سے قطعی الگ، بھاری بھرکم اور عجیب سا رعونت آمیز دبدبہ لیے ہوئی تھی کہ جیسے کوئی بجلی سی کڑک رہی ہو۔ اُن دونوں کو یوں لگا کہ کمرے میں کوئی تیسرا شخص بھی کہیں پردے کے پیچھے موجود ہے اور وہیں سے بولے جا رہا ہے۔ اس تاثر کے باوجود اُنہوں نے سر اوپر کو اُٹھانے اور آنکھیں رحمت خان کی آنکھوں میں ڈالنے میں لمحہ برابر بھی تاخیر نہ کی لیکن صرف ایک دو لمحوں کے لیے اور پھر سے وہی کہ دونوں کے سر جھکے ہوئے مگر پہلے کی نسبت کم۔

''میری آنکھوں میں دیکھو___!!'' کمرے میں اجنبی بجلی ایک بار پھر کڑکی۔

شبیر اور کاشف کو لگا کہ جیسے اُن کا پیشاب خطا ہو جائے گا۔ اُن دونوں نے ایک بار پھر مشینی انداز میں سر اوپر کو اُٹھا کر رحمت خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھنے کی کوشش کی تو اُن کی کھلی آنکھوں سے پانی یوں بہنے لگا کہ جیسے اُن میں کچھ چُبھ گیا ہو اور اُس کی رڑک پانی بہائے چلی جا رہی تھی۔ رحمت خان نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو اُنہیں قالین پر بیٹھنے کا اشارہ

کیا۔ اشارہ پاتے ہی وہ دونوں یوں نیچے بیٹھے کہ جیسے ابھی گرنے والے ہوں۔ رکوع کے انداز میں بیٹھے ہوئے بھی اُن کی نگاہیں اگرچہ پوری طرح جھکی ہوئی نہیں تھیں مگر پھر بھی اس طرح بیٹھنے میں رحمت خان کا پورا سراپا اُن کے سامنے تھا۔ ماحول کسی اور ڈھب کا ہوتا تو محض رحمت خان کا سراپا ہی اُنہیں ہنسائے رکھنے کے لیے کافی تھا لیکن یہاں کی غیر معمولی صورتحال میں ایسا سوچنا بھی محال تھا۔

''میں تم سے یہاں کے حالات پر تبصرہ نہیں پوچھوں گا کہ جانتا ہوں تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو___ یا یہاں کے لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں___ مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ کل کیا ہوگا___ میں ہمیشہ آج میں زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' رحمت خان کے چہرے پر پھر سے اضمحلال آتا جا رہا تھا۔ جبڑوں کا کھنچاؤ بڑھا تو وہ نیم دراز رہنے کی بجائے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ گُل مکئی نے بھی اپنی نشست بدلی اور اُس کی پشت کی عقبی سمت بیٹھ کر کندھوں کو ہولے ہولے دبانے لگا۔

''تین مہینے کے بعد میٹرک کا امتحان ہو رہا ہے___ میں نے تم دونوں کے لیے پڑھائی کا بندوبست کر دیا ہے___ ادھر جیل میں ایک ماسٹر اپنی بیوی کو قتل کر کے عمر قید بھگت رہا ہے___ حرام خور بہت قابل ہے، تمہیں تین مہینے میں میٹرک کرا دے گا___ اُس کے بعد دیکھیں گے کہ تمہارا کیا کرنا ہے۔'' بات کرتے کرتے رحمت خان کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا مگر اس دوران بھی وہ مسلسل پادتا رہا۔ ایک ہلکی مگر ناگوار بو کمرے کے ماحول کا حصہ بنتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن اس صورتحال سے قطع نظر شبیر اور کاشف کے لیے میٹرک کرنے کی بات ایسی تھی کہ جس کا بظاہر کوئی سر پیر نہیں تھا اور نہ ہی وہ دونوں اس کو سمجھ پا رہے تھے۔ اُن کا خیال تو یہ تھا کہ رحمت خان نے انہیں اُن کی مفعولیت کی شہرت اور ہنروری سے متاثر ہو کر اپنے حجرے میں طلب کیا ہوگا کہ جس کے لیے وہ ہر طرح سے تیار ہو کر آئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اُنہیں کسی دشمنی کی واردات کا بدلہ چکانے کے لیے استعمال کیا جاتا مگر یہ تو اُن کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ دس دن کے بعد اپنے تخلیے میں بلا کر انہیں اگر کچھ کہا جائے گا تو یہ کہ

انہوں نے تین مہینے میں میٹرک کرنا ہے۔ وہ تو اُس وقت بھی نہ پڑھ سکے کہ جب پڑھنے کی عمر تھی، اب اِس عمر میں کیا خاک پڑھائی ہوگی۔ رحمت خان نے اُن کے چہروں سے اندازہ لگا لیا کہ اُن کے دل میں کیا اور ذہن میں کیا چل رہا تھا۔

''تم نے گُل مکئی کو دیکھ لیا ناں ___ اُس کے ہوتے ہوئے اِس کام کے لیے میں تمہیں کیوں بلاتا بھلا؟ اور اگر تم تینتالیس تو کیا سو ہزار قتل بھی کر لو تو میرے کسی کام کے نہیں ___ کیونکہ میرے پاس جو لوگ اِس کام کے لیے ہیں وہ تم لوگوں سے زیادہ بہتر طور پر بندہ مارنا جانتے ہیں ___ تمہیں تو پولیس کے ایک لِتر نے بک بک کرنے پر مجبور کر دیا لیکن میرے بندوں کو جان سے بھی مار دو تو پھر بھی زبان نہ کھلے ___ میں نے تم سے کیا کام لینا ہے لینا بھی ہے یا نہیں لینا تو اُس کے لیے پہلے تمہیں مجھے جاننا ہوگا، میرے بارے میں جاننا ہوگا۔ ابھی تک تم نے گردنیں جھکا کر اپنے پچھواڑوں سے کام لینا سیکھا ہے، سر اُٹھا کر دماغ سے کام لینا نہیں۔ کسی کو پیچھا دکھا کر اپنے پیچھے لگاتے ہوئے جان سے مار دینا بہادری نہیں، سامنے آ کر سینے پر وار کرنا بہادری ہے ___ اب نکالو یہ قتل وَتل دماغ سے اور اپنے پچھواڑے پر مان کرنا چھوڑو ___ میں نے اب تمہاری شکل اُس وقت دیکھنی ہے کہ جب تمہارے ہاتھ میں میٹرک پاس کرنے کا کارڈ ہوگا۔''

بات پوری کرنے سے پہلے ہی رحمت خان نے منہ موڑ کر دوسری جانب کر لیا۔ اگرچہ یہ واضح اشارہ تھا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا مگر اُن کے وہیں ٹھہرے رہنے کے سبب گُل مکئی کو اُنہیں جانے کا اشارہ کرنا پڑا۔ وہ دونوں اُلٹے پاؤں رحمت خان کے کمرے سے باہر نکل کر انتظار گاہ میں پہنچے تو وہاں گُل مکئی کی عمر کا ایک اور حسین و جمیل لڑکا، اُسی ڈیزائن اور اُسی رنگ کا لباس پہنے ہوئے اُن کا منتظر تھا۔ شبیر اور کاشف آپس میں بات کرنا چاہتے تھے مگر اُس لڑکے کی موجودگی کے سبب وہ صرف ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ہی رہ گئے۔ کاشف نے، جو اِس لڑکے کو دیکھتے ہی اِس پر بھی فریفتہ ہو چکا تھا، بات چلانے کے بہانے کچھ بات کرنا چاہی مگر اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی دیکھ کر نہ تو ہمت ہوئی اور نہ ہی زبان نے ساتھ دیا۔

انتظار گاہ سے باہر نکلے تو جمال دین اُن کا منتظر تھا سو کہیں بھی رُکے بغیر وہ واپس اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ اگرچہ چند قدم کا یہ فاصلہ بھی بنا کسی تکلم کے گزرا مگر جمال دین اُن دونوں کو اُن کے کمرے کے اندر تک پہنچا کر پھر واپس پلٹا لیکن پلٹنے سے پہلے اُنہیں یہ پیغام دینا نہ بھولا کہ اُن کی کتابیں الماری میں رکھ دی گئی ہیں جب کہ ماسٹر صاحب کل سے ہر صبح نو بجے پہنچ جایا کرے گا۔ جمال دین کی گفتگو ویسے تو انہیں کبھی بھلی نہیں لگی تھی لیکن آج تو حد ہو گئی۔ دونوں کو یوں لگا کہ جیسے پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈالنے سے پہلے مجسٹریٹ مجرم کو کو اُس کی زندگی کے آخری لمحات سے متعلق تفصیل سے آگاہ کرتا ہے۔ اُنہیں زندگی میں سینکڑوں لوگ ایسے ملے تھے کہ جنہیں دیکھتے ہی اُن سے شدید نفرت ہو گئی تھی مگر اُن میں سے کوئی بھی نفرت کے اِس درجے پر نہیں تھا کہ جہاں رحمت خان براجمان پایا گیا۔ کمرے میں آنے کے بعد کے ابتدائی لمحات میں وہ دونوں ایک جیسی باتیں سوچ رہے تھے۔ اُنہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیسا شخص ہے کہ جو خود تو جرائم کی دلدل میں ناک تک آیا ہوا ہے مگر اُن کے لیے چلا ہے تلقین شاہ بننے۔

''وہ شاید یہ سمجھتا ہے کہ ہمیں اُس کے کرتوتوں کی خبر ہی نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ وہ کون سا جرم ہے کہ جو رحمت خان نے نہیں کیا۔ بندے مار مار کر دولت کے پہاڑ بنائے اور ہمیں کہتا ہے کہ میٹرک پاس کرو اور وہ بھی تین مہینے میں۔ خود ابھی تک کسی کا پچھواڑا چھوڑا نہیں اور ہمیں طعنے دیتا ہے کہ ہم سینے پر وار کیوں نہیں کرتے۔''

شبیر تو آنکھیں لال کیے نیچے میٹرس پر بیٹھ چکا تھا جب کہ کاشف بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ نجانے اچانک جی میں کیا آئی کہ آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ بنی ہوئی بڑی الماری کے پَٹ کھول دیے۔ اندر نئی کتابوں کے دو سیٹ، کاپیاں اور اسٹیشنری کے دیگر آئیٹمز وافر مقدار میں رکھے ہوئے تھے۔ کاشف نے غصے سے پَٹ دوبارہ ٹھوک کر دبائے مگر وہ اُتنی ہی شدت سے پھر کھل کر دائیں بائیں ہلنے لگے۔ غصے کے اظہار کی کوئی اور صورت نہ پا کر کاشف بھی جھنجلاہٹ میں تنتناتا ہوا نیچے میٹرس پر بیٹھ گیا۔

''اِس سے تو بہتر تھا کہ ہم مُنڈوں کی بیرک میں ہوتے ___ کم از کم آزاد تو ہوتے۔''
کاشف منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''کیا کہا ___؟'' شبیر نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں کہا اور نہ ہی کچھ کہنے کو ہے ___ اب ہم حکومت کی جیل میں نہیں بلکہ رحمت خان کی جیل میں ہیں لہٰذا جیسا وہ چاہے گا، ویسا ہی کرنا پڑے گا۔'' کاشف نے گردن کے پیچھے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں اور میٹرس پر لیٹ گیا۔ بھوک اور نیند دونوں کا احساس کہیں جا تا رہا تھا۔

۞

﴿۲۵﴾

اگلے روز زفیرہ احمد دن بھر سوتی رہی۔ گذشتہ شب کے تیسرے پہر اُس نے کافی دنوں کے بعد اپنی پسندیدہ اِٹالین ڈش چکن کیشا تورے (Cacciatore) خاص طور پر تیار کرا کر پیٹ بھر کھائی اور پھر مدہوش ہو کر سو گئی۔ وہ جب بھی بہت زیادہ خوشگوار موڈ میں ہوتی تو اِس ڈش کو نہایت اہتمام سے پرندوں کے گوشت، مشروم اور ریڈ وائن کے ساتھ تیار کرانے کے بعد اپنی پسندیدہ وہسکی بلیک ڈاگ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قتلوں کی صورت کھاتی رہتی، تب تک کہ جب تک کھانے اور شراب کا سرور پاؤں کے ناخنوں تک نہ پہنچ لے۔ اور جب اُس کی آنکھ کھلی تو اگلی رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ بیداری کی اولین ساعتوں میں تو اُسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ صبح کے آٹھ بجے جاگی ہے یا رات کے آٹھ بجے مگر پھر بھی کہیں ناں کہیں کوئی وسوسہ ضرور تھا کہ جو آٹھ کے ہندسے سے جڑا ہوا تھا۔

قدرت نے انسان کو حسیات کے ایک کمال مگر پیچیدہ نظام کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ جو اُسے آنے والے لمحات اور زمانوں کی چاپ سنوانے پر قادر ہے مگر یہ اور بات کہ انسان خود ہی اِس چاپ کو سننے یا محسوس کرنے سے گریزاں ہوا رہتا ہے۔ اچھے اور برے وقت کا گھڑیال اِس سے بھی سوا ہے کہ جو سوئیوں کی بجائے ڈیجیٹل انداز میں ہمہ وقت منادی دیتا رہتا ہے مگر انسان ہر وہ کام کیے رہتا ہے کہ جو اُس گھڑیال کی آواز کو مسلسل دبائے رکھے۔ قدرت کی عطا کردہ حسیات کو ہم اپنی منشا کے تحت تو کبھی نہیں کر پائے مگر اُس سے گریز کی صورت میں خبر گیری اور خبرداری جیسی نعمتوں کو زندگی اور کائنات کی تفہیم کے واسطے بھی استعمال نہیں کر پائے۔ اِس

گریز میں بھی عمومی طور پر خود غرضی کی وہ جبلت کارفرما رہتی ہے کہ جو انسان کو انسانیت کے لیے آمادۂ کار نہیں ہونے دیتی۔ ہوسکتا ہے اِس کے پس منظر میں کچھ ایسی طبع بھی دخیل ہو کہ جو انسان کو آگہی سے آنکھیں چرانے پر مجبور کیے رہتی ہو کیونکہ وہ پہلے سے جاننے کی خواہش ہوتے ہوئے بھی پہلے سے کچھ نہیں جاننا چاہتا۔ وہ اچانک دکھ میں مداوے کا جواز اور اچانک خوشی میں زیادہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ مگر خبر اور بے خبری کے اِس کھیل میں نہ تو کبھی حسیات نے حساسیت کا دامن چھوڑا اور نہ ہی کائنات نے اپنی فہم کے پیمانے بدلے۔

اِس سے پہلے کہ زفیرہ کو آٹھ کے اِس ہندسے سے جُڑے وسوسوں کے جال میں کچھ دیر اور معلق رہنا پڑتا اُس کے موبائل فون پر ہونے والی دستک نے اُسے بے خبری کے خواب سے خبریت کی حقیقت میں لا کھڑا کیا۔ فون کی اسکرین پر بڑے صاحب کا نام چمک رہا تھا۔ زفیرہ احمد کو یقین ہو گیا کہ یہ آٹھ وہ آٹھ ہیں کہ جن کے بجنے کی مہلت بڑے صاحب کی جانب سے ہزار منت کے بعد عطا ہوئی تھی۔ تو کیا وہ گذشتہ شب کے آخری پہر سمیت آج کا پورا دن سوتی رہی ہے؟ اُس کے بدن میں لہر بہ لہر پھیلی ہوئی آلس نے چپکے سے احساس دلایا کہ ایسا ہی ہوا ہے۔

عجیب بات تھی کہ اپنی بربادی کی گھڑی آ چکنے کے باوجود وہ سرشار تھی، پرسکون تھی بے حسی کی حد تک کہ فون پر لگاتار ہونے والی گھنٹی بھی اُس کے ذہن میں اضطراب کی چھوٹی سی گونج پیدا کرنے میں ناکام چلی آ رہی تھی۔ گھنٹی بند ہوئی تو وہ بستر پر لیٹے لیٹے ایک لمبی سی انگڑائی لیتے ہوئے مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کا یہ اِغماض بھی بربادی کی اُس آندھی کو نہیں روک پائے گا کہ جو آج کی شب کے آٹھ بجنے تک تھمی ہوئی تھی مگر پھر بھی نہ تو کہیں کوئی خوف تھا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی اندیشہ۔ کل شب کی نیند سے آنکھیں چار کرنے سے پہلے ہی وہ تمامی فکرات سے ماورا ہو چکی تھی۔ کیا کیفیت تھی القا کی، کیا مکاشفہ تھا ذات کا کہ جس نے زندہ رہنے کے نئے رموز اُس کے سامنے لا کھڑے کیے تھے۔ آج پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ عزت مآب اور قابلِ احترام ہونا کچھ بھی نہیں، محض تصوراتی القابات ہیں اُس وقت تک کے لیے کہ جب تک آپ اپنے ڈھب سے جینے کی بجائے سماجی ضابطوں کے قیدی ہو کر رہتے

ہیں۔ عزت، آبرو اور پندار کا تصور سماج کے خوف سے جُڑا ہوا ہے جب کہ آبرو باختگی اور مذلت سماج کے خوف سے مُکتی پا لینے کی کیفیات ہیں۔ کیسے کیسے عذابوں کے وسیلے سے معاشرہ اپنے اِس خوف کو نافذ کیے رکھنے کا جتن کرتا رہتا ہے کیونکہ سماج کے کرتا دھرتا جانتے ہیں کہ ایک بار یہ خوف کسی کے ذہن سے نکل گیا تو پھر واپس آنے کا نہیں۔ یہ خوف کسی فرد کو جاننے ہی نہیں دیتا، سمجھنے ہی نہیں دیتا کہ ذلیل و رسوا سمجھے جانے والے سماج کے باغی اِس خوف سے نجات پا کر کس قدر مزے میں ہیں۔ کم از کم اپنی زندگی تو خود جی رہے ہیں۔

کل شب کے تیسرے پہر میں داخل ہونے سے قبل جتنے خوف مختلف مکھوٹوں میں اُس کے سامنے حصار بنا کر کھڑے ہوئے تھے اُن سب کی بنیاد صرف دو خوف تھے: بدکرداری کے الزامات اور معاش بربادی کا سامنا، اِن کے سوا کچھ نہیں۔ اِن سے چھٹکارا ایک ہی صورت ممکن تھا کہ وہ یہ یقین کر لے کہ ایسا ہو چکا ہے۔ پندرہ گھنٹے قبل وہ جونہی امکان سے یقین کے مدار میں داخل ہوئی، خوف کے وہ سارے بھتنے جو اُس کے گرد حصار بنائے ہر وقت ناچتے رہتے تھے، اچانک ہی تتر بتر ہو گئے۔ دہشت سے خلاصی کی اِس کیفیت کو سب سے پہلے شونی نے جانا، سمجھا اور اُسے منایا۔ نیند میں مسلسل خلل کا شکار زفیرہ احمد کی پندرہ گھنٹے کی پرسکون نیند اُس خوف سے مُکتی کی منادی تھی جس نے اُسے کئی دنوں سے اِس طرح سے مصلوب کر رکھا تھا کہ زندگی اور موت کا امتیاز ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن اب اگر کچھ بھی اُس کے لیے اہم تھا تو وہ اُس کی زندگی اور زندہ رہنا۔ اِس کے سوا سبھی کچھ ثانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

زفیرہ احمد رات کے پہلے پہر طلوع ہونے والی چھٹکارے کی اِس صبح کو کچھ زیادہ پرسکون بنانے کے لیے اُٹھی اور سگریٹ سلگا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے لطف آگیں انداز میں آنکھیں موند لیں۔ اِس کیفیت میں اُسے کردار اور معاش کا تصوراتی تعلق بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ کڑوے دھوئیں سے نچڑی ہوئی نکوٹین خون میں شامل ہوئی تو زفیرہ احمد کو معاشی کامیابیاں اچھے کردار کی سماجی سطح پر رائج شدہ تعریف سے قطعی طور پر الگ دکھائی دینے لگیں۔ وہ حیران ہو کر اکڑوں ہو بیٹھی اور اپنے آپ ہی مسکرانے لگی۔ ''یہ بات مجھے اب تک کیوں سمجھ نہیں آئی تھی؟ کون سا کاروبار ہے کہ جس میں سبھی کے سبھی افراد شرافت کی سماجی تعریف پر پورے

اُترتے ہوں گے؟'' بے معنویت کی اس گھڑی میں بھی کچھ رائیگانی کی طرف بھاگتا ہوا سجھائی دے رہا تھا۔ جس ذاتی کردار کو ڈھانپ ڈھانپ رکھنے میں عمر کا لذتوں بھرا دور تنہائیوں میں غرق ہوا وہی کردار، بنا کسی ظاہری ملال کے بدکرداری کے گھاٹ اُترنے جا رہا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ننگ دھڑنگ گھر سے باہر نکل کر اُس وقت تک سڑکوں پر گھومتی رہے کہ جب تک لوگ اُس پر جوتے برساتے رہنے کے بعد تھوکنا نہ شروع کر دیں۔ چند برس پہلے ایک مشہور برانڈ کی چائے کی اشتہاری مہم بناتے ہوئے اُس نے صوفی کلام اور صوفی رقص میں پنہاں عشقیہ رموز کو چائے کی چاہت سے جوڑنے کی کوشش کی تو اُسے تصوف کے بارے میں پڑھنے کا موقع ملا۔ ملامتی صوفیوں کے زمرے میں اُسے حیرت ہوئی کہ یہ کیسے لوگ تھے جو خود پیدا کردہ ذلت کی دلدل میں لتھڑے رہنے کے باوجود عزت و احترام کی بلندیوں تک پہنچے۔ زفیرہ احمد کا دل چاہا کہ وہ بھی اُٹھ کر یوں رقصاں ہو کہ کائنات اُس کے ساتھ محوِ رقص ہو جائے اور اُس پر انگلیاں اُٹھانے والے کہیں پاتال نشیں ہو جائیں۔ اِسی لہر میں لہرا کر وہ اِس طرح اُٹھی کہ باریک سا پیرہن کہیں دور جا گرا اور اُس کا ہاتھ سیدھا اُسی طرف لپکا کہ جہاں کل شب سے دھری ہوئی بلیک ڈاک کی بوتل دکھائی دے رہی تھی۔

لیکن اِس دوران زفیرہ احمد کے فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اُٹھی۔ اب کے بھی کال بڑے صاحب کی طرف سے تھی۔ زفیرہ نے وقت دیکھا۔ شب کے آٹھ بج کر دس منٹ ہو چلے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سینے سے بے اختیار نکلنے والی ٹھنڈی سانس نے اُسے متزلزل کرنا چاہا لیکن ہونٹوں پر در آنے والی کرب انگیز ملامتی مسکراہٹ نے اُس کا بھرم رکھ لیا اور طے شدہ امور کو دراڑیں پڑنے سے بچائے رکھا۔ زفیرہ نے بلیک ڈاگ کی اُلٹی ہوئی بوتل کو سیدھا کرتے ہوئے سوچا کہ اب تک جو بھی ہونا تھا، وہ ہو چکا ہوگا۔ آٹھ بجے کے بعد نہ تو بڑا صاحب اُس کے لیے کوئی بڑا صاحب رہا تھا اور نہ ہی اُس کی جانب سے امکانی طور پر برپا کیے جانے والے عذاب میں کسی ایذا کی اذیت۔ اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کل تک جو کچھ اُس کے لیے انتہائی پریشان کن تھا یوں اتنی آسانی سے غیر متعلقہ ہو کر رہ جائے گا۔ زفیرہ احمد کے لیے اِس نوعیت کی کایا کلپ حیران کن تھی۔ اُس نے اب تک کی زندگی میں ہمیشہ معاملات کو سر پر سوار رکھا اور خود

پیدا کردہ ٹارگٹس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر خود کو ہلکان کیے رکھا۔ اُسے کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ زندگی یوں بھی مسائل سے ماورا اور اِس قدر سہل ہو سکتی ہے؟ لیکن گلاس میں شراب اُنڈیلتے ہوئے ایک اور متوازی سوچ اُبھر کر سامنے آ گئی کہ زندگی اپنی تمام تر گنجھلوں کے ہوتے ہوئے سہل ہوتی نہیں، سہل کی جاتی ہے۔

پیگ اُٹھا کر زفیرہ احمد نے دروازہ کھولا اور ٹیرس میں نکل آئی۔ گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے نے سناٹے میں مزید خامشی اور ٹھہر ٹھہر کر چلنے والی صبا میں خنکی بڑھا دی تھی۔ حدِ نگاہ تک تمام کا تمام منظر ساکت اور اطراف میں پھیلی ہوئی پہاڑیوں پر کہیں کہیں دکھائی دینے والی روشنیاں بھی اپنی جھلمل کو منجمد کیے ہوئے بے حرکت و جامد دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں زفیرہ احمد بھی اِس پرسکون سکوت کا جزو ہو کر اپنے آپ کو مہربان آغوش کی مانند پھیلی ہوئی تاریکی میں تحلیل کر چکی تھی۔ کچھ بھی تو پہلے کی مانند نہیں رہا تھا۔ نہ تو خوشی کی مسرت اور نہ ہی دکھ کی کوفت، چبھن اور دکھن۔

گو کہ زفیرہ نے اپنے بے لباس بدن کو محض ایک شال سے ڈھکا ہوا تھا مگر کھلی فضا میں کھڑے ہونے کے باوجود وہ اُسے ناروا سا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ پیگ کے ختم ہوتے ہوتے جب خنکی اچھی خاصی بڑھ چکی اور بھوک کا احساس بھی اپنا آپ منوانے لگا تو اُسے اُن تمام حاجات کا پورا کیا جانا اولین ترجیح لگنے لگا کہ جو اِنسانی طبع سے جڑی ہوئی ہیں۔ کمرے میں داخلے ہونے کے بعد درجہ حرارت کا تھوڑا سا بڑھاؤ جسم کی ٹکور کے خوشگوار احساس میں بدل گیا۔ اب اگر کمرے میں کچھ ناگواری تھی تو اُن فون کالز کے سبب کہ جو متواتر آئے چلی جا رہی تھیں۔ زفیرہ احمد فون دیکھے بنا جانتی تھی کہ فون کالز کن کی جانب سے ہیں اور وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہ سب کے سب وہ حرمزادے ہوں گے کہ جو اُس سے بزنس میں تو مقابلہ نہیں کر سکے مگر اب انٹرنیٹ پر اُس کے برہنہ بدن کو شہوت سے لیپی ہوئی آنکھوں سے بار بار دیکھنے کے بعد چاپلوسی سے لتھڑی ہوئی زبانوں سے بظاہر تو ہمدردی جتائیں گے مگر اصل میں اپنی منحوس سماعت کی تسکین کے لیے سننا چاہتے ہوں گے کہ وہ کس قیامت سے گزر رہی ہے۔ مگر وہ اپنے حریفوں کو خوش ہونے کا یہ موقع بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔

خانساماں کو کھانے کے بارے ہدایات دینے کے بعد اُس نے دوسرا پیگ بنایا اور پہلے سے زیادہ پُرسکون ہو کر صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ یہ کیسا ردِعمل تھا کہ آج اُس نے خانساماں کے سامنے کچھ زیادہ کپڑوں میں چھپنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ کمرے میں بلائے جانے سے قبل اُس کے فارم ہاؤس کا ذاتی عملہ اُس کی کالے لوگوں کے ساتھ اجتماعی مجامعت کے مووی کلپ دیکھ چکا ہو گا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس کے روبرو کبھی پلکیں اوپر نہ اُٹھانے والا خانساماں کنکھیوں سے سہی مگر آج کیسے اُس کے بدن کے خاص حصوں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ شاید یہ اُس کا واہمہ ہو مگر پھر خیال آیا مرد کی آنکھوں کی خفی سی سرسراہٹ بھی عورت کے جسم سے زیادہ اور کہاں محسوس کی جا سکتی ہے۔ شاید قدرت نے ازل سے نر اور مادہ کو خلق کرتے ہوئے نر کی آنکھوں اور مادہ کے جسم میں باہمی کشش و قربت کا کوئی قبل از ملاپ قرینہ سمو دیا ہو کہ جہاں حتمی قربت کے واسطے موزونیت کا قابلِ عمل طریقہ کار (Operative Procedure) طے پاتا ہو۔

زفیرہ احمد کو جسم کا یوں بے معنی ہو جانا اب سے پہلے کبھی اتنا نہیں کھلا تھا۔ اُس نے جسم کے جزوی حصوں کو ڈھانپتی ہوئی مخملیں شال کو پاؤں کی غیر ارادی حرکت سے پرے پھینک دیا۔ مذلت اور بے معنویت کو شراب میں ڈبو دیے جانے کے بعد اُسے اپنے موبائل فون کا کال اور میسج ریکارڈ نہ دیکھنا کارِ کم ہمتی محسوس ہونے لگا تھا۔ اُسے اپنا یہ عمل اُس پست ہمت کبوتر کی طرح لگا کہ جو سر پر کھڑی بلی کے جھپٹنے کا انتظار تو کرتا ہے مگر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھنے کے سبب موت کی وحشت اور بے رحمی کا حظ اُٹھانے سے اپنے آپ کو محروم کر لیتا ہے۔

اُس نے دور پھینکے ہوئے فون کو اُٹھایا اور تیزی سے اُس کا کال ڈیٹا چیک کرنے لگی۔ ماسوائے بڑے صاحب کی دو کالز کے اور کوئی بھی ایسی کال نہیں تھی کہ جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ اُس کے بدترین حریفوں نے شاید اُسے اِس قابل ہی نہیں سمجھا تھا کہ اُس کی برہنہ ویڈیوز دیکھنے کے بعد بھی اُس پر کوئی طنز کر سکیں، کوئی گالی کوئی دشنام ہی بک سکیں؟ تو کیا اُس کی سماجی اور معاشی موت پر رسماً بھی کوئی رونا دھونا نہیں تھا۔ کوئی اور گھڑی ہوتی تو شاید وہ اِس گھڑی کے کبھی نہ آنے کی دعائیں کرتی مگر یہاں تو وہ خود ہی بڑے صاحب کے جال

میں اپنے پیروں پر چل کر پھنسی تھی تو پھر یہ لمحات تو آنا ہی تھے مگر ان لمحات سے جڑی توقعات اِس بری طرح بھی ٹوٹ سکتی ہیں، یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ملک کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی کی چیف ایگزیکٹو کی برہنہ ویڈیوز انٹرنیٹ پر ہر ہما شما کے واسطے دستیاب ہوں اور کوئی اُس کا نوٹس تک نہ لے۔ ایک دم اُس کے ذہن میں ایک اور خیال شعلے کی طرح لپکا۔

''کیا ایسا تو نہیں کہ بڑے صاحب نے اُسے محض خوف زدہ کرنے کے لیے ایسا شوشا چھوڑا ہو اور حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہ ہو؟ ___ لیکن اگر بڑے صاحب کا کوئی ایسا مقصد نہیں تھا تو پھر اتنا بڑا اڈرامار چا کر اُس کی خلوت کی قابلِ اعتراض ویڈیوز کیوں بنائی گئیں؟''

زفیرہ احمد نے پہلے سے زیادہ سرعت کے ساتھ اِن باکس کھولا جہاں چھ کے قریب ٹیکسٹ میسج موجود تھے اور یہ سب کے سب بڑے صاحب کی جانب سے تھے۔ پہلے پانچ پیغامات تو زفیرہ احمد کی جانب سے فون کال اٹینڈ نہ کرنے کا استفسار تھے کہ جن میں بار بار آٹھ بجے کی مہلت گزر جانے کی بات کی گئی تھی جب کہ آخری میسج میں مختصری دو سطریں تھیں ''آٹھ بج کر دس منٹ ہو چکے! اب تمہارا کوئی گلہ میرے ذمے نہیں رہا ___ بربادی مبارک۔''

اب سے کچھ لمحے پہلے تک کا سکون، لاتعلقی اور بے معنویت سبھی غتر بود ہو چکے تھے۔ بڑا صاحب اپنا وار کر چکا تھا مگر کسی جانب سے بھی کوئی ریسپانس نہ آنا زفیرہ احمد کے اعصاب چٹخائے چلا جا رہا تھا۔ اُس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر اپنے ڈائریکٹر ہیومن ریسورس خوشنود ملک کا نمبر ملانے لگی۔ شاید یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ دوسری جانب کافی دیر تک رنگر بجنے کے باوجود فون اٹینڈ نہیں کیا گیا تھا۔ زفیرہ احمد نہ چاہتے اور نہ سمجھتے ہوئے بھی بوکھلا چکی تھی اِس طرح کہ اُس کے مضبوط اعصاب اُس کو جذباتی لحاظ سے سہارنے سے قاصر ہو چکے تھے۔ اس ہیجان میں اُس نے ٹیلی وژن آن کیا اور بوکھلاہٹ میں چینل پر چینل بدلتی چلی گئی۔ ہر چینل پر معمول کی ہر خبر کو غیر معمولی بنا کر اپنے اپنے انداز میں پیش کیا جا رہا تھا۔ مگر زفیرہ احمد تو اپنے ذہن میں گھس کر بیٹھ چکے خوف کا عکس ٹیلی وژن کی اسکرین پر دیکھنا اور اُسی خوف کو مجسم خبر ہو کر اپنے بارے میں سننا چاہتی تھی لیکن کسی بھی چینل پر نہ تو اُس کی تصویر اور نہ ہی اُس کے بارے میں کوئی خبر۔ زفیرہ نے امکانات اور خوف کے پیچوں پیچ بنتی اور بگڑتی صورت حال میں اِس

طرح سے اطمینان کی سانس لی جیسے تسلی دینے کی بجائے خود سے سوال کر رہی ہو کہ ایسا اگر نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے۔

اِسی منجدھار میں ڈوبتے ابھرتے اُسے اپنے بدترین حریف خالد رومی کا خیال آیا۔ ’’اگر میری ویڈیوز انٹرنیٹ پر اپ لوڈ ہو چکی ہیں تو اب تک خالد رومی کا فون یا میسج کیوں نہیں آیا؟ وہ بھلا ایسا موقع کیونکر جانے دیتا؟____‘‘ اِسی خفتار میں اُسے یاد آیا کہ خالد رومی کا تو اپنا اسٹلائٹ چینل بھی ہے لیکن اُس کا نام اُسے یاد نہیں تھا۔ اگر یاد تھا تو بس اتنا کہ نسبتاً نیا اور غیر اہم چینل ہونے کے سبب سب سے آخری نمبروں پر کہیں دکھائی دیتا تھا۔ زفیرہ احمد نے ایک بار پھر انتہائی سرعت سے چینل گردانی شروع کر دی اور آخر اُسے ’’رومی‘‘ نام کا چینل مل ہی گیا جہاں اُس کی تصویر پوری اسکرین پر چھائی ہوئی تھی۔ زفیرہ احمد کا دل ایک دم دھڑکنا بھول گیا اور کان سیٹیاں بجاتی ہوئی تیز ہوا کی گزرگاہ بن کر رہ گئے۔ اُس نے ٹی وی کا والیم بڑھایا تو چیختی چنگھاڑتی آواز میں کوئی خاتون نیوز ریڈر بار بار ایک ہی جملہ دہراتے ہوئے ہلکان ہوئے جا رہی تھی کہ ملک کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی کی چیف ایگزیکٹو زفیرہ احمد کی شرم ناک ویڈیوز منظرِ عام پر اور اس کے ساتھ ہی اسکرین پر دھندلی کی ہوئی تصویریں دکھائی دی جانے لگتیں جن کے درمیان وقفے وقفے سے زفیرہ احمد کی کسی تقریب میں لی گئی تصویر کا چہرہ نمایاں کر کے سامنے لایا جاتا اور پھر وہی شرم ناک کی تکرار۔

زفیرہ احمد کے سُتے ہوئے چہرے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اشک اِس قدر وافر بہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے گال پوری طرح بھیگ گئے۔ کپکپاتے ہاتھ سے اُس نے ریموٹ کا سرخ بٹن دبا کر ٹی وی کو آف کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں لیکن آنکھیں موند لینے سے جسم اور ذہن کے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ تو شاید نہ رک سکی۔ ایک بھونچال سا تھا جس نے اُسے زمین اُدھیڑتی لہروں پر اَٹکایا ہوا تھا۔ زفیرہ احمد کچھ لمحات تک تو مسمرائز ہو کر اِن لہروں کے ساتھ بہی مگر پھر کم و بیش اُسی حالت میں دوبارہ سے خوشنود ملک کو فون ملانے کی کوشش کرنے لگی۔ اب کہ فون اٹینڈ تو ہو گیا مگر دوسری جانب سے آنے والی آواز قطعی اجنبی ہو چکی تھی۔ زفیرہ نے اپنی سماعت کو یقین دلانے کے واسطے پوچھ ہی لیا کہ وہ خوشنود ملک ہی ہے۔ مہ نور ایڈورٹائزز کا ڈائریکٹر

ہیومن ریسورس؟

’’جی میں خوشنود ملک ہوں جو کبھی مہ نور ایڈورٹائزر کا ڈائریکٹر ہیومن ریسورس ہوا کرتا تھا مگر اب سے چند گھنٹے پہلے استعفٰی دے چکا ہوں اِس گذارش کے ساتھ کہ مجھے خاموش ہی رہنے دیا جائے____ بولنے کا موقع مجھ پر تھوپ دیا گیا تو شاید پھر کسی کا پندار سلامت نہ رہے۔‘‘ یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔

’’کیا لوگ ہیں یہ؟ کیا رویہ ہے ان کا کہ عذاب کی اِس گھڑی میں میرا ساتھ دینے کی بجائے اُلٹا مجھے ہی اکیلا کر دیا!!! کیوں نہیں سمجھتے کہ بعض اوقات آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا، سب غلط بھی ہو سکتا ہے۔‘‘ زفیرہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کی خوشنودی کے لیے سراپا خوشامد ہو چکا اُس کا یہ ادنیٰ ملازم خوشنود ملک آج اُس سے اِس لہجے میں بات کرنے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟

اِس صورتِ حال میں وہ زفیرہ احمد جسے مہ نور ایڈورٹائزرز کی چیف ایگزیکٹو زفیرہ احمد نے بڑی تپسیا سے جوڑ جوڑ کر مجتمع کیا تھا، پل بھر میں بکھرنے لگی تھی۔ اُس نے جس خود اعتمادی کے بل بوتے پر بڑے صاحب سے ٹکر لی تھی وہ ریت کی دیوار ثابت ہو رہی تھی۔ اُس کا وجود جو اُس کے ملازمین کے لیے کبھی احترام کا مینارہ ہوا کرتا تھا، ذلت اور شرمندگی کی علامت بن کر رہ گیا تھا۔

’’کیسے سامنا کرے گی وہ اِن طوطا صفت لوگوں کا کہ جو اُس کا ساتھ دینا تو درکنار، اُسے مزید رگیدنے کے لیے میدانِ مخالفت میں اکٹھے ہو کر صف بندی کی جستجو میں تھے۔‘‘ اُسے لگا کہ وہ مقابلے سے پہلے ہی ہار چکی ہے۔

۞

﴿۲۶﴾

کالے کو سزا ہو جانے کے بعد کلثوم کی حد سے بڑھتی ہوئی نوازشات اور گھر کے کھلے دروازے سے اندر آنے والی لڑکیوں کے علاوہ رال ٹپکاتی زبانوں والے گاہک نما مردوں کی بے محابا آمد و رفت نے ماہین کی ذہنی حساسیت کو جگا دیا تھا۔ اگر چہ بظاہر وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی لیکن اس کے باوجود سمجھنے لگی تھی کہ کلثوم کے ارادے کیا ہیں۔ نوید سے ملاقات کے لیے گھر سے نکالے گئے پہلے قدم کے بعد محض چند دنوں کے دوران زندگی اِس طرح ہنگام و حوادث کی نذر ہوئی کہ شاید کسی عام لڑکی کو عمر بھر بھی اس نوعیت کے واقعات و سانحات کا سامنا نہ ہو۔ جس انسان نما سانڈ نے اُس کے باکرہ پن کی دھجیاں اُڑائی تھیں اُسی نے ماہین کو احساس دلا دیا تھا کہ وہ بھی اپنی طلب، رغبت، شہوت اور مجامعتی حیوانیت کے لحاظ سے کسی عام مرد کے بس کا روگ نہیں۔ جس سطح پر ایک نارمل عورت کی طلب تسکین میں منقلب ہو سکتی تھی وہیں سے اُس کے ہاں اِس کا آغاز ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ ایک پڑھی لکھی نفیس لڑکی کو جب طیفے جیسے شخص نے کمال بربریت سے اُسے خود کی ذات کے رموز کا آشنا کیا تو پھر زمانہ ما بعد میں کالے سپاہی جیسا بے رحم وحشی ہی اُس کی توقعات پر پورا اُتر سکتا تھا، کوئی کھلنڈرا چاکلیٹی ہیرو یا عام بابو ٹائپ مرد نہیں۔

عجیب بات تھی کہ اتنے مختصر عرصے میں لذت آشنائی کے تمام مدراج طے کر چکی ماہین کے دل میں طیفے اور کالے سپاہی جیسے جاہل، غیر مہذب اور غلیظ اشخاص کی گنجائش تو تھی مگر کسی ایسے بھلے آدمی کی نہیں کہ جس کی شہوانی طلب میں کثافتوں کی بجائے لطافتیں دکھائی دیتی

ہوں۔ لیکن اِس کے باوجود وہ جسم فروشی یا قحبہ گری کی جانب خود کو مائل نہیں پا رہی تھی۔ ماہین کو یقین ہو چلا تھا کہ کالے کو سزا ہو جانے کے بعد وہ کلثوم کے نزدیک قحبہ گری کے واسطے نعمت غیر مرقبہ ثابت ہو گی مگر بری سے بری صورتحال کا تصور کر کے بھی وہ اپنے آپ کو جسم فروشی کے لیے تیار نہیں کر پا رہی تھی۔

کلثوم کے گھر مکمل تنہائی میں گزرنے والے تین چار دنوں میں اُسے بہت کچھ سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملا۔ اُسے اب ادراک ہو رہا تھا کہ ہوٹل میں ہونے والی حادثاتی مجامعت سے قبل بھی اُس کا بدن کیوں رات رات بھر اُسے بیدار کیے رکھتا تھا۔ فون پر سیکس اور سکائپ کے ذریعے خود لذتی کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کی نمائش کیا معنی رکھتی تھی۔ اُس کے اندر ضرور کچھ ایسا تھا کہ جو دوسری عورتوں سے مختلف اور بڑھ کر تھا۔ اگر ہوٹل میں نوید کی بجائے طیفے اور بعد میں کالے جیسے غیر معمولی مردوں کے ساتھ جنسی تصادم نہ ہوا ہوتا تو شایداُسے اِس طرح، اتنی آسانی سے اور زندگی کے اولین مراحل میں اپنے جسم کی استعداد اور ترجیحات کی خبر بھی نہ ہو پاتی۔ عین ممکن تھا کہ نسوانی حیات کی اِس رمز سے بے خبری، کسی اوسط درجے کے مرد سے شادی کی صورت میں، شادی کی ناکامی کا باعث ہوتی اور بار بار ہوتی رہتی۔

اب کے جب وہ پندار ہی کو اول آخر جاننے والے مڈل کلاس خاندان کے لیے ہمیشہ کے واسطے مر چکی تھی اور پولیس کے ہاں بھی نوید کے قتل کے الزام میں گرفتاری کے بعد مفرور ہو چکی مگر پھر بھی بدن کو کسی اصیل مرد سے رگیدے جانے کی خواہش کے باوجود کسی بھی نوعیت کی بدن فروشی کے خلاف آخری حد تک مزاحمت کے لیے تیار تھی۔ مگر حیران تھی کہ گھر میں پراسرار چہل پہل کے ہوتے ہوئے بھی کلثوم نے ابھی تک اُسے ایسا کچھ بھی کرنے کو نہیں کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ماہین کی یہ حیرت پریشانی میں منقلب ہوتی ایک دوپہر اُسے بھی اپنا منہ متھا ٹھیک کرنے کو کہا گیا اس خبر کے ساتھ کہ مقامی تھانے کا حوالدار مقبول بھٹی کھانے کی دعوت پر اُن کے ہاں آ رہا تھا جو پلس برادری میں کسی لحاظ سے بھی کالے سے کم بدنام نہیں تھا۔ کافی دنوں کے بعد خوشی کلثوم کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی کہ مقبول بھٹی جیسا دبنگ اور دور دور تک اپنا اثر رسوخ رکھنے والا حوالدار ایک لمبی چوڑی منتھلی اور کئی دیگر شرائط کے ساتھ کلثوم کے قحبہ

خانے کی سرپرستی اور تحفظ کے لیے رضا مند ہو گیا تھا۔

ماہین کے لیے بھی یہ خبر اطمینان کے کئی زاویے لیے ہوئے تھی۔ اِس کا سب سے اہم پہلو تو یہ تھا ایک ایسا مرد پولیس والا وہاں آ رہا تھا جس نے دی گئی ''دعوت'' میں خریدے ہوئے بدن کی بجائے ''پیش'' کیا ہوا بدن تصرف میں لانا تھا لہٰذا ماہین مطمئن تھی کہ اگر اُسے حوالدار مقبول بھٹی کو پیش بھی کیا جاتا ہے تو یہ جسم فروشی نہیں ہو گی۔ وہ اِس پہلو پر بھی سوچ رہی تھی کہ اگر مقبول بھٹی جسمانی لحاظ سے واقعی کالے کا متبادل ہے تو وہ اَب اُسے کسی اور کے پاس جانے جوگا رکھے گی بھی نہیں اور جتنا جلدی ممکن ہو سکا وہ کلثوم کی ہر چال ناکام بنا کر وہاں سے نکلنے کی پوری پوری کوشش کرے گی۔ لیکن اِس سے پہلے کہ حوالدار مقبول بھٹی وہاں آتا، کلثوم نے چھ سات دیہاڑی دار لڑکیاں بھی مزید رونق کے لیے وہاں بلا لیں جو پہلے بھی اُس کے اڈے سے سپلائی ہوتی رہتی تھیں۔ اِن میں سے دو تین تو بلاشبہ ماہین سے زیادہ خوبصورت اور کمال نسوانی خدوخال رکھتی تھیں۔ کلثوم نے اُنہیں ماہین کے سامنے خوب بننے سنورنے کی تاکید کی اور واضح کر دیا کہ مقبول بھٹی کیسا ہے اور اُسے کس درجہ تک خوش کرنا ہے کہ وہ اُن کا گرویدہ ہو کر رہ جائے۔ اُن لڑکیوں کو ہدایات دیتے ہوئے وہ کنکھیوں سے مسلسل ماہین کو دیکھے جا رہی تھی۔ ماہین نے اُن کی طرف پشت کر لی اور یوں تاثر دیا کہ جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں لیکن دوسری جانب منہ پھیرتے ہوئے وہ کلثوم کے چلتروں پر مسکرائی ضرور کہ کیسے اُسے اپنی اوقات میں رکھنے کی سازش کی جا رہی تھی لیکن پھر بھی اُسے حیرت تھی کہ مقبول بھٹی قسم کے مردوں کی جنسی نفسیات کو جتنا اُس نے چند دنوں میں جان لیا تھا کلثوم تو برسوں بعد بھی اُس کا عشرِ عشیر نہیں سمجھ پائی تھی۔ اگر اُس میں ککھ برابر بھی عقل ہوتی تو وہ جان لیتی کہ حوالدار مقبول بھٹی کو پچھاڑنے کے واسطے ماہین کو اپنا چہرہ مقابلے میں لانے کی کیا ضرورت تھی، اُس کا منہ یوں دوسری سمت پھیر کر کھڑا ہونا ہی کافی تھا۔

ماہین نے کلثوم کی ہدایات کے بعد اُن لڑکیوں کو اُلٹی سیدھی لیپا پوتی کرتے دیکھا تو خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ کپڑے تو اُس نے پہلے بدل لیے تھے اور چہرہ بھی دھلا دھلا سا تھا لہٰذا پولیس کے ایک میٹرک پاس نسوار خور حوالدار کی خوشنودی کے واسطے اپنے آپ کو جاہل

لڑکیوں کے ساتھ تقابل کے عذاب میں ڈالنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ جاہل، میٹرک پاس اور تقابل جیسے الفاظ اُس کے ذہن میں اُبھرے تو اُس کی سوچ کا دھارا بدلنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ صرف چند دن پہلے وہ شہر کی ایک بڑی یونیورسٹی میں ایم فِل کیمسٹری کی ایک ذہین طالبہ تھی کہ جس کے چادر میں لپٹے ہوئے بدن کی ایک جھلک دیکھنے کے واسطے کتنے ہی وجیہہ یونیورسٹی فیلوز چادر کا پلو پھسلنے کی تاک میں رہتے اور محض چند دن کے بعد اب یہ عالم ہے کہ طیفے اور کالے جیسے جاہلوں کا پامال کیا ہوا وہی جسم ایک اور اُجڈ اور گنوار کا التفات پانے کے لیے دیگر جاہل جسموں کے ساتھ قطار میں کھڑا ہوا ہے۔

آخر کیا ہے یہ سب کچھ!! کیسی بھاگم بھاگ ہے یہاں کہ ہر درجے کے مرد حاکم کے دربار میں علم اور ذہانت کوڑے دان میں اور محض نسوانی بدن ہی خلعتِ تفاخر کے حق دار قرار پاتے ہیں۔ اور یہی معاملہ معکوس صورت میں بھی درپیش کہ جہاں حاکمِ وقت کا ''حرم'' جسمانی راحت و تلذذ کے واسطے اُسی حاکم کے بدبودار غلاموں کے روبرو ران کشادہ اور سربسجود۔ تمام تر ذہنی اور جسمانی اضافتوں کے ہوتے ہوئے بھی ماہین چکرا کر رہ گئی۔ بدن اپنی تسکین پانے کے عمل میں کس قدر خود غرض، بے رحم اور بلاخیز واقع ہوئے ہیں کہ اپنے گھڑی پل کے کھیل کے لیے اذہان کی عمر بھر کی مشقت، جستجو اور کاوشوں کو بے توقیر کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ذہن تہذیب، پندار، خاندان اور سماج جیسے اداروں کی پرداخت کرتے ہیں مگر جسم ایک ہی ساعت میں وحشت، بربریت اور طاقت کے طلسم کو ان کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ ذہن کائنات کی بقا کی جستجو کا دعویدار اور جسم نسل انسانی کے تسلسل کا علم بردار۔ ذہن کو اپنی سربلندی کے واسطے ایک جسم ایک گردن کی ضرورت مگر جسم کو لذائذ نفسانی کی بلا تعطل دستیابی کے لیے کھوپڑی میں صرف دماغ کی موجودگی چاہیے، ذہن اور عقل کی نہیں۔ اِسی لیے انسانی زندگی میں عقل کبھی بھی مستقل بنیادوں پر مقدم حیثیت کا حامل نہ ہو سکا۔ ہاں مگر جوں جوں انسان تہذیبی اور سائنسی ترقی کی جانب بڑھا، اُس نے نفس اور ذہن، دونوں کو ٹھگانے کی اٹکل سیکھ لی۔ یہ اٹکل تھی نفس اور ذہن کو حسبِ ضرورت سوئچ آن اور سوئچ آف کرنے کی۔ لیکن اِس کے واسطے انسان نے اُن تمام قوائد اور ضابطوں کو پس پشت ڈالنا بھی سیکھ لیا کہ جو صدیوں سے مختلف حوالوں کی بنیاد پر

اُس پرلاگو چلے آرہے تھے۔اب وہ جب چاہتا تسکینِ نفس کے لیے جسم کو مقدم کر لیتا اور جب عقلی معاملات کی کھوج کاری کرنا ہوتی تو جسم کا سوئچ آف کر کے ذہن کو مقدم کرنے لگا۔

ماہین کو بھی لمحہ موجود میں دونوں کی طلب اِس طرح جاگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ تسکینِ نفسانی بھی ہو اور عقل بھی مقدم رہے لیکن یہ دونوں میں سے کسی ایک کا سوئچ آف کیے بِنا ممکن نہیں تھا۔اب تک کے حالات میں وہ اپنے وجود میں طغیانی کی مانند فراواں خواہش نفسانی کو ہی مقدم رکھتی چلی آ رہی تھی کہ جہاں عقل نام کی کوئی چیز اُس کے قربِ بعید میں بھی پائی جانی ممکن نہیں تھی۔طیفے اور کالے جیسے انسان نما جانوروں کی نفسانی وحشت کو جسمانی تلذذ میں منقلب کرتے ہوئے اُسے کبھی یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ نوعمری کے اولین پائیدانوں پر ہوتے ہوئے کسی یونیورسٹی میں ایم فِل کی طالبہ بھی رہی ہے۔لیکن اَب بھی، اگر اِس پس منظر کے ہوتے ہوئے بھی وہ کلثوم اور اُس کی کماؤ لڑکیوں کی سطح پر نہیں آنا چاہتی تھی یا اُن کے درمیان اپنا شمار نہیں چاہتی تھی تو ایسا سوچنا بھی محض خام خیالی کے مترادف تھا۔

حوالدار مقبول بھٹی دوپہر کا کہہ کر کہیں رات کے دس بجے وہاں پہنچا۔کلثوم نے بھی استقبال کا بندوبست خوب کر رکھا تھا۔گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہاں موجود تمام لڑکیوں کو دو رویا کھڑا کر کے اُس پر گل پاشی کرائی گئی۔مگر ماہین اُن چار لڑکیوں میں شامل تھی جنہوں نے مقبول بھٹی کے صوفے پر بیٹھنے کے بعد اُس کے گلے میں سوسو روپے کے کرنسی نوٹوں سے مزین ہار ڈالے تھے۔کلثوم کی توقع کے مطابق حوالدار مقبول بھٹی کی باچھیں مختلف سمتوں میں کھل سی گئی تھیں۔حوالدار لمبے قد بُت کا تنومند مگر چہرے سے کرخت دکھائی دینے والا مرد تھا جس کی عمر پینتیس سے چالیس برس کے درمیان رہی ہوگی۔اُس کے لمبے ہاتھ پاؤں اور کھنچے ہوئے جبڑے اُس قیاس کی تصدیق کر رہے تھے کہ اپنے رویوں میں وہ اگر کالے کا ہمسر نہیں تو قریب قریب ضرور رہا ہوگا۔عجیب بات یہ بھی تھی کہ یہاں آنے کے بعد وہ کوئی بات کرنے کی بجائے مسلسل مسکرائے چلا جا رہا تھا۔صوفے پر بٹھانے کے بعد کلثوم ایک ادائے دلربائی سے اُس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہوگئی جب کہ لڑکیوں نے کلثوم کے اشارے پر اُس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔شراب پیش کرنے کی ڈیوٹی پہلے ماہین کی لگائی گئی تھی لیکن عین موقع پر ایک

اور لڑکی کو آگے کر دیا گیا جس کا لباس زرق برق اور چہرے پر لیپا پوتی دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

ابھی محفل جمنے کو تھی کہ ایک نوجوان سپاہی ہاتھ میں وائرلیس پکڑے دھڑ دھڑ کرتا ہوا اندر داخل ہوا اور نہایت سخت روی سے لڑکیوں کے جمگھٹے کو ایک طرف ہٹا کر مقبول بھٹی کی طرف بڑھا اور وائرلیس اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔حوالدار نے آنکھ کے اشارے استفسار کیا تو اُس نے ہر ممکن آہستگی سے سرگوشی کی کہ ایس ایچ او صاحب۔لیکن یہ سرگوشی بھی اتنی گھمبیر مردانہ آواز میں تھی کہ ہر طرف پھیل گئی۔لڑکیوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اُس چوبیس پچیس برس کے رنگروٹ کی طرف جس کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی ملہار اور گہری سانولی رنگت پر سیاہ گھنی مونچھیں وہاں موجود ہر لڑکی کو اُسی کی طرف دیکھنے پر اُکسا رہی تھیں۔وائرلیس ہاتھ میں لیتے ہی حوالدار صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن جیسے ہی اُس نے ایس ایچ اُو سے بات کرنے کے لیے منہ کھولا ہر کوئی دم بخود رہ گیا۔یا خدا اتنی باریک اور بچوں جیسی آواز جو کسی طور بھی اُس کے جثّے سے لگا نہیں کھاتی تھی۔لڑکیوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔اُن کا جی چاہ رہا تھا کہ قدرت کے اِس مخول پر وہ کھل کر ہنسیں مگر صورت حال کی نزاکت کے پیشِ نظر اُن کے ہونٹ تو ساکت تھے مگر آنکھیں قہقہے لگا رہی تھیں۔ایسے میں ماہین سے چپ نہ رہا گیا اور وہ منہ دبائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کے باوجود کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ایس ایچ اُو سے مہربانی مہربانی کے انداز میں خوشامدانہ باتیں کرتے ہوئے حوالدار مقبول بھٹی کی باچھیں ایک دم اندر کو سکڑیں اور اُس نے گھور کر ماہین کی طرف دیکھا مگر ماہین کے چہرے پر نہ تو خجالت تھی اور نہ ہی کوئی خوف، بس آنکھوں میں ابھی تک ایک شریر سی مسکراہٹ جب کہ کلثوم سمیت سبھی لڑکیاں سانس روکے سہم کر ایک طرف ہو گئیں۔نجانے مست آنکھوں والے رنگروٹ کے دل میں کیا آئی، وہ آگے بڑھا اور ماہین کو سر کے پچھلی جانب کے بالوں سے پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا اور پورے زور سے دو چانٹے جڑ دیے۔یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ بہت سُوں کو تو خبر ہی نہ ہوئی کہ ہوا کیا ہے۔خود ماہین اس طرح سکتے کی سی کیفیت میں تھی کہ جہاں تکلیف اور ذلت دونوں اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ایسے میں

معاملے کو دبانے کے لیے کلثوم بھی آگے بڑھی اور ماہین کا بازو مروڑ کر اُس کی تواضع ہتھڑوں سے کرنا چاہ رہی تھی کہ حوالدار مقبول بھٹی نے وائرلیس بند کرتے ہوئے اُسے ایک طرف دھکیل دیا۔

''نہ مارو اِس بے چاری کو خوشی کے موقع پر ___ میں تھانے کا محرر لگ گیا ہوں۔ چل چل تو پیچھے ہو جا۔'' حوالدار بھٹی نے ماہین کو عقبی سمت دھکیلنے کے بعد اپنی خوشی کو نمایاں کرنے کی کوشش کی تو اُس کی باچھیں پھر سے مخالف سمتوں میں چر سی گئیں۔ ایک بار پھر ''مبارک ___ ''مبارک'' کا شور اُٹھا۔ کلثوم نے اندر رکھی ہوئی باقی ماندہ گلاب کے پھولوں کی پتیاں اُٹھوا لیں اور پھر سے حوالدار مقبول بھٹی پر گل پاشی ہونے لگی۔ اُچھلتی کودتی لڑکیوں کے پیچھے ساکت کھڑی ہوئی ماہین کو سپاہی کے چانٹے کھانے کے بعد پہلا احساس منہ میں نمک کے گھلنے کا تھا۔ اُس نے دائیں ہاتھ کی دونوں اُنگلیوں کو ہونٹوں پر پھیر کر دیکھا تو وہ خون آلود تھیں۔ اُس کی زبان شاید اندر سے کٹ گئی تھی۔ ماہین نے بے تاثر سی آنکھوں کے ساتھ مست آنکھوں والے سانولے سپاہی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی شاید اُسی کی طرف دیکھنے کے لیے نگاہیں اُٹھا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ملہار کی جگہ اب غصے کی لال لکیریں تھیں لیکن اس کے باوجود وہ ماہین کی بے تاثر آنکھوں کی جانب زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔

حوالدار مقبول بھٹی تھانے کا محرر کیا تعینات ہوا، خوشی اُس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ ایس ایچ اُو کے بعد تھانے کی سب سے اہم پوسٹ پر تعینات ہو کر اُسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کائنات اُس کے روبرو سرنگوں ہو چکی ہو۔ ایک تھانے کی اقلیم کا میر منشی ہو کر اُسے اپنے تھانے کی حدود میں رہنے والی تمام مخلوق رعیت کی مانند دکھائی دینے لگی تھی کہ جن کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی عرضیاں تو اُس کے رحم و کرم پر ہوئیں سو ہوئیں، اُن کے تمامی بنیادی حقوق بھی اُسی کی قلمرو میں سسکتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ کلثوم کے کوٹھی خانے پر اُس کی آمد خوش بختی کا پیغام لے کر آئی تو اُس نے بھی محفل کا حظ اُٹھانے میں کسر نہ چھوڑی۔ شراب کی فراوانی اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بنی ٹھنی کم عمر لڑکیوں کی یلغار نے اُسے دیوانہ کر دیا۔ دیوانگی سے بھرپور انبساط کے اِن لمحات میں اُس نے ملہار آنکھوں والے اپنے جی دار گن مین ڈرائیور کانسٹیبل

ذیشان کو بھی شامل کر رکھا تھا لیکن کائیاں طبع ذیشان جان بوجھ کر لڑکیوں کے جھرمٹ میں ہوتے ہوئے بھی محتاط تھا۔ وہ تو جانتا تھا کہ کلثوم کی ڈھکی چھپی گھوریوں کے باوجود تقریباً سبھی لڑکیاں فطری طور کسی نہ کسی بہانے اُسی سے قربت کی خواہاں تھیں لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں اُن کی یہ حرکت اگر حوالدار مقبول بھٹی نے سونگھ بھی لی تو ذیشان کی نوکری کی خیر نہیں۔ کون اَفسر برداشت کرتا ہے کہ اُس کا ماتحت اُس کی موجودگی میں حسیناؤں کا منظورِ نظر ٹھہرے۔ یہ تو سیدھی سادھی قابل گردن زدنی صورتحال تھی اور اِس سے بچ نکلنا دو دھاری تلوار پر ننگے پاؤں چلنا۔

لیکن یہ صورتحال زیادہ دیر باقی نہ رہی۔ حوالدار مقبول بھٹی نے کم سن حسیناؤں کے ہاتھوں اتنی پی لی کہ وہیں صوفے پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں بند ہوتے ہی کلثوم نے بھی لڑکیوں کو گھور گھور دیکھنا بند کیا اور خود بھی ذیشان کی جانب مسکرا کر دیکھنے لگی۔ یہ اشارہ تھا کہ جانِ محفل اب وہی اور محفل اب اُسی کے احکامات کے تحت چلے گی۔ اپنے اردگرد منڈلاتی لڑکیوں میں سے ایک کو اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اُسے ادارک تھا کہ حوالدار کسی وقت بھی ہوش میں آ گیا تو کم از کم اِس نشست میں اُس کی حد تک سب کچھ یہیں دھرا رہ جائے گا سو اُس نے لڑکی کے قریب آتے ہی تخلیے کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کلثوم ایسے میں بھلا بے خبر کیسی رہتی، وہ اپنے ہونٹ ذیشان کے کان کے قریب لا کر بولی۔ ''بن داس ہو کر سامنے والے کمرے میں چلے جاؤ، تمہارے افسر کو میں نے جاگنے یا بھاگنے نہیں دینا۔''

''اتنی مہربان ہو! ___ '' ذیشان نے کلثوم کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''تو یہ بتاؤ کون سی لڑکی میں ہمت ہے دس مردوں کا بوجھ اُٹھانے کی؟''

''چُن تو لیا ہے پہلے اسے ___ مان گئی سوہنے کے ساتھ ساتھ سیانے بھی ہو۔'' کلثوم نے اُس لڑکی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جسے ذیشان اپنے قریب بلا چکا تھا۔ ذیشان نے دایاں بازو لڑکی کی کمر میں ڈالا اور اُس کے کان میں کچھ کہتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دور برآمدے میں کھڑی ہوئی ماہین پلک جھپکنے ہی میں وہاں پہنچی، ذیشان کا بازو لڑکی کی کمر سے

نکالا اور ہکا بکا ہو چکے ذیشان کے سامنے سر اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

''کس نے کہہ دیا کہ عورت کے چہرے پر تھپڑ مارنا مردانگی ہوتی ہے ___ مردانگی بستر پر ثابت کرنا ہوتی ہے ___ مرد ہو تو اِس کو چھوڑ و اور میرے ساتھ چلو ___ یہ دس بیس پچاس والی گنتی نہ بھلا دوں تو میرے منہ پر تھوک دینا۔'' ماہین کی آنکھیں میں اُمڈی ہوئی وحشت اور ٹپکتا ہوا یقین دیکھ کر ذیشان مسمرائیز ہو کر رہ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اُسے کیا کہے اور کیا کرے۔ لیکن ماہین یہیں تک نہ رہی، اُس نے ذیشان کو کلائی سے پکڑا اور کلثوم سمیت سبھی لڑکیوں کو حیرت اور حسد میں مبتلا چھوڑتے ہوئے اُسے سامنے والے کمرے کی بجائے اپنے کمرے کی جانب لے گئی جو سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں واقع تھا۔ ہونقوں کی طرح اُس کے ساتھ جاتا ہوا ذیشان ابھی تک جان نہیں پایا تھا کہ ایک پھول ایسی نوعمر لڑکی کی گرفت اِس قدر آہنی بھی ہو سکتی ہے کہ اُس جیسے تگڑے مرد کے لیے جنبش کرنا تک ممکنات میں نہ رہے۔ وہ تو کچھ دیر پہلے چانٹے کھانے والی اِس لڑکی کی جرات پر حیران تھا کہ اِس عمر میں جب لڑکیاں کسی کے چھو لینے سے ہی چھوئی موئی ہو جاتی ہیں، اُس نے اُدھار چکانے کے واسطے توقف بھی نہیں کیا بلکہ اُسی کے سے انداز میں سب کے سامنے اُس کی مردانگی کا ثبوت مانگ کر ششدر ہی نہیں کیا ___ لرزا دیا۔

ذیشان کو یوں لگا کہ مردانگی شاید عورت کے خوف سے جنم لیتی ہے اور عورت کی جرات آزمائی پر دم توڑ دیتی ہے۔ اُدھر ماہین ذیشان کی سوچ سے قطعی لاتعلق، کمرے میں جاتے جاتے عجیب سے انداز میں کلثوم کو بھی چتاونی دیتی گئی کہ جب تک اُس کے کمرے کا دروازہ نہ کھلے، چھڑ حوالدار کو ہوش نہیں آنا چاہیے۔ کلثوم کو ماہین کے تحکمانہ لب و لہجے پر حیرت نہیں ہو رہی تھی، تبھی تو وہ خاموش رہی۔ وہ دونوں ہی جان چکی تھیں کہ لمحۂ موجود میں طاقت کا سرچشمہ کہاں واقع ہے۔

۞

﴿ ۲۷ ﴾

زفیرہ اگلے روز صبح سویرے ہی اپنے فارم ہاؤس سے نکل آئی کہ اُس کا سینئر ڈرائیور بن بلائے اُس کے فارم ہاؤس پر پہنچا ہوا تھا۔ مارگلہ کی پہاڑیوں سے بار بار چکرا کر تنگ موڑ کاٹتے ہوئے نیم عمودی ڈھلوان سے نیچے اُترنا اُسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ جب کہ پہاڑ ہوں یا میدان، ڈرائیونگ کے دوران ڈرائیور تو ویسے بھی عموماً خاموش رہا کرتا تھا مگر آج اُس کی خاموشی زفیرہ احمد کو بہت کھل رہی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ انٹرنیٹ پر اُس کی بلیو موویز دیکھنے کے بعد وہ جان بوجھ کر اُس سے بات کرنے کا روادار نہیں رہا۔ ایک آدھ بار اُس نے عقبی آئینے میں پیچھے کی طرف دیکھا تو زفیرہ نے غیر اضطراری طور اپنا بدن اِس طرح سمیٹا کہ جیسے وہ بستر پر برہنہ بکھری ہوئی ہو مگر اگلے ہی لمحے ڈرائیور کے آنکھیں پھیر لینے نے اُسے باور کرایا کہ ہو سکتا ہے اُس نے اب تک کچھ بھی نہ دیکھا ہو۔

سپر مارکیٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے اُسے ناشتے کا خیال آیا مگر اُس کا پسندیدہ ریستوران ابھی بند تھا۔ اُس نے گھڑی دیکھی تو ابھی سوا سات ہوئے تھے جب کہ اُس کی کمپنی کے سبھی دفاتر صبح دس بجے سے پہلے نہیں جاگتے تھے۔ اُس کا دل چاہا کہ کراچی کمپنی مارکیٹ میں جا کر کسی ڈھابے سے نان چنے کا ناشتہ کرنے کے بعد بالائی ڈالی ہوئی گرم ترین کڑک چائے پی جائے۔ زفیرہ احمد نے ڈرائیور سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اُس نے کراچی کمپنی کی بجائے آبپارہ مارکیٹ جانا بہتر جانا اور یوں آبپارہ مارکیٹ کی عقبی سڑک پر ایک ڈھابہ دکھائی دے ہی گیا کہ جہاں نان چنے کے ساتھ ساتھ گرم حلوہ اور پوریاں بھی تیار کی جا رہی تھیں۔ جب کہ

اُس سے ملحقہ چائے کی دوکان پر چائے بنانے والا لڑکا پتیلی میں مگا ڈال کر بار بار کھولتی ہوئی چائے کی دھار کو اپنے سر سے بھی خاصا بلند لے جاتا اور پھر ایک اندازِ ماہرانہ سے اُسے واپس پتیلی میں اِس طرح لے آتا کہ چولہے میں جلتی آگ کی حدت پکتی ہوئی چائے کے ایک ایک قطرے میں سموتی چلی جا رہی تھی۔

چائے کو یوں حدت کے انتہائی درجے پر کھولتا دیکھ کر زفیرہ احمد کو اپنی کل شب کی وہ کیفیت یاد آ گئی کہ جس کا سامنا اُسے اپنے ڈائریکٹر ہیومن ریسورس یزدانی ملک کے مستعفی ہونے کی خبر کے بعد جذباتی لحاظ سے کرنا پڑا تھا۔ حالانکہ اُس کا فون سننے سے پہلے بڑی مشکل سے اُس نے اپنے آپ کو جذباتی لحاظ سے مجتمع کیا ہوا تھا مگر اپنے قابل اعتماد ملازم کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ نے اُسے پھر سے دانہ دانہ بکھیر دیا تھا۔ لیکن یہاں پھر اُس کے نظامِ اعصاب کی ڈھٹائی کام آئی اور کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کرنے سے پہلے ہی اُس نے اپنے آپ کو جوڑنا شروع کر دیا۔ اِس کے ساتھ ہی اُس کی مقابلے سے پہلے ہارے ہوئے ہونے کی منفی حساسیت ماند پڑنے لگی اور رات بھر کے جگراتے کے باوجود وہ صبح صبح اپنے فارم ہاؤس کے اُس کمرے سے باہر نکل آئی کہ جس میں کئی روز سے خود ساختہ قید میں چلی آ رہی تھی۔

یوں عام لوگوں کے بازار میں عام لوگوں کی مانند، عام سے ڈھابے سے، عام سا کھانا کھانے کی خواہش نے اُسے تازہ دم کر دیا تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ گاڑی سے نکل کر سڑک کنارے رکھی ہوئی لکڑی کی میلی کچیلی بینچ پر جا بیٹھے یا اُن پانچ چھ چوبی کرسیوں میں سے کسی ایک پر کہ جو نان چنے اور چائے والے ڈھابوں کے بیچوں بیچ دھری ہوئی تھیں مگر زفیرہ کی خواہش اِس لیے پوری ہونا ممکن نہیں تھی کہ گاہکوں کے اژدھام نے کھڑے ہونے کو جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن اتنے رش اور اس قدر اژدھام کے باوجود کس قدر سکون اور کتنی بے فکری تھی اِس طرزِ حیات میں کہ جو بچپن سے آج کے دن تک کبھی اُس کے نصیب کا حصہ نہیں رہی تھی۔ زفیرہ احمد نے ماضی میں جھانک کر دیکھا تو رکھ رکھاؤ کے نام پر تصنع اور بناوٹ نے پوری زندگی کو کھونٹی پر لٹکائے رکھا تھا۔ جب کہ عوام کہلائی جانے والی اِس مخلوق نے چنے کی ایک پلیٹ اور گرما گرم نان کی جستجو میں ہر شے تیاگ دینے کے باوجود بے فکری کا دامن ہاتھ

سے جانے نہیں دیا تھا۔ ضروریاتِ زندگی کی کم سے کم درجہ فراہمی کے واسطے حد درجہ جدوجہد کا مظاہرہ دیکھنے کے بعد زفیرہ کو اپنے دفتری اور کاروباری معاملات ہیچ دکھائی دینے لگے تھے۔ کیا ہو گیا اگر مبشر رضا لاپتہ ہو گیا تھا؟ بس کچھ کنٹریکٹ ختم ہو جاتے!! کچھ کروڑ کا نقصان ہو جاتا!! اور کیا ہو جاتا؟ یہ کروڑ بلکہ کئی کروڑ کمائے بھی تو یہیں سے تھے اِس واسطے اگر اُن کا عشرِ عشیر یہیں ڈوب جاتا تو اُس خجالت اور بربادی سے کہیں افضل قرار پاتا کہ جس کا سامنا اُسے اب کرنا پڑ رہا تھا۔ بُری سے بُری صورتحال میں اگر مالی لحاظ سے کچھ بھی نہ بچ رہتا تو پھر بھی کچھ خسارہ نہ تھا۔ کم از کم اُس ذہنی اذیت سے تو نہ گزرنا پڑتا کہ جو انٹرنیٹ پر اَپ لوڈ کر دی گئی موویز کی صورت میں اب ایک دنیا کی بصری دسترس میں تھیں۔

استعمال شدہ اخبارات کے ٹکڑوں پر رکھی گرما گرم پوری اور ایک چھوٹی رکابی میں اچاری چنوں کی بھاجی کے ساتھ ساتھ ایک چمچ سوجی حلوے کی سپلی نے زفیرہ احمد کے ناشتے کو ناشتہ نہ رہنے دیا بلکہ چٹخارے کا ایک ایسا فلی لوڈڈ پیکج بنا دیا کہ جسے دیکھتے ہی بھوک سمیت اُس کی سبھی پژمردہ ہو چکی حسیات میں جان پڑنے لگی تھی۔ تھالی کو چونکہ گاڑی میں سجا رکھنے کو کوئی جگہ نہیں تھی اِس لیے زفیرہ احمد کو خود ہی اُسے تھامنا پڑا۔ چنے پوری کے بعد میٹھے حلوے کے ایک نوالے نے جتنا مزہ دیا اُس سے کہیں بڑھ کر اُس کڑک چائے کے پہلے گھونٹ کا سواد تھا کہ جس کے ساتھ ہی پیالی میں چائے کے اوپر تیر رہی بالائی کی موٹی تہہ کی آدھی مقدار بھی پیالی سے سلپ ہو کر زفیرہ احمد کی زبان پر پھیل چکی تھی۔ کرشمہ تو تب ہوا کہ جب چائے نے ختم ہوتے ہوتے زفیرہ کو اِس قدر بشاش کر دیا کہ اُسے اب وہاں اپنا کچھ دیر اور رکنا مشکل ہو رہا تھا۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے بدمزہ ناشتے سے حد درجہ بہتر ناشتہ اُس سے بیس گنا کم قیمت میں کرنے کے بعد زفیرہ کو زندگی میں رائیگانی کا احساس شدت سے ستانے لگا تھا۔

''کاش میں نے زندگی کو سہل رہنے دیا ہوتا، اُسے اُس کے فطری بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہنے کے لیے۔'' ڈرائیور کو دفتر چلنے کا کہہ کر وہ پھر اُنہی خیالات میں کھو گئی۔

''زندگی کو جب بھی ہم مشکل بناتے اور مشکلات کے جوکھم میں ڈالتے ہیں تو اِس کے ردِعمل میں وہ بھی ہمیں مشکلات کے بھنور میں صرف پٹخنیاں نہیں دیتی بلکہ چکی میں ڈالی گئی

گیہوں کی مانند پَل پَل پِستی چلی جاتی ہے ___ کہیں اس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو والا معاملہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کرنا تو انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے ___ آسان سے آسان تر بناؤ اُسے، خوش رکھو، پیار کرو، مستیاں کرو اُس سے ___ جھولنا جھولو ایک ساتھ، رقص کرو، گھومو پھرو، کھیلو کودو، کوئی بھی گُنجل ڈالے بغیر، کوئی بھی کچوکا دیے بِنا، پورے فطری میلان اور فطری تقاضوں کے ساتھ۔"

زفیرہ احمد نے بھاگتی ہوئی گاڑی کے باہر تیزی سے دوڑتے ہوئے مناظر پر نگاہ ڈالی جن کی رفتار محض نگاہ کا زاویہ بدلنے سے ایک دم آہستہ ہو جاتی تھی۔ سامنے کے شیشے کے باہر کی دنیا پاؤں پاؤں چلتی ہوئی اور عقبی سیٹ کے شیشوں کے باہر ایک اور دنیا، سرپٹ دوڑتی ہوئی۔ زفیرہ احمد کو یوں لگا کہ اُس نے اپنے اطراف کو زندگی بھر شاید گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر پچھلے دروازوں کے شیشوں سے باہر جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک سرد آہ نے بے اختیار اُس کے سینے باہر نکلنا چاہا مگر وہ کہیں سینے ہی میں رہ گئی۔

"کاش اُلجھی ہوئی زندگی کو سلجھانے کا کوئی مکینزم ہوتا!! کوئی ہم سفر؟" ___

"ہم سفر؟؟ زندگی کا کون ہم سفر ہو سکتا ہے زندگی کے سوا ___ زندگی جس جسم کے ساتھ جنم لیتی ہے، وہی اُس کا محرم، وہی اُس کا ہم سفر، ایسا ہم سفر کہ جو خود مر کر زندگی کے تسلسل کو امر کر جاتا ہے ___ باقی سبھی تو اِس سفر میں ملتے اور بچھڑتے چلے جاتے ہیں ___ یہی تو ہیں جو ہم سفری کے نام پر زندگی سے کھلواڑ کرتے اور اُسے گنجلک کرتے چلے جاتے ہیں۔

خلافِ توقع گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی تو زفیرہ احمد کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اِس قدر ہموار طریقے سے گاڑی چلانے والے ڈرائیور کو کیا ہوا۔ ابھی کچھ پوچھنے کے لیے وہ لب کھولا ہی چاہتی تھی کہ اپنے کارپوریٹ دفتر کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ زفیرہ احمد کے ذہن میں آنے والا پہلا خیال ہی یہی تھا کہ یہ لوگ اُس پر حملہ کرنے کے لیے اُس کے آنے کے منتظر تھے۔ اُس نے ڈرائیور کو فوراً گاڑی موڑنے کو کہا تا کہ جان بچنے کی تدبیر ہو سکے مگر ڈرائیور پرسکون رہا۔ اُس نے گاڑی آگے بڑھائی تو زفیرہ احمد چیخ پڑی مگر ہجوم میں سے ہر شخص نے گاڑی کی طرف بڑھنے کی بجائے منہ مخالف سمت میں پھیر لیے۔ اُن کے

چہروں پر گاڑی میں بیٹھی ہوئی عورت کے لیے نفرت ہی نفرت تھی، شدید نفرت۔ لیکن گاڑی میں بیٹھی ہوئی عورت پھر بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی، بس چیخے جا رہی تھی ___ کون ہیں یہ لوگ؟ کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟

"آپ گھبرائیے مت ___ یہ کل تک آپ کے ملازم تھے مگر آج استعفیٰ دینے کے بعد اپنے بقایا جات کی وصولی کے لیے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" ڈرائیور کا لہجہ مودب ضرور تھا لیکن اُس میں آیا ہوا بدلاؤ صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" ___ زفیرہ کی حواس باختگی اب حیرت میں بدل چکی تھی۔

"میڈم! میں آپ کے ساتھ نہیں، اُن کے ساتھ ہوں۔" ڈرائیور نے بے اعتنائی سے ہجوم کی طرف گردن کی جنبش سے اشارہ کیا۔ "استعفیٰ تو میں بھی دے چکا ہوں لیکن بقایا جات کی وصولی کے لیے آپ کو اِدھر لانا ضروری تھا۔"

"مگر کیوں ___؟" زفیرہ احمد پھر چلانے پر آ گئی تھی۔

"بھرم رہنے دیجئے میڈم ___ آپ کو شرم آئے نہ آئے لیکن ہم لوگ بہت شرمسار ہیں، دنیا جہان سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔" ڈرائیور نے گاڑی ہجوم کے ایک جانب سے نکال کر مہ نور ایڈورٹائزنگ کے دفتر کے پورچ میں پارک کی اور خود باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تو اب شاید زفیرہ احمد کی جانب دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن خود زفیرہ احمد بھی سکتے کی سی کیفیت میں جا چکی تھی۔ کافی دیر تک جب وہ گاڑی سے باہر نہ نکلی تو بے تاب ہجوم سے کچھ لوگوں نے کار کے شیشوں کو اُلٹی مگر ٹیڑھی انگلیوں سے بجانا شروع کر دیا۔ ساکت حالت میں بیٹھی ہوئی زفیرہ احمد نے اتنے سارے لوگوں کو کار کے گرد جمع ہوتے دیکھا تو ایکدم گھبرا گئی۔ شاید اُس کا خیال رہا ہو کہ گاڑی رکنے کے بعد ڈرائیور حسب معمول بھاگم بھاگ نیچے اُتر کر اُس کے لیے دروازہ کھولے گا لیکن یہاں تو صورتحال قطعی اُس کے برعکس تھی جس کا ادراک ہوتے ہی وہ دروازہ کھول کر تیزی سے نیچے اتری اور آفس کی مین بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔

مہ نور ایڈورٹائزر کے کارپوریٹ آفس کے داخلی دروازے سے چیف ایگزیکٹو کے دفتر تک زفیرہ احمد کو کوئی بھی انسان دکھائی نہیں دیا۔ نہ تو کمپنی کا کوئی ملازم اور نہ ہی کوئی وزیٹر۔ صبح

سے رات گئے تک اپنی کاروباری ہماہمی سے پہچانا جانے والا دفتر ایک ایسے ویرانے کا ماحول پیش کر رہا تھا کہ جسے دیکھ کر ہی گھبراہٹ ہونے لگی تھی لیکن اس کے باوجود زفیرہ احمد نے اپنی چال ڈھال، اپنے رویے اور چہرے کے تاثرات سے اپنے آپ کو مضطرب یا بکھرا ہوا ہونے کی بجائے مجتمع ظاہر کیا۔ محض چند لمحے پہلے چیختی چلاتی اور خوفزدہ عورت کی جگہ ایک بے حس، بے رحم اور بے خوف عورت نے لے لی تھی۔ کاروباری ہنرمندی میں یکتا ایک ایسی عورت کہ جس کو مکالمے کی میز کی دوسری طرف بیٹھا ہوا دیکھ کر جغادری سے جغادری تجارت پیشہ شخصیات اپنی سودے بازی کی منطق اور دلیل، دونوں بھلا بیٹھتی تھیں۔

زفیرہ احمد جونہی اپنے کمرے کے سامنے پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ گذشتہ چالیس برسوں سے کمپنی کا ملازم، اُس کا پیون اصغر کسی ہنگامے کی پرواہ کیے بغیر اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا ۔زفیرہ کو دیکھتے ہی اُس نے اپنے مخصوص انداز میں اُسے سلام کیا اور احتیاطاً مقفل کر کے رکھا ہوا آفس کھول کر انتہائی مودب انداز میں اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ زفیرہ احمد جونہی اپنی چیف ایگزیکٹو کی کرسی پر بیٹھی، اُسے یوں لگا کہ اُس کے ساتھ جڑے ہوئے سبھی اختیارات بھی اُس کے اندر حلول کر چکے ہیں۔ اب وہ اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ با اختیار محسوس کر رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اُسے سب سے پہلا خیال سیکورٹی گارڈز کا آیا کہ جو اُسے کہیں بھی دکھائی نہیں دیے تھے۔ یہ صریحاً اُس سیکورٹی کمپنی کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی خلاف ورزی تھی کہ جس کے ذمہ اِس آفس کی سیکورٹی تھی۔ اصغر نے نجانے کیسے اُس کے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے۔ بولا کہ میڈم اسیکورٹی موجود ہے لیکن سامنے کیوں نہیں اس کی تفصیل فاروقی صاحب کے پاس ہوگی۔

''فاروقی موجود ہے؟''___اپنے سامنے موجود صورتحال دیکھتے ہوئے زفیرہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''جی میڈم___پی اے صاحب بھی موجود ہیں اور چھوٹی سیکریٹری صاحبہ میمونہ بی بی بھی ڈیوٹی پر ہیں۔''اصغر کے لہجے سے کہیں بھی کوئی پریشانی عیاں نہیں تھی۔ اُن دونوں کی موجودگی کا سن کر زفیرہ احمد اپنے آپ کو اور بھی مضبوط اور با اختیار محسوس کرنے لگی تھی۔ اصغر کو کافی کا کہہ

کر اُس نے انٹرکام پر فاروقی کو اندر بلا لیا۔ فاروقی اندر آیا تو اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ زفیرہ احمد کو اپنا اعتماد ایک بار پھر ڈولتا ہوا محسوس ہونے لگا لیکن اُس نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور ایک لمبی سانس اور چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ فاروقی کو بیٹھنے کو کہا۔

''گھبراتے نہیں___جتنی بھی بری خبریں ہیں، ایک ساتھ سُنا دو۔''زفیرہ بدستور مسکرائے جا رہی تھی۔''ہاں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ سیکورٹی کدھر ہے؟''

''میڈم آپ کے آنے سے پہلے سیکورٹی جان بوجھ کر invisible کی گئی تھی مگر آپ کے آنے کے بعد تمام پوسٹیں معمول کے مطابق آکو پائی (occupy) کی جا چکی ہیں سوائے دو اضافی گارڈز کے کہ جو آپ کے آفس کے باہر تعینات کیے گئے ہیں۔''

''اور اب بری خبریں؟___''

''کمپنی کے ساتھ پچھلے ایک ماہ میں کیے گئے سارے بزنس ایگریمنٹ کینسل ہو چکے ہیں اور ایڈوانس میں ادا شدہ رقم واپس مانگی جا رہی ہے جو کہ کروڑوں میں ہے۔''

''اور___؟''

''کمپنی کے سارے ملازمین سوائے ہم دو چار کے، نوکریوں سے استعفیٰ دے چکے ہیں اور اب بقایا جات کا مطالبہ کر رہے ہیں جو کہ کروڑوں میں ہے۔''

''اور___؟''

''اور یہ کہ منور ایڈورٹائزرز کے شیئرز ٹکے ٹوکری ہو چکے ہیں اور خبر یہی ہے کہ اسٹاک مارکیٹ کھلتے ہی کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔''آخری خبر تک آتے آتے فاروقی کا چہرہ کسی بجھے ہوئے چراغ کی مانند ہو چکا تھا۔

''ہوں___تو فاروقی صاحب اگر ایسا ہونا ہی ہے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے___آپ بھی استعفیٰ دے کر بقایا جات لینے والوں کے ہجوم میں شامل ہو جائیں۔''زفیرہ احمد اب بھی مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر چہرہ ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اُسے توقع تو تھی کہ سب کچھ یونہی ہوگا مگر اتنا جلدی ہوگا، یہ نہیں سوچا تھا۔

''میڈم اگر میں استعفیٰ دینے والوں میں ہوتا تو کب کا دے چکا ہوتا۔ میں آپ کے

ساتھ ہوں۔ جہاں آپ وہیں میں۔'' اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور کمپنی کا اکاؤنٹنٹ کچھ فائلیں اُٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کا چہرہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''ہمدانی صاحب ___ خبریں تو میں ساری سُن چکی ہوں ___ اس سے پہلے کہ اسٹاک مارکیٹ میں ہمارے شیئرز کی قیمت گرے، آپ فوری طور پر اکاؤنٹس سے رقم نکلوا کر مستعفی شدہ ملازمین کے کلیمز تو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کریں تا کہ اِس گھیراؤ جلاؤ سے تو بچا جا سکے۔ پھر سوچتے ہیں کہ کمپنی کو کیسے بچایا جائے۔''

''میڈم! آپ کو شاید پوری خبریں ابھی نہیں ملیں؟'' __ ہمدانی کے چہرے سے اندرونی اذیت کے آثار نمایاں تھے۔

''پوری خبریں کون سی؟''

''یہ کہ جن کلائنٹس نے گذشتہ کل اپنے معاہدے منسوخ کیے تھے انہوں نے اپنے ایڈوانسز کی ریکوری یقینی بنانے کے لیے مہ نور کے بینک اکاؤنٹس منجمد کرا دیے ہیں، اب ہم اِن کاؤنٹس سے ایک پیسہ بھی نہیں نکلوا سکتے۔ جہاں تک رہی کمپنی بچانے کی بات تو کمپنی کے سات ڈائریکٹرز میں سے سوائے آپ کے باقی سب استعفیٰ دے چکے ہیں ___ اب تو ہم اگر اِس بلڈنگ سے اپنی جان بچا کر نکل ہی پائیں تو بہت بڑی بات ہو گی۔'' بات مکمل کرتے ہی ہمدانی نے سبھی فائلز کھول کر زفیرہ احمد کے سامنے میز پر دھر دیں۔

''مگر میں اسٹاک ایکسچینج کھلنے تک کوئی فیصلہ نہیں کرونگی۔'' زفیرہ احمد نے دوٹوک انداز میں ہمدانی اور فاروقی دونوں کو اپنا فیصلہ سنایا اور سر کرسی کی پشت سے لگا لیا۔ اتنا کچھ سننے کے بعد بھی وہ پہلے سے زیادہ پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ اگر اُس کی آنکھوں کے سامنے کچھ تھا تو بڑے صاحب کا چہرہ جو اُس کی خوئے انتقام کو مہمیز کرتے ہوئے اُس کے اعصاب کو شکستہ کرنے کی بجائے مزید پرسکون کیے چلا جا رہا تھا۔

۞

﴿۲۸﴾

کلثوم کے کوٹھی خانہ کے سب سے الگ تھلگ کمرے میں اُس رات جسمانی مکاشفے کی ایک نئی داستان رقم ہوئی۔ چند دنوں میں وحشت، دہشت، جنون اور ننگی مردانگی کی بے محابا زور آزمائی کی منتہائی حدوں تک پہنچ چکی ماہین پر پہلی بار عیاں ہوا کہ عورت اور مرد کے تعلقات میں جس تلذذ، تسکین اور طمانیت کو اُس نے حرفِ آخر سمجھ لیا ہے وہ نہ تو اُس جسمانی پاگل پن کی محتاج ہے اور نہ ہی اُس سے کشید کی جا سکتی ہے۔ یہ اگر ہے تو اِن معاملات سے ہٹ کر اور اِن سے سوا۔ ماہین نے جانچا کہ خلوت کے اِن لمحات میں مرد کا کردار ذاتی وحشت خیزی سے کام لینا نہیں بلکہ عورت کے وجود میں تلاطم اور وحشت کو مسلسل جگائے رکھنا ہے۔ یہ بھی شاید ماہین کا کشفِ وجود تھا کہ عورت کو مرد سے مردانگی چاہیئے ہوتی ہے، ننگی مردانگی نہیں۔ وہ حیران تھی کہ کس نے درندگی کو مردانگی کا عروج ٹھہرایا؟ خلوت کا تقاضا تو بس اتنا تھا کہ کوئی نکیل ڈال کر گام گام چلتا رہے، کہیں سرِراہ جنوں اور کہیں بر سرِ وحشت۔ جب کہ عورت ذیشان کے لیے بھی اب تک ایک بے بس و بے حس وجود کا استعارہ تھی کہ جسے مرد اپنی تھکاوٹ اُتارنے کے واسطے پنچ بیگ (punch bag) کی طرح استعمال کرتے چلے آ رہے تھے۔ اُس نے بستر پر پہلی بار ماہین کی صورت کسی عورت کو بیدار وجود کے ساتھ برابری کا دعویدار پایا وگرنہ اِس سے پہلے تو عورت میں زندگی کا احساس تک بھی اُس کے کردار کو مکمل طور پر مسخ کرنے کے لیے کافی تھا۔ شاید مردانگی یکطرفہ حاکمیت میں ہی عافیت محسوس کرتی ہے وگرنہ نسوانی وجود میں ہلکی سی مدافعانہ جنبش یا طمانیاتی تحرک اُس کی مردانہ اَنا کو کیوں لرزائے رکھتا۔

ماہین نے اپنے وجود کے دستر خوان پر اب تک مہمان بنے مردوں کا مکھوٹا آنکھیں میچ کر دوبارہ سے دیکھا تو اُسے کراہت سی ہونے لگی۔ کس ڈھب پر ڈال دیا گیا تھا اُسے کہ جس کا کوئی اَنت ہی نہیں؟ اور اگر اُسی ساخت اور ذہنیت کے دو چار مزید مرد اُس کی اشتہا کی بھینٹ چڑھا دیے جاتے تو وہ خود کسی نُکیل جوگی نہ رہتی۔ اُسے ذیشان کے چانٹوں پر بھی پیار آنے لگا تھا کہ جس نے اُس کے تیور دیکھ کر نکیل ڈالنے میں کچھ بھی تاخیر نہ کی۔ اُسے اِس پر بھی کسی اہانت کا احساس نہیں تھا کہ ایم فِل کیمسٹری ایک بار پھر میٹرک کی گرفت میں اور اُسی کے رحم و کرم پر تھی۔

''مجھے لے چلو یہاں سے ـــــ'' ماہین نے ذیشان کی بغل میں منہ چھپا کر منمنانے کی کوشش کی۔

''لیکن کہاں؟ ـــــ'' ذیشان نے کروٹ لی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مجھ سے شادی کرلو!!'' ـــــ ماہین نے لیٹے لیٹے اُس کی ران پر سر رکھ لیا۔

''میں کیوں کرنے لگا تم سے شادی؟'' ـــــ ذیشان کے لہجے میں رعونت تھی۔

''پڑھی لکھی ہوں، تمہارا گھر جنت بنا دوں گی۔'' ماہین نے اپنا سر ذیشان کی ران سے اُٹھا کر اُس کے پاؤں پر اِس طرح رکھا کہ انگوٹھا اُس کے لبوں کو چھونے لگا۔ ذیشان نے اُس کے بکھرے ہوئے بالوں میں ہاتھ ڈالا اور اِس طرح بَل دیا کہ ماہین کا چہرہ اُبھر کر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

''کیا ہوتا ہے فرق پڑھی لکھی اور اَن پڑھ عورت میں؟ مرد کے نیچے آ کر تو دونوں ایک ہو جاتی ہیں۔ اب کہاں گئی تیری ایف ایس سی کی فسٹ ڈویژن؟ اِس وقت تو میٹرک تھرڈ ڈویژن کے نیچے لیٹی ہوئی ہے۔ گشتی ہے تو گشتی بن کے رہ ـــــ ورنہ میں نہیں تو کوئی اور تجھے پھانسی کے پھٹے پر چڑھا دے گا۔'' یہ کہہ کر ذیشان نے اِس طرح اُس کے مُٹھی میں آئے ہوئے بالوں کو جھٹکا دے کر چھوڑا کہ اُس کا سر چارپائی کے پائے سے جا لگا۔ ماہین کو یوں لگا کہ کالا جیل سے رہا ہو کر ذیشان کے روپ میں وہاں آن پہنچا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جس کیفیت کا احساس اُس کے اندر جاگا تھا وہ ہوا ہوتے ہوتے قطعی معدوم ہو چکی تھی۔ کافی دیر تک دونوں

کے درمیان خاموشی رہی۔ ذیشان اپنا آج کا کھیل ختم کر چکا تھا مگر شدید غنودگی کے باوجود سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کوٹھی خانے میں سو جانے کا مطلب اچھی طرح سے جانتا تھا سُو سگریٹ پر سگریٹ سلگائے چلا جا رہا تھا۔ جب کہ ماہین تو ابھی ابھی بیداری کے مراحل میں داخل ہوا چاہتی تھی کہ جھٹک دی گئی سُو پھر سے خول میں بند ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ اُس خول میں چھوٹے چھوٹے پانچ مردوئے بھی گھسنے اور گھس بیٹھنے کی کوششوں میں تھے۔ طیفا کھوتا، الیاس، رمضان، کالا اور شادا ـــــ وہ پانچوں اپنی فطری درندگی کے باوجود ماہین کو معصوم سے لگ رہے تھے۔ جیسے تھے کم از کم دِکھتے تو ویسے تھے، نہ کہ ذیشان کی مانند، جو نہیں تھا وہ دِکھا اور جو تھا وہ دِکھا ہی نہیں۔

نجانے کیا سوچ کر وہ بھی اُٹھ بیٹھی اور مسکراتے ہوئے ذیشان کے پاؤں دبانے لگی مگر اُس نے پسارے ہوئے پاؤں سمیٹ لیے۔ وہ پھر سے اُس کے پاؤں کی طرف لپکی تو ذیشان نے بازو سے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔

''تو پاؤں چھوڑ ـــــ کام بتا کام؟''

ماہین بھی پینترے بازی چھوڑ کر سیدھی سادی بات پر آ گئی۔

''مجھے کوٹھی خانے کے دروازے کے باہر پہنچا دے۔''

''اِس وقت؟''

''اگر اِس وقت چھوڑ سکتے ہو تو مجھے سکستھ روڈ چھوڑ دو!!''

کمرے کے باہر صحن میں مکمل خاموشی تھی جب کہ حوالدار مقبول بھٹی بھی وہاں نہیں تھا کہ جہاں اُسے سوتا چھوڑ کر وہ کمرے میں گئے تھے۔ ابھی وہ دونوں صحن کے درمیان ہی پہنچے ہوں گے کہ کلثوم کہیں آس پاس سے نکل کر اُن کے سامنے آ گئی۔ نہ تو اُس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور نہ ہی چہرے پر کسی قسم کی کوئی پریشانی۔

''مجھے یقین تھا کہ یہ لڑکی یہاں سے بھاگنے کے لیے تمہیں استعمال کرے گی!!''

''میری باتیں کان کھول کر سن لے ـــــ تھانہ اگر مقبول بھٹی چلاتا ہے تو اُس کی بیوی کو میں رواں رکھتا ہوں ـــــ اب تو خود سوچ لے کہ حق سچ میں تھانہ کا بادشاہ میں ہوا یا مقبول

بھٹی ___ اگر مجھ سے بگاڑنا ہے تو پھر بوریا بستر باندھ لے ___ ہاں ایک بات اور سُن !! تیرا کالا دنیا جہان کی چھترول کیا کرتا تھا مگر جب اُس کا برا وقت آیا تو اُس کی چھترول مجھے دے دی گئی ___ کبھی زندگی میں ملاقات ہو تو پوچھ لینا کہ ذیشان پچھواڑے سے روح کیسے نکالتا ہے؟ میں تو اُس کا پُلس مقابلہ کرنے لگا تھا مگر بچ گیا حرامی، ورنہ دو سال کی نوکری میں اکاون قتل میرے ہاتھ سے ہو چکے ہوتے ___ اب چھوڑ ساری باتیں اور وداع کر چھوٹی بہن کو ہزار کا نوٹ ہتھیلی پر رکھ کے۔ اور ہاں وہ مقبول بھٹی میرا پوچھے ناں تو کہہ دینا کہ میں اُسی کے گھر گیا ہوا ہوں، اُس کی بیگم کی طبیعت ٹھیک کرنے۔" ذیشان کے لہجے میں کچھ ایسی سفاکیت تھی کہ کلثوم اور ماہین دونوں حواس باختہ ہوتے ہوتے دم بخود ہو کر رہ گئیں۔ کلثوم نے جتنا جو کچھ اُس کے بارے میں سن رکھا تھا اب وہ ویسا ہی ثابت ہو رہا تھا۔ ایسے میں اُس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ جیسا وہ کہہ رہا تھا وہ بھی ویسا ہی کرے۔

صبح کی اذان سے کہیں پہلے ذیشان نے پولیس کی ڈبل کیبن گاڑی سکستھ روڈ راولپنڈی کے رہائشی علاقے میں ایک چالیس پچاس برس پرانی کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے روکی اور چادر میں لپٹی ہوئی ماہین کو نیچے اُتر جانے کو کہا جو عین اُس کے عقب میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اگرچہ کوٹھی کے باہر کوئی بورڈ آویزاں نہیں تھا مگر ماہین کے مطابق وہ ایک پرائیویٹ گرلز ہوسٹل تھا کہ جہاں اُس کی ایک ہم جماعت لڑکی پہلے سے رہ رہی تھی۔ گاڑی سے نیچے اُترنے میں ماہین نے قدرے تاخیر کی تو ذیشان نے مضطرب ہو کر پانچ سات گالیاں ایک ساتھ اِس طرح بکیں کہ جیسے اُس کے لیے الوداعی کلمات کہہ رہا ہو۔ اس کے باوجود ماہین نے گاڑی سے اُترتے ہوئے آنکھ بھر کر ذیشان کو دیکھا تو اُس کا دل بھر آیا۔ بس ایک شام سے صبح تک کا تعلق تھا اور تعلق میں مسلسل اُتار چڑھاؤ۔ جیسے وہ خود ایک شخص اور ایک شخص کے اتنے زیادہ مزاج، رویے اور روپ۔

خود ماہین نے بھی اتنے کم دنوں میں اتنے زیادہ ٹھکانے اور اتنے زیادہ مرد بدلے کہ اُسے عورت کے مزاج میں دخیل پردیسی پن اور عدم تحفظ کی وجوہات سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ ہر نئی جگہ اور ہر نئے مرد سے بہت کم وقت میں جڑت کا وصف عورت کو شاید اسی پردیسی پن اور

عدم تحفظ کے ردِعمل میں عطا ہوا گا کہ جو مردوں کے نزدیک بے وفائی سے عبارت ہے۔ ذیشان بھی اگرچہ تمام راستہ خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا تھا مگر ماہین کو گاڑی سے نیچے اُتارنے کے بعد واپس آواز دے کر سمجھانا نہیں بھولا تھا کہ اگر زندہ رہنا چاہتی ہے تو پولیس سے بچ کر رہے ورنہ اُس کے خلاف درج ہو چکے کیس کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بس وہی ایک لمحہ تھا کہ جب ذیشان کے چہرے کی سفاکیت ذرا سی ماند پڑی لیکن نجانے کیوں ماہین کو اُس کا یہ روپ اچھا نہ لگا۔ وہ اُس کے ہاتھوں پولیس مقابلے میں اُس کی اکاونویں مقتول ہونے کو تو تیار تھی مگر اُس کے چہرے کی سفاکیت کے ماند پڑنے پر کسی صورت بھی راضی نہیں تھی۔ وہ پہلی نظر ہی میں جان چکی تھی کہ اِسی سفاکیت اور اِسی کڑک دھڑک کے نتیجے میں تو ذیشان کی ستواں ناک برچھی بن کر عورتوں کے دل میں اُتر جایا کرتی تھی۔

ماہین جس کوٹھی کے سامنے اُتری وہ اُس کی منزل نہیں تھی۔ ذیشان کے چلے جانے کے بعد وہ پیدل چلتی ہوئی اُسی لین میں تیسری کوٹھی کے گیٹ پر جا کر رکی اور ادھ کھلے لکڑی کے گیٹ کے دائیں ستون پر نصب الیکٹرک گھنٹی کے بٹن کو دبا کر کسی کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ دل میں پیوست ذیشان کی مردانہ وجاہت کی برچھی کے باوجود زندہ رہنے کی جدوجہد میں اُس پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی۔ یہ صنفی فہم کا تعصب ہے یا عورت ہونے سے جڑی ہوئی محتاط روی کہ وہ مرد کو عمومی طور پر ایک سنگل پیکج گرداننے کی بجائے مختلف ٹکڑوں میں بانٹ کر قبول یا رد کرتی ہے جب کہ مرد عورت کو ہمیشہ ایک سنگل پیکج ہی سمجھتا اور اُسے اُسی طور قبول یا رد کرتا ہے۔ عورت کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ جس مرد کو اُس نے ایک معاملے میں قبول کیا ہو وہ اُسے اپنی ذات سے جڑے ہوئے باقی معاملات میں بھی قبول کرتی ہو جب کہ مرد کو اُس کی تصوراتی برتری کا زعم عورت سے تعامل کے معاملات میں اِس کے برعکس باور کرائے رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ وہ اُسے آسان لیتا ہے اور ہمیشہ خسارے میں رہنے کے باوجود خسارہ ماننے کو تیار بھی نہیں ہوتا۔

دو تین بار بیل دیے جانے کے باوجود جب کوئی بھی گیٹ پر نہ آیا تو وہ اَدھ کھلے گیٹ سے گزر کر اندر پورچ میں چلی آئی۔ پرانی کوٹھی کا اُجاڑ پورچ اور پورچ سے ملحقہ چھوٹا سا کچا قطع

اراضی، سبھی کسی ویرانے کا منظر دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹا سا کچا قطع اراضی کبھی گرین بیلٹ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا مگر دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب اَب دھول اڑاتی زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ماہین نے اندرونی دروازے پر کسی بیل کا کوئی بٹن نہ پا کر اُسے تھپتھپانا شروع کردیا۔ اطراف کی مساجد میں صبح کی اَذانوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا جس سے ظاہر تھا کہ کچھ ہی دیر میں سڑکوں پر چہل پہل شروع ہوجائے گی۔ صورتحال کا احساس ہوتے ہی ماہین نے زیادہ زوراور زیادہ تواتر سے دروازے پر دستک دینا شروع کردی لیکن دروازہ نہ کھلا۔ یوں لگ رہا تھا کہ چوکیدار یا تو کہیں غائب ہے اور یا پھر نشہ کرنے کے بعد کہیں انٹاغفیل ہوا پڑا ہے۔ ماہین کو اِس بات پر بھی حیرت تھی کہ چوکیدار اگر اُس کی دستکوں پر توجہ نہیں کر رہا تو کمروں میں موجود کسی لڑکی کو ہی اِس جانب خیال کرلینا چاہئے تھا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ شاید اُس سے ہوسٹل تلاش کرنے ہی میں کہیں بھول ہوگئی ہو ورنہ ممکن نہیں تھا کہ اتنی دیر تک دستکیں دیے جانے کے باوجود دروازہ نہ کھلے۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اِن حالات اَب میں اُس کا اگلا قدم کیا ہو اُسے دور سے رکشے کی آواز سنائی دی جو خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی اِسی جانب آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ اِس تمام تر صورتحال سے اُکتائی ہوئی ماہین بلا سوچے سمجھے گیٹ سے نکل کر باہر سڑک پر آ گئی۔ دور سے کپکپاتی ہوئی رکشے کی مدھم ہیڈ لائٹ کا رخ واقعی اِسی جانب تھا۔ گو کہ سڑک پر فجر کی باجماعت نماز ہونے سے پہلے ہی اکا دُکا لوگوں کا آنا جانا شروع ہو چکا تھا لیکن ماہین کو اِس کی پرواہ نہیں رہی تھی کہ اُسے اتنی صبح سویرے ایک پرائیویٹ گرلز ہوسٹل کے باہر یوں کھڑے دیکھ کر کوئی کیا کہے گا۔ رکشا قریب آیا تو وہ ماہین کے ہاتھ کا اشارہ ہونے سے پہلے ہی اُس کے نزدیک آ کر رُک گیا۔ رات بھر رکشا چلانے والا اُدھیڑ عمر رکشا ڈرائیور شاید اپنی آج کی آخری سواری کی تلاش میں تھا۔

''کہاں جانا ہے بی بی! فیض آباد بس ٹرمینل یا پیر ودھائی؟'' ــــــ رکشے والے نے ماہین کے ظاہری حلیے سے اُس کی منزل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ اُس نے کہاں جانا ہے، یہ تو اُس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اُس کا ذہن بالکل خالی اور چہرہ بجھ چکا تھا۔

''بی بی بتا ہی دینا تھا کہ تم کسی کے انتظار میں ہو۔'' رکشے والا چڑ سا گیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ رکشا آگے بڑھاتا، ماہین کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''محلّہ وارث خان''

محلّہ وارث خان کا نام اُس کے منہ سے تو نکل گیا لیکن اپنے منہ سے یہ نام سن کر وہ خود ہی لرز گئی کیونکہ وارث خان ہی میں تو اُس کا اپنا گھر تھا۔

''کیسے جا سکے گی وہ اپنے گھر اور کس منہ سے سامنا کرے گی گھر والوں کا کہ جن کے سامنے اُسے پولیس گرفتار کر کے وہاں سے لے گئی تھی۔ اور اگر وہ وہاں پہنچ بھی گئی تو اُسے گھر میں کون داخل ہونے دے گا، وہ تو اُن کے لیے مر چکی تھی۔''

''بی بی! رکشے میں بیٹھنا ہے تو بیٹھو ورنہ موج کرو، مجھے جانے دو ــــــ پوری رات کا جگراتا ہے مجھے۔'' ماہین نے خالی خالی آنکھوں سے رکشے والے کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس نے کافی دیر سے رکشے کا دروازہ ــــــ بازو پیچھے کی طرف گھما کر کھول رکھا تھا۔ ماہین کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی رکشے میں بیٹھ گئی اور رکشہ محلّہ وارث خان کی طرف چل پڑا۔

۞

﴿۲۹﴾

زفیرہ احمد کا فیصلہ نہ صرف ہمدانی اور فاروقی کے لیے مایوس کن تھا بلکہ دفتر کے باہر جمع ہو چکے ملازمین کے لیے بھی مزید اشتعال دلانے کا باعث تھا جو بینک اکاؤنٹس منجمد ہو جانے جیسی خبروں کے پھیلنے کے بعد پہلے ہی مایوسی اور اشتعال کی ملی جلی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ ہمدانی جیسے وفادار ملازم کے لیے اسٹاک ایکسچینج میں کاروبار شروع ہونے کا انتظار کرنا صریحاً خودکشی تھی خاص طور پر اِن حالات میں کہ جب ہر شخص جان چکا تھا کہ آج مہ نور ایڈورٹائزرز کے شیئرز کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ مارکیٹ میں گردش کر رہی افواہ نما خبروں کے مطابق مہ نور ایڈورٹائزرز کے اُنچاس فیصد حصص کی مالیت صبح صبح ہی ان کی بے محابا فروخت کے ذریعے اِس طرح گرادی جائے گی کہ اگلے دو تین روز اُنھیں کوئی اونے پونے خریدنے والا خریدار بھی مارکیٹ میں نہ رہے اور یوں زفیرہ احمد کو مجبور کر دیا جائے کہ کُلی نقصان سے بچنے کے لیے وہ بھی اپنے اکاون فیصد حصص مارکیٹ میں لا پھینکے اور پھر مہ نور کے ہیڈ آفس کی خالی عمارت کو خالی جیب اور خالی پیٹ ہمیشہ کے لیے سلام کر کے چلتی بنے، جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے قرض خواہوں کے قرضے چکانے۔

زفیرہ احمد اِن افواہوں کو امکانی صورتحال کے طور پر لے رہی تھی۔ اُسے ادارک تھا کہ مہ نور کے اُنچاس فیصد حصص بے وقعت کر دیے جانے کے بعد وہ بھی کسی ڈھلوان پر مسلسل پھسلتے چلے جانے کی مانند اپنے حصص فروخت کرنے پر مجبور ہوگی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی تو کوئی صورت نہیں تھی کہ جسے اپنا کر اپنا تحفظ کیا جا سکے۔ بس اتنا تھا کہ اپنے اعصاب کے امتحان

کی خاطر اور امکانات سے نکل کر یقین کے مدار میں داخل ہونے کے بعد اگر بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو کم از کم یہ قلق نہیں ہوگا کہ اگر کچھ انتظار کر لیا جاتا تو ہو سکتا ہے صورتحال وہ نہ ہوتی کہ جس سے گھبرا کر اپنا سب کچھ تیاگ بیٹھے۔

لیکن اسٹاک ایکسچینج میں حصص کا کاروبار شروع ہونے کے بعد بھی کچھ کام نہ آیا۔ نہ دعائیں اور نہ ہی امکانات سے ماورا کچھ اور کہ جو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہی کہا جا سکتا۔ زفیرہ احمد کے لیے مقامِ حیرت تھا کہ صرف اُسے یعنی ایک بے بس عورت کو برباد کرنے کے لیے کروڑوں روپے داؤ پر لگا دیے گئے تھے محض اِس واسطے کہ وہ ایک بھڑوے کے سامنے سر جھکانے سے انکاری ہوئی تھی۔ یہ داؤ ہی تو تھا جس میں ضروری نہیں کہ بڑے صاحب کو اپنی لاگت فوری طور پر واپس ہو سکتی۔ اگرچہ وہ کم قیمت پر بیچے گئے حصص اُسی قیمت پر واپس خرید کر اپنے داؤ میں گھاؤ لگا سکتا تھا مگر اِس دوران بہت سے مہم جو حصص خریدنے کی مسابقت میں شامل ہو کر کھیل کو پلٹ بھی سکتے تھے جس سے مالی نقصان صرف بڑے صاحب کا ہی ہوتا۔ اِس سے بھی بڑھ کر اہم معاملہ اگلے ایک آدھ دن میں زفیرہ احمد کو اپنے اکاون فیصد حصص کی فروخت پر مجبور کرنا تھا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ اگلے ایک آدھ دن مارکیٹ میں فروخت شدہ حصص کی قیمت کم سے کم سطح پر اس طرح برقرار رکھی جائے کہ کسی مہم جو کو قیمت بڑھانے کا موقع نہ مل سکے۔ اِس نفسیاتی مقام پر کسی کا حوصلے سے قیام کرنا اور اپنے ہر داؤ کو پوری استقامت سے کھیلنا اچھا بھلا دل گردے کا کام تھا۔ کروڑوں یونہی اپنی اَنا پر قربان کر دینا کسی طور جرم نہیں رہا تھا بلکہ کسی اور کھیل کی نشاندہی کر رہا تھا جس کا ظاہر کیا جانا ہنوز غیب میں تھا۔ زفیرہ احمد کو بھی یوں لگ رہا تھا کہ اُس کی بربادی کا یہ ڈراما اُس کے ساتھ کھیلے جانے والے کھیل کا انجام نہیں بلکہ نکتہ آغاز ہے۔

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو مہ نور کے حصص کا یوں مصنوعی طور پر گرا دیا جانا کسی طور ممکن نہیں تھا کیونکہ اُس صورت میں زفیرہ احمد خود سستے داموں ان کی خریدار ہو کر کروڑوں کے فائدے میں رہتی مگر اب تو اکاؤنٹ منجمد ہونے کے سبب روزمرہ کے دفتری اخراجات تک کے لیے رقم دستیاب نہیں تھی سو شیئرز کی خریداری کہاں سے کی جاتی۔ زفیرہ نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح

اُس کے دوستوں میں سے کوئی بڑھ کر یہ شیئرز خرید لے مگر دباؤ کے کئی ظاہری عوامل ہونے کے سبب دوست، دوست ہونے اور دوست رہنے کو تیار نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ بڑے صاحب کا نہ صرف کاروباری حلقہ اثر وسیع تر تھا بلکہ اُس کے سماجی اور سیاسی اثر ونفوذ کو آسانی سے تو کیا بمشکل نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ایسے میں بڑے صاحب کی مخالفت میں ایک سر پھری عورت کی شہرت رکھنے والی یہ مخلوق کس طرح ٹھہر پانے کی جستجو کر سکتی تھی کہ جو اپنی تمام تر اخلاقی ساکھ کھو دینے کے بعد بھی مقابلے پر مصر تھی۔

اسٹاک ایکسچینج میں حصص کا کاروبار بند ہونے تک جہاں مہ نور ایڈورٹائزرز کے حصص بے وقعت ردی کے ٹکڑوں کی طرح شیئر مارکیٹ میں پھینکے جا چکے تھے وہاں اُن کا کوئی خریدار نہ ہونے کے سبب کاروباری حلقوں میں ابہام اور وسوسوں کو لیے ہوئے عجیب سی صورتحال پیدا ہو چکی تھی۔ بظاہر شیئرز ہولڈرز کے کروڑوں روپے ڈوب چکے تھے لیکن پھر بھی بڑے صاحب کی توقعات کے مطابق اُس قدر ہیجان پیدا نہیں ہو پا رہا تھا کہ جو زفیرہ احمد کو بھی اپنی جمع پونجی شیئر مارکیٹ میں اونے پونے پھینکنے پر مجبور کر سکے۔ لہذا ایسے میں مقامی کیبل نیٹ ورک پر زفیرہ احمد کے برہنہ مووی کلپس کے بارے میں محلہ اور کالونی سطح کے سماجی اور مذہبی رہنماؤں کے لعن طعن پر مبنی شارٹ انٹرویوز چلائے جانے کے علاوہ دوپہر کے اخبارات کے خصوصی ضمیمے شائع کرا کے مفت بانٹے جانے لگے۔ گھٹیا پن اور رذالت کی یہ وہ سطح تھی کہ جس کے بعد مضبوط سے مضبوط اعصاب بھی جواب دینے لگتے ہیں۔ زفیرہ احمد کی برہنہ تصاویر سے مزین چٹ پٹے ضمیمے مہ نور کے ہیڈ آفس کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں آئے تو غلاظت سے لتھڑے ہوئے نعرے اُن کی زبانوں پر آ گئے۔ انہوں نے دفتر میں گھس کر توڑ پھوڑ کرنا چاہی تو سیکورٹی والوں نے اُن کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس پر انہوں نے باری باری میگا فون ہاتھوں میں لے کر زفیرہ احمد کے کردار کو خوب لتاڑا اور اپنے اپنے عرصہ ملازمت کو اپنے اور اپنے اہل خانہ کے واسطے محض شرمندگی قرار دے کر بار بار اللہ تعالیٰ سے مغفرت کے طالب ہوتے رہے۔ یہ وہ نفسیاتی حربے تھے کہ جنہوں نے زفیرہ احمد کی ہمت اور جرات کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ مکمل بربادی کو اَب اُسے مزید کچھ دیر اور موخر کرنا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ اُس نے ہمدانی کو

بلایا، لیکن ہمدانی نے کسی بھی مشورے کے لیے بہتر جانا کہ فاروقی بھی ساتھ رہے لہذا وہ دونوں اُس کے سامنے تو آ بیٹھے لیکن قطعی خالی ذہن۔ دن بھر پل پل بدلتی صورتحال نے اُن سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نچوڑ لی تھی۔ اُن کے بجھے ہوئے چہرے دیکھ کر زفیرہ احمد کا رہا سہا حوصلہ بھی ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

''آپ لوگ پچھتا رہے ہیں میرا ساتھ دے کر!''...... زفیرہ نے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا لیکن بولا صرف ہمدانی، جبکہ فاروق خاموش رہتے ہوئے بھی اپنے چہرے کے تاثرات سے ہمدانی کی تائید کر رہا تھا۔

''آپ شک نہ کیا کریں میڈم...... فیصلے کیا کریں! اگر ہم لوگ اس صورتحال میں بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہیں تو آپ کو بھی ہماری نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہئے...... آپ کا صبح کا فیصلہ صریحاً غلط تھا لیکن ہم نے آپ کے فیصلے کو مانا یہ جانتے ہوئے کہ ہماری اپنی کمپنی کے ملازمین ہمیں بھی بدکردار جان کر کیسی گھٹیا نظروں سے دیکھ رہے ہیں!''

زفیرہ احمد نے اپنے سب سے زیادہ وفادار ملازم کی آنکھوں میں اپنے لیے بے توقیری کی عبارت دیکھی تو سر جھکا لیا۔ ''نہیں اب آپ بتائیں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟'' اُس نے اُن دونوں سے آنکھیں ملانے کی بجائے چرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ بتایئے! آپ کے ذہن میں کیا ہے؟''...... اَب کے فاروقی گفتگو میں شامل ہوا۔

''مجھے تو کچھ سجھائی نہیں دے رہا سوائے اکاون فیصد شیئرز کا بوجھ سر سے اُتارنے کے، ہمارے اکاؤنٹس فریز اور ہمارے دوست ہمارا ساتھ دینے کو تیار نہیں تو کیسے مقابلہ کیا جا سکتا ہے اس سچوایشن کا سوائے اِس کے کہ کمپنی دیوالیہ قرار پائے...... اِس سے یہ بھی ہوگا کہ جو لوگ اس وقت باہر کھڑے میری جان کو رو رہے ہیں وہ بھی لیکوئڈیشن (liquidation) کی ذمہ داری ہو جائیں گے۔''...... زفیرہ احمد جذباتی انداز میں کہتی چلی گئی۔

''لیکن اب میں آپ سے کہوں گا کہ جلدی نہ کریں اور کل کا دن طلوع ہو لینے دیں۔''

فاروقی ایک بار پھر ہمدانی کے بولنے سے پہلے بول پڑا تھا۔

''کل کیا باقی بچے گا؟''......زفیرہ احمد کے چہرے پر حیرت تھی۔''ہمدانی صاحب! آپ بتائیں! معاملات کل تک موخر کرنے سے کیا ہو جائے گا؟ اور آج اِن لوگوں سے کیسے جان چھڑائی جائے جو باہر محاصرہ کیے کھڑے ہیں؟''

''میں بھی یہی کہوں گا کہ اِس وقت، اِن حالات میں فاروقی صاحب کی تجویز ہی بہتر ہے، ویسے بھی تمام سرکاری آفس بند ہو چکے ہیں اور جو کچھ آپ کرنا چاہتی ہیں اِس وقت نہیں ہو پائے گا، رہی بات باہر کھڑے ملازمین کی تو مجھے ایک کوشش کر لینے دیجئے......پھر بھی وہ نہ مانے تو جیسے آپ کی مرضی!۔'' بات ختم کرتے ہی ہمدانی اُٹھ کھڑا ہوا۔''آیئے فاروقی صاحب! آپ بھی میرے ساتھ چلیں!۔''

اُن دونوں کے کمرے سے باہر جاتے ہی زفیرہ احمد نے پاؤں سے جوتے اُتارے اور گردن ایک بار پھر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اُسے اپنے اطراف میں سب کچھ اجنبی سا لگنے لگا تھا۔ وہ کمرہ، کمرے کا فرنیچر، عمارت اور پھر کمپنی، کمپنی کا نام ''مہ نور ایڈورٹائزرز'' اِس کے ملازم، ملازموں کے مسائل، کمپنی کا بزنس اور بزنس میں مسابقت اور پھر اِسی مسابقت میں دن رات کی تفریق کا ختم ہو کر رہ جانا، سبھی کچھ غیر متعلق اور بے محل ہو کر رہ گیا تھا کہ جیسے کبھی ان میں سے کسی سے واسطہ ہی نہ پڑا ہو اور نہ کبھی رکھا گیا ہو۔ آنے والے کل کے دن کا خیال کرتے ہوئے اُس کی سوچ، سوچنے کی حد تک بھی نہیں جا پا رہی تھی۔ عجیب سی بے کلی تھی کہ جو اضطراب کا سبب بننے کی بجائے انجماد کا باعث ہوئی جا رہی تھی۔ خیال، سوچ، وقت اور وقت کی حرکیات، سبھی منجمد۔ اس کیفیت سے پیچھا چھڑانے کے واسطے اُس نے سر کو زور سے جھٹکا اور اُسے دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے یوں لگا کہ اُس کے گرد برف کا غلاف سا جم گیا تھا جو یکدم تڑتڑاہٹ کے ساتھ ٹوٹ کر گرنے لگا تھا۔ زفیرہ احمد کو شدت سے سکاٹش مشروب کی طلب ہو رہی تھی مگر اُس کی دفتر میں عدم دستیابی کے باعث پیون کو کافی کا کہنا پڑا۔

کافی کے گھونٹ کے حلق سے اُترتے ہی اُسے پہلا خیال بڑے صاحب سے بات

کرنے کا آیا۔ کوئی مضائقہ نہیں تھا اگر وہ اُسے فون کر کے اپنی شکست کھلے دل سے تسلیم کر لیتی، کم از کم یہ تو ہوگا کہ باقی کے شیئرز مارکیٹ میں ڈالنے سے اُن کا حشر اُنچاس فیصد والا نہیں ہوگا اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اپنی فتح کے بعد وہ اِس قدر ترنگ میں ہو کہ اُس غلیظ مہم سے باز آ جائے جو اُس نے اُس کے خلاف شروع کر رکھی تھی۔ لیکن دل پھر بھی نہیں مانتا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ ایک گھٹیا ترین ذہن اپنے بدبودار رویے سے اجتناب پر مائل ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ امکانات کا کھیل تھا جس میں آخری داؤ کا نتیجہ آنے تک کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار شکست کے عمل سے گزرتا ہوا کھلاڑی، فتح کی جانب بڑھتے ہوئے حریف کی چہرہ خوانی میں کچھ ویسا ہی لطف کشید کرتا ہے کہ جیسے کوئی ملامتی صوفی تذلیل کی انتہا جھیلتے ہوئے سرور و انبساط کی معراج پر پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ زفیرہ احمد کا دل نہ ماننے کے باوجود چاہ رہا تھا کہ وہ ذلتوں کے باب میں اپنی فتح ڈھونڈتے شخص کی آواز سنے، لب و لہجہ محسوس کرے، اُس کے اگلے قدم کی چاپ کو سمجھے کہ اُس نے بربادیوں کی راکھ سے ایک بار پھر جنم لینے کا تہیہ کر لیا تھا۔

زفیرہ احمد نے کافی سے حاصل شدہ بشاشت کے بل بوتے پر بڑے صاحب کا نمبر ڈائل کر ہی لیا۔ آج اُس نے نہ تو کوئی جھگڑا کرنا تھا اور نہ ہی کوئی طعنہ زنی، بس کہیں اُسے سننے کی آڑ میں اپنی کیفیت اُس تک پہنچانا چاہتی تھی کہ دیکھ جسے تو اپنا بہت کچھ داؤ پر لگا کر برباد کر چکا ہے وہ اپنا سب کچھ کھو کر بھی برباد نہیں ہوئی۔ زفیرہ احمد اس حالت میں بھی اپنے دماغ کا عدم کھولاؤ بڑے صاحب تک پہنچانا چاہ رہی تھی کہ وہ اس کی بے بستگی دیکھے، محسوس کرے اور ہیجان میں مبتلا ہو کیونکہ یہ بات صرف بڑے صاحب جیسا حرامی ہی جانتا تھا کہ دشمن کو برباد کرنے کے لیے کھوپڑی میں آگ نہیں بلکہ برف ہونی ضروری ہوتی ہے۔

لیکن بڑے صاحب کا فون اٹینڈ نہیں ہوا۔ یقیناً وہ اپنے برباد کر دیے گئے دشمن کو اتنی سی خوشی بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ جنگ میں فتح کی بے اصولی اور فاتح کے چلن کو اُس سے بہتر کون جانتا ہوگا کہ جس نے زفیرہ احمد جیسی عورت سے اُس کا کاروبار چھیننے کے واسطے اتنا بڑا جال بچھایا۔ دوسری جانب اتنا تو زفیرہ احمد بھی جانتی تھی کہ بڑے صاحب جیسے بڑے آدمی کو اُس کے کاروبار کو یوں بھونڈے انداز میں چھیننے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، یہ سب کچھ کیوں اور کس

کے کہنے پر کیا گیا، ابھی تک راز ہی تھا۔ ابہامات میں گرفتہ زفیرہ کے تئیں بڑے صاحب جیسا نامرد بھڑوا اگر اس کھیل میں شامل ہوا تھا تو کسی کرائے کے پیشہ ور مجرم کے طور پر کہ جس کا کام اپنے کلائنٹ کی تشفی تھی، اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ گماں یہ بھی تھا کہ وہ اِس بربادی میں کہیں حصہ دار ٹھہرا ہو کیونکہ کُلی طور پر پورے کا پورا کھیل اُس کی کائنات سے ہٹ کر اور اُس کے کروفر سے لگا نہیں کھاتا تھا۔

زفیرہ احمد ابھی اپنے موبائل فون کو ہاتھ میں رکھے اُسے دوبارہ ڈائل کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ہمدانی اور فاروقی ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ اُن کے چہرے جہاں خوشی سے دمک رہے تھے وہاں بدن بھی کپکپا رہے تھے۔ زفیرہ نے حیران ہو کر اُن کی جانب دیکھا اور خوشی کا سبب جاننا چاہا۔ وہ دونوں خود بھی جلدی میں بہت کچھ کہہ جانا چاہ رہے تھے مگر کہہ نہیں پا رہے تھے۔ زفیرہ احمد بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے مگر اُنہیں مسکراتا دیکھ کر غیر ارادی طور پر مسکراتے ہوئے کرسی چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ کیا وہ لوگ ڈسپرس (disperse) ہو گئے؟''......زفیرہ احمد نے اپنے طور پر اندازا لگانے کی کوشش کی۔

''حیرت انگیز طور پر!!!! ابھی ہم باہر پہنچے بھی نہیں تھے کہ وہ خود بخود بکھرنا شروع ہو چکے تھے۔'' ہمدانی نے پھولی ہوئی سانس میں ایک ساتھ پوری بات بتانے کی کوشش کی۔

''یہ کیسے ہو گیا؟......کس نے کیا ہے یہ؟......زفیرہ جسے قیاس سمجھ رہی تھی وہ حقیقت کے طور پر سامنے آ چکا تھا۔'' آپ نے کھوج لگائی؟......کسی ملازم سے بات ہوئی؟''

''ہم نے بہت کوشش کی لیکن یہی معلوم ہوا کہ یونین کے جو لوگ اس دھرنے کے پیچھے تھے، وہی اُٹھا کر لے گئے ہیں۔'' ہمدانی نے ایک بار پھر وضاحت کی۔

''میڈم! سُنا تو یہ بھی ہے کہ یونین والوں نے دو دن کے اندر کوئی خوشخبری سُنانے کا وعدہ کیا ہے۔'' اَب کے فاروقی نے باقی کی بات بتانے کی کوشش کی۔

''خوشخبری؟ ...... یہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا پھر کوئی اور سازش! ہم کیسے ادائیگیاں کر سکتے ہیں دو دنوں کے اندر؟......'' زفیرہ پریشان ہوئی تو پھر سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اکاؤنٹ فریز تو ادائیگیاں کہاں سے؟''......فاروقی بھی اچھا بھلا حیرت میں تھا۔

''کیا پھر کوئی سازش کہ لوگوں کی توقعات بڑھا کر دو دن کے بعد اُنہیں مہ نور کے ہیڈ آفس میں لایا جائے اور ادائیگیاں نہ ہونے کی صورت میں مشتعل ہجوم سے توڑ پھوڑ کرائی جائی۔'' زفیرہ احمد ایک بار پھر جذباتی انداز میں کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ ''لیکن میں ان کی یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گی، میں کل تک ہی کمپنی کا جو بھی بندوبست کرنا ہے کر لوں گی، اس کے لیے چاہے مجھے فٹ پاتھ پر ہی کیوں ناں آنا پڑے۔''

''میڈم! میں تو کہتا ہوں کہ ہمیں جذباتی فیصلوں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔'' ہمدانی نے کوشش کی کہ زیادہ لمبی بات نہ کرے۔

''حیرت ہے کہ آپ اس فیصلے کو بھی جذباتی فیصلہ کہہ رہے ہیں دشمنوں کی سازش کو سمجھے بغیر......آپ تو اُن کے سازشا دھرنا اُٹھا لینے کو بھی نہیں سمجھ سکے اور خوش ہوتے ہوئے چلے آئے۔ آپ کو علم ہی نہیں کہ ہمارا کس مزاج اور کس قسم کے دشمن سے واسطہ ہے!!'' زفیرہ احمد چڑ سی گئی تھی۔

''دشمن جو بھی ہو میڈم! وہ اپنی پچ پر کھلا کر مارتا ہے......ہمیں بس اُس کی پچ کی طرف نہیں جانا......بس اپنی کریز پر رہنا ہے۔ آپ بس کل کا دن چڑھنے تک کوئی فیصلہ نہ کریں۔'' ہمدانی کا لہجہ منت کرنے والا ہو گیا تھا۔

''فیصلے دن چڑھنے کا انتظار نہیں کرتے ہمدانی صاحب، ہو کر رہتے ہیں......آپ بس گاڑی لگوا دیجئے، مجھے سونا ہے ایک لمبی نیند......اور کوشش کروں گی کہ کمپنی کل کا سورج دیکھ سکے۔'' زفیرہ احمد کا چہرہ ذہنی خلجان کا آئینہ بنا ہوا تھا۔

''مگر میڈم! ڈرائیور جاب چھوڑ چکا ہے......البتہ چابی میرے پاس ہے، میں گاڑی لگائے دیتا ہوں۔'' فاروقی نے جیب سے چابی نکال کر زفیرہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔

''چھوڑیے مسٹر فاروقی! مجھے دیجئے چابی......آج آفس سے زندہ بچ نکلنے کا موقع مل رہا ہے...... یہی غنیمت ہے۔'' زفیرہ نے بوجھل آنکھوں کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھا اور فاروقی سے چابی لے کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

گاڑی سڑک پر آئی تو زفیرہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرف جائے۔ اپنے والدین کی قبروں پر، فارم ہاؤس یا پھر کسی دوست کے پاس۔ دوست کا لفظ ذہن میں اُبھرا تو وہ خود ہی مسکرا دی، ایک تلخ مسکراہٹ۔ ''کونسا دوست؟'' ...... زفیرہ نے اپنے آپ سے پوچھا۔ کل تک کے درجنوں دوستوں میں سے آج کسی ایک نے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ ''کیا کبھی شرفاء بھی کسی پورن اسٹار سے کھلے عام سماجی مراسم رکھتے ہیں؟'' کل تک ایڈورٹائزنگ بزنس کی کوئین سمجھی جانے والی زفیرہ آج پورن اسٹارز کی دنیا کی کوئین بن چکی تھی۔ کل تک ملک کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی کی چیف ایگزیکٹو آج ایک دیوالیہ سمجھی جا چکی کمپنی کی دھتکاری ہوئی مالکن تھی جس نے کل کا سورج طلوع ہونے پر گمنامی کے جوہڑ میں ڈوب جانا تھا۔ ناکام و دلبرداشتہ زفیرہ احمد نے گاڑی کا رخ راول ڈیم کی طرف موڑ دیا۔

دن اگرچہ ڈھل چکا تھا مگر راول ڈیم کے ساتھ ملحقہ پارک میں رونق اپنے عروج پر تھی۔ زفیرہ کا دل چاہا کہ جھیل کے کنارے جا کر بیٹھے اور خاموش پانی کی بے آواز لہروں کے ہنگام میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ گاڑی پارکنگ میں لگانے کے بعد وہ ابھی اترنے والی تھی کہ ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کے شیشے کو کسی نے اُنگلی سے بجا دیا۔ بے دھیانی کے عالم میں ہونے والی دستک نے اُسے گڑبڑانے سے زیادہ ڈرا دیا۔ وہ سامنے بنے ہوئے کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹال سے آیا تھا اور چائے کافی یا جوس کا آرڈر لینا چاہ رہا تھا۔ باہر کھلے آسمان کے نیچے مچھروں کے تیرتے ہوئے غول دیکھے تو اُس کا جھیل کنارے جا کر بیٹھنے کا ارادہ گاڑی میں بیٹھ کر کافی پینے میں بدل گیا۔ گاڑی سے کچھ دور بچوں کے گروپس اپنے والدین کی لاپرواہی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کھیل ہی کھیل میں ایک دوسرے کی ٹھکائی کر رہے تھے لیکن کوئی بھی گلے سے رونے کی آواز نہیں نکال رہا تھا مبادا والدین کو خبر ہونے پر گیم سے نہ آؤٹ ہونا پڑے۔

زفیرہ احمد کو لگا کہ وہ بھی کسی ایسی ہی ڈرٹی گیم میں پھنسی ہوئی کوئی بچی ہے جسے دوسرے بچے مل کر پیٹ رہے ہیں۔ اُس کے منہ پر پڑنے والے پے در پے مُکّے اُسے رونے اور چیخنے چلانے پر مجبور کر رہے تھے مگر وہ پھر بھی رو نہیں رہی کہ کہیں اُسے تماشا بنا کر گیم ہی سے نہ نکال

دیا جائے۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اگر اپنی پٹائی کا بدلہ لینا ہے تو اُس کا گیم میں رہنا بہت ضروری ہے۔ وہ حیران تھی کہ یہ عقدہ اب تک اُس پر کیوں نہ کھلا کہ شکست گیم سے نکل جانے میں ہے، گیم میں رہ کر ہارنے والا کبھی شکست خوردہ نہیں ہوتا، وہ کبھی نہ کبھی ضرور جیتتا ہے۔ ابھی وہ حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ ہی رہی تھی کہ اُس کے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اگلی سیٹ پر پڑے ہوئے سیل فون کی اسکرین پر ایک نمبر چمک رہا تھا، بغیر نام کا قطعی اجنبی نمبر۔

''کون ہو سکتا ہے ایسے میں کہ جو ایک دیوالیہ ہو چکی کمپنی کی چیف ایگزیکٹو کو فون کرے؟ شاید کسی اخبار کا رپورٹر جو پورنز کی دنیا میں ایک پاکستانی عورت کی انٹری کو اُس کی رہی سہی دھجیاں اُڑا کر سیلیبریٹ کرنا چاہتا ہے؟ یا پھر کسی تیسرے درجے کے ٹی وی چینل کا کوئی بلیک میلر رپورٹر جو اُس کی بربادی کا تمسخر اُڑا کر اپنی ریٹنگ بڑھانا چاہ رہا تھا۔''

گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ ''میں تو سماج میں باعزت کہلانے کے تمام مروجہ اصول و ضوابط سے ماورا ہو چکی ــــ اب جو بھی پچوڑے، جو بھی بھنبوڑے ذلت کی اِس لاش کو، اِس سے لاش کو کیا فرق پڑتا ہے ــــ برباد ہو کر کھنڈر ہو چکے گھر کی کچھ اور اینٹیں اُکھاڑ لی جائیں تو کھنڈر کا کیا جاتا ہے، وہ تو کھنڈر ہی رہتا ہے۔ یہی پوچھے گا ناں کہ مجھے کب یہ شوق ہوا سیاہ فام مردوں کے ساتھ گروپ سیکس اور پھر اُس کی موویز بنوانے کا؟ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ میں جنسی جنونی کب سے ہوئی؟ کتوں کے ساتھ سیکس کرتے کرتے مردوں کو کب سے کتا سمجھنے لگی؟ مجھے اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' زفیرہ احمد نے کچھ بھی سوچے بغیر فون اُٹھا کر ریسیو کر لیا۔

بہت مہذب آواز تھی دوسری جانب۔ ''میڈم! کیا آپ کچھ دیر کے لیے چک شہزاد آ سکتی ہیں؟ میں جانتا ہوں اصولاً تو مجھے آپ کے ہاں آنا چاہیئے تھا مگر جس قسم کے حالات کا آپ کو سامنا ہے، اُس کا تقاضا یہی تھا کہ میں آپ کو اپنے ہاں آنے کی زحمت دیتا تا کہ گفتگو کا بھرم رہ سکے۔''

''سوری! نہ تو میں آپ کو جانتی ہوں اور نہ ہی ایک انٹرپرینیور عورت ہونے کے باوجود میرا کسی اجنبی کی اجنبی جگہ پر جانا مجھے اجازت دیتا ہے۔''

''میڈم! فون نہ بند کیجئے گا...... آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں...... میں نے آپ کی کمپنی کے بارے میں بہت ضروری بات کرنی ہے کہ کل اُس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے......ضدمت کیجیئے...... مانا کہ آپ کا اعتماد مجروح ہوا ہے لیکن ہر کوئی بڑا صاحب نہیں ہوتا کہ جس کا نام بڑا اور کام انتہائی چھوٹا بلکہ گھٹیا ہو۔''

زفیرہ احمد چونک اُٹھی۔ فون پر جو بھی تھا اُس کے بارے میں انتہائی باخبر تھا۔ اُس کے لہجے سے تصنع، تمسخر یا چھل کی بجائے دردمندی نمایاں تھی۔ '' اب تک جو میرے ساتھ ہو چکا اُس سے زیادہ اَب اور کیا ہونا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ میرے لیے کوئی موقع ہو دلدل سے نکلنے کا؟ لیکن یہ کوئی اور سازش بھی تو ہوسکتی ہے؟ کوئی اور بڑی دلدل؟ لیکن جو پہلے ہی گردن تک دلدل میں پھنسی ہو، اُسے کوئی کسی اور دلدل میں کیوں پھینکے گا؟ ایک عورت جس جس پہلو سے بھی برباد کی جاسکتی ہے، میں کی جا چکی ہوں تو پھر ایسے میں کیا کسی سے ڈرنا...... اب کوئی دوستی نہ سہی، دشمنی سہی!!''

''میڈم! آپ بہت دیر کررہی ہیں۔'' اجنبی شخص کا لہجہ بھی اجنبی ہونے لگا تھا۔

''مجھے چک شہزاد کہاں آنا ہوگا؟''...... زفیرہ نئی مہم جوئی کے لیے خود کو پوری طرح تیار کرچکی تھی۔

''راول چوک میں فور فائیو سکس سیون نمبر کی سفید پراڈو آپ کی منتظر ہے، بس اُسی کو فالو کرلیجئے۔'' اجنبی فون بند ہو چکا تھا۔

اگلے پندرہ منٹ کے بعد زفیرہ احمد چک شہزاد اسلام آباد کے ایک وسیع و عریض اور آراستہ و پیراستہ فارم ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔ سیاہ پینٹ کوٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس ایک خوبرو شخص نے اُسے نہایت تپاک سے ریسیو کیا۔ پینتیس چھتیس برس کے اس نوجوان نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا نام شاید گوندل بتایا تھا۔ زفیرہ احمد کو صوفے پر بٹھانے کے بعد گوندل نے خود ہی ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں بنی ہوئی بار سے بلیک ڈاگ کے دو پیگ بنائے اور نہایت ادب سے اُسے پیش کرنے کے بعد اپنا پیگ لے کر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

''میڈم! آپ ریلکس ہوجائیں تو پھر کام کی بات کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اُس نے پیگ ہلکا سا ہوا میں بلند کیا اور چھوٹا سا سپ لینے کے بعد اُسے میز پر رکھ دیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ محض زفیرہ احمد کا ساتھ دینے کے لیے وہسکی پی رہا تھا۔

''آپ کام کی بات کیجئے! میں ریلکس ہوں۔'' کہنے کو تو زفیرہ نے یہ جملہ کہہ دیا مگر اُس کا لیا ہوا وہسکی کا لمبا گھونٹ بتا رہا تھا کہ وہ پرسکون نہیں بلکہ اُتاولی میں ہے۔ اُسے تکریم سے لانا، اُس کے پسندیدہ برانڈ کی شراب پیش کرنا اور اُس سے اُس کی چھینی جارہی کمپنی کی بات کرنا، یہ سب کچھ معمولاً نہیں ہو رہا تھا بلکہ غیر معمولی تھا۔ گوندل نے بھی مزید کسی توقف کے بغیر میز پر پہلے سے رکھی ہوئی فائل اُٹھائی اور نہایت احترام کے ساتھ زفیرہ کو پیش کردی۔

''کیا ہے اِس میں؟''...... زفیرہ کا ذہنی تجسس اُس کی آنکھوں میں در آیا تھا۔

''آپ کی کمپنی کے فروخت شدہ انچاس فیصد شیئرز۔''

''مگر یہ آپ کے پاس کیسے آئے؟'' زفیرہ کے ہاتھ سے پیگ چھوٹنے لگا تھا۔

''خریدے ہیں۔''...... گوندل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''لیکن آج اسٹاک مارکیٹ بند ہونے تک تو اِن کا کوئی خریدار نہیں تھا؟''

''میڈم! یہ پاکستان ہے...... یہاں کرامات ہوتی رہتی ہیں۔ آپ فائل کھولیے اور خود ہی دیکھئے کہ یہ تین لوگوں نے آج ہی خریدے ہیں اور کل اِن کا ریٹ اتنا زیادہ ہو چکا ہوگا کہ آپ کے دشمن دیوالیہ ہوکر بھی انہیں خرید نہیں پائیں گے۔ آپ انہیں اپنے پاس رکھئے اور کل صبح نئے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا اجلاس بلا کر کمپنی چلایئے پھر سے دبنگ انداز میں ...... اور ہاں بزنس کی فکر نہ کریں، بس چند دن اور...... اور اِس دوران سٹے خارج کرایئے عدالتوں سے۔''

فائل اور فائل میں رکھے ہوئے پرچیز سرٹیفکیٹ زفیرہ احمد کے کپکپاتے ہاتھوں میں کپکپانے لگے تھے۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ پلک جھپکتے ہی اِس طرح کھل جا سم سم ہوسکتا ہے۔ اُس نے پرنم آنکھوں سے گوندل کی طرف دیکھا جو بدستور مسکرائے چلا جا رہا تھا۔

''اِس کے بدلے میں مجھے کیا قیمت چکانا ہوگی؟''

''مجھے نہیں معلوم لیکن جتنا میں جانتا ہوں...... کچھ بھی نہیں !!''

''تو پھر مجھ پر یہ کروڑوں کی مہربانی کیوں؟''

''میڈم! میں نہیں جانتا اور نہ ہی میں نے خود سے کچھ کیا ہے...... یہ ہمارے باس کا حکم تھا اور بس!! میں نے صرف حکم کی تعمیل کی ہے۔''

''باس؟ کون باس؟ اور مجھ پر کیوں یہ مہربانی؟'' ...... زفیرہ احمد مسلسل حیرت کے جھٹکوں کی زد میں تھی۔

''آپ نہیں جانتی انہیں ...... وہ بھی آپ سے ملیں گے لیکن پہلے آپ اپنی کمپنی کو پھر سے چلا لیں، ایسٹیبلش (establish) کرلیں تاکہ ملاقات اچھے ماحول میں ہو اور ہاں! بے فکر ہو جایئے اس بات کی گارنٹی کے ساتھ کہ اب مہ نور ایڈورٹائزرز کے شیئرز کا ریٹ نہیں گرنے والا کیونکہ سو فیصد شیئرز آپ کے اپنے پاس ہیں۔'' گوندل کھڑا ہوا تو زفیرہ احمد کو بھی کھڑا ہونا پڑا لیکن وہ ابھی تک ابہام کے بھنور میں تھی کہ ایسا کیسے ہو گیا اور اگر ہوا بھی تو کس قیمت پر!!

۞

﴿ ۳۰ ﴾

ماہین جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے رکشے میں بیٹھ گئی تھی ویسے ہی ذہنی گومگو اور ابہام کے عذاب سے سراسیماں محلّہ وارث خان میں اپنے گھر سے کچھ پہلے مسجد کے موڑ پر اتر گئی۔ کرائے کی ادائیگی کے لیے کلثوم کا دیا ہوا ایک ہزار کا نوٹ کام آیا۔ ابھی وہ رکشا والے سے بقایا رقم وصول کر ہی رہی تھی کہ اُس کا والد سر جھکائے ایک ایک قدم بمشکل اُٹھاتا ہوا اُس کے قریب سے گزر کر مسجد کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کسی انہونی کے خوف سے بدن تو سُن ہوا سو ہوا لیکن باپ کو یوں کمزور و ناتواں دیکھ کر آنکھیں بھی بھر آئیں۔ جوان بیٹی کے یوں برباد ہونے کا دکھ باپ کو جیتے جی پچھاڑ چکا تھا۔ نجانے کیسے اُس نے بیٹی کی گرفتاری کے بعد اُسے جیتے جی مردہ سمجھ لینے کا صدمہ سہا ہوگا اور کس جگرے سے رشتہ داروں اور ہمسایوں کی ناقدانہ نگاہوں کا سامنا کیا ہوگا؟

رکشے والے سے بقایا لینے کے بعد بھی چند ثانیے وہ وہیں ٹھٹکی کھڑی رہی پھر ہمت کی اور قدم اپنے گھر کی جانب بڑھا لیے۔ والد کا مسجد میں ہونا غنیمت ثابت ہوا کہ مین گیٹ اندر سے بند نہیں تھا لہذا وہ زندگی میں پہلی بار اپنے گھر میں یوں داخل ہوئی کہ جیسے کوئی لٹیرا نقب لگا کر لوٹنے کو آتا ہے۔ اتنے دنوں کے بعد گھر کو اندر سے دیکھا تو ماہین کا دل بھر آیا۔ سب کچھ ویسے کا ویسے تھا مگر آسیب زدہ سا، ملگجی تاریکی میں ڈوبا ہوا کہ جس میں صبح کی نورانی روشنی بھی اُجلا پن پیدا نہیں کر پا رہی تھی۔ تمام کمرے اندر سے بند تھے۔ اُسے یاد آیا کہ والد کے مسجد میں چلے جانے کے بعد اُس کی اماں بھی برآمدے میں رکھے تخت پوش پر فجر کی نماز پڑھا کرتی

تھی۔ مگر آج وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی اپنی آنکھوں کے سامنے کا منظر مسمرائز انداز میں دیکھتی رہی تاوقتیکہ اِدھر اُدھر سے ہلکی پھلکی آوازیں آنا نہ شروع ہو گئیں۔ وہ بے اختیار اپنے کمرے کی طرف بڑھی، دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گئی۔ سب کچھ جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ گرفتاری کی رات جو کپڑے اُس نے صبح پہننے کے واسطے استری کر کے کھونٹی سے لٹکائے تھے وہ بھی وہیں کے وہیں، ویسے کے ویسے لٹکے ہوئے تھے۔ گو کہ کمرے میں زیادہ روشنی نہیں تھی مگر اتنا اندھیرا بھی نہیں تھا کہ لائٹ جلانے کا خطرہ مول لینا پڑتا۔ ابھی وہ اپنی مسہری کی جانب بڑھی ہی تھی کہ احساس ہوا کمرے میں اُس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ وہ فوراً پلٹی تو دیکھا کہ دروازے کے ساتھ والے کونے میں بچھی ہوئی جائے نماز پر اُس کی اماں نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیر رہی تھی۔ اماں کو یوں اچانک اپنے سامنے پا کر ماہین گڑبڑا سی گئی، اِس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی یا جا کر ماں سے لپٹتی، ماں نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو ماہین نے شرمندگی سے نگاہیں جھکا لیں اور مسہری کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی۔

ماہین نے محسوس کیا کہ اماں دعا مانگتے ہوئے دوپٹے کے پلو میں چہرہ چھپائے ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ اگرچہ ماں کو یوں آنسو بہاتا دیکھ کر ماہین کو آنسو روکنا مشکل ہو گیا تھا مگر پھر بھی نجانے وہ کون سی کیفیت تھی کہ جس کے طاری ہوتے ہوئے اُس کا اندر باہر سبھی پتھر بن کر رہ گیا۔ یہ شاید ردِ عمل تھا اُن تمام عذابوں کا کہ جن سے گزر کر وہ ایک بار پھر اپنے ہی کمرے میں اپنی ماں کے روبرو تھی یا پھر شاید اُس ہزیمت کو کوئی جواز دینے کی کوشش کہ جو اُس کی حرکتوں کی وجہ سے پورے خاندان کا مقدر ہو چکی تھی۔ وہ رونا چاہتے ہوئے بھی رونا نہیں چاہتی تھی کم از کم اپنے گھر والوں کے سامنے تو ہرگز نہیں۔ اماں کی دعا لمبی ہوئی تو وہ پھر سے سجدے میں چلی گئی۔ ماہین حیران تھی کہ اُس جیسی بیٹیوں کا یوں اتفاقیہ گھروں کو واپس لوٹنا بھی ماؤں کے لیے کہیں کوئی مقامِ شکر ہوتا ہے کہ جس کے لیے سجدۂ شکر واجب ہو؟

اماں نماز، نماز کے بعد دعا اور دعا میں کئی بار سجدوں کے بعد اُٹھی تو بے اختیار ماہین کو گلے سے لگا کر رونے لگی۔ یہ رونا بھی کیا رونا تھا کہ جس میں طمانیت اور تشکر کے ساتھ ساتھ

خوف بھی گندھا ہوا تھا۔ لیکن اِس دوران بھی ماہین کسی بے جان بُت کی مانند ہی رہی کہ جس میں آنسو آنکھوں سے بہنے کی بجائے بدن میں دراڑیں ڈال کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُدھر اماں کی آنکھوں سے بہتے ہوئے طمانیت اور تشکر کے یہ آنسو بہت جلد ہی کمرے سے باہر موجود خوف کے سبب خشک ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنی بیٹی کو منہ سے کچھ بولے بغیر بتائے چلی جا رہی تھی کہ مردانہ سماج کی رو سے اِس گھر کا مالک اِس کمرے کو اُس کی قبر قرار دے چکا کہ جہاں وہ صبح سویرے نماز پڑھنے اور پھول چڑھانے چلی آتی ہے۔ ''دیکھ اب اِس قبر سے باہر نہیں آنا......!!''

''لیکن ماں! مجھے ابھی جینا ہے......''

''تو پھر جہاں سے آئی ہے، جیسے آئی ہے ویسے ہی چلی جا......لیکن پہلے ناشتہ کر لے اور پھر سو جا کچھ دیر کے لیے، بہت جاگی ہوئی لگتی ہو......میں کمرے کو باہر سے بند کر دیتی ہوں۔ وہ سپاہی بھی کبھی کبھار تمہیں پھر سے پکڑنے چلا آتا ہے۔ اب تو پولیس کے ہاتھوں بے عزت ہوتے رہنا عادت سی بن گئی ہے۔''

ماں دروازے کو باہر سے بند کر کے چلی گئی تو ماہین کو یوں لگا کہ وہ واقعی اپنے باپ کی بنائی ہوئی قبر میں دفن ہو چکی کہ جس کی مجاوری ہمارے نظامِ انصاف کے پاس تھی۔ پولیس جانتی تھی کہ وہ بے گناہ ہے مگر پھر بھی کاغذوں میں پہلی گرفتاری ڈالے بغیر اب بھی اُس کے بدن کو رگیدتے رہنے کے لیے اُس کی ٹوہ میں تھی۔ اور ایک ماں تھی کہ اُس کے نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کی صبح سویرے صحن میں لگی ربیل سے موتیے کے پھول توڑ کر کمرے میں لانے کی عادت نہیں بھولی تھی۔ یہ رشتوں کے احساس کی خوشبو تھی یا موتیے کے پھولوں کی خوشبو کہ جس نے مشامِ جاں معطر کر رکھا تھا۔ مگر اب کے اُس نے ماں کے بدن کی خوشبو کو اپنے احساس سے لپٹایا اور جی بھر کر رو لی۔ آنکھیں کیا دھلیں، بدن کے اندر تک سے پوری کثافتیں ہی دھل گئیں۔

اتنے میں دروازہ باہر سے کھلا تو ماں اُس کے لیے اُس کا پسندیدہ قیمے والا پراٹھا اور سبز مرچ کے قتلوں والا انڈے کا آملیٹ بنا لائی تھی۔ ماہین کا دل چاہا کہ اب وہ کہیں نہ جائے، اِسی

قبر میں رہ جائے کہ جہاں گھر جیسی مہک تو تھی۔ گھر سے باہر تو نرے کمرے ہوتے ہیں، کوٹھے اور مکان جن میں سبھی کچھ ہوتا ہے مگر گھر جیسی مہک نہیں ہوتی۔ لیکن کیا کرے کہ کمرہ قبر ہو کر بھی پولیس کی زد میں ہے اور پولیس اُسے نشانِ عبرت بنانے پر تلی ہوئی۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ سوئی تو کہیں شام کو آنکھ کھلی۔ اُس کا بستر مانوس بدن کی حرارت پا کر ماں کی گود کی مانند ہو گیا تھا۔ واقعی نجانے کب کی جاگی ہوئی ماہین کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ سونے کے باوجود نیند سے محرومی انسان کے بدن سے زندگی تو کیا زندگی کی علامات تک نچوڑ لیتی ہے۔ نیند سے جاگ جانے کے کافی دیر بعد وہ شعوری بیداری کی طرف آئی تو معلوم ہوا کہ اُس کی اماں بھی کب سے کمرے میں موجود تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماں کا چہرہ بتا رہا تھا کہ شام ہو چکی ہے اور اَب اُسے گھر چھوڑ دینا چاہیے۔

''شام ڈھلے تو پرندے بھی اپنے بچوں کو گھونسلے سے باہر نہیں جانے دیتے لیکن میں کیسی ماں ہوں کہ جس کے پاس بیٹی کو رات کی رات روک لینے کا بھی اختیار نہیں بلکہ صرف ایک گھنٹہ ہے تمہیں کسی نئی مصیبت سے بچانے کے لیے، اُس کے بعد تمہارا باپ اور بھائی دونوں گھر پر ہوں گے۔''

ماہین کچھ بھی بولے بِنا صرف ماں کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔

''تم منہ ہاتھ دھو لو...... میں کھانا لاتی ہوں...... اور ہاں یہ رکھا ہے تمہارا سوٹ کیس جس میں تمہارے کپڑے اور کچھ رقم رکھی ہے جو تمہاری اِس سال کی تعلیم کے لیے پس انداز کی تھی لیکن میں پریشان ہوں کہ تم اِس وقت جاؤ گی کہاں؟! اگر کچھ دن کے لیے اپنے ماموں کے ہاں چھپ کر رہنا چاہو تو میں فون کر دیتی ہوں، امید ہے وہ مان رکھ لے گا .... تم سیدھی وہیں چلی جاؤ۔''

''نہیں اَمی! جب اپنا گھر مجھے پناہ نہیں دے سکتا تو کسی اور سے کیا توقع رکھنا.... ویسے بھی بہت جگہیں ہیں اِس شہر میں چھپنے کے لیے..... بس قیمت چکانی آنی چاہیے۔'' جملے کے آخری لفظ ماہین نے کچھ اِس انداز میں بولے کہ ماں لرز کر رہ گئی لیکن پھر بھی کچھ کہے بغیر کھانا لانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ماں کے کھانا لے کر آنے تک ماہین خود کو گھر چھوڑنے

کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔ اُس نے ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اوپر اُٹھائے اور نہایت حوصلے سے، آنکھوں میں نمی لائے بغیر چوم لیے۔

''اَمی! کھانا نہیں کھا سکوں گی اَب..... چلتی ہوں..... میں نے پانچ ہزار روپے نکال لیے ہیں لفافے میں سے، باقی تم کل میرے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا جو میں نے لفافے پر لکھ دیا ہے........ اپنا بہت خیال رکھنا۔'' ماہین نے بہت گہرائی میں جا کر ماں کی آنکھوں میں جھانکا مگر وہاں آنسوؤں میں بھیگی ہوئی دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا حتیٰ کہ یہ تنبیہہ بھی نہیں کہ باپ اور بھائی کی غیرت کے پندار کا بھرم رکھنا۔

گھر سے نکل آنے کے بعد اُسے راولپنڈی اسلام آباد کے جڑواں شہر ایک ایسی وسیع و عریض کائنات کی مانند دکھائی دینے لگے کہ جہاں شکار ہونا بھی آسان اور شکاری بننا بھی مشکل نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے دنوں میں اُس نے کلاس فیلوز سے سپر مارکیٹ کے اطراف سیکٹر ایف سکس میں پھیلے ہوئے نجی ورکنگ وومن ہاسٹلز کے آسان رہن سہن اور سہولتوں کے بارے میں بہت سن رکھا تھا۔ لہٰذا محلّہ وارث خان سے وہ سیدھی ایک ایسے ہی ہوسٹل پہنچی مگر شناختی کارڈ نہ ہونے کے سبب کمرہ حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ یہی مشکل دوسرے اور تیسرے ہاسٹل میں بھی پیش آئی تو سب سُنا ہوا جھوٹ لگنے لگا۔ مناسب یہی تھا کہ آج کی رات سکستھ روڈ راولپنڈی کے ہاسٹلز میں اپنی کسی کلاس فیلو کے توسط سے قسمت آزمائی کی جائے لیکن اندیشہ بات کھل جانے کا تھا کیونکہ گھر جانے پر ماں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ پولیس اُس کی تلاش میں یونیورسٹی بھی جاتی رہی ہے۔

ابھی وہ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ آخری ہوسٹل کا چوکیدار اُسے بلانے آ گیا۔ اب کے ہوسٹل وارڈن کے ساتھ ہوسٹل کا مالک بھی بیٹھا ہوا تھا۔ چھوٹی آنکھیں، چپٹی ناک، قد درمیانے سے بھی قدرے چھوٹا، عمر یہی کوئی چالیس برس لیکن چہرے پر عجیب سا شہوت آمیز حرامی پن جسے ماہین نے پہلی نظر ہی میں بھانپ لیا تبھی کچھ اِس انداز میں ہونٹ سکیڑ کر آنکھوں سے کلام کیا کہ اُس کی جانب سے شناختی کارڈ جلد پیش کرنے کی یقین دہانی کو خود اُسی مالک نے ہی تصدیق کر دیا۔ ہوسٹل

وارڈن نے ماہانہ کرایہ معمول سے دگنا بتایا تو آنکھوں ہی آنکھوں میں طے پا جانے والے معاملات کے پیشِ نظر مالک ایک بار پھر آڑے آیا اور یوں وارڈن کو اُس مَد میں بھی ساٹھ فیصد رعایت کرنی پڑی۔

یہ ماہین کا ایک ایسی زندگی کی طرف پہلا پڑاؤ تھا کہ جس کا انتخاب اُس کی خواہش نہیں تھا اور نہ ہی اُس نے کبھی اِس طرح کی زندگی کا تصور کیا تھا۔ لیکن اُس کے جسم، ذہن اور گھریلو ماحول کے عدمِ توازن نے اُسے وقت سے پہلے ہی ایک ایسی لت سے آشنا کر دیا کہ جس کے بعد کوئی بھی عورت معمول کی جنسی زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہ جاتی۔ اگرچہ بلوغت کی حدود میں قدم رکھتے ہی ماہین کے بدن کی غیر معمولی جنسی طلب نے اُسے ٹیلی فونک تلذذ کی راہ پر لگا دیا تھا لیکن اِس کے باوجود اُس نے کوشش کی کہ اُس کا آئے روز کا جسمانی اُبال، جسمانی اتصال بننے کی بجائے گھریلو ضابطوں کی حد میں رہے لیکن اُس کی یہ خفی تدبیر نوید کی تقدیر کی نذر ہو گئی۔ ہاں مگر ہوٹل سے ہی شروع ہونے والے پے در پے جنسی تجربات نے جہاں اُس کے مزاج میں کسی حد تک ٹھہراؤ پیدا کیا وہیں نوید کے قتل کے الزام سے پیدا شدہ صورتحال نے اُسے مردوں کی دنیا میں اپنے آپ کو تولنے، برتنے اور شخصی سودے بازی میں بہتر سے بہتر بارگین کرنے کا ہنر سکھا دیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ اب اپنے آپ کو تولتے رہنے کا مرحلہ نہیں رہا بلکہ برتنے اور سودے بازی میں پلہ بھاری رکھنے کا ہے۔

شروع کے دنوں میں اُس نے کوشش کی کہ اپنے آپ کو زیادہ تر ہوسٹل تک ہی محدود رکھے لیکن اِس دوران اُس پے پھر ٹیلی فونک تلذذ کا بھوت سوار ہوا تو کئی مہم جو اُس کے دائرۂ شکار میں آتے چلے گئے۔ اب اُس نے موبائل فون بیلنس اور ایزی پیسہ کے ذریعے چھوٹی چھوٹی رقوم بٹورنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ بے ضرر دکھنے والے چنیدہ لوگوں سے میل ملاقات میں موبائل فون اور دوسری اشیائے ضرورت کا تقاضا کرنا بھی سیکھ لیا۔ لیکن ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے سبب ہوسٹل کے مالک کو سمجھنے میں غلطی ہو گئی۔ ماہین نے اُس کی اُتاول کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے اُسے محض زبانی وعدے وعید پر ہی ٹرخائے رکھا لیکن جب اُس نے لڑکی کی ہاسٹل کے باہر کی سرگرمیوں کی ٹوہ لگانی شروع کی تو معاملہ کھلتا چلا گیا کہ کس

طرح اُس کو بے وقوف بنایا جاتا رہا ہے۔ ماہین کا خیال تھا کہ دور دور رکھے جانے کے سبب اُس کی طلب میں مزید شدت پیدا ہو گی لیکن وہ اس طرح بدظن ہوا کہ صرف ایک مہینے بعد ہی اُسے ہوسٹل سے نکال باہر کیا۔

ماہین نے اِس سے سبق سیکھنے کی بجائے اُلٹا اِسی چلن کو اپنا وطیرہ بنا لیا۔ دوسرے سے تیسرا اور تیسرے سے چوتھا ہاسٹل بدلتا چلا گیا یوں دیکھتے ہی دیکھتے تین مہینے کے مختصر عرصے میں اُس نے اپنی مالی حالت اچھی خاصی بہتر کر لی۔ اِس دوران ماہین کی ملاقات نیئر جمیل نام کے ایک سر پھرے شخص سے ہوئی کہ جو عمر کے لحاظ سے پینتیس چالیس کے درمیان رہا ہو گا۔ ماہین نے پہلی بار اُسے فیس بک پر دیکھا تھا۔ عجیب گھامڑ سی صورت تھی اُس کی جس کے ایک کان سے دوسرے کان تک بے وقوفانہ ناگواری کے پھیلے ہوئے گھمبیر تاثرات۔ اُس کے مطابق وہ کسی نجی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر تھا مگر اُسے دیکھتے ہی پہلا تاثر کسی جاہل اور مردم بےزار شخص کا اُبھرتا۔ اچھی گاڑی، اچھی جاب اور بظاہر متمول ہوتے ہوئے بھی ابھی تک شادی نہیں کر سکا تھا۔ مردانہ وجاہت میں وہ اگر اوسط تھا تو شکل صورت بھی اُسی درجے کی تھی لیکن قرینِ قیاس یہی تھا کہ شادی اگر نہیں ہوئی تو اُس کی متلون مزاجی اور اکھڑ پن کے سبب نہیں ہوئی۔

لیکن اِس تاثر کے برعکس فون پر پہلی بار ہی اُس کی جنسی شدت سے لبریز گفتگو ماہین کو اُس کا گرویدہ بنا گئی۔ اُس کے پاس نہ تو الفاظ کی کمی تھی اور نہ ہی جذبات کی۔ ادب سے لے کر نفسیات، معاشیات، تاریخ، فنونِ لطیفہ، سماجی علوم اور جنسیات سبھی پر اُس کی علمی گرفت دیدنی تھی۔ جونہی وہ فون پر آتا ماہین کے جسم کے مسام مسام میں اضطراب کی آگ بھڑکاتا چلا جاتا۔ اِس آگ کو الاؤ بنانا جہاں اُس کے لیے ستار کے تار کو انگلیوں سے چھیڑ دینے کے مترادف تھا وہاں اِسی الاؤ کو پھر سے تسکین و طمانیت کی جھیل میں بدل دینا بھی محض الفاظ کی ترتیب کو سُروں کی ترتیب سے بدل دینے سے عبارت تھا۔

ماہین سے بالمشافہ ملاقاتیں شروع ہو جانے کے بعد بھی اُس کی توقعات کے برعکس نہ تو نیئر جمیل نے کبھی جسمانی اتصال کی خواہش ظاہر کی تھی اور نہ ہی اُس کے بدن کے نسوانی

کشش کے اعضا کو بھی چھونے کی کوشش۔ عجیب سا رویہ تھا اُس کا کہ ماہین کے روبرو وہ اُس سے بات بھی نہ کر پاتا اور جب کبھی ماہین کو جسمانی ہیجان سے نجات کی سوجھتی تو ایک ہی گھر میں ایک ہی بستر پر لیٹے ہوئے وہ موبائل فون لیے باہر گاڑی میں جا بیٹھتا اور اُس وقت واپس آتا کہ جب اُس کی زباندانی کی مہارت کے باعث ماہین پُرسکون ہو چکی ہوتی۔ لیکن کبھی کبھی بہت تھوڑی دیر کے لیے اُس پر نامعلوم سی برتری کا خبط کسی آسیب کی مانند سوار ہو جاتا۔ اُس مختصر سے دورانیے میں وہ ماہین سے کچھ اس قسم کا برتاؤ کرتا کہ جیسے وہ اُس سے عورت ہونے کا انتقام لے رہا ہو۔ تضحیک، تمسخر اور تذلیل۔ مسلسل ذہنی ایذا کی کھونٹی پر لٹکائے رکھنا۔ عموماً اُسے جذبات کی انتہا تک پہنچا کر اِس طرح منجدھار میں چھوڑ دیتا کہ ماہین کے پاس تڑپنے، سسکنے اور سلگتے رہنے کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہ رہتا۔ لیکن اس سے قطعی کے برعکس جب اُس کے ناز اُٹھانے کی طرف آتا تو نوازشوں کی انتہا کر دیتا۔ من چاہے ملبوسات، جیولری، کاسمیٹکس، ہوٹلنگ اور سیر تفریح کے علاوہ وہ سب کچھ جو ماہین کی خواہش ہو سکتی۔ نیئر جمیل سے بڑھتی قربت اگرچہ اُسے باقی لوگوں سے دور کرتی چلی گئی لیکن یہ قربت کبھی بھی اُس کی فراواں ہوتی ہوئی جسمانی تشنگی کے لیے قرار کا باعث نہیں ہو پا رہی تھی۔ اُن کے درمیان اس عجیب سے تعلق نے نجانے کیسی صورت اختیار کر لی تھی کہ دوری کا تصور ناپید ہو کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ ماہین کا زیادہ وقت نیئر جمیل کے ای الیون والے اپارٹمنٹ میں گزرنے لگا کہ جو اُس نے خاص طور پر ماہین سے ملاقاتوں کے لیے خرید رکھا تھا مگر یہاں قیام کے دوران سہولتوں کی فراوانی کے باوجود ہر وقت ماہین کو اپنی سانس رکتی ہوئی اور دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔

ٹیلی فونک تلذذ میں پھر سے کچھ دن گزار لینے کے بعد ماہین کی جسمانی خواہشات بے لگام ہونا شروع ہوئیں تو اُس پر وہی جنون طاری ہونے لگا کہ جس کا مداوا انسان کی مہذب خصلت میں رہتے ہوئے ممکن ہی نہیں تھا۔ ماہین پر طاری ہو چکے مسلسل چڑچڑے پن اور نیئر جمیل پر اب کے بہت کم وقفوں سے بار بار پڑنے والے خبطِ عظمت کے دوروں نے بہت جلد دونوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ماہین کو کوئی شبہ نہ رہا کہ نیئر جمیل نام کا یہ مرد اُس کی خلوت میں کبھی بھی مرد ثابت ہو سکے گا۔ اُدھر نیئر جمیل نے بھی سمجھ لیا کہ اُن دونوں کے

درمیان موجود قربت کی نوعیت کو ماہین کس نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ اُس کے سبھی شکوک رفع کرنے کے معاملے میں انجانے تذبذب اور گھبراہٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ ماہین کے مزاج میں موجود تمام تر اطاعت اُسے اکثر دکھاوا دکھائی دیتی۔ وہ بیک وقت ماہین کو اپنے تسلط میں رکھنا اور اُس سے جان بھی چھڑانا چاہتا تھا لیکن یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اُسے اپنی فتوحات کی فہرست میں شامل کیے بغیر چلتا کرے۔ کبھی کبھار وہ اُسے ایک نئے ڈھب کی محدود آزادی دیے جانے کے بارے میں بھی سوچتا کہ جس کے نتیجے میں اُس کا تسلط بھی قائم رہے اور ماہین بھی قرار میں رہے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ اُن کے درمیان تعلقات کی نوعیت اسٹاک ایکسچینج کے حصص بازار کی طرح ہو چکی تھی۔ نیئر اکثر سوچتا کہ وہ ماہین کے ساتھ محدود آزادیوں کی مشروط بات بحث میں لائے گا مگر ہر ملاقات میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہو جاتی کہ بات کا کرنا ممکن نہ رہتا اور اُس کی سوچ اُس کے ذہن تک محدود رہ جاتی۔ اُدھر تعلقات کی ابتری کے باوجود ماہین نے بھی کبھی اِس مسئلے پر رائے زنی کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے نظریہ ضرورت کی اَن لکھی دستاویز پر دکھائی نہ دینے والے دستخط کر دیے۔ لیکن یہ پریشر ککر پھٹ پڑنے کے لیے کسی بدقسمت لمحے کا منتظر تھا۔

۞

﴿ ۳۱ ﴾

زفیرہ احمد عجیب سی گومگو کی کیفیت میں گوندل کے فارم ہاؤس سے نکلنے ہی لگی تھی کہ اُسے ایک لمحے کے لیے رکنے کو کہا گیا لیکن انتہائی احترام کے ساتھ کیونکہ عین اُسی وقت گوندل کے سیل فون پر کسی کا فون آ گیا تھا۔ گوندل فون سننے کے بعد زفیرہ کے قریب آیا اور تمام ممکن لجاجت سے اُس کے قریب ہوکر کوئی سرگوشی کی جسے سنتے ہی زفیرہ کے چہرے کا رنگ قدرے متغیر ہوا لیکن اُسی لمحے اُس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر شیئرز کی خریداری کی فائل گوندل کو واپس تھمادی۔ گوندل نے آگے بڑھ کر زفیرہ احمد کی کار کا دروازہ کھولا اور اُس کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد آہستہ سے بند کرتے ہوئے ایک طرف ہوگیا۔

زفیرہ احمد نے فارم ہاؤس سے گاڑی نکالتے ہوئے کچھ زیادہ ہی عجلت کا مظاہرہ کیا۔ پہلے وہ اِس بات پر حیران بلکہ پریشان تھی کہ مہ نور ایڈورٹائزرز کے شیئرز خرید کر اُس کے حوالے کیوں کیے جارہے تھے اور اب اِس بات پر کہ فوری طور واپس کیوں لے لیے گئے۔ گو کہ گوندل نے یقین دہانی کرائی تھی کہ یہ فائل کل صبح نو بجے بہرصورت اُس کے آفس میں پہنچادی جائے گی لیکن پھر بھی ان سرٹیفکیٹ کی رات بھر کی تحویل کے لیے اُس پر اعتبار کا نہ کیا جانا اُسے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ معاملہ اگر صرف شیئرز کی حفاظت کا تھا تو تب بھی عورت ہونے کے ناتے وہ اُن کی بہتر حفاظت کرسکتی تھی اور اگر اِس کے علاوہ بھی کوئی خدشات یا مصلحتیں راہ میں حائل تھیں تو اُن کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکالا جاسکتا تھا لیکن یوں سرٹیفکیٹس کا واپس لے لیا جانا گوندل کے پورے کے پورے امیج کو تار تار کر گیا۔

دن بھر کی بیوسیت ختم ہونے کو ہی نہیں آرہی تھی۔ اُس نے کافی کا جو آرڈر راول لیک پارک میں دیا تھا وہ وہیں رہ گیا اور پینا پڑا بلیک ڈاگ کا ایک پیگ جو طبیعت کو شاید سکون دے پاتا مگر گوندل کی فائل واپس لینے کی حرکت کے سبب سب کچھ مکدر ہوکر رہ گیا۔ پورے دن کی خجالت اور ذہنی دباؤ کو گوندل جیسے آدمی کی ڈرٹی گیم نے اعصاب شکن تناؤ اور تشنج میں منقلب کر دیا تھا۔ اُسے اپنی پسندیدہ شراب اور محبوب ساتھی بلیک لبراڈار کی بہت طلب محسوس ہوئی۔ لیکن نجانے کیوں وہ اپنے فارم ہاؤس جانے سے خوفزدگی کی حد تک کترا رہی تھی۔ اُس کا دل چاہا کہ اپنی اکلوتی خالہ کے ہاں چلی جائے اور جی بھر کر روئے کہ جس کے ساتھ بچپن ہی سے اُس کا خصوصی التفات رہا تھا لیکن کیسے کرے گی ہمت اُس کے سامنے جانے کی۔ کم از کم اُس وقت تک تو نہیں کہ جب تک اپنا کھویا ہوا وقار بحال نہیں کر لیتی۔ وہ جانتی تھی کہ کھوئے ہوئے وقار کی بحالی دو چار ہفتوں یا مہینوں کی بات نہیں، شاید یہ روگ زندگی بھر چلے لیکن پھر بھی ایک کج رویانہ تفاخر تو تھا تو بس اتنا کہ بڑے صاحب کے توسط سے دنیا بھر کے سامنے برہنہ ہو چکے جسم کو وہ اپنی محبوب خالہ کے سامنے لے کر نہیں گئی۔

کچھ اِسی سے ملتا جلتا معاملہ فارم ہاؤس پر بھی درپیش تھا۔ اگر وہاں موجود ڈرائیور تمام روداد سے باخبر ہوسکتا ہے تو کُک اور چوکیدار کیوں نہیں؟ ہوسکتا ہے کہ وہاں رات کو اُس پر کوئی حملہ ہوجائے یا کسی ایسی ناخوشگوار صورتحال کہ جس میں کُک اور چوکیدار اُس کی مدد کو آنے کی بجائے روپوش رہنے کو ترجیح دیں۔ زفیرہ نے چاہا کہ آج کی شب اسلام آباد کے ریڈ زون میں واقع کسی فائیو اسٹار ہوٹل ہی میں قیام کر لیا جائے لیکن ایسے میں کہ جب بدن کا ایک ایک مسام روح کا ساتھ دینے سے انکاری ہو چکا ہو بدن کے تقاضے، ترجیحات کی اپنی فہرست مرتب کر لیتے ہیں کہ جس میں سرفہرست جسمانی تسکین، تلذذ اور جنوں جب کہ سب سے آخر میں خوف، خلجان اور خرد رہ جاتے ہیں۔ سو ہوٹل میں شب بسری کا خیال خام ہوا اور زفیرہ احمد نے گاڑی کا رخ مارگلہ کی پہاڑیوں کی طرف کر لیا۔

فارم ہاؤس مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہی گھر کے دروازے پر گاڑی روکے سوچتی رہی کہ اُس کے جانثار ملازموں نے اُسے کتنا جلد جسمانی اور معاشی طور پر

مردہ سمجھ لیا ہے۔ اُس نے جان بوجھ کر کافی دیر تک گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند رکھنے کے ساتھ ساتھ ہارن بجانے سے بھی گریز کیا۔ بظاہر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ زفیرہ احمد نے سوچا کہ اگر اس دوران کوئی بھی دشمن یہ چھوٹا سا گیٹ پھلانگ کر اندر آن گھسے تو کون خبر لے گا کہ تھا کون اور ہوا کیا۔ اتنے میں اُس نے محسوس کیا کہ نہ صرف کوئی گیٹ کے عقب میں اِدھر اُدھر تیزی سے گھوم رہا ہے بلکہ بار بار گیٹ کے اوپر اُچھل کر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے چونکہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لہٰذا زفیرہ احمد نے گاڑی کی پارکنگ لائٹس آن کر لیں۔ اب کے اندر سے جو کوئی اُچھلا وہ شونی تھا..... زفیرہ کا محبوب لبراڈار۔

زفیرہ کا دل بھر آیا۔ جن ملازموں کو اُس نے عطا اور داد و دہش کے معاملات میں ہمیشہ مقدم رکھا، وہ اُس کی آمد کی کوئی امید نہ رکھتے ہوئے پہلے ہی روز بھلا بیٹھے تھے لیکن ایک جانور اُس کی عدم موجودگی میں بھی محض اُس کے آمد کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے کتنا اُتاولا ہو رہا تھا۔ اُس نے گاڑی میں بیٹھے بٹھائے ہی مخصوص انداز میں ہارن دیا۔ ہارن کا ردِعمل بنگلے کے اندر سے تو خاصی دیر کے بعد ملا لیکن اس دوران شونی اتنا بے چین، مضطرب اور اُداس تھا کہ اپنی زندگی تک کو داؤ پر لگا کر اُس نے کسی نہ کسی طور گیٹ پھلانگ لیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی سے لپٹ کر اگلے دونوں پنجوں کے ناخنوں سے نہ پڑنے والے نشان بنانے لگا۔ لیکن زفیرہ نے تاخیر کا موقع دیے بغیر مخالف سمت کا دروازہ کھول کر اُسے اندر اپنے پاس بُلا لیا۔ شونی پر کوئی پاگل پن سا سوار تھا۔ کبھی اُسے لپٹنے کی کوشش کرتا، کبھی اُس کے ہاتھوں کو اپنی تھوتھنی سے چھوتا اور کبھی اُس کے پاؤں کی طرف لپکتا جو کافی نیچے ہونے کی وجہ سے اُس کی پہنچ سے دور تھے۔ اپنے جذبات کا اظہار کر چکا تھا تو تھوتھنی زفیرہ کے کندھے سے ٹکالی اور زبان نکال کر خوشی سے ہانپنے لگا۔

اتنے میں خانساماں نے فارم ہاؤس کا گیٹ کھولا اور جونہی زفیرہ کی گاڑی اندر داخل ہوئی وہ تیزی سے مختلف جگہوں پر لگی ہوئی لائٹس آن کرنے لگا یوں دیکھتے ہی دیکھتے پورا بنگلہ پھر سے جگمگا اُٹھا۔ خانساماں کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ اِس سے پہلے کہ زفیرہ اُس سے چوکیدار کے بارے میں پوچھتی وہ خود ہی بتانے لگا کہ اوپر پہاڑ پر اُس کا بچہ بیمار تھا لہٰذا وہ چلا

گیا۔ دونوں گن مین کو بھی ملیریا ہو گیا اور وہ ڈاکٹر کو دکھانے گئے ہیں، شاید آج نہ آئیں۔

''مجھ سے فون پر پوچھ لیا ہوتا۔'' زفیرہ کوشش کے باوجود چہرے پر چھایا ہوا تناؤ اور برانگیختگی کم نہیں کر پا رہی تھی۔

''بہت کوشش کی مگر آپ کا فون لگ نہیں رہا تھا۔'' صاف لگ رہا تھا کہ خانساماں جھوٹ بول رہا ہے۔ پھر بھی اُس نے غصے پر قابو پانے کی اپنی سی کوشش کی مگر جب ناکام ہوئی تو لائبریری میں چلی آئی اور جلدی جلدی بلیک ڈاگ کی بوتل نکال کر ایک لمبا سا گھونٹ لینے کے لیے بوتل ہی منہ کو لگا لی۔ شدید تلخی گلے سے سینے تک اُتری تو روہانسی ہو گئی۔

''کیوں جھوٹ بولتے ہیں یہ بھڑوے مجھ سے؟ کیا کوئی ایک بھی آدمی نہیں اِس دنیا میں جو مجھ سے سچ بولے، جس پر اعتماد کیا جا سکے؟ کیا کمی رکھی ہوئی ہے میں نے اِن کا خیال کرنے میں۔'' شونی بدستور اُس کے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، اُن پر اپنی زبان پھیر رہا تھا، کوشش کر رہا تھا کہ زفیرہ کے چہرے پر مسکراہٹ آئے۔ زفیرہ کے چہرے پر مسکراہٹ تو کیا آنی تھی، کچھ کچھ سکون پھیلنا شروع ہوا تو اُس نے اپنے لیے گلاس اور شونی کے لیے اُس کا مخصوص بلوریں کٹورا الماری سے نکالا کہ جس میں وہ شبِ عنایت مے نوشی میں زفیرہ کا ساتھ دیا کرتا تھا۔ ابھی اُس نے پیگ بنائے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اسکرین پر ایک مسکراتی ہوئی حسین لڑکی کی تصویر بار بار جھمک رہی تھی۔

''دُرخانئے !!!......'' زفیرہ احمد کے چہرے پر خوشگوار حیرت کے تاثرات اُبھرے اور اُس نے فون اُٹھا کر کال ریسیو کرتے ہوئے اِس سے پہلے کہ درخانئے بولتی، زفیرہ خود بول پڑی۔

''درخانئے! آج اتنی مدت کے بعد!''

''میم! آپ کے اور میرے بیچ میں جو رشتہ ہے، اُس پر مدت اثر انداز ہوتی ہے کیا؟ لیکن آپ بتائیں، آپ ہیں کیسی؟ ویسی ہی ڈیشنگ اور دبنگ ناں!!''

''میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم کہاں ہو؟''

''میں نے کہاں ہونا ہے میم! بس یہاں مونال تک آئی ہوئی ہوں......سوچا آپ کو ملتی

چلوں۔'' درخانئے نے اپنے لہجے میں اشتیاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''مگر میں مونال میں تو نہیں ہوتی......''

''جانتی ہوں آپ مونال میں نہیں ہوتیں مگر مونال کے قریب تو ہوتی ہیں ناں......''

زفیرہ ایک دم گڑبڑا کر رہ گئی۔ ''مگر تمہیں کیسے معلوم؟''

''میم یہ کوئی سیکرٹ تو نہیں...... every body knows۔''

''زفیرہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''اکیلی ہوں؟''

''ہمیشہ سے اکیلی، اب تو اور بھی اکیلی!......'' درخانئے نے جواب کو ہلکا پھلکا بنانے کی کوشش کی۔

''آجاؤ! میں تمہارے لیے پیگ بنا کر رکھتی ہوں...... ہاں اور سُنو! میرے پاس اِس وقت تمہارے برانڈ کے سگریٹ نہیں ہوں گے، لیتی آنا۔'' زفیرہ موڈ کو نارمل رکھنے کی تدبیر کے باوجود مسلسل سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔

''آپ فکر نہ کریں میم! میں اپنے برانڈ کی ہر چیز اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتی ہوں۔'' اب کے درخانئے کا قہقہہ زندگی سے بھرپور تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں فارم ہاؤس کی لائبریری میں آمنے سامنے بیٹھی بلیک ڈاگ کی چسکیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں جب کہ دوسرا بلیک ڈاگ شونی اُن کی صوفہ کرسیوں کے درمیان میں کچھ فاصلے پر بیٹھا اپنے بلوریں پیالے میں سے انہیں کے انداز میں برابر برابر وقفوں سے زبان ڈبو کر لطف کشید کر رہا تھا۔ زفیرہ کو وہ دن یاد آ رہا تھا کہ جب سترہ اٹھارہ برس کی یہ سواتی لڑکی کئی ہاتھوں اور کئی بستروں سے گزر کر اُس کے پاس ماڈلنگ کے بریک تھرو کے لیے اُس وقت کے ایک صوبائی گورنر کے سفارشی فون کے ذریعے پہنچی تھی۔ درخانئے جسمانی طور پر اِس قدر زیادہ رگیدے جانے کے باوجود اچھی خاصی تر و تازہ تھی۔ مزاج کی نرماہٹ اور رویے میں عدم تکبر نے اُسے بہت جلد نو آموز ماڈلز کے اُس گروپ میں شامل کرا لیا کہ جن پر زفیرہ احمد مہربان رہا کرتی تھی۔ لہٰذا بہت جلد وہ ایک ملٹی نیشنل تجارتی ادارے کی بہت بڑی اشتہاری مہم کے لیے منتخب کر لی گئی اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک مسلی اور کچلی ہوئی لڑکی

کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن کر رہ گئی۔

اِس کے بعد وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ سازشیں، فریب، مکاری۔ دھوکہ دہی اور آخر کار محسن کشی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ درخانئے نے مہ نور ایڈورٹائزرز کے مخالف کیمپ میں نہایت طمطراق سے شمولیت اختیار کر لی۔ یہ اُس کے انتہائی عروج کے دن تھے کہ جب دولت، شہرت اور عزت اُس کے روبرو سرنگوں رہتے تھے۔ لیکن وہ جہاں بھی گئی محسن کشی کا پس منظر اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اُس کے پاس اب سب کچھ تھا مگر اُس کی ذات سے وابستہ اعتبار، اعتماد اور بھرم کہیں بہت پیچھے رہ گئے اور یوں وہ اپنے عروج کے دنوں ہی میں اُن لوگوں کے ہاتھوں راندۂ درگاہ ہو کر رہ گئی کہ جو اُسے ماضی میں محسن کشی پر آمادہ کرتے رہے تھے۔ اگرچہ وہ ایک بار پھر زفیرہ احمد سے معافی کی طلب گار ہوئی اور معاف بھی کر دی گئی مگر ماڈلنگ میں اُس کا کیریئر ختم ہو چکا تھا چنانچہ درخانئے نے عین عروج شباب میں اپنے لیے بادشاہ گری کا راستہ چن لیا کہ جو کبھی زمانہ قدیم میں محلات اور حرم سراؤں کی غلام گردشوں کے اندھیروں میں ہونے والی سازشوں سے عبارت ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ یہ شعبہ اُس کی عمر کے لحاظ سے اُس کے لیے موزوں نہیں تھا مگر اُس کی عمر سے بھی زیادہ پختگی کا حامل ذہن اور عمر سے بھی کم، کمسنی کے اوصاف سے مرصع جسم اُس کے لیے بیش بہا نعمت ثابت ہوئے۔ در در کی ٹھوکروں نے جہاں اُس کے ذہن کو شاطری کے تمام تر چلتروں سے کل حکمت کر رکھا تھا وہاں جسم کو بار بار تسلسل کے ساتھ رگیدے جانے کے عمل نے مردوں کو تلذذ میں تلنے اور لذت پیمائی سے پہلی منزلوں پر ہی اُن کے سانسیں اکھیڑنے کے جوہر عطا کر رکھے تھے۔

درخانئے اب حکومتیں بنانے اور گرانے کے عمل میں عمل انگیز کے طور شامل ہونے لگی تھی۔ کتنے ہی سرپھرے سیاسی رہنما جب دولت اور مناصب کو ٹھوکروں سے اُڑا کر بھی اپنی وفاداریاں بدلنے کو تیار نہ ہوتے تو ایسے میں درخانئے اور اُس کی ٹیم کی حسینائیں بس ایک رات ہی میں بازی پلٹ کر رکھ دیتیں۔ ایک عرصے کے بعد آج کی امیر کبیر اور مصروف ترین درخانئے کا اپنی پہلی پہلی اتالیق اور پہلی پہلی گرو کے روبرو یوں بلا مقصد آ کر بیٹھ جانا، زفیرہ کے نزدیک شاید پھر کوئی بازی پلٹانا تھا۔ ''اب میرے ہاں کون سی بازی بچھی ہے کہ جسے یہ پلٹانے

آئی ہوگی۔'' زفیرہ اپنے شبے پر دل ہی دل میں مسکرا دی۔ ''اُسے جس نے بھی وہاں بھیجا ہوگا، کیا وہ نہیں جانتا، درخانئے کی پہلی مینٹورز فیرہ احمد کے ہاں سب کچھ لپیٹا جا چکا ہے اور اُلٹانے کو کچھ بھی نہیں بچا۔ ہوسکتا ہے وہ اُس کی بربادی کا سُن کر دلجوئی کے واسطے آئی ہو۔'' لیکن نجانے کیوں اُسے قرار نہیں تھا کہ جیسا وہ سوچ رہی تھی سب کچھ ویسا ہی تھا۔

دوسرا پیگ ختم ہونے لگا تو اِدھر اُدھر کی باتیں بھی دونوں کو بے معنی سی لگنے لگیں۔ غالباً دونوں اب چاہتی تھیں کہ مزید کسی اکتاہٹ کا شکار نہ ہوا جائے۔ گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے درخانئے نے سگریٹ سلگایا اور شونی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''کیسا جا رہا ہے آپ کا شونی؟''

''بس وفادار ہے ...... اور میرے لیے یہی بہت ہے۔''

''آج کل آپ وہسکی کے ساتھ کچھ نہیں لیتیں؟''

''پران لیتی ہوں ناں!! مجھے تو بات ہی بھول گئی، خانساماں انہیں تیار کر کے میری بیل کا انتظار کر رہا ہوگا، سوری ڈیئر۔'' زفیرہ نے ریموٹ بیل کا بٹن دباتے ہوئے درخانئے کو عاشقانہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔

''ذرا بھی نہیں بدلی تم درخانئے! تمہارا یہ جھینپنا کیا قیامت ڈھاتا ہوگا حکمران لوگوں کے دلوں پر اُن کی خوابگاہوں میں۔'' زفیرہ پیگ بنا کر درخانئے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''میم آج شام کوئی گوندل نام کا شخص ملا تھا آپ سے؟'' درخانئے نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگایا اور پوچھنے اور بتانے کے ملے جلے انداز میں جملہ لپیٹتے ہوئے بولی۔ زفیرہ کو اچھا خاصا جھٹکا لگا۔ جس معاملے کو وہ چھوٹی موٹی گیم سمجھ رہی تھی، درخانئے کے آنے کے بعد وہ اُسے فٹ بال کے عالمی مقابلوں کا فائنل بجھائی دینے لگا تھا۔ اپنے آپ کو کمپوز رکھنے کے لیے اُس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا اور صوفہ نما کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''کچھ پوچھا ہے یا بتا رہی ہو؟''

''نہ کچھ پوچھا اور نہ کچھ بتایا، بس بات شروع کی۔'' اتنے میں خانساماں فرائیڈ پرانز کی

ڈش لایا اور ضروری کراکری اور کٹلری کے ساتھ اُن کے سامنے سجا کر چلا گیا۔

''میں نے بس اتنا بتانا ہے کہ گوندل ایک مہا حرامی کھرب پتی بھڑوے دانش سعید کا فرنٹ مین ہے۔ اُس نے آپ کو مہ نور ایڈورٹائزر کے انچاس فیصد شیئرز کی آج کی خریداری کے سرٹیفکیٹ دیے ہوں گے اور کہا ہوگا کہ آپ کل نئے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا اجلاس بلائیں اور پھر سے سی ای اُو بن کر کمپنی کو اُسی طرح رن کریں کہ جیسے پہلے کرتی چلی آ رہی تھیں۔'' درخانئے پلک جھپکائے نہایت غور سے زفیرہ کے چہرے کو پڑھنے کی مسلسل کوشش میں تھی۔ مگر زفیرہ نے بھی تیسرا پیگ ایک ہی سانس میں ختم کرنے کے علاوہ ایسا کوئی تاثر نہ دیا کہ جس سے اُس کی دلی کیفیت بھانپی جا سکتی۔

''اگر آپ محسوس نہ کریں تو کیا میں وہ سرٹیفکیٹ دیکھ سکتی ہوں؟''

''وہ اُس نے مجھ سے آتے ہوئے واپس لے لیے تھے۔'' زفیرہ گفتگو کا مزاج بدلنے کے بعد پہلی بار بولی۔

''دراصل وہ سرٹیفکیٹ جعلی ہیں اور آپ کو دھوکہ دینے کے لیے تیار کرائے گئے ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اسٹاک ایکسچینج بند ہونے تک مہ نور ایڈورٹائزرز کا ایک سرٹیفکیٹ بھی فروخت نہیں ہوا اور نہ ہی وہاں کسی نے خریدا۔ کاش میں وہ جعلی سرٹیفکیٹ دیکھ سکتی!!''

''میں تو پہلے ہی برباد ہو چکی تو پھر یہ تمہارا کھرب پتی بھڑوا میرے ساتھ اور کیا ہاتھ کرے گا، کیوں بنائے گا جعلی سرٹیفکیٹ میرے لیے اور خوامخواہ اپنے آپ کو ذلیل کرتا پھرے گا۔''

''میڈم! آپ ہی تو مجھے بتایا کرتی تھیں کہ ان بڑے لوگوں کی لڑائیوں میں وجہ کچھ اور ہوتی ہے، لڑتا کون ہے اور مرنا کسی اور نے ہوتا ہے۔ بہرحال ہوشیار رہیے گا، کوشش کریں کہ صبح دفتر نہ جائیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کے ساتھ کچھ ناخوشگوار ہو جائے۔ مہ نور ایڈورٹائزرز اَب دو بڑے ہاتھیوں کے لڑنے کا میدان بن چکی ہے، آپ میری مینٹور رہیں، بہتر جانتی ہیں کہ ہاتھیوں کی لڑائی میں نقصان ہاتھی والوں کا نہیں ہوتا، بس گھاس ہی روندی جاتی ہے ___ چلتی ہوں''

درخانئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ زفیرہ اُسے گاڑی تک چھوڑنے گئی تو اندھیرے ہونے کے باوجود اُسے یوں لگا کہ جیسے ڈرائیور کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے مگر گھومتا ہوا سر اور بکھری ہوئی یادداشت ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ لائبریری میں پہنچی تو شوٹی فریفتہ انداز میں اُس کے گرد گھمریاں لگانے لگا لیکن اُس کی نیت کے باوجود جس انداز میں درخانئے اُس کے دماغ کی دہی بنا کر گئی تھی، وہ اُس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ آنکھیں تھیں کہ پپوٹوں کے اندر پیک ہو چکی تھیں۔

۞

﴿۳۲﴾

اور پھر ایک دن وہ لمحہ آن پہنچا کہ جب یک جان دو قالب رہ چکے صنفِ مخالف کے دو فریقین کے بیچ اُن کے قلوب اور اذہان میں اپنے اپنے طور پر طے پا چکے، ایک جیسے فیصلے پر عمل درآمد کا مرحلہ ایک ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ اُس روز ایک خاصی طویل بک بک جھک جھک کے بعد خلافِ معمول نیئرِ جمیل نے اچانک ہتھیار ڈال دیے اور اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔ بات تو کوئی نئی نہیں تھی، بس وہی پرانی چخ چخ لیکن اَب کے ماہین نے اچھی خاصی بے ہودگی کا مظاہرہ کیا جس میں نامردی کی طعنہ زنی کے علاوہ اُس کی جان چھوڑ دینے کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ اتنا تو نیئرِ جمیل بھی جانتا تھا کہ جان چھوڑ دینے کا مطالبہ عورت کسی مرد سے اُس وقت کرتی ہے جب اُسے یقین ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ مرد اُس کی جان چھوڑنے والا نہیں۔ یہ ایک ایسے گرفتہ مرد کو مزید گرفتگی کی سب سے نچلی سطح تک پہنچا کر اُس کی عشقیہ جاں کنی سے حظ اُٹھانے کا حربہ ہوتا ہے کہ جو پہلے ہی اُس عورت کے عشق میں فنا فی الذات کی مرحلوں تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا مرد بدقسمتی سے شوہر واقع ہوا ہو تو بیویاں اُس کے عشق انتہا دیکھنے کے واسطے گاہے بگاہے طلاق کا مطالبہ دہراتی رہتی ہیں تاکہ وہ اُن کے قدموں میں پڑا پھڑ پھڑاتا تو رہے مگر اُڑ نہ سکے۔

سمجھ دار عورتیں اِس قسم کے مطالبات اُن مردوں سے کرتی ہیں کہ جن میں اُن کے ہاتھوں سے نکل اڑنے کی سکت مفقود ہو چکی ہوتی ہے۔ مگر کچھ ناسمجھ یا اناڑی محبوبائیں یا محبوبہ نما بیویاں مرد کی حد درجہ عاجزی یا اطاعت گزاری کے درجات کو پرکھ نہیں پاتیں اور قبل از وقت

اُن کی انانیت کو کچلنے کی کوشش کرتی ہیں یہ جانے بغیر کہ اُن میں قوت پرواز ابھی باقی تھی۔ اور یہی غلطی مرد بھی اِسی زعم میں دہرانے سے باز نہیں آتے کہ اُن کی ساتھی عورت، اُن پر فریفتگی کے مراحل میں اپنی جاں سے تو کیا اپنی نسائی حمیت سے بھی گزر چکی ہے۔ لیکن جسے وہ ساتھی عورت کی خود پر مر مٹنے کی کیفیت سمجھ رہے ہوتے ہیں، اُسی خاک اور اُسی راکھ سے ایک اور عورت کا جنم قرار پا چکا ہوتا ہے کہ جسے پہلے والے مرد سے شناسائی تک کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔

سورج ڈھلے تک بھی نیئرؔ جمیل واپس نہ آیا تو ماہین کو اندیشہ ہوا کہ وہ اُس سے التفات کا کہیں ڈھونگ تو نہیں رچا تا رہا لیکن اُس کے واپس نہ آنے کی صورت میں کچھ اور تو مسئلہ نہیں تھا بس پھر سے پرانے لوگوں میں سے کوئی نیا تعلق ڈھونڈنا تھا کہ جو اُسے نہ صرف معاشی طور پر آسودہ رکھ سکے بلکہ نیئرؔ جمیل سے قربت کے دنوں میں جتنی دراڑیں جنسی عافیت سے محرومی کے سبب پڑی ہیں، اُن کا بھی مداوا ہو سکے۔ اُسے نیئرؔ جمیل جیسے مردوں سے تو اب کراہت ہو چلی تھی کہ جو کسی عورت کے قابل نہ ہوتے ہوئے بھی اُسے اپنی کھونٹی سے لٹکائے رکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اُس کی جان چھوڑ دینا اس لیے بھی عذاب لگتا ہے کہ اُسے اپنے ساتھ چپکائے رکھنے کی آڑ میں وہ اپنی مردانگی کا بھرم رکھے ہوئے ہوتے ہیں، چاہے اِس کی قیمت انہیں اپنی دولت، عزت اور غیرت سے ہی کیوں ناں چکانی پڑے۔

اُسے اِس بات پر بھی غصہ تھا کہ تمام معاملات طے پا جانے کے باوجود نیئرؔ نے اُس کے واسطے کسی ایسے شخص کا بندوبست کیوں نہیں کیا کہ جو اُس کے حصے کا حق ادا کرتے ہوئے صورتحال کو اِتنا تو خوشگوار بنائے رکھے کہ اُسے اُس کی کھونٹی سے لٹکنے میں کوئی ذہنی یا جسمانی دقت نہ ہو۔ سورج غروب ہونے کے بعد تو اُسے اچھا خاصا پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ اُس جیسے کیچوے کے ساتھ اُس نے زندگی کے اتنے خوبصورت دن کیوں برباد کر دیے۔ جتنا مالی مفاد نیئرؔ نے اُسے اِس دوران پہنچایا تھا وہ تو کوئی بھی شخص اُس پر کرنے کو تیار ہو سکتا تھا کہ اگر ڈھنگ سے اُس کا چناؤ کر لیا جاتا۔ غصے، پچھتاوے اور جسمانی اضطراب نے اُسے اِس حد تک نفسیاتی دباؤ کی چکی میں ڈال کر دھیرے دھیرے پیسنا شروع کر دیا تھا کہ سانس رکتی ہوئی اور اعصاب چٹختے ہوئے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ یوں لگ رہا تھا کہ رگوں میں خون نہیں بلکہ

آگ پگھل کر بہنا شروع ہو چکی ہے۔ اِس کیفیت میں اُس کے ہاتھ میں نجانے کہاں سے پھل کاٹنے والی چھری آ گئی، نتیجہ کیا نکلا کہ اُس نے کمرے میں موجود نیئرؔ جمیل کی تصویر کی فریم توڑ کر اُس کے ٹکڑے کرتے ہوئے ہر اُس چیز کو بھی چیر پھاڑ ڈالا کہ جو کبھی نیئرؔ کے جسم سے مَس بھی ہوئی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ بیڈ شیٹ اور بیڈ کے میٹرس کی طرف متوجہ ہوتی باہر سے بجنے والی ڈور بیل نے اُسے اِس طرح چونکایا کہ جنون سے واپسی کی طرف پلٹتے ہوئے وہ بیڈ پر بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ باہر سے کسی کے آنے کے خوف نے اُسے اِس لیے خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ جو بھی کوئی تھا نیئرؔ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اُس کے پاس تو باہر کے لاک کی چابی تھی لہذا اُسے اندر آنے کے لیے ڈور بیل بجانے کی ضرورت نہیں تھی۔

تین بار بیل بجنے کے بعد بھی جب ماہین باہر کی جانب نہ گئی تو دروازے کے لاک میں چابی گھومی اور ایک تنومند کثرتی بدن کا حامل نوجوان سیاہ پتلون اور سیاہ پولو شرٹ میں اندر داخل ہوا۔ اُس نے ایک ہی ہاتھ میں تین چار بڑے بڑے تھیلے پکڑے ہوئے تھے جن پر کپڑوں کے انتہائی معروف برانڈ کا نام چھپا ہوا تھا۔ نوجوان شکل صورت سے بس قبول صورت سے بھی ایک آدھ درجہ کم رہا ہوگا لیکن اُس کی اُٹھان بتا رہی تھی کہ وہ ہنر مند لڑکیوں میں کس قدر چاہا جاتا ہو گا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اُس کے چہرے پر معذرت خواہانہ تاثرات تھے جو شاید دروازہ کھول کر اِس طرح چلے آنے کے سبب فطری سے لگ رہے تھے لیکن اندر آنے کے بعد اُس نے جس حال میں ماہین کو دیکھا اُس کا چہرہ نارمل ہوتا گیا کہ وہ اُسے جس طرح مسلسل گھورے جا رہی تھی اُس میں شدت کی آخری حدوں کو چھوتی ہوئی پیاس اور وارفتگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

نوجوان نے سلے ہوئے ملبوسات کے تھیلے ماہین کی طرف بڑھائے اور نیئرؔ جمیل کی جانب سے کچھ پیغام دیا مگر یوں لگ رہا تھا کہ ماہین کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں اور اُس کا وجود پتھر سے تراشیدہ مجسمے کی مانند ہو چکا تھا۔ وہ نوجوان اُس کو متوجہ نہ پا کر اپنی بات بار بار دہرائے چلا جا رہا تھا لیکن ماہین اِس دوران اپنے تپے تپے چہرے پر حدت بکھیرتی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے اُس کی طرف اِس انداز سے دیکھنے لگی تھی کہ جیسے اب جھپٹی سُو جھپٹی۔ نوجوان کو کچھ نہ سوجھی تو اُس نے پتلون کی جیب سے موبائل نکالا اور غالباً نیئرؔ جمیل کو

فون ملانے لگا مگر اِس اثناء میں وحشت اور دیوانگی کی غیر ممیّز کیفیت میں ہوش و خرد تو کیا اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکی ماہین نوجوان کی طرف جھپٹی اور اُس کے ششدر چہرے پر پھٹی پھٹی آنکھوں کی پروا کیے بغیر صوفے پر گرا لیا۔ اُس کے گھٹے گھٹے حلق سے نکلنے والی غراہٹ کی نوعیت کی آوازیں کمرے کو کسی کچھار کا صوتی رنگ دے رہی تھیں۔

ماہین اُس نوجوان کے ساتھ نیئرّ جمیل کی جانب سے بھجوائے گئے خوبصورت ترین پارٹی لباس میں اُسی کے بتائے گئے بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر اسلام آباد کے مضافات میں کسی پہاڑی کی بلند ترین مگر وسیع و عریض اور ہموار چوٹی پر بنائے گئے محل نما بنگلے میں پہنچی تو وہاں موجود مہمانوں کی تعداد، اُن کی شان و شوکت اور ماحول سے چھلکتا ہوا احتشام دیکھ کر سہم سی گئی۔ وہاں آنے سے پہلے اُسے اُس انصر نامی نوجوان کی زبانی اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ نیئرّ جمیل کی بزنس اسٹیبلشمنٹ میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود صرف اُس کے ذاتی امور کی انجام دہی پر مامور ہے۔ انصر اُسے بار بار احساس دلاتا رہا تھا کہ وہ دیے گئے وقت سے تین گھنٹے لیٹ ہو رہے ہیں مگر اُس وقت ماہین کے نزدیک نہ تو نیئرّ جمیل کی کوئی حیثیت تھی اور نہ ہی اُس کے دیے گئے وقت کی۔ انصر اُس کے خیال میں محض ایک ڈرائیور تھا اور نیئرّ جمیل کا بلاوا صرف اُس خوش کرنے اور پھر سے اپنے تسلط میں کھونٹی سے لٹکائے رکھنے کا ایک بہانہ۔ ویسے بھی اگر انصر جیسا نوجوان اُس وقت وہاں نہ آتا تو شاید ذہنی طور پر وہ گھر سے باہر نکلنے کے قابل بھی نہ ہوتی۔ مگر پارٹی میں پہنچنے کے بعد اُس کا سہم کر دم بخود رہ جانا اُس احساس کا کروڑواں حصہ بھی نہیں تھا کہ جو وہاں کا ماحول اور نیئرّ جمیل کی حیثیت دیکھنے کے بعد اُس پر طاری ہو چکا تھا۔

پارٹی چونکہ اپنے عروج پر تھی اس لیے ماہین کا استقبال نیئرّ جمیل کی بجائے وہاں استقبالیے پر موجود خوبصورت لڑکیوں کے پَرے نے کیا۔ وہاں آنے سے پہلے شہر کے سب سے مہنگے بیوٹی پارلر سے پارٹی میک اپ اور بیش قیمت لباس زیب تن کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو آسمانی اپسرا سمجھ رہی تھی کہ جو نیئرّ جمیل کی جانب سے کی گئی اِس قدر مدارت کے بعد اُسے رفاقت کے کچھ اور دن دینے کو آمادہ ہو چکی تھی مگر پارٹی میں محض استقبال کے لیے موجود ایک

سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی دیکھ کر اُسے ڈیپریشن ہونے لگا تھا۔ اُسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی پارٹی کا میزبان نیئرّ جمیل ہو سکتا ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اتنے میں شراب سے دل بہلاتی اور اٹھلاتی حسیناؤں اور خوبرو مردوں کے جھرمٹ میں سے نیئرّ کسی چاند کی طرح طلوع ہوا۔ سیاہ پینٹ کوٹ کے ساتھ بو ٹائی لگائے وہ کسی ملک کا فرمانروا دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی انصر جھک کر آداب بجالاتے ہوئے ایک طرف ہو گیا جب کہ ہکا بکا کھڑی ماہین کو نیئرّ نے ہلکی سی مسکراہٹ اور گردن کے معمولی خم کے ساتھ ویلکم کیا اور ہاتھ کے اشارے سے پارٹی جائن کرنے کو کہا۔ شاید کوئی اشارہ انصر کی جانب بھی ہوا تھا تبھی تو وہ باس کے سامنے ہی اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اِس طرح ایک طرف لے گیا کہ جیسے اپنے مالک کے ذاتی امور میں سے کسی حکم کی تعمیل کر رہا ہو۔

ماہین کو چند ثانیوں کے لیے اُس وقت نیئرّ کی آنکھوں میں جھانکنے کا موقع ملا کہ جب وہ اُسے پارٹی جائن کرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں جہاں پارٹی میں تین گھنٹے تاخیر سے آنے کا سوال موجود تھا وہاں ماہین کے چہرے پر پھیلی ہوئی طمانیت بھی اِس کا جواب بن کر اُس کی آنکھوں ہی سے ہویدا تھی۔ بیک وقت سوال اور جواب دونوں ایک ہی جگہ موجود۔ لیکن ماہین کو اپنے سوال کا کہیں بھی جواب نہیں مل پا رہا تھا کہ نیئرّ جمیل نے اپنی اصل حیثیت چھپا کر اُس سے کھلواڑ کیوں کیا تھا۔ پارٹی میں آنے سے پہلے وہ اِس زعم میں تھی کہ ایک اوسط درجے کے کھاتے پیتے مگر نامکمل شخص کے دوست نما ملازم سے صحبت کے بعد وہ اُس کی تسلط پسند عیاش طبع کے پندار کو اپنے انجام تک پہنچا چکی ہے کہ جو اُسے اپنی ذات کی کھونٹی سے ہمیشہ کے لیے لٹکائے رکھنا چاہتا تھا مگر اب اُسے انصر کے اُس بازو کے لمس سے بھی کراہت ہو رہی تھی کہ جو نیئرّ جمیل کے اشارے پر اُس کی کمر کے گرد حائل ہو چکا تھا۔ اُسے یوں لگا کہ جیسے نیئرّ اُس کے کان کے قریب آ کر سرگوشی کر رہا ہو۔

''اگر تم مجھے زک پہنچانے کی بجائے اپنے آپ کو میرے تئیں ہی رکھتیں تو اس وقت تمہاری کمر میں میرے ملازم کی بجائے میرا بازو حائل ہوتا۔''

ماہین نے چونک کر سر اوپر کی طرف اُٹھایا۔ وہاں نیئرّ نہیں بلکہ انصر تھا جو اُپنے ہونٹ

اُس کے کان کی لووں کے قریب لا کر اُس کی احسن جسمانی تقویم کے لیے رطب اللسان ہو رہا تھا۔ ماہین کا دل چاہا کہ اُس کا منہ نوچ لے۔ نجانے کیوں وہ شخص جو چند گھنٹے پہلے اُس کے لیے تسکین و تفنن کا منبع تھا، دیکھتے ہی دیکھتے نفرت و کراہت کی تصویر بن کر رہ گیا تھا۔ جب کہ وہ شخص جسے وہ ہمیشہ اپنے لیے ناکافی صلاحیتوں کا حامل قرار دے کر دھتکارتی رہی، پلک جھپکتے ہی مرکزِ نگاہ اور سراپا دلکشی ہو چکا تھا۔ ایک عجیب سی سوچ اُس پر اُس کی اندر کی عورت کا مکاشفہ کرنے لگی تھی کہ جسے دن رات کے آٹھ پہروں میں ایک نہیں بلکہ مختلف صلاحتیں رکھنے والے آٹھ مرد درکار تھے۔ وہ اپنے آپ پر حیران ہو رہی تھی کہ کس نطفے سے وہ جنمی ہے اور کس رحم نے نو مہینے اُسے اپنے اندر سمائے رکھ کر اُس کی رگ رگ میں شہوانی آگ کی کئی کئی جہتیں سمو دی تھیں۔ اُس نے اپنے گرد تھرکتی ہوئی حسیناؤں کی عشوے طرازیاں دیکھیں تو اُسے اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگی کہ کسی کے چہرے یا آنکھوں میں وہ بھوک اور پیاس نہیں تھی کہ جس کا اُسے دن رات سامنا تھا۔ اِس تشنگی نے نہ تو اُسے کہیں کا چھوڑا اور نہ ہی کسی ایک کا ہو کر رہنے دیا۔ انصر کی جانب سے کی جانے والی دل جوئیانہ کوششوں کے باوجود ماہین کی نگاہیں مسلسل نیئر جمیل کی تلاش میں تھیں کہ جو اَب کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے انصر کو بھی اپنے ساتھ چپکے رہنے سے منع کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ اُس کے ساتھ رہنے سے اُس کا دم گھٹتا ہے اور وہ کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتی ہے۔

ماہین اکیلی ہوئی تو کئی لوگ اُس کی طرف کمپنی کے لیے آگے بڑھے مگر پارٹی کے تہذیبی تقاضوں سے بے بہرہ ہونے کے سبب وہ سبھی کو انکار کرتی چلی گئی۔ اُس کا جی دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا مگر چاروں جانب خوش گپیوں میں مصروف طبقہ اشرافیہ کے دمکتے چہرے اُس کے آڑے آ رہے تھے۔ وہ اِن سب سے بچ کر نکلتی ہوئی پیچھے رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئی کہ جن کی زیادہ تعداد خالی پڑی ہوئی تھی۔ اُس سے کچھ فاصلے پر موجود انصر بھی اُس پر غیر محسوس طریقے سے نگاہ رکھے ہوئے تھا اِس طرح کہ ماہین کو محسوس بھی نہ ہو اور اُس کی حرکات و سکنات کا علم بھی ہوتا رہے۔ اپنی ناتجربہ کاری اور اُجڈ پن کے باوجود پارٹی میں موجود دیگر حسین لڑکیوں اور خواتین کے ہوتے ہوئے بھی کچھ شکرے قسم کے شرفاء

ماہین کے سراپے سے پھوٹتی ہوئی جنگلی گلاب کی سی مہک کا سراغ پا کر اُسے اپنی نگاہوں میں رکھنے کی کوشش میں مگن ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ماہین میں کھولاؤ کا سب سے بڑا سبب نیئر جمیل کا پارٹی میں بلانے کے بعد اُسے نظر انداز کر دینے کا طرزِ عمل تھا کہ جو اُس کے پہلے کھلواڑ سے بھی کہیں زیادہ قابلِ اعتراض تھا کہ جس کی رو سے نہ صرف اُس نے اپنی حیثیت کو چھپایا تھا بلکہ اپنے رویے سے اُسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ اب تو ماہین کو یوں لگ رہا تھا کہ اُس کا اپنے آپ کو نامکمل مرد ظاہر کرنا بھی محض دکھاوا تھا کہ جس کے پس منظر میں اُسے آزمانے یا اُس کا امتحان لینے ایسی بے وقوفی کارفرما رہی ہوگی۔

"کیسا شخص ہے یہ...... ذہنی بیمار!! لیکن تو خود کیا ہے؟ تجھ سے زیادہ ذہنی بیمار اور کوئی کیا ہوگی کہ جس نے اپنے عقل کو کھوپڑی کی بجائے ٹانگوں کے سنگم میں جوڑ کے رکھا ہوا ہے تا کہ وہ اُسے ہر جگہ ٹکے ٹوکری کیے رکھے۔" اِس سے پہلے کہ وہ پھر سے ٹکے ٹوکری ہونے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوتی، ایک ویٹر آیا اور اُسے وہسکی کا گلاس پیش کر کے چلا گیا۔ نیئر جمیل سے ملاقات کے بعد وہسکی ماہین کے لیے کوئی اجنبی ذائقہ نہیں رہی تھی۔ بارہا اُسے حد سے زیادہ شراب پلا کر نیئر اپنے جسمانی ادھورے پَن پر پردہ ڈالنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ آج پہلی بار اُس نے اپنی مرضی سے وہسکی کا گھونٹ بھرا اور کوشش کی کہ اپنے اندر جمع ہو چکی ساری کی ساری کڑواہٹ کو اُسی ایک گھونٹ کی تلخی سے برابر کرنے کی کوشش کرے مگر جب ایک گھونٹ اندر کی کڑواہٹ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا تو اُس نے ایک ہی سانس میں پورا پیگ اِس طرح اندر اُنڈیل لیا کہ جیسے اُسے نیئر پلایا کرتا تھا۔ کڑواہٹ برابر ہوئی یا نہ ہوئی لیکن وہسکی کی تلخی سینے کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔

ماہین شراب نوشی سے آشنا ہونے کے باوجود مواقعوں کا امتیاز نہیں کر پاتی تھی۔ اپارٹمنٹ کے بستر پر پلائی جانے والی شراب اُس کے جسم کی مستی کو سلانے کے لیے گیلپ کرائی جاتی تھی جب کہ آج جسم میں وحشتیں برپا کرتی مستی کو سلانا مقصود نہیں تھا بلکہ مری ہوئی مستی کی خاک سے جمے ہوئے غصے کی کڑواہٹ کو وہسکی کی تلخی سے پانی کرنے کا چکر تھا۔ لیکن نہ کڑواہٹ پانی ہوئی اور نہ ہی تلخی میں تیکھا پن باقی رہا۔ ماہین کو گیلپ کرتے دیکھ کر جہاں ویٹر ایک اور پیگ لیے حاضر ہو گیا وہاں اُن شرفاء کی بھی آس بندھی کہ جو اِس جنگلی گلاب

کی وحشی خوشبو کے تعاقب میں اپنی تمام حسیات ایک ہی نکتے پر مرکوز کیے ہوئے تھے۔

اتنے میں نیئر جمیل کے محل کے اُس حصے کی نہایت مدھم روشنیاں ایک دم بجھ گئیں کہ جہاں پارٹی ہو رہی تھی۔ اچانک اندھیرا چھا جانے کے سبب محسوس ہوا کہ یہ روشنیاں انتہائی مدھم ہوتے ہوئے بھی کس قدر روشن تھیں۔ مردوں نے تو شاید اسے غنیمت جانا اور خاموش رہے لیکن خواتین نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا احتجاج اِس طرح ریکارڈ کرایا کہ کہیں ہلکی اور کہیں بلند چیخیں سنائی دینا شروع ہوئیں جن میں تکلیف کی بجائے تصنع آمیز خوف کا عنصر نمایاں تھا۔ اِن سب کے پس منظر میں ملازمین کی دوڑ دھوپ، سراسیمگی اور بوکھلاہٹ لیکن یہ سب کچھ صرف پینتالیس سیکنڈ تک باقی رہا اور اُس کے بعد روشنیاں جس طرح اپنے آپ بجھی تھیں، اُسی طرح خود بخود روشن ہو چکی تھیں۔ اِس سے قطع نظر کہ اتنے مختصر اندھیرے کے بعد بھی خواتین اپنے لباس کو درست کرنے میں اور شرفاء اپنے چہروں کو ٹشو پیپرز سے صاف کرنے میں لگے ہوئے تھے، نیئر جمیل کا معتمد خاص انصر بوکھلائے ہوئے انداز میں اِدھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا مگر ماہین کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اُدھر ماہین تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ روشنیاں بجھتے ہی جو شخص اُس کے منہ کو ہاتھ سے دبائے کندھے پر اُٹھا کر عقبی دروازے سے نکل بھاگتے ہوئے کسی پولیس آفیسر کی گاڑی میں لا پھینکے گا، وہ ڈرائیور کانسٹیبل ذیشان ہو گا۔ اِس اچانک سے ہونے والی واردات نے ماہین کو گڑبڑا سا دیا تھا۔ پارٹی کے مخصوص ماحول اور نیئر جمیل جیسے کئی چہرے رکھنے والے شخص کے چنگل سے یوں رہائی کے تصور نے جہاں اُسے شاداں کر دیا تھا وہاں پھر سے پولیس والوں کی گرفت میں آنے کا تصور بھی روح فرسا تھا۔ ماہین کے پاس پوچھنے کو کئی سوالات تھے لیکن گاڑی کو پارکنگ سے تیزی سے نکال کر مین روڈ پر آتے ہوئے اُس نے صرف اتنا بتایا کہ وہ اپنے ڈی آئی جی کے ساتھ پارٹی میں بطور ڈرائیور آیا ہوا تھا کہ جب اُس نے کسی کو اُسے وہاں لاتے ہوئے دیکھا۔ چونکہ وہ چہرے کے تاثرات سے ابھی تک کوئی مغوی ہی لگ رہی تھی لہذا اُس نے اُسے وہاں سے نکال لانے کا پروگرام بنایا اور اب ایک قریبی کالونی میں ایسی جگہ پہنچانے جا رہا تھا کہ جہاں وہ اپنی مرضی سے ایک کوٹھی کے پورشن میں کرایہ دار کے طور پر رہ کر

آئندہ کی زندگی کے بارے میں سوچ سکے گی۔

''لیکن میرا سامان تو ایک وومن ہاسٹل میں پڑا ہے۔''

''کون سا وومن ہاسٹل؟''

''ایف سکس میں ہے سپر مارکیٹ کے سامنے۔''

''کوئی بات نہیں...... میں تم سے کل ایڈریس معلوم کر کے سامان یہاں پہنچا دوں گا۔''

''لیکن میں تمہارے ساتھ کیوں رہوں؟''

''لیکن تم کسی اور کے پاس بھی کیوں رہو؟''

''تم نے خود ہی مجھے چھوڑا تھا۔''

''تمہارے کہنے پر چھوڑا تھا...... لیکن اب چھوڑنے والا نہیں۔'' اتنے میں گاڑی ایک پوش آبادی میں واقع کوٹھی کی عقبی گلی میں رُکی۔ ماہین گاڑی سے اترنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔

''جلدی اُترو...... میرا صاحب مجھے ڈھونڈ رہا ہو گا۔''

''اور اگر میں نہ اُتروں تو......؟''

''ٹھیک ہے!! پھر تھانے لے چلتا ہوں ...... حوالدار مقبول بھٹی اب بھی تمہاری راہ دیکھتا ہے اور وہ کالا بھی آج کل ضمانت پر ہے۔''

''لیکن یہ جگہ......؟''

''پرائیوٹ کالونی ہے...... گلشن کریم ...... اور اس پورشن کا دو مہینے کا کرایہ میں نے ایڈوانس دیا ہوا ہے...... کھانے پینے کا بھی کچھ سامان پڑا ہو گا ...... بن داس رہو! اب ملاقات کل ہو گی اور ہاں آج سے تمہارا نام وہ پہلے والا نہیں بلکہ عارفہ ہے ...... کیا سُنا؟ عارفہ!!

۞

۳۴

دُرخانئے کے جانے کے بعد سکون اور قرار نام کی کوئی چیز زفیرہ احمد کے پاس نہیں رہی تھی۔ اگر کچھ تھا تو محض اضمحلال، اضطراب، ابہام اور استردادِ اعتماد۔ ایسے میں جہاں شراب اُس کی اعتماد سازی میں معاون ثابت ہوا کرتی وہیں شونی کی جانب سے دلجوئی بھی ایک ایسی کیفیت میں لے جایا کرتی کہ جہاں بے پایاں لطف ونشاط ہمہ نوعیت اضطراب پر غالب اور حالتِ ابہام ایک گونہ یکسوئی میں منقلب۔ مگر اُس رات دُرخانئے کی آمد اور اُس کی گفتگو دونوں نے زفیرہ احمد کے اندر اور باہر چھائی ہوئی پژمردگی میں اِس قدر اضافہ کیا کہ اُس کے جانے کے بعد شراب کی اچھی بھلی مقدار بھی اُس میں کوئی کمی نہ کر سکی۔ شونی نے کئی بار مختلف حیلوں بہانوں سے اپنی قربت اور قرب کی خواہش کو رجسٹر کرانا چاہا مگر اِس تمام عرصے میں پہلی بار ایسا ہوا کہ زفیرہ کی جانب سے التفات کی بجائے بے اعتنائی غالب رہی اور شراب بھی پیئے جانے کے باوجود شراب نہ رہی۔ پانی ملائے بغیر پانی بنتی رہی۔

راحت کے سبھی عوامل اگرچہ شرمندۂ تاثیر نہ ہو پائے مگر پھر بھی آنکھ لگی کہیں صبح جا کر اور دوپہر تک لگی رہی۔ اِسے نیند کا غلبہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی شراب کی حد درجہ بے توقیری کا ردِعمل لیکن جو کچھ بھی تھا وہ اعصاب کی شکستگی کی انتہائی صورت کے سوا کچھ نہ تھا کہ جس کی اولیں صورت میں بدن ذہنی توانائی سے ربط کھو کر شکستہ تر ہوتا چلا جاتا ہے اور اگر یہ ناتا قائم رہے تو اعصابی تعمیرِ نو کے عمل سے گزرتے ہوئے انسانی جسم اُسی طرح زندہ مگر غیر فعال ہوا رہتا ہے کہ جیسے کمپیوٹر اسی قسم کی کیفیت سے گزرنے کے بعد تازہ دم ہو جاتا ہے لیکن اُس دوران غیر فعال

ہوتے ہوئے بھی اُسے آف نہیں کیا جاتا۔

بارہ بجے کے قریب کی بیداری زفیرہ احمد کے لیے عجیب سی کیفیت لیے ہوئے تھی کہ نہ تو اُسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا تھا اور نہ ہی کوئی اُتاول، خلجان یا اضطراب اُس پر حاوی دکھائی دیتا تھا۔ زندگی میں کم ہی ایسا ہوا ہوگا کہ نیند سے جاگنے کے بعد اُس نے نہ تو فون کی کال لسٹ دیکھی ہو اور نہ ہی وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ اُچٹتی ہوئی نگاہ پڑی بھی تو ایسے کہ جیسے دیکھنے کے باوجود کچھ نہ دیکھا ہو۔ مہ نور ایڈورٹائزرز کے معاملات ابھی وائنڈ اپ ہونا باقی تھے مگر وہ آفس جانا چاہتے ہوئے بھی رات بھر اس لیے تذبذب میں رہی کہ اُس سے ہمدردی جتانے والا اجنبی شخص گوندل خدا جانے کیوں اور کس کے لیے اُسے استعمال کرنے کے درپے تھا۔ چنانچہ صبح سویرے ہی اپنے طور پر طے ہو چکا کہ کمپنی کی تحلیل یا بقیہ شیئرز کی فروخت تک وہ کمپنی سے جذباتی وابستگی کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دے گی۔ اب ایسے میں ایک من پسند ناشتہ تو بنتا تھا۔

زفیرہ احمد بیڈ سے اُٹھی اور کھڑکی کے قریب چلی آئی۔ باہر حد نگاہ تک پہاڑوں پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی لیکن پھر بھی آسمان بادلوں سے یکسر خالی نہیں تھا۔ امکان تھا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے بادل بھی اپنی من مانی کر سکتے تھے۔ اتنے میں شونی کمرے میں داخل ہوا اور چپکے سے گردن جھکائے اُس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں اگرچہ تھکن اور چہرے پر کبیدہ خاطری کی پرچھائیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں لیکن پھر بھی اطاعت گزاری کی علامت سمجھے جانے والے لیبرا ڈار سے جڑی وفاداری کا تقاضا یہی تھا وہ مالکن کے پاؤں میں پڑا رہے۔ زفیرہ کو اپنے رویے پر ندامت ہونے لگی۔ وہ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے لیے جھک کر بیٹھا چاہتی ہی تھی کہ اُس کی نگاہ قالین پر پڑے ہوئے سیل فون پر پڑی جو خاموشی سے مسلسل بلنک کیے جا رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ کل شب دُرخانئے کے جانے کے بعد کوئی بھی فون اٹینڈ نہ کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے اُس نے فون کی گھنٹی بند کر دی تھی۔ مگر اب کے جب بارہ گھنٹے سے بھی زائد کا وقت گزر چکا تھا زفیرہ احمد نے فون اُٹھا لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ کالر کا نام دیکھ پاتی فون ایک بار پھر بند ہو چکا تھا۔ زفیرہ نے دیکھنے کے واسطے کہ

کال کس کی تھی،موصول شدہ کالز کی فہرست نکالی تو دیکھتے ہی پریشان ہوگئی کہ اتنی کالز یعنی کل رات سے اِس وقت تک تین سو بارہ کالز جن میں سے اسی فیصد آج صبح نو بجے کے بعد آفس سے ہمدانی اور فاروقی کی جانب سے کی گئی تھیں جب کہ کچھ کالز گوندل کے نمبر سے اور باقی اجنبی نمبروں سے کی گئی تھیں۔صاف ظاہر تھا کہ آفس میں دن بھر خیریت نہیں رہی۔ابھی وہ ہمدانی کو کال بیک کرنے کے واسطے متعلقہ بٹن پریس کرنے ہی لگی تھی کہ فون کی اسکرین ایک بار پھر ہمدانی کے نام سے بلنک کرنے لگی۔زفیرہ احمد کال سننے سے پہلے اُس کا رنگر آن کرنا نہ بھولی،چنانچہ اب گھنٹی کی آواز بھی سنائی دینی لگی تھی۔

''میم! کہاں ہیں آپ؟ آفس تشریف لائیے۔'' ہمدانی کی آواز میں اضطراب آمیز کپکپاہٹ تھی۔

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں۔'' زفیرہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''میم! آپ جہاں بھی ہیں،فوراً آفس تشریف لے آیئے۔'' ہمدانی زفیرہ کی بات کا جواب دیے بغیر اپنی بات کیے جا رہا تھا۔

''ہمدانی میں کچھ بزی تھی......کیا ایمپلائیز نے کچھ گڑبڑ کر دی ہے؟''

''میم! ایمپلائیز نے کچھ نہیں کیا لیکن آپ کا اِسی وقت پہنچنا بہت ضروری ہے۔پلیز! آفس تشریف لے آیئے۔'' ہمدانی کی آواز میں مایوسی در آنے لگی تھی۔زفیرہ احمد کو یوں لگا کہ شاید عدالتوں کے احکامات کے بعد مہ نور ایڈورٹائزرز کے دفاتر کو سیل کیا جا رہا ہے۔یہ ایک ایسی صورتحال تھی کہ جس میں ہمدانی تو کیا وہ خود بھی کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔زفیرہ کو زیادہ خطرہ بڑے صاحب کے اُن لوگوں کی جانب سے تھا کہ جنہوں نے کمپنی کے انچاس فیصد شیئرز کل فروخت کر دینے کے بعد آج اُسے اپنے شیئرز اونے پونے فروخت کرنے پر بہر صورت مجبور کرنا تھا۔ایک لمحے کے لیے اُسے گوندل کا بھی خیال آیا کہ جو اپنے آپ کو ایک نئی سازش کے ذریعے ''ہمدردی'' کے منظر نامے پر لا کر درحقیقت اُسے ناکوں چنے چبوانا چاہتا تھا۔لیکن اب جو بھی تھا زفیرہ احمد اپنے آپ کو ہر قسم کی سچوایشن کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر چکی تھی۔

''ٹھیک ہے......میں آتی ہوں۔'' زفیرہ نے ایک لمبی سانس لے کر اپنے سامنے آیا ہوا ناشتہ ایک طرف کیا اور خانساماں کو چائے فلاسک میں ڈال کر گاڑی میں رکھنے کو کہا اور خود بھی ہلکی پھلکی تیاری کے بعد گاڑی کی طرف چل دی۔

اُس کی گاڑی آفس کے پورچ میں جا کر رکی تو کوئی بھی غیر معمولی صورتحال نہیں تھی سوائے اِس کے کہ اُس کا کل سے ملازمت چھوڑ چکا ڈرائیور پھر سے یونیفارم میں ہمدانی صاحب اور دوسرے سینئر ایگزیکٹوز کے ساتھ موجود تھا۔ڈرائیور نے اُس کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لینا چاہی تو زفیرہ نے جھجک کر ہمدانی کی طرف دیکھا۔اُس نے آنکھ کی پتلی کی جنبش سے اثبات کا اشارہ کیا تو زفیرہ نے چابی اُس کے ہاتھ پر رکھ دی۔اب اُسے یاد آیا کہ ہمدانی اور فاروقی کے ہمراہ کھڑے ہوئے کمپنی کے سینئر ایگزیکٹوز وہ ایگزیکٹوز تھے جو گذشتہ کل آفس میں موجود ہی نہیں تھے بلکہ اُن میں سے دو تو ایمپلائیز کے احتجاج میں بھی شامل تھے۔اُن سب کے چہروں پر خوشامدانہ مسکراہٹیں دیکھ کر زفیرہ کو احساس ہو چلا تھا کہ گیم اُس کے حق میں پلٹ چکی ہے۔لیکن کیسے؟ یہ ابھی معلوم ہونا تھا۔

زفیرہ احمد اپنے ایگزیکٹوز کے ساتھ آفس میں داخل ہوئی تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ایمپلائیز اپنے اپنے شعبوں میں موجود بظاہر کام میں مگن،سیکورٹی مستعد اور ماحول ایسے کہ جیسے کل اِدھر کچھ ہوا ہی نہ ہو۔زفیرہ نے چاہا کہ وہیں رک جائے اور ہمدانی سے اِس کایا کلپ کی وجہ پوچھے مگر یہ ایک اچھی منتظم کے شایانِ شان نہیں تھا۔ہوسکتا ہے جو بھی ہوا ہو اُسے ہمدانی سمیت سبھی ایگزیکٹو اُس کی ذاتی صلاحیتوں کا ثمر سمجھ رہے ہوں اور اگر اِس کا سبب وہ خود ہی پوچھنے لگے تو اُس کا کیا بھرم رہ جائے گا۔لہٰذا اِس خیال کے آتے ہی زفیرہ احمد کی باڈی لینگویج کچھ اور باوقار اور چہرے کے تاثرات پہلے سے بھی زیادہ پُراعتماد ہوگئے۔لیکن اِس کے باوجود کہیں کوئی دل میں دھڑکا ضرور تھا کہ کل کا واقعہ رونما ہونے کے بعد نئی انٹری تو صرف دو کرداروں کی ہوئی ہے یعنی گوندل اور درخانئے۔اگرچہ اُن دونوں کے پاس ایک دوسرے کا مخالف ایجنڈا تھا مگر پھر بھی اُن میں سے کسی ایک کا ایجنڈا آگے بڑھائے بغیر بھی اُس کا مہ نور ایڈورٹائزرز کی چیف ایگزیکٹو رہ جانا کسی تیسرے کردار کی جانب اشارہ تھا کہ جو نہ تو ابھی اُس کے وہم میں تھا اور نہ ہی گمان میں۔

لیکن خیالات کا یہ مدوجزر صرف اُس وقت تک رہا کہ جب تک وہ اپنے کمرے میں داخل نہیں ہوئی۔ کمرے میں اُس کی کرسی پر تو نہیں لیکن کونے میں رکھے صوفے پر عین اُس جگہ گوندل براجمان تھا کہ جہاں زفیرہ بیٹھا کرتی تھی۔ زفیرہ کو دیکھتے ہوئے وہ کھڑا ہوا اور انتہائی ادب سے سلام کرتے ہوئے ایک طرف ہو گیا۔ زفیرہ وفورِ حیرت سے اِس قدر بوکھلائی کہ اُسے نہ تو سلام کا جواب دینے کا خیال آیا اور نہ ہی کچھ بات کرنے کی سوجھی۔ اُس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُس کے ساتھ چلے آ رہے ایگزیکٹوز میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ اوسان بحال ہوتے ہی جو پہلا خیال اُس کے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ گوندل نے کمپنی کے باقی شیئرز کو بھی مٹی میں ملانے کے بعد اُس پر قبضے کی رسمی کاروائی کے لیے اُس کے انتظار میں بیٹھا ہوا اُسے ہمدانی وغیرہ کے ذریعے بلوائے چلا جا رہا تھا۔ لہٰذا وہ چند لمحے کہ جب دونوں ایک دوسرے کے ارادوں کو تولنے کے لیے ایستادہ رہے، آفس کے ماحول کو بوجھل کر دینے کے لیے کافی تھے۔

''آیئے گوندل صاحب! آپ وہاں کیوں ہیں صوفے پر...... اِدھر آئیں اور اپنی کرسی پر بیٹھیں اور مجھے بتائیں کہ میں نے کہاں کہاں دستخط کرنے ہیں ڈاکومنٹس پر۔'' یہ کہتے ہوئے زفیرہ احمد اُس کے سامنے رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی اور بے چینی میں نہ صرف دائیں پاؤں کو ہلکا ہلکا تھرکانے لگی بلکہ دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہینڈ بیگ کو بھی دائیں بائیں گھمانے لگی۔ جب کہ گوندل بدستور مسکراتا ہوا کھڑا رہا۔

''آپ ابھی تک مجھے غلط سمجھ رہی ہیں میڈم! یہ کرسی بھی آپ کی اور یہ کمپنی بھی آپ کی۔ آپ نے غالباً آج کی شیئر مارکیٹ پر بھی نگاہ نہیں ڈالی...... ذرا گردن گھمایئے اور اپنے مانیٹر پر ہی دیکھئے کہ مہ نور کے شیئرز کا ریٹ کہاں جا پہنچا ہے۔ اُس جگہ کہ جہاں آپ کے کسی مخالف کو اُسے خریدنے کے لیے اپنا آپ بھی بیچنا پڑے تو پھر بھی خرید نہیں پائے گا۔''

زفیرہ احمد نے قطعی غیر یقینی کے انداز میں گردن گھما کر واقعی دیوار پر لگے شیئرز مارکیٹ کے مانیٹر کو دیکھا۔ مہ نور کے شیئرز کی ویلیو دیکھ کر اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ گوندل زفیرہ احمد کی ہونق ہو چکی صورت دیکھ کر مسکرا دیا اور میز سے وہی کل شام والی فائل اُٹھا کر اُس کے سامنے رکھ

دی۔

''یہ لیجئے اپنی امانت، آپ کی کمپنی کے انچاس فیصد شیئرز کی کل شام کے اوقات میں، تین مختلف اشخاص کی جانب سے خریداری کے سرٹیفکیٹ۔ کل آپ کو اِن کے جینوئن ہونے کا یقین نہیں آ رہا تھا لیکن ان کی خریداری کل بھی اسٹاک ایکسچینج سے تصدیق شدہ تھی اور آج بھی شیئر مارکیٹ میں اُس قیمت پر موجود ہیں کہ جہاں آپ کا مخالف پہنچ نہیں پائے گا۔''

''لیکن کل آپ نے یہ مجھ سے واپس کیوں لے لیے تھے؟'' زفیرہ احمد کے پاس اپنے اس شک سے الگ اور کوئی بات نہیں تھی۔ گوندل نے زفیرہ کی بات سنی تو ہلکا سا مسکرا دیا۔ ''میں جانتا تھا کہ آپ کے دل میں کیا بات ہو گی اور درخانئے نے آپ کو کیا پٹی پڑھائی ہو گی۔'' درخانئے کا نام آنے پر زفیرہ نے ایک بار پھر چونک کر گوندل کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر اطمینان تھا، آسودگی تھی۔

''میڈم! آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے سرٹیفکیٹ آپ کے حوالے کرنے کے بعد آپ کو آج صبح نو بجے آنے کا کہہ دیا تھا لیکن پھر ایک فون کال آئی تھی جسے سننے کے بعد میں نے لفافہ آپ سے واپس لے کر آج صبح یہیں آفس میں دینے کا وعدہ کیا تھا۔'' گوندل کی بات سننے کے باوجود زفیرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''میڈم! میرے باس کو خبر ہو چکی تھی کہ جونہی آپ فارم ہاؤس سے باہر نکلتیں یہ سرٹیفکیٹ ہر صورت میں آپ سے چھین لیے جاتے چاہے آپ اِس واردات میں زخمی ہوتیں یا جان سے جاتیں۔ لیکن جیسے انہیں علم ہو گیا کہ اصل سرٹیفکیٹ آپ کے پاس نہیں تو صرف دُرخانئے کو بھیج کر آپ کی برین واشنگ کی کوشش کی گئی۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ گو کہ سرٹیفکیٹ کل شام کی کلوزنگ کے لمحات میں خرید لیے گئے تھے لیکن پر چیز رجسٹر کلوز ہو جانے کے سبب اِن کی انٹری آج صبح ہونی تھی اور یہی وہ لیکونا تھا کہ جس کا فائدہ وہ اُٹھانا چاہتے تھے۔'' گوندل کی بات ختم ہوئی تو زفیرہ احمد پھر بھی چپ چاپ اُس کی جانب غور سے دیکھتی رہی کہ جیسے اُس کا سچ جھوٹ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''چونکہ آج صبح آپ نہیں آئیں لہٰذا تکمیلات کے بعد نئے ڈائریکٹرز کا اجلاس بلایا گیا

آپ کی صدارت میں۔ یہ اجلاس کی کاروائی ہے جس میں آپ کی چیف ایگزیکٹوشپ پر اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے۔ اِس پر تمام ڈائریکٹرز کے دستخط موجود ہیں سوائے آپ کے، آپ دستخط فرمایئے تاکہ اسے متعلقہ دفتر میں جمع کرانے کے بعد یہ قانونی کاروائی بھی پوری ہو۔ اور ہاں جن ڈائریکٹرز کے نام پر یہ شیئرز خریدے گئے ہیں یہ اُن کی جانب سے فروخت کرنے کی بلینک رسید شناختی کارڈز کی کاپی سمیت۔ آپ جب چاہیں ان رسیدات کی بنیاد پر انہیں اپنے نام یا جن کے نام کرنا چاہیں کر لیں۔ اب اِس تمام معاملے سے میرا یا میرے باس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ میرا مشن پورا ہو چکا۔ اب آپ آیئے اپنی کرسی پر تاکہ آپ کے دشمنوں کا رہا سہا حوصلہ بھی ٹوٹ جائے۔''

''لیکن میں پہلے آپ کے باس سے ملنا چاہوں گی تاکہ اس احسان کی قیمت کا اندازہ لگا سکوں۔'' زفیرہ کی آنکھیں نم ہو چلی تھیں۔

''میرے باس بہت موڈی ہیں میم! جب دل چاہا خود ہی چلے آئیں گے۔ اور رہی اِس مہربانی کی قیمت تو ایک بات واضح کر دوں کہ میرا باس مہربانیوں کی بولی نہیں لگاتا اور نہ ہی اِن کا دھندہ کرتا ہے...... اَب آپ آیئے اپنی کرسی پر تاکہ میں آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ کے حکم سے کافی پی سکوں اور آپ کے ایمپلائیز کو بھی یقین ہو جائے کہ آپ اپنی جگہ قائم ہیں کسی آئرن لیڈی کی مانند۔''

۞

﴿۳۴﴾

نیئر جمیل کے محل نما بنگلے میں عروج پر پہنچی ہوئی پارٹی میں کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ وہاں گذشتہ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو چکا ہے۔ انصر کے بھی رپورٹ کرنے سے پہلے نیئر کے علم میں آ چکا تھا کہ تمام تر حفاظتی حصار کے باوجود پارٹی میں سے ماہین کو اغوا کیا جا چکا ہے۔ سیکورٹی کیمرے کی فوٹیج سے اتنا معلوم ہو سکا کہ اغوا کرنے والا کس عمر اور کس قد کاٹھ کا تھا مگر چہرے پر نقاب اور مکمل اندھیرے کی وجہ سے انفرا ریڈ خصوصیت رکھنے والے جدید کیمرے لگے ہونے کے باوجود صورت کا فوری طور پر پہچانا جانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ نیئر کے محل کے سیکورٹی نگران نے مزید کسی تاخیر کے بغیر پارکنگ ایریا کی مکمل ویڈیو کوریج نیئر جمیل کے سامنے پیش کر دی لیکن یہاں بھی مکمل اندھیرے کی صورت اگرچہ ناموافق صورت حال پہلے سے موجود تھی مگر ماہین کے اغواء کے اگلے چند لمحوں میں پارکنگ سے نکلنے والی تین گاڑیوں نے معاملے کو مزید گھمبیر بنا دیا۔

یہ تینوں گاڑیاں تین مختلف شخصیات کی تھیں جن کا آپس میں ماہین جیسی عام لڑکی کے اغواء پر اجماع ہونا ایک احمقانہ خیال ہی ہو سکتا ہے۔ یہ تینوں گاڑیاں بالترتیب ڈی آئی جی پولیس، صوبائی سیکریٹری بلدیات اور صوبائی سیکریٹری محکمہ تعلیم کی تھیں۔ لیکن ان تینوں میں مشترک بات صرف گاڑیوں کے ڈرائیوروں کا باہر جانا تھا۔ یہ بھی حیران کن اتفاق تھا کہ جیسے گاڑیاں پارکنگ سے نکلیں، روشنی بحال ہو گئی۔ سیکورٹی نگران جو ابھی تک نیئر جمیل کو روشنی کے متبادل نظام کے فوری طور پر کام نہ کر سکنے کی کوئی توجیہہ پیش کرنے میں ناکام رہا تھا اِن

واقعات کی کڑیاں ملانے کے لیے بھی مزید وقت کا طلب گار تھا کہ پارکنگ سے تقریباً اکٹھی نکلنے والی گاڑیوں میں سے صرف دو مختلف اوقات میں آسکی تھیں جب کہ سیکریٹری بلدیات نے پارٹی سے قبل از وقت جاتے وقت سیکریٹری تعلیم کی گاڑی میں جانے کو ترجیح دی تھی جو خود پارٹی ختم ہونے سے پہلے جانا چاہ رہا تھا۔

نیئر جمیل سٹپٹانے کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اُس کا ذہن ماؤف اور بلڈ پریشر اِس طرح سے بے ترتیب ہوا کہ اُس کے مزاج کے بارے میں قائم کی گئیں سبھی آراء باطل ہو چکی تھیں۔ جس قسم کی پارٹی اُس نے آج ترتیب دی تھی اُس میں وہ عموماً آخری مہمان کی رخصتی تک موجود رہتا مگر آج اُس کا پارٹی درمیان میں چھوڑ کر غائب ہو جانا اُس کے دوستوں کو تو شاید نہ کھلا ہو مگر اُن شرفاء کو ضرور کھلا کہ جو آج پہلی بار خصوصی دعوت پر وہاں شریک ہونے آئے تھے۔ ماہین شاید اُس کی زندگی میں آئی ہوئی سب سے ماٹھی لڑکی نہ کہی جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا مگر اُسی لڑکی نے اُس کے ذہن کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ شہر کے امیر ترین بزنس ٹائکونز میں شامل غیر شادی شدہ نیئر جمیل اگر چاہتا تو تھا تو ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت لڑکی اُس کی بانہوں میں ہوا کرتی مگر اُس کے سر پر عجیب خبط سوار تھا۔ شادی نہ کرنے اور عام آدمی کی سی جستجو کے طور طریقوں سے کسی لڑکی تک رسائی اور پھر اُس کا فتح کیا جانا، پہلے ذہنی اور پھر جسمانی اعتبار سے۔ اِس مقصد کے لیے اُس نے ایک اوسط درجے کا اپارٹمنٹ لے کر اُسے مناسب طور پر ڈیکوریٹ کر رکھا تھا تا کہ لڑکی اِسی گماں میں رہے کہ وہ ایک کھاتا پیتا مگر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والا عیاش شخص ہے اور اِس سے زیادہ کچھ نہیں تا کہ توقعات باندھنے میں حد حائل رہے۔

یہ کوئی نفسیاتی عارضہ تھا یا کسی محرومی کا پیدا کردہ ذہنی بحران کہ نیئر اپنی ٹارگٹ لڑکی کے ساتھ تعلقات میں جس قدر پیچیدگیوں کا سامنا کرتا، وہ اُتنا ہی انجوائے کرتا، حظ اُٹھاتا اور ایک ایسی مخصوص کیفیت میں چلا جاتا کہ جہاں سرشاری کو بوند بوند اپنے خون میں رقصاں دیکھنا اور مسام مسام اپنے جسم میں محسوس کرنا اُس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ شروع شروع میں عموماً تصنع پر اُستوار انکار کے کھنچاؤ سے لبریز مراحل سے گزرنے کے بعد ایک مائل بہ مزاحمت مست

اندام مگر بظاہر کمزور سی لڑکی پر فتح یابی کا شادیانہ بجتے ہی اُس کے من میں تلاطم برپا کرتے طبلِ جنگ کو نہ صرف قرار آ جاتا بلکہ سرتاپا وہ یوں بکھر کر رہ جاتا کہ کبھی مُشتِ خاک کی شکل میں حملہ آوری کے چلن سے آشنا بھی نہ ہوا ہو۔ صنفِ نازک پر غلبہ یا فتح یابی کا مطلب اُس کے نزدیک ایک مکمل جنسی عمل کبھی نہ رہا تھا بلکہ لڑکی کی طرف سے مزاحمت ختم کرنے یا اُس کی جانب سے اجازت مل جانے کو ہی نیئر اپنی فتح گردان کر ایک طرف ہو جایا کرتا کہ جیسے کوئی کھلاڑی محض واک اوور کو ہی اپنی کامیابی سمجھ لے۔ لیکن جب تک یہ معاملہ "ناں" سے "ہاں" کے بیچ لٹکا رہتا وہ بدقسمت بھی کھونٹی سے لٹکی رہتی۔ مجال جو کسی اور کی طرف دیکھ بھی سکے یا کہیں اور جا بھی سکے۔ ایسے میں نیئر کا اصل چہرہ مکوٹھے سے باہر آ جاتا جس کا نقاب میں واپس جانا اُس وقت تک ناممکن کہ جب تک کامیابی کا پھریرا لہرا نہ جائے۔

بہت کم ایسا ہوا کہ ایک طویل تذبذب اور خاصے تردد کے بعد کوئی لڑکی اُس کے ساتھ ہم بدن ہونے کے لیے رضامند ہوئی اور نیئر واقعی اُس کے قریب بھی گیا۔ وگرنہ اُس کی کامیابی محض مفتوحات کی فہرست میں ایک اور نمبر کا اضافہ اور اُس کے بعد وہ کسی اور کے تعاقب میں۔ نیئر جمیل کا یہ روپ اُس کے معتمدِ خاص اَنصر کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ صرف وہی جانتا تھا کہ کب کس لڑکی کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں کا رنگ بدلے اور گالوں کے اندر جبڑے کچکچانے لگیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سی حدود ایسی تھیں کہ جنہیں عبور کرنے کی اجازت اَنصر کے پاس بھی نہیں تھی۔

نیئر جمیل کی مفتوحہ لڑکیوں کی فہرست میں ماہین پہلی لڑکی تھی کہ جو مفتوحہ کی تعریف میں ہوتے ہوئے بھی اُس کی فتح یابی کو چیلنج کیے ہوئے تھی۔ ہوا یوں کہ اُس نے بلا حیل و حجت خود کو پہلے ہی گام پر مغلوبانہ انداز میں کسی دسترخوان کی مانند اِس طرح نیئر کے سامنے بچھا دیا کہ اُس کی بھوک، شدت مند ہونے سے پہلے ہی بھرے ہوئے پیٹ کی اُبکائی میں بدل گئی۔ اَب نہ تو نیئر کے من میں کہیں کوئی خواہش غلبہ باقی رہی اور نہ ہی جھپٹنے سے پہلے اُس کے دانتوں میں کوئی خوئے کچکچاہٹ۔ بلکہ وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ لیکن اِس سے پہلے کہ وہ حسبِ معمول اُسے بھی لات مار کر چلتا کرتا ماہین کے جسم سے اُٹھنے والے اضطراب اور تشنج جیسے تغیرات نے

نیئر کو کچھ دیر کے لیے جامد کر لیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایسے میں خجالت اور رد کیے جانے کے شدید ترین احساسِ حقارت کے ہوتے ہوئے وہ کیا ہے جو ماہین کے وجود سے پھر سے جنم لے رہا ہے۔ وہ اُسے بھی وہی ایذا دینا چاہتا تھا کہ جو اِس سے بھی کم حساسیت کے لمحات میں وہ ٹھکرائی جا چکی لڑکیوں سے عادتاً روا رکھتا تھا مگر کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ ایسے موقع پر ٹُھس ہونے کی بجائے یہ کیسی تعجب انگیز توانائی تھی جو ماہین کو جسمانی لحاظ سے مائل بہ اضطراب کیے جا رہی تھی۔ کیا یہ کوئی ڈراما تو نہیں تھا جو کھیل ختم ہوتا دیکھ کر مطلب براری کے واسطے رچایا جا رہا تھا؟

یہ آخری خیال کیا آیا، نیئر تیزی سے اُٹھا اور برہنہ پڑی ہوئی ماہین کو ایک دم کئی طمانچے وحشیانہ انداز میں جڑ دیے۔ بس یہی وہ لمحہ تھا کہ جب ماہین کے جسم میں وہی بجلی پھر سے کوندی کہ جسے غلطی سے ہوٹل میں طیفے ویٹر نے اور پھر پولیس والوں کے نجی عقوبت خانے میں چار وحشی سپاہیوں نے جگا دیا تھا۔ اب یہی غلطی ایک اور ڈھب سے نیئر سے بھی ہو چکی تھی کہ وہ ماہین کی جانب سے اظہارِ اشتہاء کی اولیں عطا کو اُس کی شکست کا حتمی مرحلہ سمجھ بیٹھا تھا۔ پھر کافی دیر تک نیئر جمیل کو بھنبوڑے جانے کی آوازیں اُس کی دبی دبی چیخوں میں گندھی جاتی رہیں لیکن ماہین کے انگ انگ میں پھیلی ہوئی متلاطم بے قراری کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ آخرش جب ماہین کے رگ و پے میں پھنکارتے جنون کے تھمنے کی کوئی آس باقی نہ رہی تو اُس نے اپنے بدن سے پیدا ہوتی چیخوں کو اپنے گلے میں اس طرح کچلنا شروع کیا کہ جیسے کوئی ذبح ہوتا ہوا جانور سخت اذیت میں ہو۔ ماہین کی یہ کیفیت دیکھ کر نیئر نے بیڈ سے اُٹھ کر نکل بھاگنا چاہا مگر ماہین نے ایک زوردار لات مار کر اُسے منہ کے بل گرا دیا۔

''اُو کتی کے بچے چھکے! نجانے مردوں والا نام کیسے رکھا ہوا ہے؟ آئندہ میرے سامنے آنا تو نام بدل کر اور منہ چھپا کر آنا۔'' ماہین نے بیڈ سے اُٹھتے ہوئے نہ تو یہ دیکھا کہ نیئر مرا کہ جیا اور نہ ہی یہ دھیان دیا کہ اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے وہ کس حال میں تھی، بس کپکپی تھی کہ پورے بدن پر طاری اور منہ سے ہذیان کا سلسلہ رک نہیں رہا تھا۔ وہاں سے باہر آتے ہی ایک رکشا ملا اور یہ جا وہ جا ہوسٹل کی طرف۔

ماہین تو اپارٹمنٹ سے چلی گئی مگر جاتے ہوئے اِس ایک جملے کے ساتھ نیئر جمیل کے پورے مردانہ دبدبے، غرور اور گھمنڈ کو بے بسی کی کھونٹی پر لٹکاتی گئی۔ نیئر اگرچہ ماہین کی غیر معمولی شہوانی شدت سے خوفزدہ ہو چکا تھا مگر وہ ایک ایسی عورت کو اپنے تسلط سے آزاد بھی کیونکر کر سکتا تھا کہ جس نے مردانہ مکھوٹے کو اُس کے چہرے سے اتار پھینک کر اندر سے ایک چھکا باہر نکال کھڑا کر دیا تھا۔ ایک معمولی لڑکی نے اُس کو تنہائی میں بھی یوں رسوا کیا کہ اَب وہ آئینے میں بھی اپنے آپ سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ نجانے کہاں اُس نے اتنے آنسو چھپا رکھے تھے کہ بہنا شروع ہوئے تو کئی دن تک بہتے ہی چلے گئے۔ سوائے اَنصر کے کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ملک بھر کے کتنے ہی کاروبار ہائے کا پسِ پردہ ٹائیکون اور اُن کے روزانہ کے نرخ نکالنے والا نیئر جمیل کہاں اور کس حال میں ہے۔ سینکڑوں لڑکیوں کی اَنا اور عزتِ نفس کو مجروح کرنے والے کی مردانہ اَنانیت کو جس طرح ماہین خاک چٹا کر گئی تھی، اُس کا فراموش کیا جانا کم از کم نیئر جمیل جیسے منتقم شخص کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اُس نے ایک ایسے جملے میں نیئر کی پوری شخصیت کی تفہیم کر دی کہ جس کے اندر وہ خود اپنے آپ ہی لپٹتا چلا گیا۔ جیسے کہ کوئی وائرس ناموافق حالات میں اپنے آپ کو سخت قسم کے خول میں لپیٹ لیتا ہے، موافق وقت کے انتظار میں۔

لیکن ماہین سے ملے بغیر وہ بمشکل ایک ہفتہ ہی گزار سکا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے فون کر دیا۔ کوئی بات تو تھی کہ جس نے نیئر جمیل جیسے اکھڑ، تند خو اور طوطا چشم شخص کو ماہین سے رابطے پر مجبور کر دیا۔ موافق وقت کو جلد از جلد قریب سے قریب تر لانے کی خواہش یا محرومی کی اُس کھونٹی سے بندھ جانے کا ارادہ نما فیصلہ کہ جس نے اُس کے اندر کے انسان کو اُس کی شخصیت کی آخری پرت سے اکھیڑ کر اس طرح باہر لا پھینکا کہ اب چھپانے کو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ شاید ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ ہر اُجڈ، تلخ مزاج اور حاکمیت پسند عورت کی طرح انہی صفات کا حامل مرد بھی کہیں اندرخانے یہی خواہش رکھے ہوئے ہوتا ہے کہ صنفِ مخالف میں سے کوئی تو ایسا ٹکرے کہ جو اُس کے کس بل نکال کر اندرواندری عوام کی صف میں کھڑا کر دے۔ یعنی بالواسطہ خواہشِ محکومی۔

نیئر کے فون کرنے پر خلافِ توقع ماہین نے نہ تو کوئی شکوہ کیا اور نہ ہی کوئی ایسا طرزِ عمل اپنایا کہ جس سے کسی قسم کی ناراضگی جھلکتی ہو۔ بس سب کچھ پہلے جیسا نارمل مگر جب اِس کے بعد پہلی ملاقات ہوئی تو سب کچھ ویسا نہ تھا۔ دونوں جانب سے ہلکا ہلکا کھنچاؤ جو کچھ دن گزرنے کے بعد نرم تو ہوا مگر اِس دوران ماہین کے مطالبات بڑھتے چلے گئے جو زیادہ تر معاشی ضروریات سے متعلق ہوا کرتے جب کہ نیئر جمیل میں پھر سے وہی خصلت بہت کم وقفوں اور زیادہ شدت سے عود کر آنے لگی کہ جو اُس کی طبع اور فطرت کی بنیاد تھی یعنی ماہین کے عورت پن سے نفرت اور اُس کی تذلیل کا کوئی موقع ہاتھوں سے جانے نہیں دینا۔ لیکن اَب کے عجیب بات یہ تھی کہ نیئر جمال کی اِن باتوں پر ماہین کم ہی ردِعمل کا اظہار کرتی اور اگر کرتی بھی سہی تو عموماً ایک مسکراہٹ اور مسکراہٹ کے ساتھ بندھی ہوئی کوئی فرمائش۔ یہ سلسلہ بھی محض چند دن قائم رہ سکا کہ دونوں اپنی اپنی جبلت سے مجبور اور دکھاوا کرنا دونوں کی سرشت میں نہیں تھا۔ بس اتنا ضرور ہوتا رہا کہ کبھی نیئر جمیل نرم پڑ جاتا اور کبھی ماہین سُنی ان سُنی کر دیتی لیکن اِس کے باوجود اُس دن پریشر کُکر پھٹ گیا۔ کسے معلوم کہ چولہے میں آگ تیز تھی، سیفٹی والو خراب یا ڈھکن کے اندر کا ربڑ کریک ہو چکا تھا۔

لیکن حقیقت اب یہی تھی کہ وہ ایک معمولی لڑکی جس نے شہر کے پانچویں بڑے بزنس مین کے حصارِ ذات اور اعصابی کائنات میں دراڑیں ڈال کر اُسے اپنے آپ ہی میں بے وقعت کر کے رکھا ہوا تھا، اب اُسی کے قلعہ نما گھر کے اندر سے اغواء کی جا چکی تھی۔ اغواء کا موقع محل اور ٹائمنگ بھی کچھ اِس طرح ترتیب دی گئی تھی کہ نیئر جمیل اُن تین گارڈیوں کے کسی بھی ڈرائیور سے پوچھ گچھ کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ ایسے میں کچھ بھی کہنا محال تھا کہ ماہین کو زمین کھا گئی یا آسماں نگل گیا۔ نیئر جمیل کے لیے ماہین جیسی لڑکی اگرچہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی مگر اُس نے جس طور نیئر کی خوئے غاصبیت وتسلط کو مبارزت دے رکھی تھی، وہ اُس کے لیے اہم ترین ہو چکی تھی۔ وہ اُسے اُس وقت تک زندہ سلامت چاہئے تھی کہ جب تک اُس کا اندراج اُس کی مفتوحہ خواتین کی فہرست میں نہ ہو جاتا۔ شبہ تو یہ بھی تھا کہ ایک دم ہو جانے والے اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر وہ خود ہی کہیں پھسل نہ گئی ہو کیونکہ بظاہر تو اُس کی جان چھوٹنے والی

نہیں تھی۔ ہر آنے والے لمحے میں اِس آخری شبے پر اُس کا دھیان باقی شبہات کی نسبت زیادہ ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن واہمہ یہ بھی تھا کہ اُس کے یوں کھسکنے میں اُس کا کوئی اور ملازم تو ملوث نہیں۔ بات اَب کہیں آگے نکلا چاہتی تھی لیکن وہ کسی طور بھی ماہین کو یہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اُس کے خلوت کے معاملات اُن لوگوں تک پہنچائے کہ جو اُس کی شہرت کو داغدار کرنے موقع رکھتے ہیں۔ اِس قسم کی صورتحال میں چھوٹے ملازم زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ نیئر جمیل کے پاس اب اِس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اُن تینوں ڈرائیوروں کی حرکات و سکنات پر کسی نجی جاسوس کمپنی سے نگاہ رکھوانے کے ساتھ ساتھ اِس نکتے پر بھی واقعات کو کھنگالے کہ ماہین کہیں اپنے طور پر تو گھر سے نہیں بھا گی۔ اتنی خبر تو نیئر جمیل کے پاس ابھی سے پہنچ چکی تھی کہ یہاں سے غائب ہونے کے بعد نہ تو وہ ہوسٹل پہنچی تھی اور نہ ہی ای الیون کے اپارٹمنٹ میں۔ اب وہ جہاں بھی تھی، نیئر جمیل کی آنکھوں اور تصور سے دور ہوتے ہوئے بھی، اُس کے اعصاب کو رگیدے چلی جا رہی تھی۔ آج اُسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ اگر کوئی معمولی سی معمولی عورت بھی مردانہ عملداری کو غچہ دیتے ہوئے اُس کے نظامِ تسلط کا منہ چڑا کر پنجہ استبداد سے نکل بھاگتی ہے یا اُس کے حصار سے ماورا ہو جاتی ہے، تو قابلِ گردن زنی کیوں قرار پاتی ہے۔ مردانہ غیرت شاید مردانہ کمزوری کے لفافے میں لپیٹا ہوا زنگ آلود طمنچہ ہوتی ہے جس کا استعمال اجتماعی رعشے کی صورت ظاہر ہوتا ہے۔

﴿۳۵﴾

ملک میں اگلے عام انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا مگر موجودہ حکومت کے تحلیل ہونے اور عبوری سیٹ اپ کے حلف اُٹھانے میں ابھی دو ماہ باقی تھے۔ موجودہ حکومت کی گذشتہ الیکشن میں اچھی خاصی مالی اعانت کے علاوہ بھی دانش سعید نے اُس وقت اوپن چیک سائن کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا کہ جب اِس پارٹی کو حکومت بنانے کے سلسلے میں سات آزاد ممبران قومی اسمبلی کی پارٹی میں شمولیت مطلوب تھی۔ اِسی دوران وزیر اعظم کے انتخاب سے ایک رات پہلے جب ایک چھوٹی جماعت کے چار ممبران نے پارٹی لائن سے روگردانی کرتے ہوئے ایک وزارت پر اکتفا کرنے کی بجائے دوسری وزارت بھی مانگ لی تو اُنہیں رات دو بجے غیر معمولی زرتعاون پیش کرنے کے لیے بھی دانش سعید کا ''بریف کیس'' کام آیا لیکن حکومت سازی کا عمل مکمل ہوتے ہی اُسے اپنے لیے وہ توقیر کہیں دکھائی نہ دی جس کی وہ بجا طور پر توقع رکھتا تھا۔

ہاں اِن پانچ برسوں میں اُسے دو تین لائسنس ایسے ضرور دیے گئے کہ جن سے اصل سرمایہ تو واپس نکل آیا لیکن جن مفادات کے لیے اُس نے آنکھیں بند کر کے پارٹی پر سرمایہ کاری کی تھی وہاں قطعی نا اُمیدی کا سامنا رہا۔ اب جب کہ حکومت کے چل چلاؤ کا بگل بج چکا تھا دانش سعید جیسا مخلص سرمایہ دار اپنی ہی پارٹی کی وعدہ خلافیوں کے سبب کاروباری نوعیت کی کئی دیدہ اور نادیدہ پریشانیوں کے حصار میں آ چکا تھا لیکن اِس کے باوجود نہ تو ابھی تک مایوس ہوا اور نہ ہی حوصلہ ہارا۔ عالمی شہرت یافتہ سپورٹس کار کا درآمدی لائسنس اگرچہ کافی تردد کے

بعد کئی مہینے پہلے اُسے دیا دیا گیا تھا مگر یونہی نہیں بلکہ اوپر سے ملنے والے حکم کی تعمیل میں پھر سے ایک بہت بڑی رقم پارٹی کے فنڈ میں جمع کرانے کے نام پر وزیر تجارت کے حوالے کرنی پڑی تھی مگر پھر بھی امپورٹڈ گاڑیوں کی پہلی کھیپ نامعلوم وجوہات کے سبب اب تک کراچی کی بندرگاہ کا منہ نہیں دیکھ سکی تھی۔

کون نہیں جانتا تھا کہ بلین ڈالرز کی اِس گیم میں صرف تین کھیپوں کی بروقت آمد دانش سعید کو کاروباری دنیا میں ایسا جمپ دے سکتی تھی کہ اُس کے قریب قریب کے حریف بھی اُس کے قریب پھٹکنے کو ترستے مگر لگتا یوں تھا کہ اُس کے سبھی مخالف اور بدخواہ ایک ہی نکتے پر اکٹھے ہو گئے اور حریفانہ حربوں سے پہلی کھیپ کی آمد ہی کو خواب بنا دیا تھا۔ حیران کن امر تو یہ تھا اِس کھیپ کی آمد کو عبوری سیٹ اپ تک لٹکانے کے لیے جہاں حکومتی پارٹی کے کچھ ''دوست'' پیش پیش تھے وہیں حزبِ اختلاف کی سب سے بڑی پارٹی کی لیڈر شپ بھی پس پردہ تمام منفی ہتھکنڈوں کے ساتھ کارفرما تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ پارٹی فنڈ کے واسطے بلا حساب و شمار سرمایہ کسے نہیں چاہیئے تھا۔ ایسے حالات میں جب سیاسی جماعتیں الیکشن کی تیاریوں میں اپنا اپنا دھندہ چمکانے میں جُتی ہوئی ہوں، ریاستی عمال بھی اپنی اپنی جیبیں سرِ عام کھول رکھنے میں ذرہ برابر بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ جو دے اُس کا تو بھلا اور جو نہ دے اُسے مختلف حیلوں سے نشانِ عبرت بنا دیا جاتا ہے۔

پارٹی کا ہمیشہ سے وفادار ہوتے ہوئے بھی اِن حالات میں ایک بہت بڑی رقم داؤ پر لگا کر دانش سعید اپنی سرمایہ کاری سمیت ہوا میں معلق تھا۔ اگرچہ برے سے برے حالات میں بھی ایسی سرمایہ کاری کبھی نہیں ڈوبا کرتی، نکل ہی آتی ہے مگر کچھ تاخیر سے۔ لیکن یہی تاخیر سرمایہ کار کے بزنس کو کس طرح لمحہ بہ لمحہ برباد کرتی چلی جاتی ہے اُس کا اندازہ سرمائے کی شرح کے تناسب سے لگانا مناسب نہیں ہوتا۔ منافع اگر روپیہ نہ ملے تو چونی مل ہی جاتا ہے مگر کاروبار سے جڑی ہوئی اُس ساکھ کے نقصان کا ازالہ کیسے ہو جو الزامات کے انبار میں صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن اِن سبھی اندیشوں کے ہوتے ہوئے بھی دانش سعید کے لیے سب سے زیادہ پریشانی حکومت کی تحلیل کے لیے کاؤنٹ ڈاؤن کے شروع ہو جانے سے تھی۔ وہ اچھی طرح

جانتا تھا کہ ایسے میں عبوری حکومت میں شامل ہونے والے سیاست دانوں اور ٹیکنوکریٹس کے بارے میں افواہوں اور اندازوں کا بازار گرم ہو کر کرسی پر موجود بیوروکریٹس کی قوت فیصلہ سلب کر لیتا ہے۔ اور اگر فیصلہ سازی کی یہ قوت سلب نہ بھی ہو تو غیر یقینی کا خوف اِس قدر غالب آ چکا ہوتا ہے کہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس نے رشوت کا مطالبہ کیا اور کون کس کے نام پر لے کر چلتا بنا۔ دانش سعید کے لیے مخمصہ یہ بھی تھا کہ اگر یہ حکومت تحلیل ہو گئی تو عبوری حکومت میں نجانے کون آئے اور اُس سے کس طرح کا سلوک کرے۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ درآمدی لائسنس منسوخ کرتے ہوئے اُس کے خلاف احتساب کی کاروائی شروع کر دی جائے۔ کتنی دیر لگتی ہے کسی بزنس مین کا تعلق کسی سرکاری آفیسر سے جوڑنے میں۔

ایک معتمد ترین شخصیت کی براہ راست ضمانت کے نتیجے میں وزیر تجارت سے ہونے والی بالمشافہ ڈیل کے بعد کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اُن کتے بلوں سے بھی بارگین کرتا پھرتا کہ جن کا کام محض چچڑی ہوئی ہڈیوں سے گوشت کے ریشے اُتارنا رہ جاتا تھا۔ لیکن پتا یہ چلا کہ اِن کتے بلوں کی ٹاں ٹاں اور غراہٹ کے عقب میں پھر سے ایک بلیک ہاؤنڈ بھی ہے جسے بڑے صاحب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اِس بلیک ہاؤنڈ سے دانش سعید کی مخاصمت برسوں سے تھی مگر کبھی ایک دوسرے کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ دانش بسا اوقات حیران ہوتا کہ جس سودے میں وہ ہاتھ ڈالتا ہے اُسی میں کہیں نہ کہیں سے وہ بھڑ وا بھی ضرور آن ٹپکتا ہے مگر ہمیشہ کسی دوسرے سوداکار کے کاروباری مفادات کا محافظ بن کر۔ اِس بار بھی وہ ایک ایسی پارٹی کی پشت پر تھا کہ جو صرف دانش سعید کی ڈیل خراب کرنے کے لیے ایک ایسی سپورٹس کار کی فرضی درآمد کی اشتہاری مہم چلائے ہوئی تھی کہ جو عالمی سطح پر دانش کی درآمد کردہ سپورٹس کار کی ٹکر کی ہوتے ہوئے بھی قیمت میں اُس سے کہیں زیادہ کم اور استعمال میں کم خرچ تصور کی جاتی تھی۔ اِسی سبب اُن لوگوں نے بھی بکنگ سے ہاتھ کھینچ لیا جو واقعتاً دانش سعید کی درآمد کردہ گاڑیاں خریدنا چاہتے تھے۔ اب ایک طرف تو امپورٹ کا لائسنس ملنے کے باوجود گاڑیوں کی امپورٹ رکی ہوئی اور دوسری جانب جتنی رقم گاڑیوں کی بکنگ سے اکٹھی ہونی تھی، وہ بھی خواب بن کر رہ گئی۔ دانش سعید بخوبی جانتا تھا کہ اِس قسم کی صورتحال کا پیدا کرنا بڑے صاحب جیسے گُرگے کا

ہی کا ہنر تھا کہ جو بظاہر فرنٹ پر بھی اپنے کارندوں کو رکھا کرتا تھا۔

اِس دھندے میں بڑے صاحب کو اُن تمام پریشر گروپس کی خدمات حاصل ہوا کرتیں کہ کہ جو بنے بنائے کھیل کو بگاڑنا اور بگڑے ہوئے کھیل کو سنوارنا جانتے تھے۔ ایک جانب اگر اُسے متعلقہ وزارت کے اُن تمام چھوٹے بڑے اہلکاروں کا تعاون دستیاب ہوتا کہ جن کا لکھا ہوا ایک جملہ وزارت کا سیکریٹری بھی نظر انداز کرنے کی سکت نہیں رکھا کرتا تو دوسری جانب الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے تمام بزرجمہر جو صبح سے شام تک ایسا سماں باندھے رہتے کہ یوں لگتا کہ اِس وقت ملکِ عزیز کا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی ہے اور اگر اِس کو اِسی وقت اُن اینکرز یا رپورٹرز کی منشا کے مطابق حل نہ کیا گیا تو کچھ خبر نہیں کہ آسمان گر پڑے یا زمین پھٹ جائے۔ تمام چینلز کے پرائم ٹائم پر بیک وقت چیختے چنگھاڑتے اینکرز اور محض اپنی قیاس آرائی کو خبر کا رنگ دے کر اخبارات کے پہلے صفحے پر چھ چھ کالمی سرخیاں لگواتے رپورٹرز کچھ ایسا رنگ جماتے کہ کونے کھدروں میں دبکی وزارتوں کو ہاتھ جوڑ کر جان چھڑانی پڑتی۔

ایسے میں بڑے صاحب نے جب دیکھا کہ اِس دھندے میں چوروں کو مور پڑنے کا امکان اُتنا ہی ہوتا ہے کہ جتنا چوری کا تو اُس نے خود پس منظر کے بھی پس منظر میں رہتے ہوئے ایک دھانسو قسم کے اخبار کا ڈیکلیریشن اور ایک سیٹلائٹ ٹی وی چینل کا لائسنس لے کر سبھی معاملات کو چند ہفتوں میں اِس طرح عملی شکل دی کہ تمام معروف کالم نگار اور صحافی منہ مانگی قیمت پر اُس کے اخبار کے ادارتی صفحے پر اور شام سات بجے سے رات گیارہ بجے تک چائے کی پیالی میں طوفان برپا کرنے والے سبھی ٹی وی اینکرز اُس کے چینل کی اسکرین پر گلا پھاڑ پھاڑ چیخنے چلانے کو بیٹھ گئے۔ بڑے صاحب کو کسی بھی شخص کی بولی لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اُس کی پہلی آفر ہی اتنی پُرکشش ہوتی کہ سننے والے کو اپنی رال روکنی مشکل ہو جاتی۔ لیکن اِس کے باوجود کوئی نہیں جانتا تھا کہ اِس اخبار اور ٹی وی چینل کا مالک کون ہے۔ اُس کی میڈیا پالیسی ہی کچھ اِس قسم کی تھی کہ جس میں روزانہ کی بنیاد پر بڑے صاحب جیسے لوگوں کو گالیاں پڑنا ضروری خیال کیا جاتا کہ کل کلاں کو اُس کے مخالفین کی طبیعت درست کرنی پڑے تو غیر جانبداری کا تاثر متاثر نہ ہو۔

اگر بڑے صاحب کی اب تک کی زندگی میں جھانک کر دیکھا جاتا تو عورتوں کی دلالی سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کرنے والے کی پہلی ناکامی بھی زفیرہ احمد نام کی ایک عورت سے منسوب ہو چکی تھی۔ بڑے صاحب نے اِس معاملے میں ناکام نہیں ہونا تھا اگر اِسے تھوڑا سا بھی سنجیدہ لیا ہوتا۔ اُس نے اِسے بس کھیل ہی سمجھا زفیرہ کو ہلکا پھلکا رقص سکھانے کے لیے تا کہ وہ مستقبل میں اُس کے اشاروں پر ناچتی رہے۔ کلاسیکل رقاصہ تو وہ تھی نہیں کہ اُسے مشکلوں میں ڈالا جاتا اور نرت بھاؤ بتانے کے لیے کسی مہاراج کتھک کی خدمات لینی پڑتیں مگر معمولی نوعیت کے اِس بنے بنائے کھیل میں اُس وقت بگاڑ پیدا ہو گیا کہ جب اُس کا پرانا حریف دانش سعید نجانے کہاں سے کیا نیت لے کر وہاں آن ٹپکا۔ شاید ماضی کا کوئی حساب چکتا کرنا تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ زفیرہ احمد بڑے صاحب کو بہت عرصے سے بھلی لگتی تھی۔ جب ابھی وہ کچھ بھی نہ تھی وہ اُسے کچھ اچھی ڈیلز کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا مگر وہ ہر بار کسی ہرنی کی مانند ہاتھوں سے پھسل جایا کرتی۔ پھر اُس نے انٹرپینیورشپ میں نام پیدا کیا تو اُس کی حیثیت اپنی ماڈلز سے بھی سوا ہو گئی۔ کچھ سر پھرے آفیسرز اُس سے خلوت کا تقاضا کرتے تو وہ فون پر ہی ہنس کر ٹال جاتی اور بڑا صاحب بھی اسے سنجیدگی سے نہ لیتا۔ لیکن جب وہ اپنے کاروباری عروج پر پہنچی تو رعونت اور بدلحاظی اُس کے مزاج میں شامل ہوتی چلی گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انڈر ورلڈ، شوبز اور ایڈورٹائزنگ ایک دوسرے سے لاتعلق ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے بغیر پنپ نہیں رہ سکتے، زفیرہ احمد نے جھوٹ، وعدہ خلافی اور چترائی کو خطرناک حد تک اپنا وطیرہ بنا لیا۔ بڑے لوگوں سے تعلقات کے بَل پر خوامخواہ اور بلا ضرورت بڑے صاحب جیسے خیر خواہوں کو جُل دے جانا۔

ٹھیک ہے ملک کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی کی سربراہ بن کر وہ اتنی بلند قامت ہو چکی تھی کہ جہاں اپنے ہم پیشہ حریفوں کو ڈکٹیٹ کرانا اُس کے لیے مشکل نہ رہا تھا تھی مگر بڑے صاحب جیسے بلیک ہاؤنڈ کو بھی اکثر اوقات اپنی فائلیں چھوٹی میز سے بڑی میز تک پہنچانے اور پھر وہاں سے کامیابی سے نکلوانے کے لیے کسی ایسی سپر ماڈل کی خدمات کی

ضرورت پڑتی ہی رہتی کہ جس سے صحبت کے لمحات کو دولت کے پلڑے میں تولا نہیں جا سکتا تھا۔ اَب یہ زفیرہ کی بدقسمتی کہ ایسی سبھی سپر ماڈلز صرف مہ نور ایڈورٹائزرز کے اشتہارات میں ہی جلوہ افروز ہوتی تھیں لہٰذا اُن کا تعلق بھی مہ نور کی مالکہ زفیرہ احمد سے اور زیرِ اثر بھی صرف اُسی کے۔ بڑے صاحب کے تئیں زفیرہ احمد پرانی جان پہچان کے باوجود، چاہے فون کی حد تک ہی سہی، اُسے جان نہ پائی۔ وہ دوستوں سے بھی معاملہ کرتے ہوئے کسی کا حق نہیں رکھتا تھا بلکہ ''اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے'' کا قائل مگر جب زفیرہ کی چالاکیوں کے سبب اُس کے دھندے پر حرف آنے لگا تو اُس نے یونہی چھوٹی سی شرارت کرتے ہوئے اُسے اپنے پنجرے کی چڑیا بنانا چاہا مگر جب زفیرہ احمد نے اُلٹا اُسے ہی تیور دکھانے شروع کیے تو بڑے صاحب نے اگلے قدم کے طور پر یونہی تھوڑا سا سخت ہاتھ رکھا کہ بچی سیدھے راستے پر آ جائے گی مگر کھیل کھیل میں شروع ہونے والا معاملہ اُس نہج تک چلا گیا کہ جہاں بقول بڑے صاحب کے اُس کتیا نے تو اِسے مہا بھارت جان کر دانش سعید جیسے چوتیے کو اپنی ڈھال بنا کر میدان جنگ میں لا کھڑا کیا۔ حالانکہ وہ تو جانتی ہی نہیں تھی کہ اصل میں کون حرامی اُس کی دادرسی کو اور کیوں پہنچا۔ گوندل نامی جو شخص اُس کے سامنے ظاہر ہوا تھا وہ تو اصل انوسٹر کے منشیوں کا بھی منشی تھا۔

بڑے صاحب نے جتنی اوقات زفیرہ احمد کی متعین کی ہوئی تھی اور جتنا بجٹ اُس کی بربادی کے لیے مختص کیا ہوا تھا وہ اُس سے ایک روپیہ بھی زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جتنا نقصان اُس نے زفیرہ کی شہرت، ساکھ اور بزنس کو پہنچانا تھا، پہنچا چکا۔ وہ جانتا تھا کہ اِس دھچکے کے اثرات سے باہر نکلنا زفیرہ احمد کے لیے اگلے کئی برس تک ممکن نہیں ہو گا۔ اُدھر دانش سعید نے جتنا سرمایہ محض بڑے صاحب کو زک پہنچانے اور مہ نور ایڈورٹائزرز کے شیئرز کو مصنوعی تنفس پر رکھنے کے لیے اسٹاک ایکسچینج میں جھونک دیا تھا اُس کے مقابلے میں کہیں زیادہ موثر پلاننگ دانش اور زفیرہ کو نیچا دکھانے کے لیے بڑے صاحب نے پہلے سے کر رکھی تھی۔ اُس کے نزدیک مہ نور کے شیئرز کو غیر حقیقی قیمت پر خرید کر خود کو نقصان پہنچانے سے بہتر تھا کہ اُتنی سرمایہ کاری ایڈورٹائزنگ انڈسٹری کے ایک پالتو مہم جو خالد رومی کی کرشمہ ایڈورٹائزرز پر کرنے کے

بعد اُس کا بزنس اور اُسے اُس سطح پر لایا جائے کہ تمام سپر ماڈلز ''کرشمہ'' کے آفس کے باہر کھڑی نظر آئیں۔

لیکن بڑے صاحب کے ارادوں اور اندازوں سے قطع نظر دانش سعید نہ تو زفیرہ احمد کو پہلے سے جانتا تھا اور نہ ہی اُس میں مزید کوئی دلچسپی رکھتا تھا۔ اُس نے جو کچھ مہ نور ایڈورٹائزرز کے لیے کیا وہ زفیرہ احمد سے مستقبل میں کوئی بڑا کام لینے کی بجائے محض بڑے صاحب سے کاروباری رقابت اور اُسے نقصان پہنچانے کی خاطر کیا۔ بڑا صاحب جس طریقے سے اُس کے لیے مشکلات پیدا کرتا چلا آ رہا تھا اُس واسطے ضروری تھا کہ اُس کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرانے کے لیے کوئی نیا میدان جنگ کھولا جائے۔ ایسے میں زفیرہ احمد کے معاملے کا سامنے آنا صرف اتفاق ہی تھا۔ سُو اُس نے ''دشمن کا دشمن، دوست'' کے مصداق موقع جانے نہ دیا اور اپنے فرنٹ مین گوندل کے ذریعے بڑے صاحب کو ناکوں چنے چبوا کر اُس کے سبھی ارادے خاک میں ملا دیے۔ اُسے اِس پراجیکٹ میں سے بڑے صاحب کی ہزیمت اور تذلیل کے سوا اور کچھ چاہیئے بھی نہیں تھا۔ ہاں اب اگر کوئی میدان لگنا تھا تو وہ سپورٹس گاڑیوں کی درامدی کھیپ کی عبوری حکومت کے حلف اُٹھانے سے پہلے کی تاریخوں میں آمد پر۔ دانش سعید نے اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ اس بار چاہے اُسے فٹ پاتھ پر ہی کیوں ناں آنا پڑے، اُس نے بڑے صاحب کی ''صاحبی'' پچھواڑے سے نکال دینی ہے۔

۞

﴿۳۶﴾

نرس انتہائی پریشانی کے عالم میں جونہی کمرے سے باہر نکل کر نرسنگ اسٹیشن کی طرف گئی ماہین اُتنی ہی تیزی سے ہسپتال کے بیڈ سے کھڑی ہوگئی۔ کھڑے ہونے پر اگرچہ اُسے اپنے جسم کے زیریں حصے میں خاصی تکلیف کا احساس ہوا مگر حالات کی نزاکت کے پیش نظر اُس نے دائیں ہاتھ پر لگے ہوئے برینولا سے ڈرپ کی نالی کو علیحدہ کیا اور بیڈ کے نیچے پڑی ہوئی سوفٹی چپل پہن کر کمرے سے باہر کاریڈور میں نکل آئی جو سنسنان پڑا تھا۔ ڈیوٹی نرس شاید نرسنگ اسٹیشن کی جانب مڑ چکی تھی۔ وہ جلدی سے بیڈ کی طرف پلٹی، بیڈشیٹ کو اِس طرح مچوڑا اور مسلا کہ جیسے خاصی مزاحمت کے بعد وہاں سے اُسے لے جایا گیا ہو۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی محض چند قدم چلنے پر تکلیف کا احساس پہلے سے بڑھ گیا مگر وہ اسے برداشت کرتے ہوئے کاریڈور عبور کر گئی اور وارڈ ایریا سے نکلتے ہی کینٹین کی طرف چلی آئی جہاں لوگوں کا بے پناہ رش تھا۔ اُس نے برینولا والے ہاتھ کو دوپٹے میں چھپایا اور گرین بیلٹ پر بیٹھے ہوئے مریضوں کے لواحقین کے ہجوم کا حصہ بن کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

دن کا پہلا پہر ہونے کے سبب جہاں دھوپ میں اچھی خاصی تپش تھی وہاں ہلکے پسینے اور تیز تیز قدموں سے چل کر وارڈ سے باہر آنے کے سبب اُس کی رانوں کے درمیانی حصے میں لگنے والے ٹانکے بھی اب تھوڑا تھوڑا درد کرنے لگے تھے۔ اِسی دوران سر بھی چکرایا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ کہیں بیٹھا جائے مگر وہاں قریب قریب کوئی جگہ ایسی نہیں تھی کہ جہاں بیٹھا جا سکے۔ ابھی وہ متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہی تھی کہ پولیس کی ایک سنگل کیبن

گاڑی عین اُسی کے سامنے سڑک پر آ کر رکی جس میں سے ایک سب انسپکٹر اور ایک سپاہی نیچے اُترے جب کہ ڈرائیور اندر بیٹھا رہا۔ ماہین کو لگا کہ ابھی اُس کی گرفتاری کے بعد تاریخ ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو دہرانا شروع کر دے گی۔ انجانے خوف کے مارے وہ اپنے آپ ہی سمٹ کر رہ گئی اور دونوں پولیس والے قریب سے گزر کر اندر وارڈ کی طرف چلے گئے۔ لیکن یہ جھٹکا ماہین کے لیے اِس قدر اعصاب شکن تھا کہ وہ کینٹین کے برامدے میں آ کر ستون سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگی۔ اتنے میں کینٹین کا ایک ملازم لڑکا وہاں سے گزرا اور ماہین کو اِس حالت میں دیکھ کر جلدی سے اُس کے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی لے آیا۔ ماہین نے تشکر آمیز نگاہوں سے لڑکے کی طرف دیکھا تو وہ شرما گیا۔

''آپ کیوں آ گئی باہر بوتل لگی کے ساتھ؟''......لڑکے نے اُس کے ہاتھ پر لگا برینولا دیکھ لیا تھا۔ لڑکے کے سوال نے ماہین کو گڑبڑا دیا۔

''وہ میرا دل گھبرا رہا تھا تو باہر چلی آئی۔''

''میں آپ کے لیے ٹھنڈا جوس لاتا ہوں مینگو کا......طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''لڑکے کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

''مگر سنو! میرے پاس پیسے نہیں۔''ماہین نے اُسے منع کرنا چاہا۔

''کوئی بات نہیں! میں اندر آ کر لے لوں گا...... مجھے پتا ہے آپ کون سے وارڈ میں ہو۔''یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر کی طرف بھاگ گیا۔ ماہین کی پریشانی ہر آنے والے لمحے میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لڑکا جتنی تیزی سے گیا تھا اُس سے زیادہ جلدی میں واپس آیا اور مینگو جوس کا چھوٹا ڈبا سٹرا کے ساتھ ماہین کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''پی لو! ابھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔''لڑکے کے دانت کھلی ہوئی باچھوں سے پوری طرح باہر نکلے ہوئے تھے۔

''سنو! میں نے وظیفہ پڑھنا ہے ...... مجھے کسی الگ جگہ بٹھا دو گے، جو ہوا دار ہو؟''ماہین نے جوس کا ڈبہ ہاتھ میں لے لیا اور کرسی سے کھڑی ہو کر دوپٹے سے نقاب کر لیا۔

''کیوں نہیں......آئیں میرے ساتھ۔''لڑکے نے خوشی خوشی کرسی اُٹھائی اور ماہین کو

کینٹین کی عقبی سمت لے گیا جہاں کسی کا کوئی آنا جانا نہیں تھا۔

''لو جی بیٹھیں اور کریں وظیفہ آرام سے......اور میرے لیے بھی دعا کر دینی ہے عابد حسین کے لیے ...... ویسے وظیفہ ہے کتنی دیر کا؟''......لڑکا جاتے جاتے پھر رک گیا۔

''گھنٹہ تو لگے گا۔''

''بات ہی کوئی نہیں......آپ سکون سے اللہ اللہ کرو اور پہلے جانا ہو تو بتا دینا میں کرسی اُٹھا لوں گا۔''

لڑکا گیا تو ماہین نے دیوار کی طرف چہرہ کرتے ہوئے گردن کرسی کی پشت سے ٹِکا لی۔ تین دن پہلے کی وہ رات ایک خوفناک خواب بن کر اُس کے حافظے سے چپک چکی تھی۔ وہ رات کہ جب نیئر جمیل کے گھر سے اغواء کے بعد ذیشان پہلی بار اُس کے پاس شب بسری کے لیے کوٹھی کے اپر پورشن میں آیا تھا۔ ذیشان حیران تھا کہ وہ کس طرح سردار محبوب بخش جیسے خونخوار شخص کے ہتھے چڑھ گئی ہے کہ جس کا شمار شہر کی انتہائی بااثر اور خطرناک ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ اُس سے دشمنی تو کیا لوگ دوستی کرتے ہوئے بھی اِس لیے خوف زدہ رہتے ہیں کہ نجانے کب کس ذہنی رو میں بہہ کر کیا سے کیا کر دے۔ ذیشان تو اِس خبر پر بھی خاصا پریشان تھا کہ وہ کس طرح پاگل ہو کر ماہین کو شہر بھر میں تلاش کروا رہا ہے۔ ہر گلی اور ہر سیکٹر میں اُس کے لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ ''کیا چرا لائی ہوئی اُس کا؟''

ماہین بے اختیار ہنس دی۔ ''تھا کیا اُس کے پاس جو میں چرا لاتی؟''

''لیکن اُس کی حالت تو یہ ہے کہ جیسے اُس کا ایٹم بم چرا کر بھاگی ہو۔''

''میں کہاں بھاگی ہوں؟ بھگا تو تم لائے ہو___ اب بھگتو! مجھے تو اُس سے کوئی خوف نہیں آتا___ میرے پاس ہوتے ہوئے تو وہ تو ایک معصوم سا خرگوش دکھائی دیتا تھا جسے کسی بھرپور عورت کے لبالب لبریز بلکہ چھلکتے ہوئے پیار کی ضرورت تھی۔''

لیکن اِس کے باوجود ماہین سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ذیشان جیسا تگڑا مرد ڈی آئی جی کا ڈرائیور ہوتے ہوئے بھی نیئر جمیل جیسے نامرد سے خوف زدہ اور اُس کا نام عارفہ رکھنے پر کیوں مصر ہے؟ وہ اُسے اِس گھر سے نکلنے سے منع کیوں کرتا ہے کہ جس میں ابھی تک بیٹھنے کو کرسی تک

نہیں۔ وہ اُس کی بزدلی پر مسلسل مسکرائے چلی جا رہی تھی۔

ذیشان پہلی ملاقات کے ہیجان کے زیرِ اثر ماہین کو اغواء تو کر بیٹھا مگر جس طریقے سے سردار محبوب بخش اُسے تلاش کروا رہا تھا اُس نے واقعی اُسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اُس رات کی واردات کے اثرات سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ کوئی نئی قسم کا نشہ اپنے ساتھ لایا تھا کہ جسے آئس کا نام دے رہا تھا۔ ذیشان کے مطابق یہ نشہ ملن کی گھڑیوں کو امر کر دینے کے ساتھ ساتھ لطف و انبساط کی اُن منزلوں کا رہرو بنائے رکھتا کہ جہاں ہوش، حواس اور خرد انسان کا ساتھ چھوڑ کر اُسے وحشتوں کی ایسی بگھی میں بٹھا دیتے ہیں کہ جس میں گھوڑوں کی جگہ جنون جُتا ہوا ہوتا۔ ماہین کو یوں محسوس ہوا کہ آئس نام کا یہ نشہ کہیں باہر سے نہیں آیا بلکہ اُس کے اپنے لہو کے عمل تقطیر سے وجود میں آیا ہے۔ کیونکہ جو کچھ اُسے ذیشان آئس کی تعریف میں بتا رہا تھا وہی سب کچھ تو اُس کے اپنے لہو میں موجزن اور بدن کے انگ انگ میں پہلے سے رقصاں تھا۔ جنون کے جنون اور وحشت کے وحشت سے ضرب در ضرب کی بات چلی تو آئس سونگھنے سے پہلے ہی ماہین کا مسام مسام شعلہ بار ہوتا چلا گیا۔ اور جب حقیقت میں آئس کی باری آئی تو کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ زمین پر ہے یا آسمان پر۔ لطف اور سرور کی وہ سبھی منزلیں کہیں بہت نیچے رہ گئی تھیں کہ جن کے تصور سے تسکین اُمڈی چلی آتی تھی۔ ایسے میں بس اتنا یاد رہا کہ قریۂ جان کی آبیاری سے منسوب تلاطم میں کچھ دیر کے بعد وہ دو ہی شناور نہیں تھے بلکہ ذیشان کی رضا سے دو لوگ اور بھی شامل ہو چکے تھے۔ لیکن بعد میں جب اُسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھی۔

ذیشان ایسے شخص سے اُسے اِس قسم کی حرکت کی ہرگز توقع نہیں تھی کہ جس نے اُسے نیئر جمیل کے چنگل سے نکالا تھا لیکن جو کچھ ذیشان نے اُس کے ساتھ کیا اُس کی توقع اُس سے نہ کرنا بھی شاید پاگل پن تھا جس کی وہ اب تک بار بار مرتکب ہوتی چلی آ رہی تھی۔ اُسے رہ رہ کر نیئر جمیل کی آخری دن کی گفتگو یاد آ رہی تھی کہ عورت نجانے اُسی کے سر پر گوبر کیوں کرتی ہے کہ جو اُس کے قدموں میں اپنا دل ہار چکا ہوتا ہے اور جوتے ہمیشہ اُسی کے چاٹتی ہے کہ جو اُس کے لیے جوتا ہاتھ میں رکھتا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود وہ نیئر جمیل کی رائے سے متفق نہیں تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ عورت کا اپنا دل بھی تو ہوتا ہے، اُس کا کیا کرے جو آتا ہی اُسی پر ہے جو بولتا

میٹھا اور جھلاتا خوابوں کے پالنے میں ہے۔ عورت کے قدموں میں دل ہارنے والے اگر جھوٹ موٹ دکھاوے کے لیے ہی سہی، کوئی ایک دو چھوٹے موٹے خواب ہی اپنی جیب میں رکھ لیا کریں تو ایسی نوبت ہی نہ آئے۔

جوس کا ڈبہ ختم ہوا تو ماہین کو تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کا احساس ہوا۔ لمحہ موجود میں اُس کے لیے جہاں اپنے آپ کو پولیس سے بچانا اہم ترین تھا وہاں رہائش کے لیے کسی جگہ ٹھکانے کا بندوبست کرنا بھی بے حد ضروری تھا کہ ہسپتال سے نکلنے کے بعد کوئی جگہ بھی تو ایسی نہ تھی کہ جہاں وہ خود کو چھپا سکتی۔ ابھی تک تو وہ یہ بھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ ذیشان کا دیا گیا نام ''عارفہ'' بتا کر بھی ڈاکٹر اُسے ''ثمینہ'' کہنے پر کیوں مصر تھا۔ کہاں سے آئی اُس کی وہ تصویر اور کس نے اُس پر نام لکھا ''ثمینہ''۔

اتنے میں اُسے یوں لگا کہ پولیس اُسے کینٹین کے اندر ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ شاید اُن دونوں میں سے کسی نے اُونچی آواز میں وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے اُس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اِس سے پہلے کہ کسی کا گزر کینٹین کی عقبی سمت میں ہوتا ماہین بلا سوچے سمجھے وہاں سے اُٹھی اور دوپٹے سے منہ چھپائے ہسپتال کے مین گیٹ کی طرف چل دی۔ اِس سے پہلے کہ وہ گیٹ سے گزرتی وہاں کھڑے ہوئے باوردی گارڈز میں سے ایک نوجوان گارڈ نے اُسے روک لیا اور بازپرس کرنے لگا کہ وہ بر ینولا لگائے اور ہسپتال کی سرکاری چپل پہنے باہر کہاں جا رہی ہے۔ ابھی ماہین کوئی مناسب جواب دینے کے لیے سوچ ہی رہی تھی کہ گارڈ نے تین چار سوال اور داغ دیے کہ کس وارڈ سے ہے، بیماری کیا ہے، ہسپتال سے ڈسچارج ہوئی کہ نہیں یا اُس کے ولی وارث کون ہیں اور کہاں ہیں۔

اتنے سارے سوال اور گارڈ کے چہرے پر چھائی ہوئی کمینگی دیکھ کر ماہین کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر گارڈ اور بھی چوڑا ہو گیا۔ ''اچھا تو کسی یار کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام ہے، میں ابھی اطلاع کرتا ہوں ایم ایس صاحب کو اور پولیس کو بھی۔'' پولیس کا نام سن کر ماہین کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اِس سے پہلے کہ وہ چکرا کر وہیں گر جاتی اُس کے ذہن میں گارڈ کے پہلے سوال کا جواب آ ہی گیا۔

''میں سامنے جارہی ہوں میڈیکل اسٹور سے دوائی لینے۔''

''تم خود کیوں جارہی ہو اِس حالت میں؟ ساتھ کوئی نہیں ہے کیا۔'' گارڈ اب اُس پر آنکھیں نکالنے کو آ گیا تھا۔

''اُس وقت کوئی نہیں تو میں خود جارہی ہوں۔'' کوشش کے باوجود ماہین کے لہجے میں اعتماد پیدا نہیں ہو پارہا تھا۔

''مجھے دو پیسے اور نسخہ بھی...... تم یہیں ٹھہرو، میں لے کر آتا ہوں دوائی۔'' گارڈ پوری ڈھٹائی پر آ گیا تھا۔

''سوری! میں خود لینے جاؤں گی دوائی...... تم مجھے نہیں روک سکتے۔'' ماہین نے غصہ کیا تو اُس کا بدن نقاہت کے مارے کانپنے لگا مگر اُس نے پھر بھی باہر نکلنے کی کوشش کی۔

''میں دیکھتا ہوں تم کیسے جاتی ہو باہر چوری چوری ہسپتال کی چپلی پہن کر۔'' گارڈ نے سامنے آ کر اُس کا راستہ روکنا چاہا تو آتے جاتے لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اتنے میں ایک آٹھ دس برس پرانے ماڈل کی ٹویوٹا گاڑی اُن کے قریب آ کر رکی اور ڈریس پینٹ شرٹ پہنے ایک ادھیڑ عمر شخص نیچے اترا۔ اِس تمام صورتحال سے خاصی ہراساں ہو چکی ماہین کے ذہن میں نجانے کہاں سے ایک دم اداکاری کا سوجھا اور اُس نے گاڑی سے اترنے والے شخص کو پورے اعتماد سے انکل کہہ کر گارڈ کی شکایت لگانا شروع کر دی کہ وہ اُسے دوائی لینے کے لیے باہر جانے سے روک رہا تھا۔ ماہین کا لہجہ اتنا پراثر اور پُراعتماد تھا کہ جہاں گارڈ فوراً پچھلے قدموں پر چلا گیا وہاں گاڑی سے اُترنے والا شخص بھی اُسے بیٹی کہتے ہوئے گارڈ کو غصیلی نگاہوں سے گھورے بغیر نہ رہ سکا۔ بس اُس کے بیٹی کہنے کی دیر تھی کہ ماہین ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ آگے بڑھی اور کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھ گئی۔ گاڑی والے اُدھیڑ عمر شخص نے ماہین کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تو اُس نے بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

گاڑی ہسپتال کی حدود سے باہر نکلی تو ماہین کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ایک دم برس پڑیں۔ گاڑی والے شخص نے اسچویشن کو پل بھر میں حقیقی طور پر سنجیدہ ہوتے دیکھا تو گاڑی کو کم رش والی جگہ پر ایک طرف روک لیا۔ ''لڑکی میں تمہیں نہیں جانتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم کسی

مصیبت میں پھنسی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہیں دیکھتے ہی بے اختیار بیٹی کہنے کو دل چاہا کہ تمہاری جیسی میری بیٹی بھی ہے......اور ہاں میرا خیال ہے تمہارا مسئلہ ہسپتال کے گیٹ سے باہر آنا تھا سو ہم باہر آ چکے......اب بھی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ ورنہ جہاں جانا ہے میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' اُس شخص کے لہجے میں اتنی شفقت تھی کہ ماہین کے لیے اُس کے سامنے دست سوال دراز کرنا کچھ مشکل نہیں لگ رہا تھا۔

''انکل! میں بھی آپ کو نہیں جانتی لیکن اس وقت میں واقعی مصیبت میں ہوں...... مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے سوائے پناہ کے......میں ایک اچھے گھر سے ہوں لیکن حالات ایسے ہیں کہ اس وقت گھر بھی نہیں جا سکتی...... آپ بس میرے رہنے کا بندوبست کر دیجئے جہاں میری جان محفوظ ہو۔'' ماہین کے آنسو تھے کہ رو کے نہیں رک رہے تھے۔ گاڑی والے شخص نے ایک طرف رکھی پانی کی تھرماس کا ڈھکن کھولا اور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے گاڑی کو ایک مرتبہ پھر روڈ پر لے آیا۔

''بیٹا! میرا نام فرقان فاروقی ہے اور ایڈمن آفیسر ہوں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں۔ میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں کہ تمہارے مسائل کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے اور وہ کس طرح حل ہو سکیں گے۔ میرا تعلق تو بیٹا مڈل کلاس طبقے سے ہے اور سچی بات ہے کہ تمہارے مسائل مجھے میری سماجی اوقات سے اوپر کے دکھائی دے رہے ہیں___ میں تمہیں اپنے دفتر لے چلتا ہوں، تم آرام سے وہاں بیٹھو، کھانا وانا کھاؤ___ میں اپنی کمپنی کی چیف سے بات کرتا ہوں، بہت ہی شفیق خاتون ہیں___ اگر انہوں نے تم سے ملنا چاہا اور تمہاری ہیلپ کرنا چاہی تو سمجھو تمہارا کام ہو گیا___ میں بہر حال تمہیں اُن سے ملوا دوں گا___ اُس سے آگے پھر تمہارے نصیب۔''

وفورِ تشکر سے ماہین کی آنکھیں اور بھی برس پڑیں۔

﴿ ۳۷ ﴾

سردار محبوب بخش کی ملاقات اگر چہ ماہین سے نیئر جمیل کے نام سے ہوئی تھی مگر اُس کے اغواء کے بعد وہ اپنی اُس سرشت میں واپس آ چکا تھا کہ جس سے ایک زمانہ خائف رہتا تھا۔ وہ بہت کم اپنے اصل نام اور اصل پہچان کے ساتھ سامنے آتا تھا لیکن ہر جگہ موجود اور ہر بات سے باخبر رہنا اُس کا جنون تھا۔ مگر ماہین کے معاملے میں اُس کے جنون کو ہونے والی مات نے اُسے پاگل پن کی حد تک بوکھلا رکھا تھا۔ سردار محبوب بخش جو اہم سے اہم بزنس ڈیل کو بھی چند منٹ سے زیادہ نہیں دیا کرتا تھا، اپنے گھر سے ماہین کے اغواء کے معاملے پر اس قدر مشتعل اور تلملایا ہوا تھا کہ ہر مصروفیت چھوڑ کر اسے خود ہی دیکھ رہا تھا۔ صورتحال کی نزاکت کے پیشِ نظر مناسب جانتے ہوئے ایک ماہر سراغ رساں کمپنی کی خدمات پہلے ہی حاصل کی جا چکی تھیں۔

اُس کو پھر ایک اطلاع ملی لیکن تاخیر سے کہ وہ تینوں ڈرائیور جو ماہین کی گمشدگی یا اغواء کے وقت اپنی اپنی گاڑیاں لے کر پارکنگ سے باہر گئے تھے، پھر ایک ساتھ اسلام آباد ایکسپریس وے پر واقع گلشن کریم نام کی سوسائٹی کے ایک گھر کی جانب نہ صرف ایک ایک کر کے سرکاری گاڑیوں میں جاتے دیکھے گئے بلکہ رات بھر کالونی کے اندر رہے۔ اُن میں سے ایک صوبائی سیکریٹری بلدیات کا ڈرائیور تھا، دوسرا صوبائی سیکریٹری تعلیم اور تیسرا ڈی آئی جی پولیس کا۔ اِس نجی کمپنی کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق یہ شبہ تقویت پکڑتا جا رہا تھا کہ ماہین کی گمشدگی یا اغواء کا

تعلق اُن تینوں ڈرائیوروں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہے۔ اِس رپورٹ کے بعد سردار محبوب بخش کو اپنا آپ ایک ایسا بدبودار گٹر لگنے لگا تھا کہ جس میں محلے کے ہر گھر کی گندگی دن بھر شامل ہوتی رہتی ہے۔ آخر کیوں وہ خواتین کے نزدیک فوقیت کے لائق قرار نہیں پاتا اور ہمیشہ رد کر دیا جاتا ہے۔ کیا ہوتا ہے اِن دو ٹکے کے ملازموں میں کہ جن کے منہ کی بدبو بھی ملکاؤں کے واسطے خوشبو بن جاتی ہے اور وہ بادشاہوں کے مقابل آ کر بھی ٹھکرائے نہیں جاتے بلکہ ترجیحات میں مقام پاتے ہیں۔ سردار محبوب بخش کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود ہی اُس مکان تک پہنچے، پل بھر میں سارے ثبوت اکٹھے کرے اور اپنے ہاتھ ہی سے اِس ذلت کہانی کے تمام کرداروں کو اُن کے انجام تک پہنچا دے مگر اُس کا سماجی مرتبہ اُس کی راہ میں مزاحم ہو رہا تھا۔ وہ تو پہلے ہی اپنی خاندانی روایات کا باغی اور من موجی قسم کے جوان کے طور پر جانا جاتا تھا کہ جو بھی دل نے کہا، وہ کیا لیکن ہمیشہ اُس حد تک کہ جہاں تک خاندانی مرتبہ، وقار اور روایات مجروح نہ ہوں۔

سردار محبوب بخش کا خاندان اگر چہ ملکی اشرافیہ کا نمائندہ خاندان تھا لیکن دیگر اشرافیہ کی طرح انہوں نے محض کالونیل مراعات سے استفادہ کرنے کی بجائے، انگریز حکمرانوں کی معمولی سی سرپرستی سے اصل سیاسی، سماجی اور معاشی طاقت انڈر ورلڈ جتھے بندی کے نتیجے میں حاصل کی اور تقسیم ہند کے بعد کی سماجی اُتھل پُتھل سے اس حد تک ہاتھ رنگے کہ اب حکمران سیٹ اَپ کوئی سیاسی پارٹی بنائے یا اسٹیبلشمنٹ، اِس خاندان کی آشیرباد حاصل کیے بِنا دونوں کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اقتدار کی غلام گردشوں میں یہ خاندان شیداگی فیملی کے نام سے معروف تھا کہ جس کا بااثر ترین سربراہ امیر قادر بخش شیداگی چند برس قبل دارِ فانی سے ہو گزرا تھا۔ اپنے قبیلے کی روایات کے برعکس امیر قادر بخش کے والد امیر نہال بخش شیداگی نے بیسویں صدی کے اوائل میں پنجاب کے فیوڈل نیٹ ورک میں دراڑیں ڈال کر منظّم جرائم کی بنیاد اِس طرح رکھی کہ لاہور کی سرکار کے ساتھ ساتھ دلی میں بھی پہچانا جانے لگا۔

اشرافیہ روایات کی طرح شیداگی فیملی میں بھی ہر وہ جرم روا تھا کہ جو اِس کے سربراہ کے

مفاد میں ہوا کرتا۔ لہٰذا انسانی تاریخ میں مروج رہے وہ تمام جرائم میر نہال بخش اور امیر قادر بخش کے دائرہ کار میں اِس طرح شامل رہے کہ اُن کے اپنے دامن پر کبھی کسی نے کوئی لہو کی چھینٹ تک نہ دیکھی۔ امیر نہال بخش نے اپنی قبائلی روایات سے الگ ہوتے ہی جب اپنے لیے جدا راستے کا انتخاب کیا تو متواتر جرگوں کے ذریعے اُسے واپس قبیلے کی عمل داری میں لانے میں ناکامی کے بعد قبیلے سے نکال دیا گیا۔ لیکن جونہی امیر نہال بخش نے دربار سرکار کے ساتھ ساتھ اپنے اطراف میں بھی نئے سرے سے اور نئے طرز کا رعب و دبدبہ قائم کر لیا تو شیداگی قبیلے کے وہ تمام غریب غرباء جو کسی حد تک مجرمانہ جبلت کے طرفدار بھی تھے، اپنا قبیلہ چھوڑ کر اُسی کے ساتھ شامل ہوتے چلے گئے۔ اس طرح امیر نہال بخش اپنے آبائی قبیلے میں بھی دراڑ ڈال کر اُس کی سرداری کا امیدوار بن بیٹھا لیکن اس کے باوجود گذشتہ ایک صدی سے شیداگی فیملی امیر نہال بخش کے وضع کردہ اُس اصول پر کاربند چلی آ رہی تھی کہ جس کے تحت اِس فیملی کا کوئی بھی شخص براہ راست کسی انتخاب میں حصہ لینے کا مجاز نہیں تھا۔ وہ انتخاب چاہے مقامی کونسلر کا ہو یا ملکی صدر اور وزیراعظم کا۔ لیکن یہ بات اور کہ دیگر ملکی اشرافیہ کی مداخلت کی مانند کوئی بھی انتخابی عمل اِس خاندان کی رضا اور حصہ داری کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔

اِن دنوں یہ خاندان اپنی سیاسی، سماجی اور معاشی عمل داری میں دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک اِس کا ظاہر تھا کہ جس کی باگ ڈور بڑے صاحب کے ہاتھ میں تھی اور ایک باطن یا پس پردہ جس کا مالک و مختار سردار محبوب بخش تھا۔ امیر قادر بخش شیداگی نے اپنی وفات سے چند دن قبل شیداگی خاندان کے تمام تر مالی اور سیاسی مفادات کا منتظم بڑے صاحب کو اور مالک و مختار کُلی طور پر سردار محبوب بخش کو مقرر کر دیا۔ سردار محبوب بخش کے بارے میں کوئی بھی تیقن سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ امیر قادر بخش کی کونسی بیوی کے بطن سے پیدا ہوا۔ اُس کے قریبی لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی بیوی کے بطن سے نہیں بلکہ لے پالک ہے کیونکہ اُس کا اپنا اکلوتا بیٹا تو خود اُسی کے فائر سے لڑکپن میں مارا گیا تھا۔ لیکن کچھ خاص لوگ اِس سے قطعی مختلف رائے رکھتے تھے۔ اُن کے مطابق امیر قادر بخش کی تیسری بیوی سے پیدا ہونے والا بچہ ہی سردار محبوب بخش

تھا جو کسی دشمن کا فائر لگنے سے زخمی ضرور ہوا لیکن زندہ بچ گیا تھا۔ اسی لیے نہ صرف اُس کی پرورش خفیہ طور پر کی گئی بلکہ دشمنوں کی نگاہ سے اوجھل رکھا گیا۔ سردار محبوب بخش جو بھی تھا وہ اُس وقت تک دنیا کے سامنے نہ لایا گیا کہ جب تک اُس کی بطور وارث تقرری کا اعلان نہ کر دیا گیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی خاندانی راز تھا یا امیر قادر بخش کی ذات سے جڑا ہوا کوئی خوف۔

جب کہ بڑے صاحب کی زندگی ایک پالتو کتے کی طرح امیر قادر بخش کے قدموں میں گزری تھی۔ انڈر ورلڈ میں عورتوں کا دھندہ اُس نے جس قدر کامیابی سے چلایا تھا اُس کے سبب امیر قادر بخش کو نہ صرف قحبہ گری بلکہ سیاسی جوڑ توڑ، ملکی سطح پر تجارتی مفادات کی بندر بانٹ اور منی لانڈرنگ کے معاملات میں بھی ایسی ایسی کامیابیاں دلوائیں کہ اُس کے حریف تکتے ہی رہ گئے۔ امیر قادر بخش کے بدخواہوں کے نزدیک اُس کی شخصیت کی ساری کی ساری سیاہی، کمینگی اور منفیت نکال کر ایک طرف رکھ دی جائے تو اُس سے بڑے صاحب کی ذہنیت تشکیل پاتی ہے۔ عیاری، بے حسی اور بے رحمی ایسے اوصاف میں حد درجہ کی ہنرمندی نے اُسے امیر قادر بخش کا محبوب معتمد بنا دیا تھا۔

اس کے برعکس شروع شروع میں سردار محبوب بخش ایک ایسا لااُبالی سا نوجوان تھا کہ جسے نام بدلنے، کام بدلنے، لڑکیاں بدلنے اور بھیس بدلنے جیسے کاموں کے علاوہ اور کسی کام کے لیے فرصت نہیں تھی۔ اگرچہ امیر قادر بخش کا اکلوتا بیٹا ہونا اُس کے لیے لاٹری نکلنے جیسی خوش قسمتی تھی مگر اُسے اس خوش بختی میں اگر کوئی دلچسپی تھی تو بس اتنی کہ وہ روٹی روزی کے مسائل سے ماورا ہو کر اپنے شوق پورے کر سکتا تھا۔ اُسے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ بڑا صاحب اُس سے دن بھر میں کہاں کہاں اور کتنے دستخط کراتا ہے۔ سردار محبوب بخش اپنی پراسرار حرکتوں سے لوگوں کو زچ کرنے میں بہت لطف اندوز ہوتا۔ ایک دم کہیں جانا اور پھر وہاں کے لوگوں کے بہت قریب ہو کر اُن کی ضرورت بننے کے بعد چھلاوے کی مانند بغیر کچھ بتائے غائب ہو جانا اُس کی لاابالی طبع کا جزو تھا۔

اُسے رقاص بننے کا بے پناہ شوق تھا لہٰذا کراچی کے ایک تھیٹر میں جا کر نسیمہ پُتلی کے نام سے کئی مہینوں تک رقص کرنے کا شوق پورا کیا۔ اِس دوران اُسے صحافی بننے کا شوق چرایا تو کوئٹہ جا کر آغا آفندی کے نام سے ایک اخبار سے منسلک ہو گیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں اشتہاری مہم ڈیزائن کرنے اور کاپی لکھنے کا شوق ہوا تو مبشر رضا نام رکھنے کے بعد مہ نور ایڈورٹائزرز کا حصہ بن کر کمپنی کی ضرورت بن گیا۔ وہاں دل نہ لگا تو تھوڑی سے تراش خراش کے بعد اب نیئر جمیل کے نام سے آئے روز پارٹیاں کرنے اور سماجی رابطے بڑھانے میں لگ گیا۔

ابتدائی دنوں کے رجحان کے برعکس جونہی سردار محبوب بخش نے شیدا گی امپائر کے معاملات کو نسبتاً سنجیدگی سے دیکھنا شروع کیا بڑے صاحب نے بھی اُس کی ہر حرکت اور ہر شوق پر نگاہ رکھنی شروع کر دی۔ اُس کے نزدیک سردار محبوب بخش کا کوئی بھی شوق شیدا گی امپائر کے لیے مسئلہ بن سکتا تھا۔ ویسے اب تک بڑے صاحب کو اُس کی کسی مصروفیت پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا لیکن جب سے اُس نے اپنے فارم ہاؤس پر پارٹیاں کرنے اور سماجی رابطوں میں اضافہ کرنا شروع کیا تھا، بڑے صاحب کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ کیونکہ اگلے کچھ دنوں میں عبوری سیٹ اپ بننے کے بعد ملک الیکشن کی طرف جا رہا تھا۔ ایسے میں سردار محبوب بخش کا شیدا گی فیملی میں اپنی علیحدہ شناخت کا سفر آغاز کرنا کچھ مناسب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

لیکن بڑے صاحب کی اِس سوچ سے قطع نظر سردار محبوب بخش مسلسل کھولاؤ کی حالت میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ماہین کے نقشِ قدم کی جستجو میں پمز ہسپتال تک جا پہنچا تھا۔ نجی سراغ رساں کمپنی کی تازہ رپورٹ کے مطابق اُسے ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ایک اطلاع کے بعد اُسے گھر سے اُٹھا کر ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ تک چھوڑ گیا تھا۔ چند لمحے پہلے اُس کے پاس ہسپتال کے بیڈ ہیڈ ٹکٹ اور ماہین کی ہسٹری شیٹ کی کاپی بھی پہنچ چکی تھی جن کی رو سے آئس کا نشہ کرانے کے بعد اُسے اِس حد تک اجتماعی جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ اُس کے مخصوص اعضاء کو کئی جگہوں پر ٹانکے لگانا پڑے۔ اِن حالات میں اگر کوئی معاملہ سردار محبوب بخش کے واسطے

لاینحل اور سمجھ سے بعید تھا تو وہ اتنی بری حالت میں ماہین کا ہسپتال سے از خود فرار یا پھر سے کسی کے ہاتھوں اغواء تھا۔ اتنا تو اَب کنفرم ہو چکا تھا کہ اُس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کرنے والے وہ تینوں ڈرائیور تھے لیکن اب کے اُسے ہسپتال سے کس نے اغواء کیا؟ انھی ڈرائیوروں نے یا پھر کسی دوسری پارٹی نے؟ لیکن ہر بار ماہین ہی اغواء کیوں ہو؟ کون سا راز ہے اُس کے پاس؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہی تینوں ڈرائیور ماہین کے ہوش میں آنے کے بعد اپنی شناخت چھپانے کے خوف سے اُسے دوبارہ اغواء کر کے کہیں چھپا چکے تھے؟

اگر ایسا ہے تو یقیناً ماہین کی جان کو خطرہ ہے۔ عجیب بات تھی کہ غصے میں کھولتے کھولتے اُسے ماہین پر ترس آنے لگا تھا۔ نجی سراغ رساں کمپنی کے رابطہ کار کو جہاں اُس نے ہر قیمت پر ماہین کو ڈھونڈ نکالنے کا ٹاسک دے رکھا تھا وہیں اب اُن تینوں ڈرائیوروں پر نگاہ رکھنے کی مزید تاکید کر دی گئی تھی۔

﴿۳۸﴾

فرقان فاروقی ماہین کو اپنے آفس لے تو گیا مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ کب اور کیسے اپنی باس زفیرہ احمد سے بات کرے جو پوری ذہنی توانائی کے ساتھ پھر سے کمپنی کے معاملات سنبھال چکی تھی۔ اِس دوران زفیرہ احمد نے فاروقی کی موجودگی میں کئی بار گوندل سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار یہی جواب ملا کہ مناسب وقت پر وہ خود آپ سے رابطہ کر لیں گے۔ اس غیر یقینی نے کسی حد تک زفیرہ احمد کو چڑچڑا کر دیا تھا۔ ایسے میں ہمدانی اور فاروقی دونوں نے اپنی باس کو کچھ دن مزید تیل اور تیل کی دھار دیکھنے کا مشورہ دیا۔ یہ مشورہ اِس لیے بھی صائب تھا کہ کمپنی کے اُنچاس فیصد حصص کی خرید کے اصل سرٹیفکیٹ گوندل جاتے ہوئے زفیرہ احمد کے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔ اِن حالات میں گوندل یا اُس کے پیچھے جو کوئی بھی تھا، اُس کی نیت پر شبہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن اِس کے باوجود گذشتہ حالات کے پس منظر میں اگر زفیرہ احمد ایک مسلسل بے چینی اور اِن دیکھے خدشات کا شکار تھی تو یہ بھی کچھ ایسا غیر فطری نہ تھا۔

فاروقی اور ہمدانی کے مشوروں کے ساتھ ساتھ اِس حد تک تو زفیرہ احمد نے بھی گوندل کے مشورے پر عمل کو مناسب جانا کہ وہ تمام ملازمین جنھوں نے برے حالات میں اُس کا ساتھ دینے کی بجائے اُلٹا بغاوت کر دی تھی، اُنہیں نہ تو نوکری سے نکالا جائے اور نہ ہی اُن کے خلاف کسی قسم کی مخالفانہ کاروائی کا کوئی عندیہ دیا جائے۔ اِس کا اثر یہ ہوا کہ ملازمین کی اکثریت کے دلوں میں اُس کی توقیر اور بھی بڑھ گئی اور وہ اُس کے روبرو آنکھ اُٹھانے کے قابل بھی نہ رہے۔ اِس کی سب سے بڑی مثال زفیرہ احمد کا اپنا ڈرائیور تھا کہ جو اُسے عین بحران کے دن

چھوڑ کر چلا گیا تھا مگر دوسرے ہی دن اُس کی واپسی کو کسی باز پرس کے بغیر قطعی معمول کی بات سمجھتے ہوئے درگزر کیا گیا۔ لیکن اُس کی ڈیوٹی کی حساسیت کے پیشِ نظر اتنا ضرور کیا گیا کہ اُسے ملازمت سے نکالنے کی بجائے زفیرہ احمد کی گاڑی سے الگ کر لیا گیا۔ اِس واقعے کے دو تین روز بعد تک زفیرہ احمد کچھ جھجکی جھجکی سی رہی مگر جب محسوس کیا کہ کمپنی کے کسی بھی ملازم کی آنکھوں میں کچھ بھی ایسا نہیں کہ جو اُس کی بے توقیری کے زمرے میں آتا ہو تو اُسے یقین ہو گیا کہ ہمارے معاشرے میں خلقِ خدا کو دن گزارنے کے لیے واقعی ہر روز نیا حادثہ اور نیا سانحہ چاہیئے ہوتا ہے، اِس سے کچھ کم نوعیت کا جھٹکا اُن کے حافظے میں ٹھہر ہی نہیں پاتا۔

فرقان فاروقی جب بھی اپنے کمرے میں جاتا تو اُسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ لڑکی خاصی تکلیف میں ہے اور اُسے کچھ تفصیل سے بتانا چاہتی ہے لیکن وہ اُسے کوئی لمبی بات کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ بات جو بھی ہو وہ میڈم زفیرہ سے براہ راست ہو تاکہ وہ اپنی کوئی رائے دینے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں فیصلہ جو بھی ہو وہ میڈم کے اپنے اندازے اور اپنی سوچ کے مطابق ہو، کسی اور کی رائے پر انحصار کیا ہوا نہ ہو۔ اِسی اُدھیڑ بُن میں آفس بند ہونے کا وقت قریب آنے لگا تھا مگر فاروقی کو کوئی مناسب موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ وہ لڑکی کے بارے میں زفیرہ احمد سے بات کرنے کے بعد اُسے اُس سے ملوا دیتا۔ فاروقی کے لیے پریشانی یہ بھی تھی کہ اگر آج لڑکی کی ملاقات میڈم زفیرہ سے نہیں ہو پاتی تو وہ اُسے شام کو کہاں لے جائے گا، گھر تو لے جا سکتا نہیں۔ اب حالت یہ ہوئی کہ آفس کا وقت ختم ہو چکا مگر اُسے زفیرہ احمد سے بات کرنے کا صحیح طریقے سے موقع ہی نہ مل سکا اور اگر اِس دوران موقع ملا بھی تو اُس میں اُس درجہ کی ہمت ہی پیدا نہ ہو سکی کہ جس کے بل بوتے پر اپنی باس سے بات ہو پاتی۔ دفتر کا وقت ختم ہو جانے کے باوجود بھی وہ اپنے کمرے میں جانے اور میز کی درازیں اور الماریاں لاک کرنے سے گریزاں تھا کہ کہیں وہ لڑکی اُس کی نیت پر شبہ کرتے ہوئے استفسار نہ شروع کر دے کہ اُسے سارا دن اپنے کمرے میں بٹھانے کے بعد اب کہاں لے جانے کا ارادہ ہے۔

اُدھر کسی خاص کام سے زفیرہ احمد کئی بار فاروقی سے انٹر کام پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی

رہی مگر جب کوئی ریسپانس نہ ملا تو وہ خود ہی اُس کے کمرے کی جانب چلی آئی۔ کمرے میں فاروقی کی بجائے ایک جوان لڑکی کو پریشان حال بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی سی گئی لیکن سوچا کہ ہوسکتا ہے فاروقی کی کوئی عزیزہ ہو لہذا وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے اُس سے کچھ پوچھے بغیر ہی اپنے کمرے کی طرف واپس پلٹنے لگی۔ لڑکی زفیرہ احمد کو دیکھتے ہی کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ اُسے شاید وہ چہرے مہرے، لباس اور اعتماد کے سبب کمپنی کی باس ہی لگی تھی۔ ماہین کھڑی ہوئی تو اُس کے ہاتھ پر لگا ہوا بر ینولا اور پاؤں میں ہسپتال کی مخصوص سوفٹی دیکھ کر زفیرہ وہیں رک گئی۔

''کیا ہوا......؟ آپ ہاسپٹل سے آرہی ہو؟ فاروقی صاحب کہاں ہیں؟'' ......اتنے سارے سوالات ایک ساتھ ہونے پر اب پریشان ہونے کی باری ماہین کی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی زفیرہ احمد کے عقب سے فرقان فاروقی ظاہر ہوا۔

''میڈم آپ یہاں؟ میں تو آپ ہی کے آفس کی طرف تھا کہ معلوم ہوا آپ ادھر تشریف لائی ہوئی ہیں......آیئے ناں کمرے میں آیئے۔''

''نہیں......آپ آیئے ناں میرے آفس......ایک فائل ڈسکس کرنا تھی، وہیں رکھی ہے اور ہاں یہ لڑکی......آپ کی عزیزہ......بیمار ہے کیا؟......زفیرہ احمد ایک بار پھر اپنے آفس کی طرف پلٹ چکی تھی۔

''یہ بچی دراصل آپ سے ملنا چاہتی ہے؟''

''مجھے جانتی ہے کیا؟ اور کہنا کیا چاہتی ہے......اگر کچھ مالی مدد چاہتی ہے تو کردیں ناں جتنی مناسب ہو۔'' صاف لگ رہا تھا کہ زفیرہ احمد اُسی فائل کے معاملے میں الجھی ہوئی تھی لہذا فرقان فاروقی کے پاس بھی یہی موقع تھا کہ وہ جتنی بات لڑکی کے بارے میں کرسکتا تھا، کر گزرے۔

''دراصل میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ سے مل لے......مجھے یوں لگا ہے کہ وہ کسی بڑے عذاب میں مبتلا ہے۔''

''آپ کہاں سے لے آئے یہ عذاب؟'' زفیرہ احمد فائل کے صفحے پلٹتے ہوئے چہرہ اوپر

اُٹھا کر تھوڑا سا مسکرائی تو فاروقی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے جتنی بات تھی، جلدی سے بتا دی۔

''ہوں......تو یہ بات ہے......اُسے پناہ چاہیئے!! لیکن کون ہے اُس کے پیچھے؟ پولیس یا پھر کوئی بدمعاش؟ بتایا نہیں اُس نے......'' زفیرہ ہاتھ میں پکڑی فائل ایک طرف رکھتے ہوئے معاملے کی تہہ میں اترنے کی کوشش کررہی تھی۔ ''فاروقی صاحب! آپ لڑکی کو ادھر بلایئے۔''

فاروقی بھاگم بھاگ ماہین کو زفیرہ احمد کے آفس میں بلا لایا۔ اب کے زفیرہ نے ماہین کو سر سے پاؤں تک کسی تفتیشی کی نگاہوں سے دیکھا اور آن کی آن میں اپنے تجربات کی بنیاد پر جتنا کھنگال سکتی تھی، کھنگال لیا۔ وہ اُسے ایک سادہ سی لڑکی ہوتے ہوئے بھی پُرکاری کی انتہا تک پہنچی ہوئی لگی تھی۔ زفیرہ کو اُس کے چہرے کی معصومیت اُس کے بدن کی کمینگی سے لگا کھاتی ہوئی نہیں دِکھ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ کسی گملے میں اُگا ہوا لالہ کا پھول مگر اُس کا بدن اِسی پھول سے گہرے سبز رنگ کا بن چکا وہ ڈوڈا دکھائی دے رہا تھا کہ جس کے اندر تو خشخاش بھری ہوتی ہے مگر اُس کے پوست میں سوئیاں چبھو کر رکھنے سے بھورے رنگ کا وہ اَمرت رِستا رہتا ہے جو بادشاہوں کا نشہ ''افیون'' کہلاتا ہے۔ زفیرہ احمد ایک مدت کے بعد کسی بولتے بدن والی لڑکی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کاش اُس کے چہرے پر بھی اتنی ہی کمینگی ہوتی کہ جتنی اُس کے جسم میں ہے۔ ماہین زفیرہ احمد کے یوں دیکھنے سے اِس قدر گھبرائی کہ کھڑے کھڑے اپنا بدن اپنے آپ میں سمیٹنے لگی۔

''بیٹھو......کیا نام ہے تمہارا؟ ہاں ایک بات میں پہلے واضح کردوں......مجھ سے سچ بولنا ہے......اِس وقت میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی لیکن پانچ منٹ بعد سب کچھ جانتی ہوں گی، لہذا مجھ سے غلط بیانی نہیں......نہ آج اور نہ پھر کبھی۔''

''جی......جان چکی ہوں......ماہین نام ہے میرا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ زفیرہ احمد سے یوں اپنا آپ سکین کرانے کے بعد اُسے بھی اُس کی آنکھوں کا دم اُس کی ذہنی روداد بیان کر چکا تھا تبھی تو اُس کی گھبراہٹ سکون میں بدلتی چلی گئی۔

''کس سے چھپتی پھرتی ہو......پولیس سے؟ یا پھر کسی حرامزادے سے؟''

''دونوں سے......'' ماہین اب زفیرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی۔

''فاروقی صاحب! آپ جائیے...... ماہین میرے ساتھ جائے گی۔''

فرقان فاروقی کو یوں لگا کہ اُس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اُس نے زفیرہ کو ادب سے سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

آفس سے فارم ہاؤس جاتے ہوئے زفیرہ سب سے پہلے ماہین کو اپنی ایک دوست کے کلینک لے گئی تا کہ مزید علاج ہونے یا نہ ہونے کی غرض سے اُس کا تفصیلی طبی ملاحظہ ہو سکے۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق اینٹی بائیوٹک کی مزید ایک انٹراوینس خوراک سے ایمرجنسی میڈیکل کورس مکمل ہو سکتا ہے لہٰذا ایک انجیکشن دیے جانے کے بعد ماہین کے ہاتھ سے برینولا اُتار دیا گیا تاہم مزید احتیاط کی غرض سے تین دن کے لیے ایسی ادویات لکھ دی گئیں کہ جنہیں حلق سے نگلا جا سکتا تھا۔ جب کہ ماہین کو لگائے گئے ٹانکوں کے بارے میں بھی کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ دو تین روز کے اندر انہوں نے خود ہی مسلز کا جزو بن جانا تھا۔ برینولا اُترنے کے بعد ماہین بہت حد تک پُرسکون ہو چلی تھی۔

کلینک سے فراغت کے بعد زفیرہ احمد اُسے گارمنٹس کی کچھ شاپس پر لے گئی اور مختلف مواقع پر پہننے کے لیے انواع اقسام کے اتنے لباس اور اُن سے میچنگ اتنے شوز لے دیے کہ ماہین نے شاید زندگی بھر اتنی اعلیٰ کوالٹی کے ملبوسات ایک ساتھ کبھی نہ خریدے ہوں۔ آج وہ اندر سے کھل اُٹھی تھی۔ اُس کی زبان گنگ اور آنکھیں تشکر کے بوجھ سے مسلسل جھکی جا رہی تھیں۔ زفیرہ احمد اِن تمام جذبات کو محسوس کر رہی تھی مگر کسی طرح بھی اُس کے چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا بلکہ وہ اُسی سے پوچھے جا رہی تھی کہ اُسے اور کیا کچھ چاہیئے۔ کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ لیکن ماہین مسلسل حالتِ انکار میں تھی بلکہ چاہ رہی تھی کہ جلدی سے کار میں جا کر بیٹھے اور گھر تک پہنچ جائے۔ کیونکہ وہی جانتی تھی کہ جن لوگوں سے وہ چھپتی پھر رہی ہے وہ کتنے طاقت ور ہیں۔ لیکن جو بات اطمینان کا باعث تھی وہ اُس غیر معمولی عزت اور احترام کا برتاؤ تھا جس کا سامنا زفیرہ احمد کو ہر شاپ اور ہر برانڈ کی آؤٹ لٹ میں تھا۔ ماہین کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ واقعی ایڈورٹائزنگ انڈسٹری کی کسی بہت بڑی ہستی کی چھاؤں میں پہنچ چکی ہے کہ

جس سے ٹکر لینا کچھ اتنا آسان نہیں ہوگا، کسی بھی کے لیے۔

خود زفیرہ احمد بھی بڑے صاحب کے لانچ کیے گیے اسکینڈل کے بعد پہلی بار یوں کھلے عام اُن مارکیٹس تک نکلی تھی کہ جہاں اُسے ہر کوئی جانتا تھا۔ لیکن اِن لوگوں کی آنکھوں میں اپنے لیے کوئی منفی تاثر نہ پا کر اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ یا تو لوگوں کا حافظہ بہت کمزور ہے اور اگر ایسا نہیں تو معاشرتی لحاظ سے کسی بھی عورت کے یوں اسکینڈلائز ہونے کو بس ''معمول کی کاروائی'' سمجھا جاتا ہے کہ جہاں عورت ہوگی وہاں ایسا تو ہوگا۔'' ویسے بھی جب نیٹ پر کروڑوں برہنہ خواتین کے ویڈیو کلپس صرف ایک ٹچ کی دسترس میں ہوں تو زفیرہ جیسی عورت کا تمام تر برہنہ پن کسی کے حافظے میں کتنی دیر تک باقی رہ سکتا ہے۔ لگتا ہے اِس نکتے پر بڑے صاحب کی ساری بھڑواگیری دھری کی دھری رہ گئی۔'' مارکیٹ آ کر زفیرہ کو یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ مردوں کی دنیا میں عزت اور پہچان اُسی عورت کو ملتی ہے جو مردوں کی طرح ہو کر رہے، اپنے اندر اور باہر کی عورت کو مار کر۔

گھر پہنچنے کے بعد اگر کسی کے درمیان کوئی تعلق، پہچان کی حد تک بھی پروان نہ چڑھا تو وہ ماہین اور شونی کا تھا۔ ماہین نے اُسے پہلی بار یوں بے تکلفی سے پورے گھر میں چلتے پھرتے دیکھا تو پہلے خوفزدہ ہوئی لیکن بعد ازاں بھی زفیرہ احمد کے بریف کرنے کے باوجود متذبذب اور پریشان ہی رہی جب کہ شونی بھی اُسے پہلی بار ہی دور سے سونگھ کر جان گیا کہ اِس لڑکی کے بدن کی خوشبو میں سب کچھ موجود ہے سوائے اپنائیت کے۔ زفیرہ احمد نے جتنا ماہین کو شونی کے بارے میں بریف کیا تھا اُتنا ہی شونی کو ماہین کے بارے میں لہٰذا اس تعارف کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر رہنے میں ہی عافیت جانی۔

فریش ہونے کے بعد زفیرہ احمد نے ماہین کو اپنی لائبریری میں بلا لیا جہاں اپنے علاوہ دو پیگ اور بھی بنا رہی تھی۔ پیالہ نما پیگ آج اُس نے اپنے قریب والے کونے کی بجائے کمرے کے دوسرے کونے میں رکھا جو اُس کی صوفہ نما چیئر کے بالکل سامنے تھا جب کہ ماہین کا پیگ اُس نے اُس کے ہاتھ میں تھما کر بوتل میز پر آزادانہ استعمال کے لیے رکھ دی۔ ماہین حیران ہوئی کہ زفیرہ نے اُس سے پوچھے بنا کس طرح اُس کا پیگ پورے تیقن سے بنا کر اس

طرح اُس کے ہاتھ میں دیا کہ جیسے اُسے معلوم رہا ہو کہ وہ پیتی ہے۔ ماہین نے مزید حیران ہونے کی بجائے زفیرہ کے ساتھ ہی پیگ اُٹھایا اور ایک ساتھ ہی سِپ کیا۔ اُس کے شراب سِپ کرنے کا انداز دیکھ کر زفیرہ ہلکا سا مسکرا دی اور ہاتھ بڑھا کر موبائل فون سیٹ کا ایک پیکٹ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ سیل فون تمہارے لیے ہے اور ہاں اِس میں سم بھی ہے، ایکٹیویٹ کر لینا۔'' ماہین نے بھی اب کچھ کہے بغیر فون سیٹ اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔

''اب یقیناً تم مجھے اپنی داستان سنانا چاہو گی اور میں بھی سننا چاہوں گی لیکن شرط وہی کہ صرف سچ......''

''میڈم! اب سچ پر زور نہ ہی دیں تو بہتر ہے۔ اتنا تو میں بھی جان گئی ہوں کہ آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتی اور اتنا یقین تو آپ کو بھی خود پر ہونا چاہیئے کہ کوئی آپ سے جھوٹ بولنا بھی چاہے تو نہیں بول سکتا۔'' بات تو ماہین نے کر دی مگر اِس کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے اُس نے جلدی جلدی دو لمبے گھونٹ لیے اور پیگ ایک طرف رکھ کر نگاہیں جھکا لیں۔ زفیرہ احمد بھی ماہین کی بات سن کر اگرچہ چونک سی گئی تھی مگر پھر بھی بات کرتے ہوئے اُس کی باڈی لینگوئج دیکھ انداز ہ لگانے لگی کہ آیا یہ حوصلہ شراب کا دیا ہوا تھا یا وہ طبعاً اتنی ہی اکھڑ اور ہتھ چُھٹ ہے۔ ابھی وہ غور کر ہی رہی تھی کہ ماہین نے جواباً آنکھیں اُٹھا کر اُسے غور سے دیکھا۔

''چلیں میڈم! اب آپ میری کہانی سُن لیں، ایسا نہ ہو کہ شراب آگے نکل جائے اور کہانی پیچھے رہ جائے۔'' شراب کا دوسرا پیگ بنانے کے لیے ماہین اب خود اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ زفیرہ نے بھی اپنا خالی گلاس اُس کی طرف بڑھایا اور خود سگریٹ سلگانے لگی۔

ماہین نے بولنا شروع کیا تو نہ وقت گزرنے کا احساس رہا اور نہ ہی پی جانے والی شراب کی مقدار کا خیال۔ زفیرہ دم بخود، کچھ کچھ لاتعلق دِکھنے کی کوشش میں راکھ ہو چکے سگریٹوں کی گنتی بھولتی جا رہی تھی۔ عجیب جادو بیانی تھی ماہین کے اظہار میں یا کرشمہ تھا اُس سچ کا جو آج پہلی بار اُس کی زبان سے خود بخود ادا ہو رہا تھا۔ زفیرہ احمد کے تئیں یہ بھرپور نسائی مکاشفہ تھا جو شاید ہی یوں کبھی کامل سچ کی صورت میں مظاہر نفسی کے طور پر سامنے آیا ہو جب کہ ماہین کے

نزدیک یہ جو بھی تھا اُس اپنے پن اور اعتماد کی عطا تھا کہ جو اُسے زفیرہ احمد کی صورت میسر ہوا تھا۔ کتنے ہی مراحل تھے جہاں وہ پوری طرح کھل کے دھاڑیں مار مار کر روئی، کہاں کہاں اپنے آپ ہی ہنستی رہی اور کتنے ہی مقامات ایسے آئے کہ جہاں اُس کے اندر کی غیر معمولی عورت اپنی پوری تب وتاب سے جلوہ فگن ہوتی رہی۔ زفیرہ اندر ہی اندر حیران تھی کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں زندگی نے اُس کے ساتھ کیسے کیسے ہاتھ کر دیے کہ اُس نے اذیت میں لطف کشید کرنے کا ہنر پا لیا تھا۔ قبل از وقت کی ذہنی پختگی اور بار بار کی جسمانی توڑ پھوڑ نے ماہین کو اِس قدر بے خوف کر دیا تھا کہ کبھی کبھی اُس کے لب و لہجے سے زفیرہ کو بھی خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

اگلی صبح گیارہ بجے کے قریب ناشتہ کرتے ہوئے زفیرہ احمد نے کمپنی کے لیگل ایڈوائزر کو نوٹ کرا دیا کہ آفس پہنچنے پر اُسے آج ہی فلاں فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو فلاں ہوٹل میں قتل ہونے والے ایک شخص نوید کے مقدمے کی اَپ ڈیٹ چاہیے۔

۞

۳۹

دانش سعید اور بڑے صاحب کے درمیان میدان لگنے کے امکانات دن بدن روشن ہوتے جارہے تھے۔ کشمکش تو پہلے سے چلی آرہی تھی کہ دانش سعید سپورٹس گاڑیوں کی پہلی درآمدی کھیپ مرکز اور چاروں صوبوں میں عبوری حکومتوں کا سیٹ اَپ بننے سے پہلے لے کر آنے میں کامیاب رہتا ہے یا بڑا صاحب اُس کی ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنا کر مردِ میداں ٹھہرتا ہے۔ گوکہ بڑا صاحب اپنے روزنامہ اخبار اور سیٹلائٹ نیوز چینل کی ملکیت کا ظاہری اور باطنی کہیں سے بھی دعویدار نہیں تھا مگر بھی وہ طاقتیں جو ملکی معاملات حکومتی سطح پر نہیں بلکہ ریاستی سطح پر چلاتی ہیں، نہ صرف یہ جان چکی تھیں کہ اخبار اور نیوز چینل، دونوں کی پشت پر کون ہے اور یہ کس قسم کی سرمایہ کاری سے اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا بڑے صاحب کو محض ایک صنعتکار ہوتے ہوئے بھی اُن سرکاری محافل میں بھی مدعو کیا جانے لگا تھا کہ جہاں صنعتکاروں اور تاجروں کے لیے بیٹھنے کو کرسی تو کیا، گزرنے کو پگڈنڈی تک نہیں ہوتی۔

اِس خصوصی توجہ کی وجہ اگرچہ دونوں فریق خوب جانتے تھے مگر کھل کر اعتراف کرنے سے گریزاں بھی دونوں تھے۔ ایک فریق اگر کچھ جتلائے بغیر پروٹوکول دیے جارہا تھا تو دوسرا اُسے اپنا استحقاق سمجھ کر قبول کیے سجا رہا تھا۔ شاید یہ کرشمہ سازی بڑے صاحب کی اِسی حیثیت کی تھی کہ موجودہ حکومت کی معیاد ختم ہونے کے دنوں میں اِس قسم کی خبریں ایک دم گردش میں آنا شروع ہوگئیں کہ اُسے عبوری حکومت میں کسی بڑے عہدے کی پیش کش کی جا رہی ہے۔ اب یہ خبر ریاست کے نگہبانوں کی جانب سے کسی قسم کا ردِعمل معلوم کیے جانے کا

اشارہ تھی یا بڑے صاحب کی جانب سے بطور شوشا کے چھوڑی گئی تھی کہ فیصلہ سازوں کو اُس کی موجودگی کا احساس دلایا جاسکے اور ثانیاً اگر کوئی مفاد بڑے صاحب کے کسی دشمن کی جھولی میں گرنے والا ہے تو اُس کو وہیں روکا جاسکے۔ بہرحال جس کا بھی کیا دھرا تھا اُس کا فائدہ بڑے صاحب کو اور نقصان دانش سعید کو ہوا کہ حکومت تحلیل ہونے کے دن تک سپورٹس کاروں کی پہلی کھیپ کراچی کی بندرگاہ تک نہ پہنچ پائی اور یوں یہ معاملہ عبوری حکومت کی کابینہ کمیٹی تک بھجوائے جانے کے لیے موخر کر دیا گیا۔ جس جس نے بھی جن جن اعتراضات کے تحت اِس فائل کو روکا تھا، صاف لگ رہا تھا کہ اُسے کس کا مفاد عزیز تھا۔ دانش سعید میں پہلے جتنی اُتاولی اور گاڑیوں کی کھیپ کی درامد میں جلدی کی جتنی ٹینشن تھی وہ حکومتی تحلیل کی تاریخ آجانے کے بعد خود بخود جاتی رہی۔ اُس نے ذہنی طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ اُسے اِس محاذ پر بڑے صاحب نے مات دے ہی دی ہے تو پھر کیا پچھتانا اور کیا اپنے آپ کو غصے میں رگیدتے رہنا۔ اُس نے گاڑیوں کی فائل کو یہیں کلوز کیا اور اب اگلے کسی میدان کے کھلنے کی آہٹ پر کان لگا دیے کہ جہاں پھر سے بڑے صاحب کے ساتھ مقابلے کے میدان میں اُترا جاسکے۔

ماضی میں جب جب دانش سعید کسی بڑے مقابلے میں بڑے صاحب سے شکست سے دوچار ہوتا تو اُس کے پاس اپنے آپ کو گزر چکی کیفیت کی ذہنی کشمکش سے نکالنے کے لیے دو طریقے ہوا کرتے۔ پہلا یہ کہ ملک سے باہر کسی پرسکون ساحلی مقام پر چلے جانا اور پھر وہاں کم از کم ایک ہفتے کے لیے خود کو ہر قسم کی کاروباری مصروفیت سے الگ کر لینا اور دوسری صورت یہ کہ اپنے ہی ملک میں کسی ایسی جگہ پر اپنے آپ کو یوں گم کر دینا کہ خود کو بھی اپنی خبر نہ ملے۔ اپنے آپ کو گم کر دینے کی عادت اُس کی بچپن ہی سے چلی آتی تھی کہ جب کبھی ماں سے بلاوجہ مار پڑتی تو وہ اپنے آپ کو بستروں والے کمرے میں اُن بستروں میں گم کر لیتا کہ جو مہمان داری یا خوشی غمی کے لیے بنا کر ایک طرف رکھ دیے جاتے تھے۔ اُسے بہت اچھا لگتا کہ جب کچھ دیر کے بعد اُسے ڈھونڈنے کے واسطے پورے گھر میں ڈھونڈ یا پڑتی اور وہ سب کی پہنچ سے دور ماں کی گود نما بستروں میں کئی کئی گھنٹے سوتا رہتا۔ سب کی آنکھوں اور پہنچ سے دور نیند کا اُس پر یوں مہربان ہونا اُن تمام گذشتہ عذابوں سے اُس کا ذہنی رابطہ منقطع کرنا ہوتا تھا کہ جو

اُسے نئی جدوجہد کے میدان میں تازہ دم ہو کر اُترنے کی راہ میں ابھی تک مزاحم ہو رہے ہوتے تھے۔ وہ گزر چکی ناکامی کے ساتھ کچھ شامیں گزارتا، کچھ راتیں مل کر جاگتا، اُس کے ساتھ کافی کے کئی گرم اور کئی ٹھنڈے ہو چکے کپ شیئر کرتا، اونچی آواز میں اپنے لڑکپن کے وہ گیت سنتا کہ جن کو سُن کر وہ بے اختیار رویا ہو یا بلاوجہ مسکرا دیا ہو، اُس کے کندھے پر اپنا سر ٹکائے گھنٹوں آنکھیں موندے رہتا، اُس ناکامی سے جڑی ہوئی وہ ساری خواہشیں، وہ سارے تپسیئے ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے کہ جن کے چہروں پر کتنے دنوں کی جنوں خیزی کی راکھ بکھری ہوئی ہوتی مگر وہ اُن سب کو بس ایک الوداعی بوسے میں تحلیل ہونے دیتا کہ جو اُس نے ناکامی کے ہونٹوں پر ثبت کرنے کے بعد زندگی کے راستے کا اگلا موڑ مڑ جانا ہوتا تھا۔

لیکن اب کی بار دانش سعید نہ تو کہیں ملک سے باہر گیا اور نہ ہی کہیں آس پاس میں اپنے آپ کو اپنے آپ سے گم کیا بلکہ وہ اپنے بنگلے میں رہا، سب کے سامنے اور سب سے رابطے میں۔ گوندل کو یقین تھا کہ عبوری حکومت بننے کے دن سے اُس کے باس نے کم از کم ایک ہفتے کے لیے تعطیلات پر چلے جانا ہے مگر جب موجودہ حکومت کے آخری دن تک اُسے کسی خاص جگہ کے سفری انتظامات کرنے کی ہدایت نہ دی گئی تو اُس کے ذہن میں ہونے والی قیاس آرائی عین فطری تھی کہ دانش سعید اپنی روش بدل کر گاڑیوں کے معاملے میں بڑے صاحب کو واضح تبدیلی کا پیغام دینا چاہتا تھا کہ مسابقت تیاگ دینے کی بجائے کشمکش بھی جاری اور مقابلہ بھی باقی۔ لیکن گوندل کا اپنے صاحب کے بارے میں کیا گیا قیاس محض چند منٹوں کے بعد عبوری حکومت کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی ختم ہو کر رہ گیا کیونکہ عبوری حکومت میں وفاقی وزیر تجارت کا اہم ترین قلمدان بڑے صاحب کو دے گیا تھا۔ یقیناً بڑے صاحب کی وزارت کا اعلان اُس سے مشاورت کے بعد کیا گیا ہوگا۔

بڑے صاحب کے تین ماہ کے لیے عبوری وزیر تجارت مقرر کیے جانے کی افواہ نما خبر بہت اندر کے مقتدر حلقوں میں کل رات سے سنی جا رہی تھی۔ اس خبر سے دانش سعید پہلے پہل تو بہت پریشان ہوا۔ اُس جیسے منتقم مزاج شخص کا وزیر تجارت کی کرسی پر بیٹھنا اُس کے تمام

کاروباری حریفوں کے لیے کھلا پیغام تھا کہ وہ اپنا بزنس لپیٹ کر کہیں اور چلتے بنیں۔ لیکن دانش سعید نے اِس کا جتنا اثر لینا تھا وہ کل رات سونے سے پہلے ہی لے چکا تھا۔ صبح سویرے جاگنے کے بعد اگرچہ پورے ملک میں ابھی تک سوائے چند ایک لوگوں کے کسی کو بھی پورے تیقین کے ساتھ عبوری حکومت میں شامل ہونے والی شخصیات اور اُن کے قلمدانوں کا علم نہیں تھا لیکن ایک باخبر بزنس مین اور سیاسی پاور بروکر ہونے کے ناتے دانش سعید کو نہ صرف بڑے صاحب کو کی گئی پیشکش کا علم تھا بلکہ یہ بھی کہ اُسے اولین پیشکش ایک بڑے صوبے کا گورنر مقرر ہونے کی کی گئی تھی مگر اُس نے صرف تجارت کی وزارت ملنے کی صورت ہی میں رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود نجانے کیوں دانش سعید کو یقین تھا کہ امیر نہال بخش کے وضع کردہ اصولوں کے تحت بڑے صاحب کو بہر صورت وزارت کا حلف لینے سے انکار کرنا پڑے گا ورنہ ایسے میں اِس شیدا گی امپائر کا وارث سردار محبوب بخش ضرور اُس کے آڑے آئے گا۔'' اور اگر وہ اُس کے آڑے نہ آیا تو!! تو کیا ہوگا بڑے صاحب کو خود سوچنا پڑے گا کہ محض تین ماہ کی وزارت کے لیے وہ اپنا پاور بروکرشپ کا اتنا بڑا اسٹیٹس داؤ پر لگا سکے گا؟''۔

دانش سعید اقتدار کے کھیل میں سابقہ حکمران پارٹی کے ہاتھوں پٹ جانے کے بعد آج ایک بار پھر شیدا گی فیملی کے سیاست میں بدلتے ہوئے کردار پر اچھا بھلا پریشان تھا۔ کیا اُسے اگلی حکومت سازی کے کھیل سے بھی باہر رکھنے کی سازش تیار ہو چکی ہے یا پھر پاور بروکری میں حکمران ادارے اُس کا رول محدود سے بھی نچلی سطح پر رکھنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟ ابھی صرف اشارے مل رہے تھے اور بہت کچھ واضح نہ تھا۔ لہٰذا مناسب یہی تھا کہ سپورٹس گاڑیوں کی درآمدی گیم میں بڑے صاحب کے ہاتھوں شکست کے باوجود معمول کی تعطیلات پر نہ جایا جائے کیونکہ کشمکش ختم ہونے کی بجائے روز افزوں ہو رہی تھی۔ اِس پس منظر میں بڑے صاحب کے وزارت کے ممکنہ حلف کی صورت میں مسابقت کا عمل وہیں سے شروع ہونا تھا کہ جہاں سے عارضی طور پر معطل ہوا تھا۔ ہاں مگر یہ اور بات کہ بڑا صاحب اگر حلف نہیں اُٹھا پاتا تو پھر دانش سعید کو شکست تو تسلیم کرنا پڑتی مگر پاور بروکری میں اُس کی ساکھ اور اُس کا کردار دونوں بچ رہتے۔

لیکن اگلے روز بڑے صاحب نے نہ صرف وزارت کا حلف اُٹھا لیا بلکہ تجارت کے ساتھ ساتھ اُسے وزارت داخلہ کا نگران وزیر بھی اِس لیے مقرر کر دیا کہ چھ رکنی مختصر ترین وفاقی کابینہ میں وزارت داخلہ کے مجوزہ نگران وزیر نے عین موقع پر حلف اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا ۔ وہ اپنے تئیں وزارت عظمیٰ کے امیدوار تھے اور اُن کے مطابق عین حلف سے پہلے حکمرانی کے فیصلہ سازوں نے اُن سے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ایک ایسے شخص کو وزیر اعظم بنا دیا گیا جو اُن کا بدترین مخالف اور اُن کے مقابلے میں کمتر حیثیت کا حامل تھا۔ بہر حال جو بھی ہوا وہ دانش سعید کے شہ مات کے مترادف تھا۔ اُس نے جونہی ٹیلی وژن پر نگران وفاقی کابینہ کی تقریب حلف برداری ختم ہوتے ہوئے دیکھی تو اعلیٰ اخلاقی اوصاف کے پیش نظر بڑے صاحب کو مبارک باد کا ایک رسمی ٹیکسٹ بھیجا اور انیکسی میں چلا آیا جو آج تک کسی مہمان کی بجائے اُس کے اپنے استعمال میں آتی رہتی تھی مگر کہیں سال میں ایک آدھ بار، اُن ایک دو مضطرب راتوں کو گزارنے کے لیے کہ جب ناسٹلجیا کدال لے کر اُس کی ذات کے ظاہر و باطن میں سے ایک ایک خلیے کو اکھیڑنا شروع کر دیتا۔ بنگلے کی مین عمارت کے کورڈ ایریا سے نسبتاً تیس فیصد چھوٹی اِس بڑی عمارت میں دانش سعید نے نہایت عرق ریزی سے اپنی زندگی کے مختلف مدارج اِس طرح تزئین و ترتیب دیے ہوئے تھے کہ وہ کسی دیہاتی چکی پر لگے پنجے کی طرح اُسے بار بار اُدھیڑتے اور بار بار اکٹھا کرتے رہتے اور اِس دوران اُس کا بدن یادوں کے پنجے سے اُڑنے والے روئی کے گالوں کی مانند بُڑواں بُڑواں ہو کر ہواؤں میں اُڑتا اور پھر زمین پر گر کر سمٹتا رہتا۔ انتہائی اذیت سے راحت اور پھر راحت سے انتہائی ایذا کی طرف مراجعت۔

انیکسی میں آتے ہوئے اُس نے گوندل کو ایک فون کیا اور پھر اُسے بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ گوندل کو اتنی سی تاکید تھی کہ اُسے باخبر رکھنا ہے بس اُس وقت اور اُتنا ہی کہ جتنا بقا کے لیے ضروری ہو، اِس کے سوا کچھ نہیں۔ انیکسی میں پہنچنے کے بعد بھی دانش سعید آج پہلی بار گومگو میں تھا کہ آیا اپنی اِس تازہ ناکامی کو ناکامی سمجھ کر الوداع کہے اور اگلے رَن کی راہ دیکھے یا اِسی کشمکش جاریہ کو فی الحال چلنے دے اور نئے فیز میں داخل ہونے کے بعد اپنی حیثیت کا ادراک کرتے ہوئے پیش قدمی کرے یا پسپائی اختیار کرے۔ جب اِن دونوں راستوں پر نشان

منزل کہیں دکھائی نہ دیا اُس نے ایک تیسری راہ نکالی خود کو حالات کے سپرد کر دینے کی اور بظاہر پُر سکون ہوتا چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کاروباری تجزیے میں کوئی کمی نہیں تھی اور نہ ہی کوششوں میں کسی قسم کا تساہل تو اگر ایسے مطلوبہ نتائج نہیں ملے تو خود کو الزام دینا کہاں کی عقل مندی ہو سکتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ہوا حریف کے کیمپ کی سمت چل رہی تھی لہذا توقف ہی بہترین حکمت عملی ہو سکتی تھی۔

انیکسی میں چونکہ کسی بھی ملازم کا غیر ضروری طور پر آنا پہلے سے ہی ممنوع رکھا گیا تھا لہذا دانش کے اپنے قیام کے دنوں میں کوشش یہی ہوتی کہ خانساماں اور صفائی والے ملازم کو وقت بے وقت چلے آنے کی بجائے صرف آن کال رکھا جائے۔ انیکسی میں قیام کے دنوں میں وہ چائے اور شراب قریب بھی نہیں جاتا تھا۔ بس ایک کافی تھی جس کے بارے میں اُس کا دعویٰ تھا کہ یہ ''مشروبِ فکر'' اُس سے بہتر اور کوئی نہیں بنا سکتا۔ اعلیٰ ترین کافی کے بیج خود پیکنگ سے نکال کر ایک چھوٹی سی مینوئل چکی نما مشین میں اُن کی پسائی اور پھر کافی دیر تک اُس کی پیسٹ بنانے کے عمل میں پھینٹنے کے دوران دنیا کے بہترین ساؤنڈ سسٹم پر شاعر منظور جھلا کے وہ تمام گیت جو گلوکارہ ریشماں نے اُس کے بچپن سے بھی پہلے گائے، اتنی اونچی آواز میں سننا کہ سماعت کے چاروں طرف کسی اور آواز کی دخل اندازی کا امکان تک نہ رہے۔

''نہ دل دیندی بے دردی نوں نہ کونج وانگوں کرلاندی'' ...... ''کتھے نین نہ جوڑیں تینوں واسطہ خدا دا واگاں وطناں نوں موڑیں'' ...... ''وے میں چوری چوری تیرے نال لا لئیاں اکھاں وے'' ...... ''ہائے اُو ربا نئیں لگدا دل میرا۔''

یہ تمام گیت اُس ماں کی اُس وقت گنگنایا کرتی کہ جب وہ گھر میں اکیلی رہ جایا کرتی۔ پردیس گئے شوہر کی ایسی بیوی جو اپنے سسرال کے ہمسائے میں دندنا کر پوری من مرضی سے رہتے ہوئے بھی اِن گیتوں کو بھرائی ہوئی آنکھوں اور رندھے ہوئے گلے سے گھر کا کام کاج کرتے ہوئے گنگناتی تو شبیر کو ایک ایسی بدکردار حرافہ دکھائی دیتی جو اپنے شوہر سے ڈنکے کی چوٹ پر بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہوتی تھی۔ مگر ماں سے زندگی بھر کی دوری اور زمانے بھر کی ٹھوکروں نے شاکے کو منظور جھلا کی شاعری اور ریشماں کی گائیکی کی اُن گُجھی رمزوں سے یوں

آشنا کیا کہ جونہی یہ بول ریشماں کی صحرائی آواز کے سوز میں نم آلود ہو کر اَب اُس کی سماعت کی بجائے دل کے کواڑوں پر دستک دیتے تو اُس کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگتیں۔اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ پردیس گئے شوہر کی بیوی اپنے سسرال کے ہمسائے میں بھلے دندنا کر من مرضی سے رہے مگر بھرائی ہوئی آنکھوں اور رندھے ہوئے گلے سے اِن گیتوں کے یہ بول گنگنانے والی جوان عورت کو شوہر سے بے وفائی کا مرتکب ہونے سے پہلے لاکھوں بار خود کو کند چھری سے ذبح ہونے کی اذیت سے گزرنا ہوتا ہوگا۔ایسے میں اُسے اپنی ماں بہت یاد آتی اور وہ دھاڑیں مارتے ہوئے رو دیتا مگر اُس کی آواز پھر بھی ریشماں کی آواز سے دبی دبی رہتی کیونکہ وہ اپنی ماں کے ہیولے میں اُس کونج کو تلاش کرتا کہ جس کے گُرلاٹ کو ریشماں اپنی آواز دے چکی تھی۔

کافی کے دوسرے کپ پر اُس کے آنسو تھمے تو اُس نے ریموٹ سے ساؤنڈ سسٹم کو آف کر دیا۔ایک دم چھا جانے والی خاموشی کو اُس نے کافی کے ایک لمبے گھونٹ کے ساتھ پزیرائی کا سندیس دیا اور اُٹھ کر ایک گیلری کی طرف چلا آیا جہاں دیوار کے دونوں طرف آئل پینٹ میں بنی ہوئی ایک ہی سائز کی پورٹریٹس آویزاں تھیں۔اِن میں پہلی تصویر اُس کے والد کی تھی اور دوسری والدہ کی۔یہ دونوں پورٹریٹس اُس نے ایک پیشہ ور مصور سے اپنی یادداشت کے سہارے بنوائی تھیں مگر جب مکمل ہوئی تو بالکل اصل کی مانند تھیں۔لیکن تصویروں سے ہٹ کر شعور نے اُس کے ساتھ عجب کھیل کھیلا۔سب کچھ اُلٹ کر رکھ دیا۔باپ بھلا دیا اور ماں ایک یافتِ نو کے عمل کے نتیجے میں اُس کی ذات کے گرد حصار کھینچ کر بیٹھ گئی جب کہ باپ کو تو اُس کے جیل جاتے ہی رحمت خان نے اپنے آپ سے بدل ڈالا تھا۔رحمت خان کی جیل میں رہتے ہوئے جب میٹرک کا نتیجہ آیا تو وہ دانش سعید ولد رحمت خان ہو چکا تھا۔اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شبیر عرف شاکا کے نام سے عمر قید کاٹنے کے لیے آئے ہوئے قیدی کی جیل میں یوں کایا کلپ بھی ہو سکتی ہے۔یہ رحمت خان کے ڈسپلن کا کرشمہ تھا کہ جب وہ سات سال کی جیل کاٹ کر باہر نکلا تو اکنامکس میں ماسٹرز ڈگری لے چکا تھا جب کہ کاشف نے گریجوایشن کے بعد رحمت خان سے جان چھڑانے کے لیے جان بوجھ کر کچھ اِس قسم کی گھٹیا حرکات کیں کہ اُسے

رحمت خان کی ناراضگی کے سبب عام قیدیوں کی بیرک میں شفٹ کر دیا گیا۔گل مکئ کا شبیر کی جانب جھکاؤ اُسے پہلے ہی شبیر سے ذہنی طور پر بہت دور کر چکا تھا۔شبیر کی رہائی کے تقریباً چھ ماہ بعد رحمت خان بھی جیل سے باہر آ گیا لیکن کاشف کا طرزِ عمل اُسے ابھی جیل ہی میں رکھے ہوئے تھا۔

دانش سعید جونہی جیل سے باہر نکلا تو کئی جان لیوا بیماریوں کا شکار ہو چکے رحمت خان کی بہت بڑی بزنس ایمپائر کی سربراہی اُس کی منتظر تھی لیکن یہ ابھی تک ایک معمہ تھا کہ بلیک منی اور منی لانڈرنگ سے صاف ستھرا کاروبار اور سیاست کی پاور بروکری کرنے والے رحمت خان نے شبیر عرف شاکے جیسے مجرم کو ہی کیوں نہ صرف اپنی ولدیت دی بلکہ کھربوں روپے کا کاروبار بھی حوالے کر دیا یہ جانتے ہوئے کہ شبیر ایک عرصہ تک پیشہ ور مفعول بھی رہ چکا ہے۔اُس کے قریبی حلقۂ احباب میں سے اکثریت کا خیال تھا کہ قبائلی علاقے سے تعلق رکھنے کے سبب وہ اپنا وارث اپنے خاندان سے ہی منتخب کرے گا مگر جب ایک پنجابی نوجوان اُس کا وارث بن کر سامنے آیا بہت سی چہ مگوئیوں اور خاصی بے سروپا باتوں کا تذکروں میں آنا بھی عین فطری تھا۔

لیکن رحمت خان نے اِن تمام باتوں کی پروا کیے بغیر جیل سے باہر آتے ہی دانش سعید کو مینجمنٹ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھجوا دیا۔گو کہ وہ ڈیڑھ برس تک انگلینڈ میں رہا مگر اس دوران جو کچھ اُس نے کاروبار کو مسلسل اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے رحمت خان سے سیکھا وہ اُس ولایتی ڈگری کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔وہ حیران تھا کہ رحمت خان نے آٹھ برس کا عرصہ ایک چھوٹے موٹے فوجداری مقدمے میں جان بوجھ کر خود کو سزا کرانے کے بعد اِس لیے جیل میں گزارا کہ اُن سازشوں سے بچ سکے کہ جو اُس کے مخالفین نے اُس کے باہر رہنے کی صورت اُس کو زندگی بھر کے لیے پھنسانے کے لیے تیار کر رکھی تھیں۔اِس دوران رحمت خان اگر جیل میں نہ رہتا تو اُس کی زندگی کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔لیکن اِس کے باوجود زندگی نے اُس سے وفا نہ کی۔جیل سے باہر آنے کے بعد کہ جب اُس کی مخالف حکومت اپنی دوسری مدت کے وسط تک آتے آتے کمزور پڑ چکی، رحمت خان نے اسمبلیاں تڑوانے کے لیے پوری بازی جمالی تھی

اورآنے والے دنوں میں کیے جانے والے ممکنہ احتساب کے دباؤ میں آیا ہوا وزیراعظم کسی وقت بھی قومی اسمبلی تحلیل کرنے کی ایڈوائس صدر کو بھجوا سکتا تھا کہ رحمت خان اچانک چل بسا۔ رحمت خان کون تھا؟ رحمت خان کیا تھا؟ دانش سعید اس کا ایک فیصد بھی اُس کی زندگی میں نہیں جان پایا تھا۔ وہ کتنے مضبوط اعصاب کا مالک اور کیسے کیسے دشمنوں سے بیک وقت کیسی کیس جوکھی لڑا کرتا تھا، اِس کا اندازہ دانش سعید کو رحمت خان کے انتقال کے بعد ہوا۔

لیکن خود دانش سعید کیا تھا، اِس کا علم اب تک دانش سعید کو بھی نہیں تھا۔ رحمت خان کے یوں اچانک انتقال کے بعد اُس نے جس طریقے سے اُس کے پورے کاروبار کو سنبھالا اس کے بعد دانش تو کیا، اُس کے بدخواہوں کو بھی احساس ہوگیا کہ اپنے جانشین کے طور پر رحمت خان نے اگر دانش سعید کا انتخاب کیا تھا تو بہت سوچ سمجھ کر اور کافی کچھ دیکھ بھال کر کیا تھا۔ دانش سعید کی انیکسی کی گیلری میں آویزاں تیسری پورٹریٹ رحمت خان کی تھی۔ وہ کافی دیر تک پورٹریٹ کے سامنے آنکھیں بند کیے کھڑا ہو کر اُن لمحات کی خوشبو کو محسوس کرتا رہا کہ جب اُسے پہلی ملاقات کے لیے رحمت خان سے کی بیرک میں لے جایا گیا تھا۔

اُس گیلری میں چوتھی تصویر کاشف کی تھی۔ دانش سعید اُس کی آنکھوں میں اب بھی اُن دنوں کے رنگوں کا متلاشی تھا کہ جب انہوں نے زندگی کا کٹھن ترین دور ایک دوسرے کی ڈھارس بن کر گزارا۔ بچپن میں اکٹھے ظلم کی انتہا سہی اور لڑکپن میں اکٹھے ظلم کی انتہا کی۔ تینتالیس قتل کرنے کا تو کیس چلا مگر اُس کے ہاتھوں اپنی جان سے جانے والے اِس گنتی سے کہیں زیادہ تھے۔ دانش سعید اکثر اپنے نرم و نازک ہاتھوں کو دیکھتا تو حیران ہوتا کہ اِن انگلیوں کی طاقت سے، محض ایک ڈوری کو بل دے کر اُس نے کتنے ہی گلے گھونٹے اور کتنی ہی گردنوں کے منکے توڑے۔ کتنی وحشت تھی اُن دونوں کے اندر ایک انسان کی جان لینا اُن کے نزدیک چیونٹی مسلنے جتنی وقعت بھی نہیں رکھتا تھا۔ سوچا ہی نہیں تھا کہ اتنے سارے لوگوں کو قتل کر کے اُنہوں نے کتنی بیواؤں کو گُرلانے والی کونجیں، کتنی یتیم بچیوں کو کال گرلز اور کتنے ہی لڑکوں کو بس اسٹینڈ کے ہوٹلوں کا شاکا اور کاشی بنا دیا تھا۔ ایسے میں دانش سعید کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنے اِن ہاتھوں کو کسی چلتی چکی کے پاٹوں میں ڈال کر اس طرح کچلے کہ وہ محض گوشت کے لٹکتے

ہوئے لوتھڑے رہ جائیں۔ بے بسی سے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ کاٹ کر اُن سے لہو کی بوندیں نکالنا گیلری میں اُس کے آخری لمحات کا خاصا ہوا کرتا۔ کاشف کی تصویر پر الوداعی نگاہیں ڈالتے ہوئے وہ ہمیشہ یہی سوچتا کہ جان لینا تو ایک طرف، وہ تو کسی پر تشدد کا بھی مخالف ہوا کرتا تھا لیکن پھر نجانے کہاں سے اُس کے مزاج میں ہٹ دھرمی، وحشت اور بے رحمی جیسے منفی رویے در آئے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ اب بھی اُن کے درمیان میں اگر کوئی رشتہ باقی رہ گیا تھا تو وہ تلاش کا تھا۔

﴿۴۰﴾

زفیرہ احمد اپنے آفس پہنچی تو کمپنی کے سینئر لیگل ایڈوائزر بیرسٹر حسین عباس نوید مرڈر کیس سے متعلق ضروری دستاویزات کے ساتھ خود وہاں آئے ہوئے تھے۔ زفیرہ کے کرسی سنبھالتے ہی انہوں نے فائل اُٹھا کر اُس کے سامنے رکھ دی۔ زفیرہ نے ایک دو صفحات اُلٹ پلٹ کر کچھ پڑھنے کی کوشش کی مگر پھر فائل کو ایک طرف کرتے ہوئے بیرسٹر صاحب سے کہا کہ وہی انہیں اِس مقدمے کے بارے میں بریف کر دیں۔

''میڈم یہ کیس تو داخل دفتر ہو چکا ہے۔'' بیرسٹر نے ایک جملے میں پوری بات ختم کر دی۔

''کیا مطلب؟ داخل دفتر کیا؟''...... زفیرہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے استفہامیہ نگاہوں سے بیرسٹر کی طرف دیکھا۔

''simply it is closed...... ہوا یوں کہ جہلم کا رہنے والا ایک ادھیڑ عمر شخص نوید اِس سستے سے ہوٹل میں آ کر ٹھہرا۔ دو روز کے بعد کمرے سے اُس کی لاش ملی تو نامعلوم افراد کے خلاف رپورٹ درج کرنے کے بعد متعلقہ تھانے کی پولیس نے اُس کا پوسٹ مارٹم ایگزامینیشن کرایا۔ چونکہ لاش کے کچھ اجزاء تفصیلی معائنے کے لیے فورنزک سائینس لیبارٹری بھجوائے گئے تھے اِس لیے جونہی دو ہفتے کے بعد اُن کی رپورٹ ملی تو حتمی پوسٹ مارٹم رپورٹ جاری کر دی گئی۔ رپورٹ کے مطابق نوید نے پہلے سے دل کا مریض ہوتے ہوئے بھی ویاگرا کی دگنی مقدار استعمال کرنے کا رسک لے لیا لہذا خون کا دباؤ ایک دم کم ہونے اور دل بند ہو

جانے کے سبب جان گنوا بیٹھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد نوید کی لاش سرد خانے میں رکھ کر اُس کے گھر والوں کو تلاش کی گیا۔ اُس کی بیوہ اور بیٹے نے آ کر نہ صرف لاش کو شناخت کیا بلکہ کسی کے بھی خلاف کاروائی نہ کرنے کا بیان دینے کے بعد رپورٹ خارج کرنے کی استدعا کرتے ہوئے لاش تدفین کی غرض سے جہلم لے گئے۔ یوں کیس ختم ہوئے کو بھی کئی مہینے گزر چکے تھے۔

''کیا اِس میں سبھی دستاویزات کی نقول موجود ہیں! یعنی مقدمہ ختم ہونے کا حکم بھی موجود ہے؟''...... زفیرہ نے اپنے جذبات چھپاتے ہوئے ایک بار پھر فائل کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔

''جی سبھی کچھ موجود ہے۔ اور بھی کچھ چاہیئے تو بتائیے گا۔''

بیرسٹر حسین عباس تو چلے گئے لیکن زفیرہ احمد سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اُس کا دل چاہا کہ ابھی فون کر کے ماہین کو ساری صورتحال بتائے یا گاڑی بھیج کر اُسے آفس میں بلا لے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اتنی اہم بات جس نوعیت کی پرائیویسی کی متقاضی ہے وہ ان دونوں صورتوں میں میسر نہیں ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ وہ خود یہ خوش خبری ماہین تک اِس طور پہنچائے کہ وہ اُسے کسی ردعمل کے بغیر سُن اور برداشت کر سکے۔ اُسے یونیورسٹی کی اُس پوسٹ گریجوایٹ لڑکی پر ترس آ رہا تھا کہ جس کی ایک معمولی سی لغزش نے اُسے کہاں کہاں کس کس کی ٹھوکروں میں رکھ کر وہ کچھ بنا دیا کہ جو کسی بھی لڑکی کے لیے مقام عبرت ہو سکتا ہے۔ زفیرہ کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں کے پولیسنگ کے نظام کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دے کہ جس کے سبب ایک بے گناہ لڑکی کو کسی نامزد پرچے کے بغیر اُس کے گھر سے محلے بھر کے سامنے گرفتار تو کیا گیا مگر ریکارڈ میں اُس کی گرفتاری ڈالے بنا ایک جانور نما ایس ایچ اُو کے نجی ٹارچر سیل میں بٹھائے گئے وحشیوں کا لقمہ ہوس بنا دیا گیا۔ یہ کہاں کا انصاف تھا کہ ہارٹ اٹیک سے مرنے والے شخص کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کیے بغیر اُسے مقتول قرار دے کر دراصل ایک لوئر مڈل کلاس خاندان کے ایک ایک فرد کو اُس کی عزت، اَنا، خودداری اور خوابوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ کیا اتنی بڑی تلخ حقیقت ماہین سُن اور برداشت کر پائے گی یا اَب اُس کی فیملی اُسے پھر

سے ایک نیک نام بیٹی کے طور پر قبول کر سکے گی؟ کیا اتنا بڑا کھلواڑ جو قانون کی حکمرانی کے نام پر رچایا گیا تھا کوئی ردعمل پیدا کیے بغیر ماہین یا اُس کی فیملی سے یونہی برداشت کر لیا جائے گا؟ زفیرہ احمد کو یہ سب کچھ ناممکن لگ رہا تھا۔ لیکن اِس سے بھی بڑے سانحے اور اُن کا برداشت کیا جانا ممکن ہو کر رہ جاتا ہے کہ جب اِس کے متاثرین اسے تقدیر کی منشا سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں یا اُن سے ایسا ہونا قبول کرا لیا جاتا ہے۔

زفیرہ کا دل چاہا کہ پورے ملک کا میڈیا اکٹھا کرے اور اُن کے سامنے اِس مقدمے کی فائل رکھ کر ماہین پر گزرنے والی وہ ساری کی ساری قیامتیں ماہین کی زبانی کھول کر سنائی جائیں اور پھر حکمرانوں سے اور اِس نظامِ انصاف کے پاسداروں سے ایک ہی سوال پوچھا جائے کہ اِس لڑکی اور اِس کی فیملی کو کوئی جرم کیے بغیر کس جرم کی سزا دی گئی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ جب حاکموں کے پاس رعیت کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا تو سوال بھی مٹا دیے جاتے ہیں اور سوالوں کے جواز بھی۔ وہ خود اِس نظام کا کیا بگاڑ پائی ہے کہ جس میں ایک طاقت ور اُسے پوری دنیا کے سامنے ننگا کر کے بھی نیک نام ہے لیکن اُس میں اتنا دم نہیں کہ دنیا کو سچ بتا سکے لہذا وہ اس سازش، اِس تہمت کا سامنا سچ کی بجائے محض ڈھٹائی سے کیے جا رہی ہے۔ تو کیا ماہین کو بھی آج ہی پوری حقیقت بتا دینی چاہیئے کہ اُس کے ساتھ ہمارے نظامِ انصاف کے تحت کیسا کھلواڑ، کیسا ظلم ہوا ہے یا دھیرے دھیرے حسبِ قانون، قانون کی چکی میں ڈال کر دانہ دانہ پیستے ہوئے انصاف کے سربلند پرچم کے ساتھ اس طرح باہر نکالا جائے کہ نظام، قانون اور انصاف سبھی کا بھرم رہ جائے۔ ''مگر وہ کیوں ایسے سسٹم کا بھرم رکھنا چاہ رہی ہے کہ جو ڈلیور کرنے کی سکت کھو چکا ہے؟'' اگرچہ زفیرہ احمد کے پاس اپنے ہی ذہن سے اُبھرے ہوئے اِس سوال کا جواب نہیں تھا مگر وہ پھر بھی اِس نکتے پر کنفیوژ اور ڈبل مائینڈڈ ہو چکی تھی۔

خیالات کی اِس تکرار، بھرمار اور یلغار نے زفیرہ احمد کو نڈھال کر کے رکھ دیا تھا اور اس کا سبب صرف ماہین کے ساتھ پیش آنے والے حالات نہیں تھے بلکہ اُس کا اپنا ماضی بھی پس منظر کے طور پر موجود تھا۔ اِس تمام تریاسیت اور یبوست سے نکلنے کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ دن کا باقی وقت آفس کی بجائے گھر پر یا کہیں اور گزارا جائے۔ اس تجویز نما خیال کے پیچھے یقیناً ماہین

تک اُس خبر کی رسائی بھی شامل تھی کہ جس نے اُس کی زندگی کو اُسی طرح بدل کر رکھ دینا تھا کہ جیسے اِس سے پہلے محض جھوٹ ہوتے ہوئے بھی بربادیوں میں بدل کر رکھ چکی تھی۔ لہذا آفس سے نکلنے کا فیصلہ ہوتے ہی زفیرہ احمد نے اپنا ضروری سامان سمیٹا، سیکریٹری اور اکاؤنٹنٹ کو انٹرکام پر ضروری ہدایات دیں اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتی فون پر بزر کی آواز سنائی دی۔ ''کوئی ضروری فون تھا تبھی تو سیکریٹری نے اُس کی ہدایات کے برعکس بزر دیا تھا۔'' وہ واپس مڑی اور فون اُٹھا لیا۔

''I am extremely sorry Mam، آریان گروپ آف کمپنیز کے امتیاز صاحب کے پی اے ہیں لائن پر، ایک اہم بزنس میٹنگ کے لیے ابھی اپائنٹمنٹ مانگ رہے ہیں، کہتے ہیں بہت ارجنٹ ہے۔'' زفیرہ احمد کی سیکریٹری کے لہجے میں بہت لجاجت تھی۔

''کیا ہیں وہ؟ I mean عہدہ کیا ہے اُن کا؟''

''جی ایم میڈیا پروٹوکول۔'' سیکریٹری کے لہجے میں اب خجالت بھی شامل ہو چکی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ اتنی بھی کیا اَرجنسی!''...... زفیرہ احمد اپنے طور پر بڑبڑائی۔

''تو کیا میں معذرت کر لوں؟''

''تم نری گھامڑ ہی نہیں، گاؤدی بھی ہو...... جب میں رک ہی گئی ہوں تو کہہ دو تشریف لے آئیں اور ہاں میرے لیے کافی بھجوا دو۔'' فون کو واپس کریڈل پر رکھتے رکھتے وہ خود بھی واپس کرسی پر بیٹھ چکی تھی مگر بے حد چڑ چڑے موڈ کے ساتھ۔ کافی آئی تو اُس نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ ایک ساتھ میٹنگ میں لیں گے۔

زفیرہ احمد کو کچھ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اگلے بیس منٹ میں آریان کی سہ رکنی ٹیم اُس کے آفس میں موجود تھی۔ آریان بنیادی طور پر فوڈ آئٹم بنانے والی کمپنی تھی لیکن اب سولہ کمپنیوں کے گروپ کی صورت میں روزانہ استعمال کی بہت سی معیاری اشیاء بنا کر مارکیٹ پر اس طرح چھا چکی تھی کہ محض اُس کا ایڈورٹائزنگ کا بجٹ کئی کروڑوں کو چھو رہا تھا۔ زفیرہ احمد کے ساتھ بڑے صاحب کی واردات ہونے سے پہلے آریان اور مہ نور کی بزنس ڈیل پائپ لائن میں تھی اور معاملہ ابھی زفیرہ احمد سے میٹنگ کی نوبت تک نہیں پہنچا تھا۔ لیکن ویڈیو اسکینڈل سامنے

آنے پر یہ گروپ بھی اُسی طرح پیچھے ہٹ گیا کہ جس طرح باقی کلائنٹس بھاگ گئے تھے۔ زفیرہ حیران تھی کہ آج نہ صرف اتنی بڑے گروپ آف کمپنیز کے جی ایم میڈیا گروپ خود آئے ہوئے تھے بلکہ وہ ایک سال کا معاہدہ کرنے کی تمام دستاویزات اُسی پروپوزل کی بنیاد پر فائنل کرا کے لائے تھے کہ جو ابتدائی طور پر مہ نور ایڈورٹائزنگ کی جانب سے اُنہیں دی گئی تھی۔ ایسے میں مہ نور کے ایگزیکٹوز کی مذاکراتی ٹیم کو اِس قسم کے بڑے کنٹریکٹ پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ جو کمپنی کی زخم خوردہ ساکھ کو تجارتی مارکیٹ میں مثبت اور بامعنی فروغ دے سکے۔ لہذا اگلے ایک گھنٹے میں آریان گروپ آف کمپنیز اور مہ نور ایڈورٹائزنگ کے درمیان معاہدے پر دستخط بھی ہو چکے تھے۔ زفیرہ احمد اور اُس کی ٹیم کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی کیونکہ صرف یہی ایک معاہدہ کمپنی کے اگلے دو برس کے اخراجات چکانے کے لیے کافی تھا۔

آریان کی ٹیم جانے لگی تو زفیرہ احمد اُنہیں رخصت کرنے کے لیے کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ ممتاز صاحب نے قصداً باقی لوگوں کو باہر جانے دیا اور آخر میں زفیرہ احمد سے مصافحہ کرتے ہوئے زیرلب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہنا نہ بھولے کہ گوندل صاحب کا حکم تھا کہ یہ معاہدہ آج اور ابھی ہو۔ ممتاز صاحب کی زبانی یہ جملہ سنتے ہی مصافحہ کرتی زفیرہ احمد کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ آریان گروپ کے لوگوں کے جاتے ہی مہ نور کی ٹیم پھر سے کمرے میں آن گھسی اور لگی دینے مبارکیں مگر زفیرہ کا پورا وجود سُن سا ہو کر رہ گیا تھا اور وہ اپنے لوگوں کو کسی بھی قسم کا ردِعمل دینے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔

مہ نور کے ہمدانی، منصور اور فاروقی نے اتنی بڑی کامیابی کے بعد بھی اپنی باس کو یوں گم سم دیکھا تو خاموشی سے باہر چلے گئے۔ زفیرہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اِس میگا بزنس ڈیل کا جشن منائے یا اس پر روئے۔ وہ تو پہلے ہی گوندل اور اُس کے مفروضہ باس کے کردار کے سلسلے میں تشکیک کا شکار تھی کہ وہ یہ سب کچھ کیوں اور کس واسطے کیے چلا جا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ گوندل اِس گیم میں اکیلا ہو اور باس کا کردار اُس نے گھڑ رکھا ہو لیکن اِس کے باوجود کروڑوں روپے کے شیئرز خرید کر اُس کے حوالے کر دینے اور پھر بڑے صاحب جیسے دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر مزید کروڑوں کے خرچے سے اُس کی کمپنی کو دیوالیہ ہونے بچانا یوں بلا سبب تو نہیں تھا۔ اور

اب پھر یہ مہربانی!!

زفیرہ کا ذہن چٹخنے لگا تھا۔ اس تمام تر عطا کی قیمت اُسے کیا چکانی ہو گی؟ کوئی بھی نہیں تھا ایسا کہ جس کے ساتھ وہ یہ روداد شیئر کر سکتی یا جان سکتی کہ اِس سودے کی قیمت اُس کے ادھار کھاتے میں کتنی لکھی جا چکی ہے۔ کئی سوالوں کا ایک سوال کئی سمتوں سے اُس کے سامنے آ کر ہنگام برپا کرنے لگا کہ اِس مہربانی کا سبب اور اِس عطا کی قیمت؟ سبب اور قیمت!! سبب اور قیمت!!! سبب اور قیمت!!! قیمت؟ قیمت؟؟ قیمت؟؟؟

اِسی کیفیت میں وہ آفس سے نکلی اور تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی اپنے فارم ہاؤس کی طرف چل نکلی۔ مارگلہ کی پہاڑیاں چڑھنے سے پہلے ایک دم موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ زفیرہ کا جی چاہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے سید پور کی طرف نکل جائے اور کافی کے ایک کپ میں اس پوری بارش کو انڈیل کر کوئی تو فیصلہ کر لے کہ اُس نے ماہین سے کہنا کیا ہے۔ وہ یوں ڈبل مائینڈ ڈ اُس کے سامنے جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ مگر کوئی بھی فیصلہ کرتے کرتے گاڑی دامن کوہ سے گزرنے لگی تو اُس نے مزید اوپر جانے کی بجائے گاڑی پارکنگ کی جانب موڑ لی۔ بارش کا زور اگرچہ ابھی نہیں ٹوٹا تھا لیکن پھر بھی اُس کی گاڑی روکتے ہی تین چار چھتری والے لڑکوں نے کھانے پینے کا آرڈر لینے کے لیے اُس کی گاڑی کو گھیر لیا۔ کافی شاپ سے آئے ہوئے ایک لڑکے کو کیپو چینو کا کہہ کر زفیرہ احمد نے سیٹ کو پوری طرح کھولتے ہوئے سر کو پیچھے کی طرف ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

کل اور آج ...... یہ دو دن اُس کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں لے کر آئے تھے۔ کل ماہین کا اچانک اُس کی زندگی میں ایک مشن کی مانند شامل ہونا کہ جسے اُس نے انصاف دلانا تھا لیکن آج یہ مکاشفہ کہ وہ اِس پورے عمل میں قاتلہ نہیں بلکہ ایسی مقتولہ تھی کہ جو اپنی جان سے تو نہیں گئی لیکن جان ہوتے ہوئے بھی اُس کے پلے کچھ نہیں رہا تھا۔ نہ عزت، نہ عصمت، نہ گھر بار اور خاندان، نہ مستقبل اور نہ ہی مستقبل سے وابستہ بھی خواب جو کسی بھی لڑکی کی عمر عزیز کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ ابھی تو اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کی باقی زندگی کس ڈھب سے اور کس کے سہارے گزرے گی۔ لیکن آج ہی اُس کا یعنی زفیرہ احمد کا ''مشن انصاف دلانا

’’(mission access to justice) شروع ہونے سے پہلے ہی غیر متعلق اور غیر موثر ہوجانا کیا معنی رکھتا ہے؟ مگر زفیرہ احمد پھر بھی وہ انصاف جو قدرت ماہین کو اپنے سسٹم میں پہلے ہی دلا چکی ہے وہ اُسے اُس سے پوشیدہ رکھ کر اُس انسانی سسٹم سے دلانے کا ڈراما کرنا چاہتی ہے جو پہلے ہی اُسے انصاف کی بجائے انتقام کا نشانہ بنا چکا ہے۔ تو کیا زفیرہ احمد بھی قدرت کے سسٹم میں حائل ہو کر اُسے اِس طرح انسانی نظامِ انصاف کے کھاتے میں ڈالتے ہوئے اپنا حصہ بٹورنا چاہتی ہے کہ ماہین عمر بھر اُسی کے احسانوں کے بوجھ تلے دبی رہی؟ اگر زفیرہ احمد خود ’’سبب اور قیمت‘‘ کے چکر میں دوسروں کو الجھائے رکھنا چاہتی ہے تو اُسے اُن لوگوں کی نیت پر بھی شک کرنے کا کوئی حق نہیں جو اُسے اپنے احسانات کے پس منظر میں اِسی ’’سبب اور قیمت‘‘ کے تجسس میں اٹکائے رکھنا چاہتے ہیں۔

تیز بارش میں کافی کے گرم کپ نے اُس کی سوچ کو اس حد تک پھیلا دیا تو زفیرہ احمد کو اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ ایک جانب وہ گوندل کے احسانات پر محض اِس وجہ سے بگڑ رہی ہے کہ وہ اِس کے سبب اور ممکنہ طور پر چکائی جانے والی قیمت سے لاعلم ہے مگر دوسری جانب وہ خود حقائق چھپا کر ماہین کو بھی اِسی ’’سبب اور قیمت‘‘ کی الجھنوں میں اُلجھائے رکھنا چاہتی ہے۔

’’لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اِس وقت کا بولا گیا پورا سچ ہوسکتا ہے ماہین کی شخصیت میں اور بھی بگاڑ پیدا کر دے اور وہ اپنے آپ کو ہر چیک اینڈ بیلنس سے ماورا گردانتے ہوئے اُن راہوں پر پھر سے نہ چل نکلے کہ جہاں سے کوئی مامون راستہ واپسی کا نہیں، اُسے ابھی کنٹرولڈ آزادی کی ضرورت ہے کہ جس میں تربیت کے ساتھ ساتھ نامعلوم کا انجان خوف قدم قدم پر ساتھ ہو اور یہ خوف نوید کے قتل کے مقدمے کے فیصلے کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔‘‘ زفیرہ احمد کو اپنی ہی سوچ کی آواز اپنی ہی سماعت سے ٹکراتی ہوئی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

’’تو پھر چھوڑیے میڈم گوندل کے احسانات سے کیڑے نکالنا ...... ہوسکتا ہے آپ کو بھی اپنے معاملات میں فی الحال کُھل کھیلنے کی بجائے نامعلوم کے انجان خوف کا احساس ہر گام ضروری ہو ورنہ امکانی طور پر پاؤں اُکھڑنے اور بزنس سے ایک بار پھر باہر پھینکے جانے کا

احتمال کہیں نہیں گیا خاص طور پر کہ جب آپ کا دشمن ملک کا وزیر تجارت اور وزیر داخلہ بن چکا ہو ...... ایسے میں کروڑوں روپے کے میگا بزنس کنٹریکٹ کا سائن ہونا بڑے صاحب کے منہ پر طمانچہ ہے یا گوندل کی نیت میں کیڑے نکالنے کا معاملہ؟‘‘

زفیرہ احمد جب اپنے گھر پہنچی تو ذہنی طور پر تمام ابہامات سے نکل کر انتہائی تازہ دم ہو چکی تھی۔ وہ اپنی اور ماہین کی پوزیشنز میں کوئی امتیاز نہیں کر پا رہی تھی۔ دونوں حالات کے جبر کا شکار مگر اب نہ اُسے اپنی طرف سے ماہین پر پورا سچ آشکار نہ کرنا برا لگ رہا تھا اور نہ ہی گوندل کی جانب سے اُس پر نوازشات کی بوچھاڑ کی وجہ کا ظاہر نہ ہونا۔ لمحہ موجود میں جو کچھ ہونے جا رہا تھا اُسی میں سب کی بھلائی تھی۔

ماہین ابھی تک اپنے کمرے میں تھی۔ نجانے کیوں آفس سے واپسی پر ماہین سے ملنے کی خواہش کا دل میں پیدا ہونا اُسے اچھا لگنے لگا تھا۔ شاید کہیں کوئی گھر کا احساس مطلوب تھا یا اپنے آپ کو اپنی سماجی سطح پر سانجھا کرنے کی جبلی آرزو۔ مگر نہ تو اُس کی کوئی بہن تھی اور نہ ہی بیٹی کہ جس کے ساتھ وہ دن بھر کی بک بک کو سانجھا کر کے اپنے آپ کو ہلکا کر سکے۔ آفس میں گھر اور گھر میں آفس کچھ بھی تو الگ سے نہ تھا۔ ہاں اگر آفس اور گھر میں کوئی ہلکی سی پہچان الگ سے تھی تو وہ شوفی اور شراب کا ایک ساتھ دستیاب ہونا۔ مسلسل ایک متجرد اور متصنع زندگی گزارنے کے عمل نے زفیرہ کی شخصیت پر اتنے خول اور اتنی پرتیں چڑھا دی تھیں کہ اب اُن کا اُتارنا خود اُس کے لیے بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

زفیرہ کا خیال تھا کہ ماہین شاید سوئی ہوئی ہوگی مگر جونہی اُس نے دروازے کو اُلٹی انگلی کے ساتھ ہلکا سا بجایا وہ اُسی لمحے کھل گیا۔ ماہین نے کل کے خریدے گئے کیژوئل ڈریسز میں سے ایک پہنا ہوا تھا۔ بلیک جینز کے اوپر سی گرین کلر کا کاٹن کا کرتا جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے اور کھلے ہوئے بالوں میں کافی دیر پہلے کا کیا ہوا برش۔ زفیرہ نے اُسے اس حال میں اس طرح کھلا کھلا دیکھا تو ایک لمحے کے لیے کچھ بھی کہنا بھول گئی۔ ’’کس قدر تر و تازہ ماڈل تھی وہ آریان گروپ آف کمپنیز کی اشتہاری مہم کے لیے ...... بالکل اُسی طرح کہ جیسے اُنہیں اپنے پراڈکٹس کے لیے چاہیے تھی۔‘‘

''آیئے ناں! کیا دیکھ رہی ہیں آپ یوں مجھے۔'' ماہین کا چہرہ لال گلال ہوا تو وہ مارے شرم کے مسکرا دی۔

''آں ہاں ...... کچھ بھی نہیں! ویسے دیکھ رہی تھی کہ تم اِس لباس اور اِس وضع میں بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

''ارے! یہ لباس کہاں سے ہو گیا؟'' ماہین بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔

''پھر بھی بہت نکھری نکھری لگ رہی ہو۔ اچھا تم اُدھر لائبریری میں آؤ...... میں بھی فریش ہو کر آتی ہوں۔''

کچھ دیر بعد وہ دونوں لائبریری میں تھیں۔ زفیرہ نے آتے ہی تین پیگ بنائے اور شونی کو ایک طرف کرنے کے بعد دوسرا پیگ ماہین کی طرف بڑھاتے ہوئے پہلا خود اُٹھا لیا۔ دو تین گھونٹ تک دونوں میں خاموشی رہی۔

''دن کیسا گزرا؟''...... ماہین سے استفسار کرتے ہوئے بھی زفیرہ کا دھیان کہیں اور تھا۔

''کافی دنوں کے بعد بہت اچھا، بہت پرسکون۔''

''اگر تم مقدمے سے بری ہو جاتی ہو تو گھر میں واپسی ممکن ہو گی؟''

''گھر واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... وہ تو مجھے دفنانے کے بعد میری قبر کا نشان بھی مٹا چکے ہیں ...... آپ نے میری کہانی شاید غور سے نہیں سنی، میں تو وہاں سے نا اُمید ہو کر اپنی لاش کو ڈی کمپوز (decompose) کرتی پھر رہی ہوں۔'' ماہین کی آنکھوں میں نمی مگر چہرے پر پھر سے کمینگی آمیز مسکراہٹ جاگنے لگی تھی۔ ماڈلنگ اور ایکسپریشن کی دنیا پر راج کرنے والی زفیرہ احمد کے لیے ماہین کے چہرے کے یوں تیزی سے بدلتے تیور اِس قدر حیران کن تھے کہ نہ تو پہلے کبھی دیکھنے میں آئے اور نہ ہی کبھی واسطہ پڑا۔ دونوں نے ایک ساتھ اگلا گھونٹ لیا خاصی تیزی کے ساتھ۔ ماہین زفیرہ سے آنکھیں ملانے سے کترانے لگی تھی۔

''کیا آپ کو بھی یقین نہیں آتا کہ نوید میری وجہ سے نہیں مرا بلکہ اپنی موت مرا ہے۔''

''ہمیں یقین عدالت کو دلانا ہے اور اِس کے لیے میں نے ایک بہترین وکیل انگیج کر

لیا ہے۔ میری کوشش یہی ہو گی کہ کیس ٹرائل میں نہ جائے بلکہ اُس سے پہلے ایف آئی آر ہی کینسل ہو جائے۔''

''کیا ایسا ہو پائے گا؟''...... ماہین کا چہرہ ایک بار پھر کھل اُٹھا تھا۔

''کیوں نہیں ہو گا؟ ایسا ہی ہو گا۔''

''اور میری ضمانت؟''

''ضمانت تمہاری ہو چکی...... تم آج سے ضمانت پر ہو۔'' زفیرہ ہلکا سا مسکرا دی۔

''مگر یہ کیسے؟ میں تو کہیں کورٹ میں گئی ہی نہیں۔'' ماہین کا چہرہ تشکیک سے آلودہ ہونے لگا تھا۔

''میرا اتنا بڑا اسیٹ آپ کس کام کا؟ یقین کرو آج تمہاری ضمانت ہو چکی ہے...... اب تم کیس کا فیصلہ ہونے تک آزاد ہو، جہاں بھی جانا چاہو جا سکتی ہو...... پولیس تمہیں اِس مقدمے میں گرفتار نہیں کر سکتی۔''

ماہین نے زفیرہ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، نجانے وہاں کیا دکھائی دیا کہ ایک جست میں کرسی سے اُٹھی اور زفیرہ سے لپٹ کر رونے لگی۔ زفیرہ نے اُسے جی بھر کر رونے دیا مگر اس دوران وہ خود ہی روتے روتے شرمندہ شرمندہ سی آنکھیں جھکائے اور چہرہ بالوں میں چھپائے ہنسنے لگی۔ زفیرہ نے اُس کے بکھرے ہوئے بال ایک طرف کیے اور اُس کے ماتھے کا بوسہ لے کر پیگ دوبارہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ماہین نے بھی آنسو ٹپکاتی آنکھوں کے ساتھ پیگ کو آخری قطرے تک خالی کرنے میں ذرا برابر بھی تامل نہ کیا۔ وہ سراپا تشکر ہو چکی تھی مگر زفیرہ اب اُس سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی تھی۔

۞

﴿۴۱﴾

زفیرہ احمد نے طے کرلیا تھا کہ آریان گروپ آف کمپنیز کی میگا اشتہاری مہم کی لیڈ ماڈل ماہین ہوگی۔ لیکن اِس کے لیے اُسے ذہنی طور پر تیار کرنا اور پھر آفر کرنا بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا خاص طور پر ایک ایسی لڑکی کو جو وقت سے پہلے ہی غیر ضروری تجربات کے بوجھ تلے دب کر اپنی جدوجہد سے سانس لینا اور زندہ رہنا سیکھ چکی ہو تو اُس کے لیے اِس قسم کی آفر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اِس کوشش کو کوئی عملی شکل دینے کے لیے زفیرہ احمد نے روزانہ کی بنیادوں پر ماڈلنگ کی خواہش مند لڑکیوں کا آڈیشن لینا شروع کیا جس کی ریکارڈنگ وہ روز کے روز ماہین کو دکھا کر اُس کے تاثرات جاننے کی کوشش کرتی۔ ماہین کے سامنے جس قسم کی میگا مہم کا تصور زفیرہ نے پینٹ کر رکھا تھا اُس کے لیے اب تک کوئی بھی لڑکی ماہین کو بھی نہیں جچی تھی۔

دونوں کی مایوسی حد سے بڑھی تو ایک دن زفیرہ نے اچانک ہی ماہین سے یونہی روا روی میں پوچھ لیا کہ وہ کیوں نہیں کرتی ماڈلنگ اِس میگا مہم کے لیے۔ ماہین نے ایک لمحے کے لیے حیرت سے زفیرہ احمد کو دیکھا اور پھر جھجکے بغیر ہی کہہ دیا کہ ـــــ ''کر لیتے ہیں''۔ ماہین کو ماڈلنگ کی دنیا میں لانے کے لیے تیار کرنا زفیرہ کے لیے جس قدر مشکل پراجیکٹ تھا وہ ماہین کی ایک چھوٹی سی ہاں سے اُتنا ہی آسان ہو گیا۔ زفیرہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنی خوشی کا اظہار کیسے کرے۔ اُس کے نزدیک ماہین کچھ اِس طرح کی بنی بنائی ماڈل تھی کہ جس کی شخصیت کی تازگی ایڈورٹائزمنٹ کی دنیا میں تہلکہ مچا سکتی تھی۔ اِس کے برعکس ماہین ماڈل بنتے ہوئے اُن

سب لوگوں کو ایک بار پھر زندہ ہو کر دکھا دینا چاہتی تھی کہ جو اُسے ننگِ خاندان قرار دے کر زمین میں گاڑ چکے تھے۔ وہ اُن لوگوں کو بھی شہرت اور عزت کے سب سے اونچے پائیدان پر براجمان ہو کر اپنا آپ منوانا چاہتی تھی کہ جو اُسے اب تک پاؤں کی ایڑی تلے مسلتے چلے آئے تھے۔

اگلے تین مہینے ماہین کی زندگی کے اہم ترین ایام میں سے تھے کہ جن کا آغاز اُسے اپنی شخصیت کے بنیادی بدلاؤ سے کرنا تھا۔ بنیادی تبدیلیوں میں بھی نقشِ اولیں نام کا بدلنا تھا۔ شوبز میں فلم یا ڈراما ہو یا ماڈلنگ کی دنیا کسی لڑکی کا اصل نام کم ہی کام دیتا ہے۔ عام طور پر لڑکیوں کے لیے وہی نام مناسب سمجھا جاتا ہے جو بولنے اور یاد رکھنے میں آسان اور پڑھنے سننے والوں کو خواہ مخواہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے انہیں خوابوں کی دنیا میں لے جانے پر قدرت رکھتا ہو۔ مگر اپنی حیاتِ نو کے سفر میں ماہین اپنے اصل نام سے ہی جانے جانے کی خواہش مند تھی لیکن زفیرہ احمد کا خیال تھا کہ بطور ماڈل ''ماہین'' نام اُس کے لیے مناسب نہیں رہے گا۔ کئی نام تجویز ہوئے مگر ماہین کے نزدیک وہ اُس کی شخصیت کو اُس طور ظاہر نہیں کرتے تھے کہ جیسے وہ تھی۔

زفیرہ تو اچھے سے سمجھ رہی تھی کہ ماہین اپنے اصل نام کے ساتھ ہی کیوں پہچانے جانے کی خواہش مند تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماہین کا پرانا نام خوئے انتقام کی علامت بن کر اُس کے ساتھ چپکا رہے۔ وہ اُسے نئی دنیا اور نئی زندگی میں لانا چاہتی تھی کہ جہاں ماضی کے عذابوں کا سایہ تک اُس پر باقی نہ رہے۔ اب جب کہ آریان گروپ آف کمپنیز کے جی ایم پبلسٹی پروٹوکول نے بھی ماہین کو پرائم ٹیلنٹ کے طور پر اپروو کر دیا تھا، کاپی لائنز، جنگلز اور لوکیشنز تک سب کچھ فائنل ہو چکیں اور محض شوٹنگ اور ایڈیٹنگ کا کام باقی رہ گیا تو زفیرہ احمد نے ماہین کے مزاج کو سمجھتے ہوئے نام کے قضیے کو میڈیا مہم کی لانچنگ کی تاریخ تک موخر کر دیا۔

اس دوران بہت کچھ عجب سا ہوا۔ مختلف ملکی اور غیر ملکی لوکیشنز پر شوٹنگ کے دوران ماہین نے خود محسوس کرنا شروع کر دیا کہ اُس کا نام اِس پروفیشن کے تقاضوں کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔ پروڈکشن کے عملے میں تقریباً ہر شخص اپنے اصل نام کی بجائے کسی مختلف نام سے پکارا

جاتا تھا۔کوئی بھی ایسا نام جو بار بار پکارے جانے پر بھی زبان پر بوجھ نہ بنے اور ہی تکلم کے بہاؤ میں آڑے آئے۔ پہلے شوٹنگ سپیل کے کامیابی سے مکمل ہونے پر ماہین کے اندر چھپا ہوا غصہ بھی قدرے کم ہونے لگا تھا۔ غصے کا بتدریج کم ہونا بھی اِس امر کی نشاندہی تھی کہ وہ انتقام کے راستے سے ہٹ کر اکرام اور درگزر کی جانب متوجہ ہونے لگی ہے۔مزاج میں در آنے والی اِس تبدیلی نے ایک شام اُسے زفیرہ احمد کے سامنے لا بٹھایا۔شرمندہ شرمندہ سی، آنکھیں جھکی ہوئی اور بال بکھر کر پورے چہرے کو چھپائے ہوئے۔

''کیا نام رکھا ہے فائنلی آپ نے میرا؟''___ماہین شرمانے کے بعد لجانے پر آ گئی تھی۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟''___ زفیرہ بھی اُسے چڑانے پر آ گئی تھی۔ماہین نے کرسی پر بیٹھی ہوئی زفیرہ احمد کے پیچھے جا کر اپنی بانہیں اُس کے گلے میں ڈال دیں اور اُس سے چپک گئی۔یوں کچھ دیر کی اِس پیار بھری ہاں ہاں ناں ناں کے بعد ماہین کا نیا نام ''نیلاب'' فائنل ہو چکا تھا۔اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا کہ جب اُسے ملک کے پانچ بڑے ملٹی نیشنل بزنس گروپس میں سے ایک یعنی آریان گروپ آف کمپنیز کی پرائم میڈیا اسٹار کے طور پر لانچ کر دیا گیا۔اُس روز کے تمام اخبارات، رسائل اور ٹی وی چینلز کی اسکرینز پر صرف ایک چہرہ جگمگا رہا تھا___ نیلاب کا چہرہ۔

اِس چہرے نے لانچنگ کے ساتھ ہی شوبز کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔یہ چہرہ اگرچہ حسین ترین چہروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اِس پر بیک وقت فراواں ہوتی ہوئی معصومیت اور چھلکتے ہوئے نسائی چلتروں کے حیران کن امتزاج نے ڈیجیٹل کیمرہ ورک کے ساتھ کچھ ایسا کرشمہ کیا کہ جس آنکھ نے بھی اُسے آنکھ بھر دیکھا، اُسے اِس نئی لڑکی کو اپنے ذہن سے نکالنا ممکن نہ رہا۔لانچنگ کے پہلے روز تو ویسے بھی ہر نیا اشتہار مکمل اور بار بار دکھایا جاتا ہے لہذا مرد حضرات اُسے بار بار دیکھنے کی خواہش میں ٹی وی اسکرین کے اطراف ہی میں گھومنے لگے اور خواتین دل ہی دل میں اُسے حرافہ اور کمینی ایسے القابات سے نوازنے کے باوجود، ٹی وی

لاؤنج سے گزرتے ہوئے اُسے کنکھیوں سے دیکھتی ضرور جاتیں۔اُس میں کسی بھی عورت کو پل بھر میں ''عدم تحفظ'' کا شکار کر دینے کی پوری صلاحیت تھی۔یوں نیلاب اپنی رونمائی کے ایک گھنٹے بعد ریٹنگ کے لحاظ سے ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں ایک نیا اور بظاہر ناقابل شکست ریکارڈ قائم کر چکی تھی۔اب تو یہ عالم تھا کہ ہر شخص جو اِس شعبے سے وابستہ تھا، اِدھر اُدھر رابطہ کرتے ہوئے اِس لڑکی کا نام اور اتا پتا ضرور پوچھے جا رہا تھا۔زفیرہ احمد کی خوشی دیدنی تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے انتہائی مختصر عرصے میں اُس کی مہ نور ایڈورٹائزنگ پھر سے ملکی مارکیٹ پر چھا چکی تھی۔یہ معجزہ صرف دو لوگوں کے سبب ہوا تھا، گوندل اور ماہین۔اگر عین بحران کے عروج پر یہ زفیرہ کی زندگی میں نہ آئے ہوتے تو کیا ہو چکا ہوتا، اُس کا تصور تک کرنا محال تھا۔زفیرہ کو اُن دونوں کا خیال آیا تو پہلے اُس نے گوندل کا نمبر ملایا مگر اُس کا فون بند تھا۔اُس نے جلدی سے اُس کے نام میسج چھوڑا اور ماہین سے رابطہ کیا۔

''ماہین! تم جانتی ہو کہ آج کا سورج طلوع ہونے کے بعد تم سپر ماڈل بن چکی ہو!۔''

''ماہین نہیں نیلاب! ...... خود ہی نام دیا اور خود ہی بھلا دیا۔'' ماہین نے زفیرہ کو زچ کرتے ہوئے کہا۔

''نیلاب تم دنیا کے لیے ہو مگر میرے لیے وہی ماہین! سنو بے بی تم نے تو کمال کر دیا! چھا گئی ہو ایڈورٹائزنگ کی مارکیٹ پر...... ہر شخص تمہارا دیوانہ ہوا پھرتا ہے، لڑکیاں تم سے جیلس ہوئی جاتی ہیں ...... اور ہاں! آج میں تمہیں نئی گاڑی گفٹ کرنا چاہتی ہوں ...... جلدی سے بتاؤ! کون سا کلر چاہیئے؟'' ...... زفیرہ جذباتی ہوئی جا رہی تھی۔

''میم پلیز! گاڑی بھی لے لیں گے......ابھی تو مجھے چلانا ہی نہیں آتا......آپ پلیز اپنا وعدہ نہ بھولیں! بس مجھے مرڈر کیس سے بری کرا دیں پلیز!!'' ...... ماہین کی آواز یکدم بھرائی اور پھر گلا رُندھ کر رہ گیا۔ایسے میں ماہین نے فون خود ہی بند کیا تو زفیرہ کو یوں لگا کہ وہ سب کچھ جانتی ہے اور اُسے محض شرمندہ کیے جا رہی ہے۔کہیں بات کھلنے کا شائبہ نہ ہوتے ہوئے بھی نجانے کیوں وہ احساسِ ندامت میں گھُسی چلی جا رہی تھی۔ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں نیلاب کی

آمد سے آنے والا بھونچال اب اُس کو اندر واندری کھڑ کھڑائے چلا جا رہا تھا۔

ایک اور بھونچال اسی شہر کے مضافات میں ایک پرفضا پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے بنگلے کے در و دیوار میں بھی آ چکا تھا۔ اگرچہ دوپہر کے دو بجے تھے مگر جونہی سردار محبوب بخش کی آنکھ کھلی اور چائے کے کپ کے ساتھ اُس کے کمرے کا ٹی وی بھی آن ہوا، وہ جمپ کر کے اُٹھا اور دیدے پھاڑے LED کی اسکرین پر نگاہیں جما کر بیٹھ گیا۔ سبھی ٹی وی چینلز پر ایک ملٹی نیشنل برانڈ کی بیوٹی پراڈکٹس کے بیک وقت چل رہے ایڈز میں ماہین کو ماڈلنگ کرتا دیکھ کر وہ ایک بار پھر مجنون ہو چلا تھا۔ اُس کے سر پر ہتھوڑے برساتے اشتہار اور بار بار اُس کا منہ چڑاتی ماہین۔ سردار محبوب بخش کو اپنے حواس سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

آج کے اخبارات کا انبار بھی اُس کے بیڈروم میں پہنچا دیا گیا جن کے پہلے صفحے پر شائع شدہ اشتہارات میں بھی ہر طرف ماہین، ماہین اور صرف ماہین۔ انصر اگرچہ اُس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا مگر اُس کا غصہ سرد ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ غضب خدا کا کہ وہ لڑکی جو اُس کے پچھواڑے پر آلو رکھ کے اُس کے چنگل سے نکل بھاگی تھی اِسی شہر میں بڑے طمطراق سے ماڈلنگ شوٹ کرتی رہی لیکن اُس کے کتوں کو اُس کی خبر تو کیا اُس کی بو خوشبو کا ہونا یا نہ ہونا بھی معلوم نہ ہو سکا۔ گذشتہ تین مہینوں میں کہاں کہاں جھک نہیں ماری گئی، جہاں جہاں ماہین کے پائے جانے کا امکان ہو سکتا تھا وہاں وہاں اُس نے ایک ایک کونا چھان مارا لیکن ماہین کا کہیں سے بھی کوئی جا ٹھکانا معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن اب آج ہی کے دن لانچ ہونے والی اِس اشتہاری مہم سے معلوم ہوا کہ وہ "نیلاب" کے نام سے مہ نور ایڈورٹائزنگ کی زفیرہ احمد کی دریافت ہے اور اگلے ایک سال کے لیے صرف آریان گروپ آف کمپنیز کے لیے ماڈلنگ کا معاہدہ کر چکی ہے۔

نیند سے بیدار ہونے کے بعد مسلسل چائے پینے کے دوران کئی بار سردار محبوب بخش کو شبہ ہوا کہ ہو سکتا ہے اشتہارات میں دکھائی دینے والی لڑکی واقعی کوئی نیلاب نام کی ہو جس کی صورت ماہین سے ملتی ہو مگر سمارٹ ٹی وی پر یوٹیوب سے اشتہار کا ایک ایک فریم دیکھنے کے بعد

اُسے سو فیصد یقین ہو چلا تھا کہ یہ ماڈل لڑکی ماہین کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ حسیناؤں سے پہلی ملاقات میں ملائم و نرم خو اور انتہا کی حد تک عاجزی سے پیش آنے والا سردار محبوب بخش اپنی انا کو ٹھیس پہنچنے پر اِس حد تک بے رحم، ضدی اور تسلط خیز بھی ہو سکتا تھا کہ اُن کا یوں برباد کر دیا جانا اُس کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہ رکھتا ہو۔ وہ کتنے ہی نام بدل لے، کتنے ہی چہرے بدل لے لیکن عورت کے سامنے وہ اپنے آپ کو کبھی نہیں بدل پایا تھا۔ اُس کے دو روپ تھے، پہلا بے لباس ہونے سے پہلے اور دوسرا بے لباس ہونے کے بعد۔ اُس کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ جتنا عرصہ کسی لڑکی کے ساتھ بے لباس ہوئے بنا گزار لے تو بہتر و گرنہ اُس کے بعد وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا تھا۔ لڑکی سے تعلق ختم ہو جانے کا خوف اُس کے سبھی جذبات، سبھی رویوں کو معکوس کر دیتا اور وہ انہیں اپنے ذہن میں ٹھونکی ہوئی کھونٹیوں پر لٹکاتا چلا جاتا۔ اُسے زندگی میں کئی ایسی لڑکیاں ملیں کہ وہ اُس کے بے لباسی کے بعد کے رویے سے خوفزدہ ہو کر یا کبھی کبھی اُس کی امارت سے مرعوب ہو کر اُس سے تعلق میں رہنے کی خود ہی خواہاں ہوتیں مگر اُسے نیئر کہیں یا سردار محبوب یا کچھ اور، اُس نے کبھی کسی ایسی لڑکی کو ذہنی طور پر برباد کیے بغیر جانے نہیں دیا کہ جو اُسے بے لباسی کی حالت میں دیکھ یا مل چکی ہو۔

اُس کے پاس ایسی لڑکیوں کو کھونٹیوں سے لٹکا رکھنے کی کئی شاطرانہ چالیں ہوتیں۔ کبھی شادی، کبھی کار کوٹھی بنگلہ اور کبھی فارن ٹورز۔ لڑکی جس کھونٹی سے لٹکنا چاہتی وہ اُسے اُسی کھونٹی سے لٹکا دیتا اور پھر اُسے ترساتا، تڑپاتا اور ذہنی اذیتیں دیتا اُس وقت تک کہ جب تک اپنی بے لباسی اُس کے ذہن سے کھرچ نہ لیتا اور پھر اِس طرح بھلا دیتا کہ جیسے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ لیکن ماہین کا معاملہ اُس کی زندگی کا سیاہ باب تھا کہ جس میں ایک لڑکی اُسے ہزیمت سے دوچار کر کے یوں نکل بھاگی کہ وہ اپنا حساب چکتا کرنے کی خواہش میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔ نجی سراغ رساں کمپنی بھی اپنا فوکس اُن تینوں ڈرائیوروں پر کیے جانے کے سبب مات کھا گئی کہ جن پر یقین تھا کہ وہ ماہین کو اغوا کرنے یا اُسے بھگانے کی سہولت کاری میں ملوث تھے۔ بڑے صاحب کے نگران وفاقی وزیر بننے کے بعد اُن تینوں ڈرائیوروں کو اُن کے نجام تک پہنچانا

اگر چہ کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ بھاگنے کی واردات کا سارا مدعا ماہین پر ڈالنے کے بعد خود بچ نکلے لیکن اتنا قبول کر لینے کے بعد کہ اُسے ہسپتال یقیناً اُن کے ساتھ گزاری ہوئی رات کے نتیجے میں داخل ہونا پڑا ہو گا۔ اتنا کچھ جان لینے کے باوجود بھی نہ تو سردار محبوب یا نیئر جمیل کی آتش طیش سرد ہو سکی اور نہ ہی خوئے انتقام کم۔ ماہین سے کھائی ہوئی مات کو ذہنی طور پر قبول کر لینا اَب اُس کے بس کی بات نہیں رہی تھی خاص طور پر آج کہ جب میدان بھی اُس کے سامنے تھا اور گھوڑا بھی رانوں کے نیچے۔ ماہین کا نام ''نیلاب'' ہو کر بھی خاک میں خاک ہونا اُسی نے لکھنا تھا کسی اور نے نہیں۔ اَنصر کے لیے بھی اپنے باس کا یہ روپ قطعی حیران کن تھا۔ اُسے حکم صادر ہو چکا کہ ماہین بہر صورت آج اور ابھی سردار محبوب بخش کے روبرو ہی نہیں بلکہ قدموں میں ہونی چاہیے کہ جسے لٹکائے رکھنے کے لیے وہ کوئی کھونٹی نہیں بلکہ اپنے ذہن میں صلیب گاڑے بیٹھا تھا۔

۞

﴿۴۲﴾

زفیرہ احمد محض حیران ہی نہیں بے پناہ ششدر تھی کہ یہ کون شخص آیا اور اُس سے کیا کہہ کر چلتا بنا ہے۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اِس دھمکی نما پیغام پر اُس کا فوری ردِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ کیا وہ پولیس کو مطلع کرے یا سیکریٹری داخلہ کو یا اپنے طور پر اپنے دوستوں کو اِس ناگہانی مصیبت سے نمٹنے کے لیے کہے یا سر دست اپنے وسائل پر بھروسہ کرتے ہوئے کوئی ایسی حکمت عملی بنائے کہ آنے والا برا وقت کسی طور گزر سکے۔ ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں دھمکیاں بھی رہی ہیں اور انڈر ورلڈ کا عمل دخل بھی لیکن جس بھونڈے اور ننگے طریقے سے اُسے آج دھمکایا گیا تھا، ایسا پہلے کبھی دیکھا نہ سنا۔

زفیرہ احمد آج صبح سے اپنی اشتہاری مہم کی کامیاب لانچنگ پر نیک خواہشات اور تہنیتی پیغامات سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی کہ یقیناً آج کا دن اُس کے لیے ایک بڑا دن تھا۔ سالِ رواں آغاز ہی سے اُس کے لیے اِس قدر مشکلات اور تکالیف کا سال رہا کہ نصف سے زیادہ گزرنے کے باوجود کوئی میگا کمپین تو کیا چھوٹا موٹا بزنس بھی ڈھنگ سے نہ ہو سکا۔ اِس پر بڑے صاحب کی ''عنایت'' مرے کو مارے شاہ مدار والی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں اتنی بڑی کمپین کا ملنا اور اُس سے زیادہ بڑی کامیابی سے ہم کنار ہونا اُس کے بزنس حریفوں کی نیند اُچاٹ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کمپنی کے ایگزیکٹوز اور دیگر ملازمین کی جانب سے ذاتی طور پر اور دیگر احباب کی جانب سے فون پر مبارک سلامت سمیٹتے سمیٹتے وہ تھک گئی تو سوچا کہ آج کے اہم ترین دن کا سورج وہ اپنے فارم ہاؤس کے لان میں ماہین کے ساتھ اسکاچ کے

پیمانوں میں غروب ہوتا ہوا دیکھے کہ جس نے اپنی شخصیت کے رنگوں سے مہ نور ایڈورٹائزرز کی کامیابی کو یقینی بنا دیا تھا۔ ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں ایسی کامیابیوں کو گرینڈ پارٹیز کی صورت میں منائے جانے کا چلن کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ خود اُسے آریان گروپ آف کمپنیز کی ٹاپ منیجمنٹ کی جانب سے آج ایسی ہی ایک پارٹی کے انعقاد کے بارے میں پوچھا گیا تھا مگر اُس نے کسی اور دن کے لیے اُٹھا رکھتے ہوئے آج کے لیے معذرت کر لی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ایسی پارٹیاں سجانے کے لیے کلائنٹ کمپنیوں کی بجائے ایڈورٹائزنگ کمپنیاں ہی تاک میں رہتی ہیں کہ ایک کامیابی کا جشن منانے کی آڑ میں مزید بزنس سمیٹا جا سکے۔ مگر یہاں وہ خود ہی ایک بڑے موقع کو ضائع کیے جا رہی تھی۔ زفیرہ احمد کو یہ بھی معلوم تھا کہ کون کون سی حریف اور کون سی حلیف کمپنیوں کے ایگزیکٹیوز اپنی شام کی مصروفیات کو ری آرگنائز کرنے کے لیے اپنے اپنے ذرائع سے اُس کی جانب سے پارٹی کے ممکنہ انعقاد کو کنفرم کرتے رہے مگر خبر پھر بھی کوئی نہ لے سکے۔ جب کہ تمام تر امکانات کے پیشِ نظر زفیرہ احمد کے مزاج میں بدلاؤ اگر کوئی تھا تو وہ بڑے صاحب کے دیے ہوئے جھٹکے کے علاوہ اپنے گھر سے لگاؤ کی وجہ سے بھی کہ جو ماہین کے آنے کے بعد فارم ہاؤس کی غیر سنجیدہ صورت لُک کی بجائے اپنا گھر دکھائی دینے لگا تھا۔

لیکن اِس سے پہلے کہ وہ اپنے کمرے سے نکلتی، اُس کا دروازہ کسی نے پوری قوت سے اندر کی طرف دھکیلا اور خاتون سیکریٹری اور پیون کے منع کرنے اور پیچھے پیچھے لپکنے کے باوجود وہ اندر داخل ہو گیا۔ اپنی وضع قطع اور شکل وصورت سے وہ اپنے رویے کے برعکس خاصا مہذب دکھائی دے رہا تھا۔ خاتون سیکریٹری اور پیون نے بیک وقت بے بسی سے اپنی باس کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی معافی رجسٹر کرائی اور اس دوران اُسی کے اشارے پر دروازہ بند کرتے ہوئے واپس مڑ گئے۔ صبح سے اُس کے چہرے پر آئی ہوئی مسرت اور جولانی پل بھر میں غائب ہوئے تو اُن کی جگہ درشتی اور ناگواری چھا گئی۔ لیکن اس کے باوجود زفیرہ نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور استفہامیہ نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھنے لگی۔

''سردار محبوب صاحب کو تو آپ جانتی ہوں گی؟''

''آپ بات کریں...... میرا جاننا اتنا ضروری نہیں۔'' زفیرہ احمد کے لہجے میں ناگواری

کے درجات ایک دم بڑھ چکے تھے۔

''میرے بتانے سے زیادہ آپ کا جاننا ضروری ہے۔'' آنے والے شخص کا لہجہ بھی کافی درشت ہو گیا تھا۔

''میں نہیں جانتی...... اب آپ جلدی سے بتائیے جو بتانا ہے۔''

''مجھے یقین تھا کہ آپ نہیں جانتیں ورنہ......!''

''ورنہ......؟''

''ورنہ ماہین کو اپنے پاس پناہ نہ دیتیں...... ویسے حیرت ہے آپ امیر قادر بخش صاحب کے اکلوتے بیٹے سردار محبوب صاحب کو نہیں جانتیں!!''

ماہین، امیر قادر بخش اور سردار محبوب کے نام ایک ساتھ سننے کے بعد زفیرہ کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا مگر پھر بھی اُس کی کوشش یہی تھی کہ اپنے حواس مجتمع رکھے اور چہرے سے کسی قسم کا کوئی تاثر ظاہر نہ ہونے دے۔

''ویسے کبھی کبھی نہ جاننا بھی صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے جیسے آج آپ کے لیے۔'' یہ کہتے ہوئے آیا ہوا شخص اچانک کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''اَنصر نام ہے میرا...... اس وقت ساڑھے تین بج رہے ہیں آپ کے آفس کی گھڑی میں اور ماہین میرے باس کو چاہیئے ایگزیکٹ ساڑھے پانچ بجے اُن کے بنگلے کے گیٹ پر، اور بس!!''

''لیکن کیوں؟ کیوں جائے ماہین تمہارے باس کے بنگلے پر؟''...... زفیرہ کی برداشت جواب دے چکی تھی۔

''اس لیے کہ وہ تین ماہ پہلے وہیں سے بھاگی تھی...... چلتا ہوں اور ہاں جتنی تم گھاگ ہو تمہیں بتانا ضروری نہیں کہ ہم لوگ ساڑھے پانچ بجے کے بعد تم سے اور تمہارے اس چھان بورے کے کاروبار سے کیا سلوک کریں گے۔''

اَنصر نامی شخص کے جانے کے بعد والی کیفیت اُس پر اگلے پندرہ بیس منٹ تو پوری شدت سے طاری رہی کہ جس میں وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے اور کون سی آپشن اختیار کرے۔ پولیس یا کسی حکومتی شخصیت کے پاس جانا خودکشی کرنا تھا کیونکہ اس سے پہلے تو

شیدا گی فیملی کا ہر حکومت میں اعلیٰ ترین سطح پر اچھا بھلا اثر رسوخ ہوا کرتا تھا لیکن اَب کے تو یہ فیملی براہ راست سیاست میں تھی۔ اِس کا سب سے بڑا حاشیہ بردار ''بڑا صاحب'' نگران حکومت میں تجارت اور داخلہ کی دو اہم ترین وزارتیں سنبھالے ہوئے تھا۔ ایسے میں پولیس نے سردار محبوب کے احکامات بجا لانے تھے یا زفیرہ احمد کی مدد کو آنا تھا؟ زفیرہ احمد کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بڑے صاحب کے انتقام سے بچنا بھی تھا کیونکہ ماہین کے معاملے کی آڑ میں وہ اُسے پھر سے کوئی نیا رگڑا لگا کر اپنا پرانا حساب چکتا کر سکتا تھا۔

اِن حالات میں اَنصر نامی شخص کی طرف سے دی گئی دھمکی کا کوئی توڑ کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ وہ اِس دھمکی کا پس منظر ہی سمجھ پاتی۔ اب تک اگر کوئی معمہ اُس کے سامنے نہیں کھلا تھا تو وہ ماہین اور سردار محبوب کے مابین کسی بہت بڑے پھڈے کا ہونا تھا۔ اُسے لگا کہ ماہین نے کچھ معاملات پر اُس سے سچ یا پورا سچ نہیں بولا تھا اور اگر ایسا نہیں تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اُس سے کچھ کچھ بات چھپائی گئی ہو۔ ماہین اگر واقعی کسی بڑے پس منظر کے بغیر ایک عام سی لڑکی تھی تو سردار محبوب کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا کہ وہ اپنی عزت اور خاندانی شہرت یوں بھونڈے طریقے سے داؤ پر لگانے کو تیار ہو جائے۔

زفیرہ حیران تھی کہ اِس قدر زیادہ التفات کے باوجود ماہین نے اُسے اِس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ ماہین کے بقول اُس کا آخری معاملہ کسی نیئر جمیل نامی شخص سے ہوا تھا کہ جہاں سے ایک پولیس آفیسر کا ڈرائیور اُسے لے اُڑا۔ ''تو کیا اُس نے ایک ایسی لڑکی کو گھر میں پناہ دے رکھی تھی کہ جو سراپا جھوٹ، چھل اور فریب تھی؟''۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ماہین کو بڑے صاحب نے اُس کے گھر میں اُس اسکرپٹ کے مطابق پلانٹ کیا ہو جس پر وہ خود بخود فطری اسچوایشن کے مطابق عمل کرتی چلی گئی۔ اِس پلانٹڈ لڑکی سے کسی بھی قسم کا پھڈا کرا کر مہ نور ایڈورٹائزنگ کی چیف ایگزیکٹیو کو ایک بار پھر عین چوراہے کے بیچ ننگا کیا جا سکتا تھا۔ انٹرنیٹ پر عام آدمی کا رجوع کرنا اور پھر دیکھے ہوئے پر یقین کرنا خاصا مشکل تھا لیکن اگر کوئی ایسی لڑکی نیشنل پریس کلب میں بیٹھ کر اُس کے خلاف پریس کانفرنس میں گھناؤنے الزام عائد کرے جو تین ماہ اُس کے گھر میں رہنے کے بعد ایک ہی دن میں ملک کی سب ماڈل بن چکی ہو، تو اُس

کی بات اور اُس کے الزامات پر کون یقین نہیں کرے گا۔

زفیرہ احمد نے اتنے سارے مخالفین کو عین اپنی کامیابی کے دن ایک بار پھر صف آرا ہوتے دیکھا تو پاؤں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ جس سچوایشن میں وہ پھنس چکی تھی اُس میں رہتے ہوئے یوں لگ رہا تھا کہ ماہین تو صرف بہانہ ہے، حملہ ہر طرف سے اُسی پر کیا جانا مطلوب ہے۔ اِن حالات میں نہ تو اُسے کسی پر اعتبار باقی رہا تھا اور نہ ہی وہ کسی پر اعتبار کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن اِس کے باوجود اُس نے کسی نہ کسی طور حالات کی اِس دلدل میں سے نکلنا تو تھا۔ اگر یہ ساری فیلڈ امکانی طور پر بڑے صاحب کی ہی ترتیب دی ہوئی تھی تب بھی کم از کم اِس پر وہ اب نہیں کھیل سکتی تھی۔ اُسے فی الفور کچھ اور کرنا تھا، اَنصر کا اُلٹی میٹم ختم ہونے سے بہت پہلے۔

تیزی سے گزرتا ہوا وقت اگرچہ زفیرہ احمد کو مزید کنفیوژ کیے چلا جا رہا تھا مگر دوسری طرف یہی کنفیوژن اُس کے ذہن میں تازہ ہوا کے طاقچے بھی اُتنی ہی تیزی سے کھولتی ہوئی آگے کو بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے فوری طور پر دو کام کرنے تھے جن میں اولیت تو ماہین کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچانے کی تھی کیونکہ وہ پلانٹڈ تھی یا نہیں لیکن اُس کا فارم ہاؤس پر رہنا کسی طور بھی دانش مندانہ طرزِ عمل نہیں تھا۔ بڑے صاحب یا سردار محبوب کے پالتوں لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ انہیں زفیرہ احمد کا ٹھکانہ معلوم نہیں ہو گا، صریحاً بے وقوفی ہوتی لیکن اِس کے ساتھ ساتھ گوندل سے رابطہ کرنا بھی انتہائی ضروری تھا۔ اِس سچوایشن سے مامون نکل آنے کی بہترین حکمت عملی اُس سے بڑھ کر اور کون ترتیب دے سکتا تھا۔ لیکن یہ سوچتے ہوئے ایک اور خیال زفیرہ احمد کے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپکا۔

''یہ دونوں کام ایک ہی شخص ''گوندل'' کے ذمے کیوں نہ لگا دیے جائیں؟ ماہین کو فارم ہاؤس سے بھی وہی لے اور اُن دونوں کے لیے کو کسی ایسی جگہ قیام کا بندوبست بھی وہی کرے کہ جہاں انصر وغیرہ کے تصور کا گزر بھی نہ ہو___''

زفیرہ کے مطابق اُس کا خیال تو بہت عمدہ تھا لیکن اِس کے لیے گوندل کو اپنے باس سے اجازت لینا ضروری ہوگی، اگر کوئی اُس کا باس ہے تو۔ اُس نے اپنا سیل فون اُٹھایا۔ صبح کے کیے

گیے ٹیکسٹ میسج کا گوندل کی جانب سے ابھی تک کوئی واپسی پیغام نہیں آیا تھا۔ پریشانی کی ایک لہر سی اُس کے سر سے پاؤں تک ہوکر گزر گئی۔ ''ہوسکتا ہے بہت مصروفیت رہی ہو۔'' اب کے زفیرہ نے نمبر ملا لیا۔ دوسری جانب مسلسل رِنگ ہورہی تھی مگر کوئی اُسے اٹینڈ کرنے کو ملتفت نہیں تھا۔ زفیرہ کی پریشانی سوا ہوچکی تھی۔ ''اگر گوندل سے رابطہ نہ ہوا تو!!'' ...... اِس سے آگے سوچنا زفیرہ کے لیے محال ہورہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر کال دہرائی مگر وہی صورتحال ۔زفیرہ احمد نے گوندل کو ٹیکسٹ بھیجا...... ''ویری ارجنٹ'' اور فون میز پر پھینک کر سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اُسی لمحے میز پر پڑا ہوا سیلولر فون وائبریٹ کرنے لگا۔ زفیرہ نے جلدی سے فون اُٹھایا مگر ڈیپریشن کی ایک اور لہر۔ کوئی اجنبی نمبر۔ زفیرہ نے اسے بند کرنے کی بجائے کپکپانے کے لیے چھوڑ دیا۔ فون جب ایک بار بند ہوکر دوبارہ اور پھر مسلسل وائبریٹ ہونے لگا تو زفیرہ نے اٹینڈ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ دوسری جانب گوندل تھا۔

۞

﴿۴۳﴾

''بڑے صاحب کو آخر بتایا کس نے کہ وہ اِدھر میرے پاس، میرے گھر میں، مجھے سمجھانے کے لیے آرہا ہے؟'' ___ سردار محبوب اپنے محل نما گھر کے مین لاؤنج میں غصے سے پاگل ہوا، شدتِ اضطراب میں تیز تیز قدموں کے ساتھ اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا جب کہ اَنصر ٹو پیس پینٹ کوٹ پہنے پسینے سے بھیگی پیشانی لیے اُس کے روبرو جوابدہی کے انداز میں کھڑا تھا۔

''سردار صاحب! یقین کریں میں نے اُنہیں ماہین تو کیا کسی بھی سلسلے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ میرا آج کے دن اُن سے کسی قسم کا کوئی رابطہ ہوا ہے، میں صرف زفیرہ کے پاس گیا اور اُسے شام ساڑھے پانچ کا الٹی میٹم دینے کے بعد واپس اپنے آفس میں لوٹ آیا...... سرکار! میری تو جاب ہی آپ کے یقین اور اعتماد سے چلتی ہے، اگر وہی نہیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔'' اَنصر اپنے باس کو یقین دلانے کی پوری کوشش کررہا تھا مگر اُس کے چہرے پر سچائی صاف جھلکنے کے باوجود سردار محبوب کھلی تشکیک کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔

''تو کیا یہ بات زفیرہ نے بڑے صاحب کو پہنچائی ہوگی؟'' ...... یہ جملہ سردار محبوب نے کچھ اِس قدر کڑواہٹ کے ساتھ بولا کہ اُس کی باچھوں کے کناروں سے جھاگ بہتی جھا نکلنے لگی تھی۔

''سردار صاحب! یہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی...... ہو اِس لیے سکتا ہے کہ زفیرہ احمد اور بڑے صاحب کا ایک عرصے تک آپس میں بہت قریبی تعلق رہا ہے جو تین مہینے پہلے اُس کی ویڈیو اَپ لوڈ کرنے پر ختم ہوا۔ اب یہ عورت، عورت پر منحصر ہے کہ چاہے تو اِس جھگڑے کو کھینچ

کرر بڑ بنالے اور اگر نہ چاہے تو کسی بھی وقت ختم کر لے۔''

''اُو چوتیے! زفیرہ نے تو آج کل دانش سعید کو قابو میں کیا ہوا ہے؟''

''آپ سے زیادہ عورت کو کون جانتا ہے سردار صاحب! اِس مخلوق کا کیا اعتبار؟ صبح اگر وہ دانش سعید کے ساتھ تھی تو ضروری نہیں کہ آج کی شام بھی اُسی کے ساتھ رہے۔'' سردار محبوب کے چہرے کے بدلتے تاثرات سے لگا کہ اَنصر کا یہ جملہ اُس کے دل کو لگا ہے۔ ابھی وہ اِس کے جواب میں کوئی بات کہنا چاہتا ہی تھا کہ لاؤنج میں بڑا صاحب اپنے دو معتمدین کے ساتھ داخل ہوا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرے پر کتنے ہی شکووں اور کتنی ہی شکایتوں کے تاثرات۔ اُس نے وہاں آتے ہی پیچھے مڑ کر اَنصر سمیت سبھی معتمدین کی طرف مخصوص انداز میں دیکھا۔ اَنصر نے فوراً سردار محبوب کی آنکھوں میں دیکھا جہاں اب بھی سوائے غصے کے اور کچھ نہیں تھا، حتیٰ کہ کوئی پیغام بھی نہیں تھا۔ اُن سب نے مزید کچھ دیکھے بغیر لاؤنج سے باہر جانا شروع کر دیا تھا۔ بڑا صاحب سردار محبوب کے سامنے آیا اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ دیے۔

''سردار محبوب! حوصلہ...... حوصلہ!''

''ناں بڑے صاحب! آپ کون ہوتے ہو مجھے حوصلے کا کہنے والے۔'' سردار محبوب اپنے کندھوں سے بڑے صاحب کے ہاتھ جھٹک کر ایک طرف ہو گیا۔ بڑے صاحب نے سردار محبوب کو پیار سے دیکھا اور مسکرا دیا۔

''میرے بھائی! میرے سردار! ہم دونوں مظاہر ہیں اِس سیاسی گدی کے کہ جس کے آپ وارث ہو، مالک ہو اور میں اس کا منتظم، خادم ...... بس آپ غصہ نہیں کرو! وہ لڑکی رات سے پہلے اِدھر ہو گی، اِدھر آپ کے قدموں میں۔''

''لیکن آپ کو کس نے کہا ہے کہ آپ تکلیف کریں میرے لیے ...... آپ وزیر ہو تو اپنی جگہ لیکن میری طاقت آپ کی وزارت سے زیادہ ہے اور وہ لڑکی! وہ لڑکی میرے لیے مسئلہ نہیں! اُس نے تو آج رات ویسے بھی اِدھر ہی ہونا ہے۔ اُس بھین یک اَنصر نے آپ کو اطلاع کر کے ویسے میرا وقت خراب کیا ورنہ اب تک وہ کتے کی بچی یہاں ٹاؤں ٹاؤں کر رہی ہوتی

میرے قدموں میں۔'' سردار محبوب کے لہجے کی تلخی ابھی تک جا نہیں رہی تھی، جوں کی توں تھی۔ بڑے صاحب نے بہت پیار سے اُس کا بازو تھاما اور لاؤنج میں ایک جانب رکھے ہوئے آرام دہ صوفے کی سنگل سیٹ پر بٹھانے کے بعد خود ایک کرسی گھسیٹ کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''میں مانتا ہوں میرے سردار! جس گدی پر آپ بیٹھے ہو اس کی طاقت بہت زیادہ ہے، میں بھی اگر آج وزیر ہوں تو اِسی گدی کا خادم ہونے کی وجہ سے، میں تسلیم کرتا ہوں کہ اُس ماڈل لڑکی کو اُٹھوانا بھی آپ کے بائیں ہاتھ کا ہی نہیں محض بائیں انگلی کا کھیل ہے لیکن ہر کھیل کے کچھ اصول ہوتے ہیں، اُن اصولوں سے ہٹ کر اگر کھیلیں تو یونہی مفت میں ناکردہ بھی گلے پڑ جاتے ہیں اور بدنامی اِس سے سوا۔''

''رہنے دو بڑے صاحب! اَب آپ مجھے سیاست کے کھیل کے اصول سکھاؤ گے! ہمارے امیر قادر بخش کی قبر نہ ہل جائے گی؟ آپ جاؤ منسٹری انجوائے کرو! ویسے بھی اب دو چار دن کی رہ گئی ہے۔''

''میرے سردار! ابھی بہت پڑی ہے یہ منسٹری___ میں نے گیم فِٹ کر لی ہے الیکشن ملتوی کرانے کی___ جہاں جہاں جو جو چاہیئے تھا، پہنچا دیا گیا ہے___ بس ایک بہت بڑا واقعہ ہونا ہے اور پھر الیکشن اگلے حکم تک ملتوی (سرگوشی کے سے انداز میں) اصل گیم یہاں تک نہیں بلکہ کچھ اور ہے، اصل گیم یہ ہے کہ میں نے اپنے سردار کو الیکشن لڑا کر اپنے صوبے کا چیف منسٹر بنانا ہے۔ بس بات صرف یہ طے ہونی ہے کہ جب تک میرے سردار کی سی ایم شپ کی گوٹیاں سیدھی نہیں ہوں گی، اِس ملک میں الیکشن نہیں ہو گا___ لیکن جب تک سیاسی گیم سیدھی نہیں ہوتی اُس وقت تک دھیرج دھرنا اور حوصلہ رکھنا ہو گا! بس جو بھی کرو گیم کے اصولوں کے مطابق کرو___ طاقت کی بجائے ذہن کا استعمال اور یہی بات سمجھانے آیا ہوں۔'' لیکن بڑے صاحب کی بات سن کر سرادار محبوب کے چہرے کے تیور اور بھی بگڑ گئے۔

''اپنے پاس رکھو اپنی چیف منسٹری بڑے صاحب! مجھے نہ دو لالچ کہ اِس کے پیچھے میں اپنا اسٹائل بھی برباد کروں___ میں کل پر یقین نہیں رکھتا بلکہ جو آج ہے اُسی میں کھل کھیلتا ہوں___ آپ جانتے تو ہو کہ میں زندگی بھر کبھی اسٹیٹس کے پیچھے نہیں بھاگا، ہمیشہ دل کا پیچھا

کیا ہے___ماہین نے جو چوٹ مجھے لگائی ہے وہ سیدھی دل پر لگی ہے، اُس کا بدلہ لیے بغیر میں نہیں ٹلنے والا۔'' یہ کہہ کر سردار محبوب صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی باتوں میں آیا ہوا چڑ چڑا پن اُس کی گفتگو کو مسموم کیے چلا جا رہا تھا۔ شدتِ غیض سے اُس سے اپنی بات ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھی۔

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے کہاں طاقت سے کام لینا ہے اور کہاں ذہن سے اور رہی بات اصولوں کی تو اصول وصول چوتیے لوگ بناتے اور چوتیے ہی اِن کے مطابق چلتے ہیں۔'' سردار محبوب کا بدن اب کے کپکپانے لگا تھا۔ بڑے صاحب نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر دوبارہ صوفے پر بٹھا لیا مگر محبوب نے ناگواری سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ لیکن اِس کے باوجود بڑے صاحب کے رویے میں جہاں لجاجت آمیز شفقت تھی وہیں اُسے اِس حالت میں تنہا نہ چھوڑنے کا عزم بھی تھا۔

''چلو اِس بات کو ہم ایک اور طریقے سے دیکھتے ہیں۔ جنت مکانی بڑے امیر قادر بخش خان نے زندگی میں کیسے کیسے کام نہ کیے۔ نا قابلِ یقین۔ چاہے بزنس ہو، سیاست ہو، عورت ہو یا دشمن داری، یہ معاملات وہ کبھی غصے میں یا رات کو پینے کے بعد ڈیل نہیں کیا کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہو گا محبوب کہ وہ کیا کہا کرتے تھے؟'' بڑے صاحب نے بات آگے بڑھانے کے لیے سردار محبوب کی طرف دیکھا مگر اُس نے نگاہیں ملانے سے کتراتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''وہ کہا کرتے تھے کہ دشمن کو غصے سے نہیں مارا جاتا، دشمن کو غصہ دلا کر مارا جاتا ہے اور تمہیں وہ دن بھی یاد ہو گا کہ جب قریشیوں کو کنگال کر کے اسلام آباد سے نکالا تھا تو کیا کہا تھا! یہی کہا تھا ناں کہ دشمن کو مارنا ہو تو اُسے ملزم بن کر نہیں مدعی بن کر مارو اور یاد کرو سینٹ کے وہ غیر جماعتی الیکشن کہ جب پولنگ والے دن ایک ہی جھٹکے میں اکٹھی نو سیٹیں خرید کر کیسا شاندار گروپ بنایا تھا تو کیا کہا تھا! کہا تھا ناں کہ دشمن کو مارنا ہو تو اُسے اُس کے وجود سے نہ مارو، ذہن سے مارو، وجود سے خود بخود مارا جائے گا۔ تو میرے سردار! ایسے امیر کی پگ کے وارث ہو کر بھی ایک گشتی کے لیے مدعی سے ملزم بننا چاہ رہے ہو؟''...... بڑے صاحب نے دیکھا کہ

محبوب کے چہرے کا تناؤ ایک دم کچھ کم ہوا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں بھی اب تشدد کی بجائے تدبر کی کرن پھوٹنے کے امکانات ظاہر ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

''دیکھ میرا وعدہ ہے اپنے سردار سے! وہ کتے کی بچی آج رات، اِسی جگہ تمہارے قدموں میں اِس طرح ہو گی کہ نہ تو کہیں کوئی پتا ہلے گا اور نہ ہی کسی میڈیا ہاؤس سمیت کسی دشمن کو کوئی خبر ہو گی، اُس کے بعد تو بے شک اُس کے ٹوٹے کر یا قیمہ کر کے کتوں کو کھلا، یہ تیری اور تیرے انتقام کی صواب دید۔ بس ابھی غصہ نہ کر، ہاتھ جوڑتا ہوں تیرے آگے۔ اُس گشتی نے تو کل کا سورج نہیں دیکھنا لیکن میرے سردار نے ابھی دیکھا کیا ہے، ابھی تو حکمرانیاں کرنی ہیں حکمرانیاں۔''

سردار محبوب غصے کی لہر اترنے کے ساتھ ساتھ ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اب حدت کی ایک لہر بڑے صاحب کے بدن میں لہرانی شروع ہو رہی تھی۔ لگ رہا تھا کہ سردار محبوب نے اُس کا بھرم رکھ لیا ہے۔ پھر بھی یقین کرنے کے لیے اب کے وہ خود اُٹھ کھڑا ہوا اور سردار محبوب کو بھی اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

''میرے سردار! آپ نے بڑے بھائی پر ہی نہیں بلکہ اِس ایمپائر پر اعتماد کیا ہے کہ جس کے آپ وارث ہو۔ اور یقین رکھو کہ دنیا کے تمام کیلنڈر اُس وقت تک آج کی تاریخ نہیں بدلیں گے کہ جب تک وہ حرامزادی گشتی اِدھر، اِس فرش پر تمہارے قدموں میں نہیں ہوتی۔''

سردار محبوب نے پہلی بار بڑے صاحب کی آنکھوں میں غور سے جھانکا جہاں نمی سی اُترنے لگی تھی۔ اُس کے ہاتھ ابھی تک بڑے صاحب کے ہاتھوں میں تھے۔ بڑے صاحب سے شاید اُس کا یوں دیکھنا دیکھا نہ گیا تبھی تو فرطِ جذبات سے ایک بار پھر سردار [illegible] سے لگا لیا۔

۞

﴾۴۴﴿

زفیرہ احمد کو بھی بھارہ کہو سے سملی ڈیم جانے والے راستے پر پڑنے والے کئی دیہاتوں میں سے ایک دیہات میں آبادی سے قدرے ہٹ کر تعمیر کیے گئے قلعہ نما فارم ہاؤس کے ایک پرتعیش کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ماہین کو آئے ہوئے ابھی دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے۔ ماہین کو اپنے گھر سے یہاں شفٹ کیے جانے سے پہلے زفیرہ احمد نے فون پر صرف اتنا بتایا تھا کہ ایک اسلام آباد نمبر کی سیاہ پراڈو اُسے لینے کے لیے بھجوائی جارہی ہے بس وہ کوئی بھی سوال جواب کیے بغیر فوری طور پر ڈرائیور کے ساتھ وہاں چلی جائے کہ جہاں وہ لے جانا چاہے۔

ماہین پریشان تو ہوئی لیکن یہ سب کچھ اُس کے لیے کوئی زیادہ تشویشناک اِس لیے نہیں تھا کہ جو بھی تھا وہ براہ راست زفیرہ احمد کے کنٹرول میں تھا یا ایسا ہونا اُسے دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے منزل پر پہنچ کر زفیرہ احمد سے رابطہ کیا تو پھر بھی اتنا ہی بتایا گیا کہ وہ گوندل کے ہمراہ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ کر پوری تفصیل بتاتی ہے۔ قلعہ نما فارم ہاؤس میں پہنچ کر جس چیز کا احساس پہلی نگاہ میں ہوتا تھا وہ وہاں کی اندرونی اور بیرونی سیکورٹی کا مناسب سے زیادہ بندوبست تھا۔ زفیرہ گوندل سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ یہ بندوبست اُس کی درخواست پر کیا گیا ہے یا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے مگر پوچھ نہیں پائی کہ اِس موضوع پر گوندل کا کرید ے جانا مناسب نہیں تھا۔ وہاں پہنچتے ہی گوندل نے زفیرہ احمد کو ماہین کے کمرے کی راہ دکھائی اور خود اُس کے مقابل بنے ہوئے بلاک کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں آتے ہوئے وہ زفیرہ احمد کو بتا چکا تھا کہ

اپنے باس کو اعتماد میں لینے کے بعد اب وہ اگلی صبح تک اُن کی ڈسپوزل پر ہے۔ زفیرہ نے بھی اُسے بتا دیا کہ ماہین سے کچھ فوری نوعیت کے معاملات طے کرنے کے بعد وہ اُسے فون کرتی ہے۔

بہت سی باتوں اور درپیش بہت سے عذابوں کا بوجھ ذہن پر لادے وہ ماہین کے کمرے میں داخل ہوئی تو اُن دونوں کے لیے خاصی پرتکلف چائے ٹیبل پر لگائی جارہی تھی۔ اِن دونوں نے ایک دوسرے کی طرف تھکی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، رسماً مسکرائیں اور ملازم کے جانے کا انتظار کرنے لگیں۔ زفیرہ احمد کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر ملازم نے چائے بنانا شروع کر دی اور لوازمات وہیں ٹرالی میں رہنے دیے۔ فطری طور پر اُتاول میں مبتلا دونوں خواتین نے ملازم کو گھور کر دیکھا مگر وہ بظاہر اُن کی عجلت سے بے نیاز اطمینان سے چائے بنانے میں لگا تھا۔ چائے کے بنائے جانے نے طول پکڑا تو زفیرہ نے اُسے چائے بنا کر فوری باہر جانے کو کہا۔ ماہین، جو خود اب خاصی حد تک پرسکون ہو چکی تھی، زفیرہ کے اضطراب پر مسکرا دی۔

جونہی ملازم باہر نکلا زفیرہ نے خلاف توقع گفتگو آغاز کرنے میں اتنا تامل ضرور کیا کہ کہیں چائے میں چمچہ ہلاتے ہوئے اُسے اپنے کپڑوں پر نہ گرا لے لیکن ماہین کے لیے یہ تامل کنفیوژن کا باعث ہونے لگا تھا اِس لیے فوراً بول پڑی کہ ”میڈم بس اتنا بتا دیں کہ آج کے اتنے اہم دن کس مہان ہستی نے مجھے آپ کے گھر سے نکلوایا؟ جب پولیس سے جان چھوٹ چکی تھی تو پھر یہ کون میرے پیچھے پڑ گیا کہ جس نے آپ کو بھی ڈرا دیا۔“

”مگر پولیس سے کب جان چھوٹی تمہاری؟“...... زفیرہ نے حیران ہو کر ماہین کی طرف دیکھا۔

”رہنے دیں میڈم! آپ کا اور میرا رشتہ ہی کچھ ایسا بن چکا ہے کہ اب بہت سی باتوں کا بھرم رہنے دیا جائے تو اچھا ہے__ بس اتنا جان لیں کہ وہ آپ کے وکیل صاحب کی فائل میں نے انہی دنوں دیکھ لی تھی۔“ ماہین کے چہرے پر مسکراہٹ تو تھی مگر کوئی طنز کوئی شکوہ کہیں بھی نہیں تھا۔ جب کہ زفیرہ احمد کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا مگر اُس نے محسوس نہیں ہونے دیا۔ ماہین کی جانب سے بولے گئے اِسی ایک جملے کے سبب وہ اُس سے آنکھیں

نہیں ملا پا رہی تھی۔ خفت کا بوجھ پہلے سے طوفان بنے اضطرابوں پر حاوی دکھائی دینے لگا تھا۔ ماہین سے نہ دیکھا گیا۔ وہ اُٹھی اور صوفے پر بیٹھی زفیرہ کو لپٹا لیا۔

''کتنا کچھ کیا ہے آپ نے میرے لیے اور وہ بھی کیسے کیسے حالات میں؟ کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے مجھے؟ ایک گمنام لڑکی کو سپر ماڈل بنا دینا کوئی کم احسان ہے کیا؟ یقین جانیں میں نے آپ کے گھر کی کسی چیز کو نہ تو کریدا اور نہ کھنگالا۔ یہ فائل نجانے آپ کیسے صوفے پر چھوڑ گئی کہ جس پر میرا نام لکھا تھا تو مارے تجسس کے سب دیکھ لیا، سب پڑھ لیا۔'' ماہین نے زفیرہ احمد کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا مگر وہ اب بھی اُس سے نگاہیں نہیں ملا پا رہی تھی۔

''چلیں چھوڑیں اِس قصے کو۔ آپ یہ بتائیں اب کون سے حرامی کا میں نے کیا اُکھاڑ لیا ہے جو اُسے تکلیف ہو رہی ہے؟''...... ماہین نے یہ جملہ کچھ اِس انداز میں کہا کہ زفیرہ کو اُسے حیرت سے دیکھنا پڑا۔ یہ کون سی زبان اور کون سا لہجہ تھا جو ایک نفیس سی لڑکی کی زبان کو آلودہ کر گیا تھا۔

''بتائیں ناں میڈم کہ معاملہ کیا ہے؟''...... اور اگلے تین چار منٹ میں زفیرہ احمد ماہین کو پوری روداد بتا چکی تھی۔

''مگر میں کسی سردار محبوب کو نہیں جانتی۔'' ماہین نے سر کو صوفے کی پشت سے ٹکا کر ماضی میں گہرائی تک اُترنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ''اور ہاں وہ دوسرا نام کیا بتایا اُس غنڈے کا جو آپ کے پاس سردار محبوب کا پیغام لے کر آیا تھا؟''...... ماہین ایک بار پھر زفیرہ کو غور سے دیکھنے لگی تھی۔

''اَنصر......۔''

''اِس نام کا ایک پالتو تو نیئر جمیل کے پاس بھی تھا۔ لمبا سا قد اور چوڑی گھنی مونچھیں۔ شکل سے ہی حرامی لگتا تھا۔'' ماہین صوفے پر بیٹھے بیٹھے آگے کی جانب جھک آئی تھی۔

''کچھ ایسے ہی تھا......۔''

''مگر وہ تو نیئر جمیل کے پاس......''

''تمہارے پاس تصویر ہے موبائل میں نیئر جمیل کی!''...... زفیرہ نے ماہین کی بات

کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہونی چاہیئے۔ ہونی چاہیئے کیا! یقینی ہوگی'' ماہین نے تیزی سے اپنے سیلولر فون کی گیلری چیک کرنا شروع کر دی تھی لیکن کافی دیر کی سرچ کے بعد بھی اُسے کچھ نہیں ملا۔

''ہاں یاد آیا...... وہ حرامی تو جاتے ہوئے ہمیشہ میری میموری کلین کر کے جایا کرتا تھا۔''

ماہین کے چہرے پر ایک دم تاسف کے تاثرات گہرے ہو چلے تھے۔

''آپ کے پاس سردار محبوب کی تصویر ہے؟''......

''آں ہاں......۔''

زفیرہ نے ماہین کی بات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ گوندل کا نمبر ملانا شروع کر دیا تھا۔

''گوندل! مجھے سردار محبوب کی تصویر چاہیئے......جی ابھی......واٹس ایپ کر دیں۔''

دونوں میں اُس وقت تک کوئی گفتگو نہ ہوئی کہ جب تک زفیرہ کے فون سے واٹس ایپ میسج کی بیپ نہ سُنائی دی۔ زفیرہ جلدی سے اپنا واٹس ایپ فولڈر کھولنے لگی اور ماہین اُسے ایسا کرتے ہوئے بغور دیکھنے لگی۔ دونوں کے چہروں پر اضطراب اور تجسس پوری شدت سے پلٹے پڑے تھے۔

''ارے! یہ تو وہ کمینہ مبشر رضا ہے!''...... زفیرہ احمد کے چہرے کا تجسس حیرت اور پریشانی میں بدل رہا تھا۔

''مبشر رضا کون؟''...... ماہین بھی حیران ہو رہی تھی۔

''یہ میرے پاس کمپنی میں کاپی اور کانسیپٹ (concept) رائٹر تھا۔ بہت ذہین، اِس کا نام ہی بکا کرتا تھا۔ پھر ایک روز یہ اچانک غائب ہو گیا اور میں بڑے صاحب کے ہاتھوں اِس کی گمشدگی کی سازش کا شکار ہو گئی۔''

''سازش کا شکار؟''...... ماہین کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

''میں بتاؤں گی تمہیں، لمبی کہانی ہے...... فی الحال تم اِس کی شکل دیکھو۔'' زفیرہ احمد نے جیسے موبائل فون ماہین کی طرف بڑھایا گوندل کی کال آ گئی۔ وہ واٹس ایپ پر سردار محبوب

کی تصویر کا موصول ہونا کنفرم کرنا چاہ رہا تھا۔

''are you sure یہ سردار محبوب ہی ہے؟''

''am hundred percent sure یہ سردار محبوب ہی ہے۔'' گوندل کی جانب سے اتنے تیقن کے ساتھ جواب نے شبہات کے سارے امکانات ختم کر دیے تو زفیرہ احمد بجھ کر رہ گئی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اُس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ کر نہایت تیزی کے ساتھ کہیں گر رہا ہے۔ اُس نے بازو کھول کر موبائل ماہین کی طرف بڑھا دیا۔ گوندل کی کال ختم ہو چکی تھی اور اسکرین پر پھر سے سردار محبوب کی تصویر آ چکی تھی۔ جونہی ماہین کی نگاہ تصویر پر پڑی، وہ بھی اُچھل پڑی۔

''میم! یہ تو نیئر جمیل ہے۔''

''مجھے کوئی حیرت نہیں ہو گی کہ کل کو یہی شخص امریکہ کا صدر بھی نکل آئے تو......؟''

زفیرہ کے لہجے میں اب بھی غیر یقینی تھی۔

''میم! لیکن یہ نیئر جمیل جس سے میری دوستی رہی ہے، وہ تو اتنا بڑا گینگسٹر نہیں ہو سکتا کہ جتنا بڑھا چڑھا کر آپ بتا رہی ہیں ___ وہ تو احساس کمتری کا مارا ہوا ایک معمولی سا چوہا جو اکڑتا تو ہے لیکن جوتی کے ایک وار سے بھاگ جاتا ہے۔''

''لیکن جس کا الٹی میٹم مجھے ملا ہے وہ سردار محبوب ہے، اُسے چوہا سمجھنے کی غلطی میں تو نہیں کر سکتی۔ میں نے تو سر سے پاؤں تک بھگت رکھا ہے بڑے صاحب کو بھی کہ جو اِس بے حد بااثر اور بہت بڑے سیاسی خاندان کا محض ایک کارندہ ہے۔''

''تو کیا مجھے اُس کے حوالے کر دینا ہے؟''...... ماہین نے پہلی بار شک آلود آنکھوں سے زفیرہ کو دیکھا۔

''اگر حوالے کرنا ہوتا بے بی تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں تو اپنے گھر میں بیٹھی ہوتی!''...... لگ رہا تھا کہ جیسے زفیرہ بھی ماہین کی بات سے رنجیدہ ہوئی تھی۔ ایک بار پھر دونوں کچھ دیر تک خاموش اور بے دھیانی میں سامنے رکھی میز کو دیکھتے رہے۔

''دیکھیں میم! آپ ایک اتنے بڑے سیٹ اپ کی مالک ہیں کہ جس سے سینکڑوں

لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔ ملک کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی مہ نور کی چیف ایگزیکٹو ۔ مجھے بتائیں آپ کتنے دن تک میرے ساتھ چھپ کر یا مجھے چھپا کر کمپنی چلا سکتی ہیں؟ ایسے تو کوئی عام آدمی بھی ایک دن نہیں گزار سکتا ...... آپ مجھے اُن لوگوں کے حوالے کریں، وہ جو بھی ہیں...... میں خود دیکھ لوں گی کہ وہ میرا کیا کرتے ہیں؟''...... ماہین نے اتنی ساری باتیں زفیرہ سے آنکھیں ملائے بغیر کہہ دیں۔

''ماہین! میں نہیں جانتی کہ تم یہ سب باتیں میری کسی بات سے ناراض ہو کر ردعمل میں کر رہی ہو یا واقعی ایسا کرنا چاہتی ہو لیکن میں تمہیں اُن کے حوالے نہیں کر سکتی۔ میں فائٹ کروں گی آخری سانس تک کیونکہ میں جانتی ہوں وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔ ادھر ہم اِس لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ تھوڑا ٹائم گین کرتے ہوئے کوئی موثر پلاننگ کر سکیں...... باقی رہی کمپنی تو کمپنی کہیں نہیں بھاگی جا رہی ...... کل اگر مجھے ہائی کورٹ تک پہنچنا پڑا تو پہنچوں گی اور ضرورت ہوئی تمہیں کسی بڑے چینل پر براہ راست آن ائیر لائیں گے۔ میں نے آفس کے سی سی ٹی وی کیمرے سے اَنصر کی دھمکیوں کی فوٹیج نکال لی ہے۔''

ماہین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ زفیرہ کا چہرہ اُسے دھندلا ہوتا دکھائی دیا تو اُس نے اپنا سر اُس کی گود میں رکھ دیا۔ زفیرہ نے ماہین کے سر کے بالوں پر ہاتھ رکھ کر اُن میں انگلیاں کیا پھیریں، اُس کی آنکھوں سے جھڑی برسنے لگی۔

۞

﴿۴۵﴾

دانش سعید حیران تھا کہ شام ڈھلے اُسے اُس کے سب سے بڑے سیاسی اور کاروباری حریف ''بڑے صاحب'' نے خودفون کر کے آج اور اسی وقت سول سیکریٹریٹ میں واقع اپنی وزارت کے دفتر میں چائے کی دعوت دی تھی۔ اُس بلیک ہاؤنڈ کی جانب سے پیشکش یہ بھی تھی کہ اگر دانش سعید وہاں نہ آنا چاہیں تو اپنی پسند کا وینیو بتا دیں، تجارت اور داخلہ کا وفاقی وزیر وہیں حاضر ہو جائے گا۔ کاروباری دشمنی کی ایک طویل فہرست کے ہوتے ہوئے بھی پہلی ملاقات کے لیے پہل کرنے کے سبب دانش سعید نے آدھے گھنٹے بعد سیکریٹریٹ آفس میں پہنچنے کی حامی بھر لی۔ اِس ملاقات کی غرض وغایت سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی صاف ظاہر تھا کہ بلیک ہاؤنڈ یقیناً کسی بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے اور اگر یہ نہ بھی ہوتو پھر بھی دانش سعید جیسا قومی سطح کا ایک بڑا بزنس مین کیوں نہیں چاہے گا اُسے اُس کی وزارت کا وزیر خودفون کر کے اِس طور ملاقات کی درخواست کرے اور وہ اُس کا سب سے بڑا مخالف ہوتے ہوئے بھی اُسے شرف قبولیت بخشے۔

سیکریٹریٹ جاتے ہوئے دانش سعید مسلسل اِسی سوچ میں گم تھا کہ عبوری وزارت کا حلف اُٹھانے سے پہلے بلیک ہاؤنڈ نے اُس کی سپورٹس گاڑیوں کی پہلی درآمدی کھیپ کی آمد رکوانے کے لیے کیا کیا سازشیں نہیں کی تھیں۔ اِس معاملے میں پہنچنے والی زک کا بدلہ اگرچہ دانش سعید نے مہ نورایڈورٹائزنگ کو بڑے صاحب کے چنگل سے بچا کر لے لیا تھا مگر پارٹی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کے درمیان نئی مخاصمت کا آغاز الیکشن کے بعد نئی حکومت کے

حلف اُٹھاتے ہی شروع ہو جاتا تھا۔ لیکن افواہیں گرم یہ تھیں کہ ملک میں نگران حکومت کو طول دے کر ''پہلے احتساب'' کا نعرہ لگانے پر غور شروع ہو چکا تھا۔ دانش سعید کو اپنے سب سے بڑے کاروباری حریف سے پہلی بار بالمشافہ ملنے میں کم وبیش اُسی صورتحال کا سامنا تھا کہ جو کسی من چاہے محبوب سے پہلی ملاقات سے پہلے درپیش ہوتی ہے۔ ''بھڑوے نے یقیناً مجھے اُلٹی اڑنگی لگانے کے لیے بُلایا ہوگا کہ نہ تو پھنسا رہ سکوں اور نہ نکل سکوں۔''

دانش سعید کا رہا سہا سکون اُس وقت غارت ہو گیا کہ جب بڑے صاحب نے اُسے اپنے آفس کے باہر آ کر ریسیو کیا اور ہاتھ پکڑ کر انتہائی محبت سے اندر لے گیا۔ ایک کونے میں رکھی صوفہ نما کرسیوں پر پرخاصی قربت میں بٹھانے کے بعد ایک دوسرے سے خیریت تو رسماً پوچھی گئی جب کے مطلب کی بات کا آغاز چائے کے پیش کیے جانے کے بعد ہوا۔ بڑے صاحب نے پہلے تو دانش سعید سے براہ راست کسی لگی لپٹی کے بغیر انتہائی عاجزی سے کام کی نوعیت بتائے بغیر ذاتی طور پر مدد کی درخواست کی لیکن اِس خواہش کے ساتھ کہ اِس ذاتی درخواست کو اب تک کی تمام کاروباری رنجشیں بھلا کر کھلے دل سے دیکھا جائے گا۔ دانش سعید نے بڑے صاحب جیسے متکبر شخص کو دو دو وزارتوں کے ہوتے ہوئے بھی یوں بے بس پایا تو سمجھ گیا کہ وہ کہیں بہت بری طرح پھنس چکا ہے۔ لین دین اور کاروبار کے اصولوں کے موجب اب موقع تھا کہ اُسے ٹھیک ٹھاک رگید کر زیادہ سے زیادہ وصولنے کی کوشش کی جائے۔ دانش سعید کی نگاہ اگر چائے کی پیالی کی گہرائی میں گھوم رہی تھی تو بڑے صاحب کی نگاہ اُس کے چہرے پر تھی کہ سب سے بڑے مخالف کی طرف سے یوں منت زاری کیے جانے کے بعد وہاں کس قسم کی بارگین کا کس قدر ردم خم ظاہر ہونے لگا ہے۔

''آپ کام بتایئے؟''...... دانش سعید نے فاتحانہ انداز میں چائے کی چسکی لے کر اپنے تئیں بڑے صاحب کو تاثراتی بلف کرانے کی کوشش کی۔

''ماہین کو واپس کر دیجئے لیکن آج کی تاریخ میں۔'' بڑے صاحب کے لہجے میں لجاجت، منت اور حاکمیت ایک ساتھ در آئی تھیں۔

''ماہین کون ......؟'' دانش سعید نے حیران ہو کر بڑے صاحب کی طرف دیکھا۔

''اب جانے بھی دیں غصہ! میں نے سیکریٹری کامرس کو بٹھایا ہوا ہے آپ کی فائل نکالنے کے لیے وہ اسپورٹس گاڑیوں والی ...... اب پہلی کھیپ بے شک کل منگوالیں۔'' بڑے صاحب نے بے تکلفی سے دانش کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''سچی بات ہے بڑے صاحب! میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

''آپ نے زفیرہ احمد کے ساتھ جس ماڈل لڑکی کو اپنے سملی ڈیم والے فارم ہاؤس میں چھپا رکھا ہے ...... وہ ماہین۔'' بڑے صاحب کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل کر جم چکی تھی۔ دانش سعید کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو کر رہ گیا، بس فکر کے ساتھ چائے کے سِپ لیتا رہا۔ ایسے میں بڑے صاحب کو پھر بات کرنے کا موقع مل گیا۔

''میرے خیال میں گوندل نے آپ کو لڑکی کا نام نہیں بتایا ہوگا، بس زفیرہ کا بتایا ہوگا۔''

دانش سعید نے اب کے چائے کی پیالی ایک طرف رکھ دی۔ ''بڑے صاحب! ایک طرف آپ انٹیریر منسٹر، ساری پولیس اور خفیہ والے آپ کے انڈر، آپ سے بھلا کون چھپ سکتا ہے؟ آپ چاہیں تو ابھی فورس استعمال کر کے ایک لڑکی تو کیا اُس کی سات پشتوں کو قبروں سے نکلوالیں مگر پھر بھی حیرت ہے کہ آپ مجھے مدد کرنے کو کہہ رہے ہیں، ایک پناہ دینے والے ملزم سے درخواست کر رہے ہیں ...... واقعی آپ بڑے صاحب ہیں۔''

''میں سمجھ گیا ...... آپ گاڑیوں کی ایک کھیپ کی بجائے دو منگوالیں اور ابھی آرڈر لیتے جائیں۔'' بڑے صاحب کی نگاہیں بدستور دانش کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

''بڑے صاحب! کیا کروں پناہ کی زبان دے بیٹھا ہوں اور وہ بھی ایک عورت کو۔ معاملہ میری ذات کا ہوتا تو دوسری بات نہ سنتا اور نہ کرتا، سیدھا آپ کے قدموں میں لا پھینکتا۔'' دانش سعید کے چہرے سے بے بسی ہویدا ہو چلی تو اُس نے آنکھیں ملائے رکھنے کی بجائے جھکا لیں۔

''زبان تو ہم نے بھی دے رکھی ہے سردار محبوب بخش جیسے فقیر منش کو۔ اُس کی فقیری تو دیکھیں کہ امیر قادر بخش کی امپائر کا مالک ہوتے ہوئے بھی نہ تو کبھی کسی کے سامنے آیا اور نہ کسی کو بے جا پریشان کیا۔ لیکن اگر کوئی گشتوڑی اُس فقیر کا گریبان تار تار کر کے آپ جیسی ہستی سے

پناہ لے بیٹھے تو ہم جیسے فقیر کس کے پاؤں پکڑیں؟ ___ دانش صاحب آپ ایسا کریں کہ گاڑیوں کی تینوں کھیپ اکٹھی منگوالیں ___ ہاتھ اِدھر کریں، اب ملا بھی لیں ہاتھ ہم سے، آپ بھی کیا یاد کریں گے ہماری دوستی کو ___ ایسا ریلیف تو آپ منسٹر بن کر بھی خود کو نہیں دے سکتے تھے۔'' بڑے صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر دانش سعید کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبا دیا۔

''کہاں بھجوانا ہے اُس لڑکی کو؟'' ___ دانش سعید کا چہرہ کھلنے کو بے قرار مگر بظاہر مضطرب دکھائی دینے کی جستجو میں تھا۔

''یہ ہوئی ناں بات ___ پہلے آپ اپنے آرڈر کی کاپی وصول کر لیں پھر بتاتا ہوں کہ لڑکی کو کہاں بھجوانا ہے۔'' اب بڑے صاحب کا چہرہ فتح یابی کی چکا چوند سے دمک اُٹھا تھا۔ اُس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا انٹرکام اُٹھایا اور اپنی وزارت کے سیکریٹری کو ضروری ہدایات دینے لگا۔ ابھی اُس کی بات اپنے سیکریٹری سے بمشکل پوری ہوئی ہوگی کہ کمرے کا دروازہ ایک دم کھلا اور سردار محبوب بخش پھر سے تلملائی حالت میں اندر داخل ہوا مگر جونہی اُس کی نگاہ دانش سعید پر پڑی وہ ٹھٹک کر وہیں رُکا لیکن چند ثانیوں میں چہرے کے تاثرات بدل کر بڑے صاحب کی طرف دیکھا جو خود اُسے اپنے آفس میں دیکھ کر ششدر دکھائی دے رہا تھا۔

دانش سعید نے بھی جونہی سردار محبوب بخش کو دیکھا وہ مسرت سے لبریز جذبات کے ساتھ صوفے سے اُٹھا اور ''کاشف'' کہہ کر اُس کی جانب لپکا لیکن سردار محبوب نے اُسے اِس طرح اجنبی رعونت سے دیکھا کہ وہ اُنہی قدموں ساکت ہو کر رہ گیا کہ اِس سے زیادہ آگے بڑھنا اخلاقی طور پر مناسب ہی نہیں رہا تھا۔ دانش سعید کے چہرے پر تذلیل و ہزیمت کے کئی رنگ آ کر رہ گئے لیکن اُس کے ذہن میں اُمڈا ہوا خلفشار کسی طور بھی اُترنے کا نہیں تھا۔ اس سے بھی کئی گنا زیادہ پیچ و تاب اور ذہنی ابتری کا سامنا بڑے صاحب کو تھا۔ یہ جلکڑن کچھ اِس قدر اچانک تھی کہ اُسے اس سے باہر آنا غضب ہو کے رہ گیا۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ وہ دانش سعید کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کہہ دے کہ جو ایک طرف اُس کی سبکی کا باعث ہو اور دوسری جانب بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ جائے۔ سردار محبوب کی بے وقت آمد سے حیرت زدہ بڑے صاحب کو

''کاشف'' نام کے پس منظر میں بھی بہت سے ایسے مکاشفے دکھائی دینے لگے تھے کہ جو ابھی ظہور پذیر ہونے مقصود تھے۔ سردار محبوب کی اچانک آمد سے پیدا ہونے والی الجھن کو وہ اُن دونوں کے درمیان کسی ممکنہ تعلق یا تعارف سے جوڑ کر اِس صورت حال سے باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔

''دانش صاحب! آپ جانتے ہیں پہلے سے سردار صاحب کو؟''

اِس سے پہلے کہ دانش سعید کچھ بولتا سردار محبوب نے اُسے نخوت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر بڑے صاحب کی طرف مڑ گیا۔

''بڑے صاحب! میں یہاں کسی کو جاننے واننے نہیں آیا، صرف یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ کر کیا رہے ہیں میرے ساتھ؟ لگتا ہے آپ مجھے سنجیدہ نہیں لے رہے...... آپ کا وعدہ پورا نہ ہوا تو سُن لیں! صبح تو میں نے بھی نہیں ہونے دینی، سارا بندوبست کر رکھا ہے مگر میں آپ کے ارادے بھی ایکسپوز کر کے رہوں گا کہ آپ کرنے کیا جا رہے ہیں؟''...... سردار محبوب بخش کا کمرے سے باہر جانے کا انداز اُس کے اندر کی وحشت اور ارادوں کو برہنہ کیے جا رہا تھا۔ دانش سعید نے ٹشو پیپر نکال کر ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ یہ پسینہ غالباً شرمندگی کا تھا۔

''تو یہ ہیں آپ کے فقیر منش سردار محبوب بخش!''

''جی ہاں لیکن لگتا ہے کہ آپ انہیں پہلے سے جانتے ہیں؟'' بڑا صاحب خاصی حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔

''میں تو نہیں جانتا لیکن آپ ضرور جانتے ہوں گے کہ اب آپ کو ہم جیسے دشمنوں کی ضرورت نہیں رہی۔''

دانش کی بات سن کر بڑے صاحب نے خاصا بلند قہقہہ لگایا تو دانش سعید بھی ہنس دیا۔

''پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' دانش سعید کا بلیک ہاؤنڈ گفتگو کو پھر اُسی نکتے پر لانا چاہ رہا تھا۔

''محسوس تو مجھے بھی ایسا ہی ہوا لیکن وہ مغالطہ تھا۔'' اب کے دونوں کے قہقہے پہلے سے بلند مگر کھوکھلے ہو چکے تھے۔

اتنے میں بڑے صاحب کا پرائیویٹ سیکریٹری ایک لفافہ لے کر آیا اور نہایت ادب سے اُس کو پیش کر دیا۔ بڑے صاحب نے لفافہ کھولے بغیر اُسی انداز میں دانش سعید کے حوالے کر دیا۔ دانش سعید نے لیکن لفافہ کھول کر اُس کی تحریر دیکھی اور پھر عجیب سی نگاہوں سے بڑے صاحب کو دیکھا۔ وہ پہلے سے اِسی کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا، لیکن کچھ الگ انداز میں۔

''ٹھیک دو گھنٹے بعد رات دس بجے، سملی ڈیم والے فارم ہاؤس پر...... لیکن آنے کی زحمت آپ خود کریں گے۔''

اب کے جاتے ہوئے ہاتھ ملانے میں پہل دانش سعید نے کی تھی۔

﴾۴۶﴿

دانش سعید سیکریٹریٹ سے باہر نکلا تو عجیب مخمصے میں تھا۔ ایک طرف تو وہ گوندل پر تپا ہوا تھا کہ اُس نے زفیرہ کو پناہ دینے کے سلسلے میں اُسے مکمل تفصیل سے آگاہ کیوں نہیں کیا اور دوسری جانب اِس بات پر حیران تھا کہ کاشف نے اُسے دیکھ کر پہچانا کیوں نہیں۔ گو کہ جیل میں راہیں جدا ہو جانے کے بعد ایک عرصہ ہو چلا مگر اب یہ کیا گورکھ دھندہ ہے کہ وہ امیر قادر بخش کے اکلوتے بیٹے سردار محبوب کی شکل میں اُس کے سامنے تھا۔ کیا یہ وہی کاشف ہے کہ جس کے ساتھ اُس نے ایک عرصہ زندہ رہنے کی جہد میں گزارا؟ اگر یہ وہی ہے تو امیر قادر بخش سے اُس کی کب اور کہاں ملاقات ہوئی اور یہ رشتہ کب اُستوار ہوا کہ وہ اُسے اپنا سب کچھ سونپ کر اس طرح مرا کہ بڑے صاحب جیسا شاطر بھی ہاتھ ملتا رہ گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی کاشف نہ ہو، محض صورتیں ملتی ہوں۔ اُس نے سر جھٹک کر اس اُلجھن سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس سے چھٹکارا پانا اتنا بھی آسان نہ تھا۔

اس کیفیت میں فارم ہاؤس جاتے جاتے اُس نے نہ صرف گوندل کی اچھی خاصی سرزنش کر ڈالی بلکہ وارننگ دے دی کہ اُس کے وہاں پہنچتے پہنچتے وہ زفیرہ احمد کو ذہنی طور پر ماہین اُن کے حوالے کرنے کے لیے تیار کر لے۔ گوندل اگرچہ غیر مشروط معافی کا طلب گار تھا لیکن اُس کا خیال تھا زفیرہ کے معاملات چونکہ اب تک وہی دیکھتا چلا آ رہا تھا لہٰذا وہ اُسے اپنی سطح کا معاملہ سمجھتے ہوئے اپنے باس کو خوامخواہ بے سکون نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد گوندل نے اُسے دوبارہ آگاہ کیا کہ زفیرہ احمد نے لڑکی اُن کے

حوالے کرنے سے انکار کرتے ہوئے فارم ہاؤس سے چلے جانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

دانش سعید کو زفیرہ احمد سے اِس جواب کی قطعی توقع نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بڑے صاحب سے کیے گئے وعدے کا پاس نہ کرنا ایک ایسی کھلی جنگ کو دعوت دینا ہوگا جس کے نتیجے میں دونوں فریقوں کی مکمل سیاسی اور کاروباری تباہی کے علاوہ اُن کے حلیفوں کا دامن بھی جلے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ دانش سعید نے گوندل کو صاف صاف بتا دیا کہ اُس کے وہاں پہنچنے تک صورت حال کو جوں کا توں رکھا جائے۔ جب کہ اپنے طور پر وہ طے کر چکا تھا کہ لڑکی کو بہر صورت بڑے صاحب کے حوالے کیا جائے گا چاہے اس کے لیے طاقت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑے۔

دانش سعید فارم ہاؤس پہنچا تو گوندل پورچ ہی میں اُس کا بے چینی سے منتظر تھا۔ سٹڈی روم میں جاتے جاتے اُس نے دانش سعید کو ایک نئی ڈیولپمنٹ سے بھی آگاہ کر دیا کہ جسے سنتے ہی وہ اور بھی مضطرب ہو گیا۔ زفیرہ احمد کے مطابق آتے ہوئے وہ انصر کی جانب سے اُسے دھمکانے اور ماہین کی زبردستی حوالگی سے متعلق اُس کے آفس کے کیمرہ سے بنائی گئی فوٹیج کا سودا ملک کے سب سے بڑے میڈیا ہاؤس سے اس شرط پر کر کے آئی ہے کہ اگر آج رات نو بجے تک یعنی دس منٹ بعد تک وہ اُس میڈیا ہاؤس کو اپنی خیریت سے مطلع نہیں کرتی تو نہ صرف وہ فوٹیج آن ایئر کر دی جائے بلکہ اُس کی جانب سے دو زندگیاں بچائے جانے کا پیغام بھی نشر کر دیا جائے۔ ایک اچھی خاصی رقم کے عوض زفیرہ احمد نے اُسی میڈیا ہاؤس سے یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا کہ ''نیلاب اغواء'' کے سلسلے میں ہر قسم کی ٹیلی کاسٹ، براڈ کاسٹ اور پرنٹ میڈیا اسٹوریز بریک کرنے کے حقوق صرف اُنہیں حاصل ہوں گے۔

دانش سعید دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ عورت جسے اُس نے کسی بھی قسم کا مفاد حاصل کیے بغیر کروڑوں کی بلائنڈ سرمایہ کاری کے ذریعے بڑے صاحب کی دشمنی مول لے کر دیوالیہ ہونے سے بچایا تھا، آج ہر قسم کے چلتر سے لیس ہو کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اور اُسے وہ کچھ کرنے پر مجبور کر رہی تھی جو اُس نے اب تک کی زندگی میں کبھی کسی عورت کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ وہ اُس بڑی ڈیل میں مزاحم ہونا چاہ رہی تھی کہ جو دانش سعید

کی زندگی بدلنے جا رہی تھی۔ وہ تو درآمدی اسپورٹس گاڑیوں کی محض ایک کھیپ کی آمد سے کروڑوں کے منافع کی امید لگائے ہوئے تھا اور کہاں قسمت اِس طرح مہربان ہوئی کہ تینوں کھیپ منگوانے کی اجازت ایک ساتھ عطا ہو چکی تھی۔ وہ تو اپنے تئیں اُس کے قتل تک کی منصوبہ بندی تک کر چکا تھا مگر اُس حرافہ نے فوٹیج کے ساتھ ساتھ ماہین اور اپنے اغواء کے بعد جان خطرے میں ہونے کی اپیل تک فروخت کر رکھی تھی۔ ''تو کیا کرے؟ چھوڑ دے اربوں روپے کی ڈیل کو؟''

دانش سعید کے ذہن میں ایک دم اُس میڈیا ہاؤس سے ڈیل کرنے کا خیال آیا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ نو بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اگر اُس عورت کا چھوڑا گیا شوشہ درست تھا تو اُس نے دانش سعید کی پوری کی پوری دانش غتربود کر کے رکھ دی تھی۔ کافی دیر سے اپنا سر تھام کر بیٹھا ہوا دانش سعید اپنے مزاج اور اپنے سابقہ رویوں کے قطعی برعکس تحمل اور برداشت کھو بیٹھا اور ایک دم گوندل پر چلایا۔ ''بلاؤ جلدی سے اُس حرامزادی کو فوراً فوراً ایک منٹ میں۔''

گوندل کے لیے یہ سب کچھ حیران کن تھا۔ وہ اُس دباؤ کو سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ جو اچانک سے اُس کے حلیم اور وضعدار باس کے سر پر آن پڑا تھا۔ وہ فوری طور پر زفیرہ کے کمرے کی طرف بھاگا اور اُسے بھی دانش سعید کا پیغام اُسی لہجے میں پہنچا دیا کہ جس میں سنا تھا۔ دو منٹ ہی میں زفیرہ احمد، ماہین اور گوندل دانش سعید کے سامنے موجود تھے۔ اُس نے بلا تامل ایک نگاہ اُن دونوں عورتوں پر ڈالی اور پھر ماہین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا یہی ہے وہ لڑکی؟ اور پھر کسی کا بھی جواب سنے بغیر گوندل پر اُسی طرح شاؤٹ کیا کہ اسے کیوں لائے ہو؟ باہر بھیجو اُسے؟

ماہین نے استفساریہ انداز میں زفیرہ کی طرف دیکھا تو زفیرہ نے اثبات کا اشارہ کرتے ہوئے آنکھیں ایک ساعت کے لیے موند لیں۔ وہ خاموشی سے باہر چلی گئی۔ اُس کے باہر جاتے ہی دانش ایک بار پھر گرجا۔

''ایک منٹ باقی ہے نو بجنے میں ...... کون سے چینل کو فوٹیج بیچی ہے؟''

''چینل گیارہ کو۔'' دانش سعید کے ذہنی خلفشار کے روبرو زفیرہ قطعی پرسکون تھی۔

دانش نے ریموٹ اُٹھا کر تیزی سے گیارہ نمبر فکس کیا جہاں اسکرین پر ڈیجیٹل کلاک نو بجانے کے لیے کاؤنٹ ڈاؤن کیے چلا جا رہا تھا۔ نو بجے کے خبرنامہ میں نیوز ریڈرز نے معمول کی خبروں کا خلاصہ پڑھا اور پھر شارٹ بریک اناؤنس کر دی۔ دانش سعید نے ریموٹ سے ایل ای ڈی کی آواز کم کرتے ہوئے زفیرہ احمد کی طرف دیکھا جس کے چہرے سے بشاشت اِس طرح نچڑی کہ رنگت پیلی پڑ گئی۔

''کیا ہوا؟'' ...... دانش سعید نارمل لہجے کے ساتھ پھر سے حلیم ہو چلا تھا۔

''میں نہیں جانتی کیا ہوا۔'' زفیرہ کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

''جھوٹ بولا اور وہ بھی اپنے محسن سے؟ تم عورتیں کیوں کرتی ہو ایسا؟

اِس سے پہلے کہ زفیرہ احمد کچھ بولتی دانش سعید کے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ بڑے صاحب کا نام دیکھ کر اُس نے زفیرہ اور گوندل کی جانب آنکھ بھر کر دیکھا لیکن محض ایک لمحاتی سوچ کے زیرِ اثر کال اٹینڈ کر لی۔ دوسری جانب بڑا صاحب ہی تھا۔ اُس نے شاید زفیرہ کی موجودگی کے بارے پوچھا اور دانش کی جانب سے جواب ''ہاں'' میں آنے پر اُسے لاؤڈ رکھولنے کو کہا۔ اب اُس کی آواز کمرے میں موجود تمام لوگ سن سکتے تھے۔

''دانش صاحب! یہ عورت حیران تو ہو گی کہ اِس کی جانب سے سب سے بڑے میڈیا ہاؤس کو بیچی گئی فوٹیج نو بجے آن ایئر کیوں نہیں ہوئی؟ اب آپ پوچھیں کیوں نہیں ہوئی جب کہ اِس نے اپنی خیریت کا فون بھی نہیں کیا؟ کیسے ہوتی آن ایئر کہ اِس خود ساختہ عاقلہ فاضلہ نے میرے خلاف فوٹیج میرے میڈیا ہاؤس کو ہی بیچ دی اور وہ جو باقی ہیرا پھیری والا معاہدہ ہے ناں، وہ بھی میرے ساتھ کر لیا۔ اس رنڈی سے پوچھو! کہ اب کون سا چینل، کون سا اخبار یا کون سا سوشل میڈیا اِس کی چیخ و پکار کو کوریج دے گا؟ زور لگا کر دیکھ لے اُس کا بھی کہ جس پر بہت اتراتی ہے ___ میں بڑا صاحب صرف عورتوں کی بھڑوا گیری کر کے نہیں بنا ___ یہ تمام شعبے تمہارے ہمارے معاشرے اور حکومت کے میرے سامنے یوں الف ننگے ہیں ___ جانتے تو آپ بھی ہو اور جانتی تو یہ گشتوڑی بھی ہے کہ ہم بھڑووں سے کیا چیز چھپی ہوتی ہے؟ نیت

سے بد نیتی تک ہر چیز کپڑے اتار کے لیٹی رہتی ہے قدموں میں، بس ریٹ لگانے کا ہنر آنا چاہیئے ___ آپ بھی اِس کا ریٹ لو! نہیں مانتی سالی تو قیمہ کر کے کتوں کو کھلا دو، اِس لیے کہ کتوں پر ایف آئی آر نہیں کٹتی اور اچھا بھلا فرعون ٹٹی بن کر نالی میں بہہ جاتا ہے۔ اور یہ بات کوئی اور نہیں کہہ رہا، انٹریئر منسٹر کہہ رہا ہے۔''

بڑا صاحب فون بند کر چکا تھا مگر اُس کا فون بند ہونے سے پہلے زفیرہ احمد کا زرد ہوا چہرہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ دانش سعید نے فون بند کر کے میز پر رکھا اور بے اختیار مسکرا دیا۔ اُس کی نگاہیں زفیرہ احمد پر مرکوز ہوتے ہوئے بھی اُس کے تاثرات کا طواف کر رہی تھیں۔

''کیا چاہیں گی اب آپ میڈم زفیرہ احمد؟ میرے سامنے اِس صوفے پر تشریف رکھتے ہوئے مجھے مہمان نوازی کا موقع دیں گی یا اب بھی کچھ اور ارادے ہیں؟'' تمام تر تہذیب مجسم ہو کر پھر سے دانش سعید کی شخصیت کا جزو بن چکی تھی۔

''زفیرہ اُس کے سامنے رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اگر میں پہلے آپ سے یوں آمنے سامنے مل چکا ہوتا تو یقین کریں وہ غلطی کبھی نہ کرتا جو تین چار مہینے پہلے کی۔'' دانش کی بات کا زفیرہ نے کوئی نوٹس نہیں لیا، بس پسینہ خشک ہونے لگا تھا۔

''ایک بات کہوں! عمل تو آپ نے پھر بھی نہیں کرنا لیکن کہے دیتا ہوں کہ اپنے کسی بھی محسن کو پھر کبھی اپنے کیے پر پچھتانے کا موقع نہ دینا۔''

''دانش صاحب! چھوڑیں ان باتوں کو، یہ مجھے بھی بہت آتی ہیں اور آپ بھی یقین کریں اگر میں نے آپ کو پہلے سے دیکھا ہوا ہوتا تو سڑک پر آ جانا قبول کر لیتی کبھی آپ کا احسان نہ لیتی۔ کیا کہوں کہ میں نے تو آپ کو آپ کے اس گوندل میں دیکھا تھا۔''

اب کے رنگت اُڑنے کی باری دانش سعید اور گوندل کی تھی۔

''لگائیے میری بولی! کیا لگاتے ہیں؟''

''جو کچھ آپ کو دے چکا، آپ کا ہوا۔'' دانش سعید ابھی تک زفیرہ احمد کے دیے گئے جھٹکے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اور......؟''

''اور پانچ کروڑ روپے کی میڈیا کمپین امپورٹڈ اسپورٹس گاڑیوں کی۔''

''اور......؟''

''اور کیا......؟''

''میڈیا کمپین پانچ کی نہیں پچیس کروڑ کی!!''

دانش سعید نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر او کے کے انداز میں دائیں ہاتھ کا انگوٹھا کھڑا کر دیا۔

''اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ آپ وعدہ نبھاتے ہو لیکن پھر بھی تمام دستاویزی کام ایک ہفتے میں مکمل ہو جانا چاہیئے۔'' دانش سعید نے گوندل کی جانب دیکھنے کے بعد مزید یقین دہانی کے لیے گردن اثبات میں ہلا دی۔ اب کے زفیرہ احمد نے اُٹھ کر اپنا دایاں ہاتھ دانش سعید کی جانب بڑھا دیا۔ دانش بھی مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

زفیرہ احمد کے کہنے پر گوندل جب ماہین کو دوبارہ کمرے میں لے کر آیا تو وہ بہت حد تک اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔ ماہین نے کمرے میں آتے ہی کسی کی جانب نہیں دیکھا سوائے زفیرہ احمد کے۔ زفیرہ سے اُسے دیکھنا ممکن نہ ہوا تو نگاہیں جھکا لیں۔ ماہین نے ہلکی سی سرد آہ بھری اور چہرہ گوندل کی جانب پھیر لیا۔

''کون کس وقت آ رہا ہے مجھے لینے کے لیے؟''

دانش سعید نے حیران ہو کر پہلے ماہین اور پھر زفیرہ احمد کی جانب دیکھا۔

''آپ نے اسے پہلے سے بتایا ہوا تھا؟'' دانش کا استفسار زفیرہ سے تھا۔

''نہیں میں نے کچھ نہیں بتایا......ہم سب میں ایک وہی تو سمجھدار ہے جسے معلوم تھا کہ کس کس نے، کس وقت کیا کرنا ہے اور اُس کے ساتھ کیا ہونا ہے؟''

۞

۴۷

بڑا صاحب ماہین کو اپنے ساتھ لے کر سردار محبوب کے بنگلے پر پہنچا تو رات کے پونے بارہ ہو چکے تھے۔ یہ تین گاڑیوں کا چھوٹا سا قافلہ تھا جس میں پہلی دونوں گاڑیاں اُس کے پرائیویٹ گارڈز کی جب کہ تیسری گاڑی میں ماہین تھی جسے بڑا صاحب خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستے میں بڑے صاحب کے فون پر سردار محبوب کی ٹیلی فون کالز کی بھر مار بتا رہی تھی کہ اُسے کس شدت کا غصہ ہے اور وہ کس قدر اضطراب میں ہے۔ بڑے صاحب نے راستے میں اُسے کئی بار بتایا کہ سب کچھ پلان کے مطابق ہو چکا ہے اور وہ خود ماہین کو لے کر وہاں پہنچنے ہی والا ہے مگر اِس کے باوجود سردار محبوب کے بار بار آنے والے فون صاف ظاہر کر رہے تھے کہ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کئی بار تو بڑا صاحب اُس کے احمقانہ پن پر ہنس دیا کہ جب وہ اُن کی لوکیشن معلوم کر کے کہتا وہ وہیں ٹھہریں، وہ خود انہیں لینے کے واسطے آ رہا ہے۔

سردار محبوب بخش کی اُتاول سے کہانی کچھ اور لگنا شروع ہو چکی تھی۔ یہ نفرت یا غصے کی شدت کی بجائے محبت کی شدت محسوس ہو رہی تھی اُس چوٹ کھائے عاشق کی طرح کہ جسے محبوبہ کی بے اعتنائی اور کبھی کبھی بے وفائی بھی اُس کے اتنا قریب کر دیتی ہے کہ جہاں ہر جذبہ اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہوتا ہے۔ یہ غصہ اُس نہج پر پہنچ کر نفرت کا نہیں بلکہ دوریوں کو قربتوں میں بدلنے کا جنون بن کر رہ جاتا ہے۔ اکثر اوقات اپنے محبوب کو ایذا دینے میں جس قدر محبت پنہاں ہوتی ہے اُتنی تو اُسے چھونے، لپٹانے یا چومنے میں بھی نہیں پائی جاتی۔ بڑا صاحب سردار محبوب کی فون کالز سے جتنا اُکتایا ہوا تھا، ماہین اُتنی ہی اُس کی اِس کیفیت سے لطف

اندوز ہو رہی تھی۔ اُس کے بدن میں عجیب سی مستی جاگنے لگی تھی کہ جیسے اُس کے مسام مسام میں سرایت کرتی آواز کی لہریں موبائل فون کی رنگ ٹون کی بجائے کسی سپیرے کی بجائی ہوئی بین سے نکل رہی ہوں۔ نجانے کیوں اُس کے ذہن میں سردار محبوب بخش نام کا کوئی ہیولہ ابھی تک نہ بن پایا تھا۔ وہاں اگر کوئی تھا تو وہ نیئر جمیل۔ ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ اُس کی خواہش فراواں ہوتی چلی جا رہی تھی کہ نیئر جمیل کچھ اور تڑپے، پیچ و تاب کھائے، اُلجھے، مضطرب ہو، اذیت جھیلے، اپنے آپ کو مارنے کے عذاب سے گزرے اور اُس کے عشق میں فنا در فنا ہوتا چلا جائے کہ اِس سے بڑھ کر معشوق کے لیے وجہِ سکوں کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اُسے اِن لمحات کی طوالت چاہیئے تھی نہ کہ ہر فون کال پر کم ہوتے ہوئے فاصلے کی نوید۔ لیکن ماہین کی تمام تر خواہش کے باوجود یہ فاصلہ ختم ہو کر رہ گیا۔

وہ بنگلے کے مین لاؤنج کے درمیان میں کھڑا غصے کی شدت سے اپنے آپ کے لیے ایک عذاب دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شراب کی بوتل اپنے آخری لبوں پر تھی اور اُس کے گلے سے نکلنے والی خرخراہٹ اُسے اُسی طرح کسی درندے اور انسان کے اجسام میں گڈمڈ کرتی چلی جا رہی تھی کہ جیسے ماہین کے لیے اُس کا کبھی نیئر جمیل اور کبھی سردار محبوب بخش ہونا۔

ماہین بڑے صاحب سے ایک جانب مگر دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ سردار محبوب کی نگاہیں اُس پر پہلے سے ہی گڑی گڑی دِکھنا شروع ہو چکی تھیں۔ بڑے صاحب نے اُسے مسکرا کر دیکھا کہ جیسے کہہ رہا ہو کہ میرے سردار! دیکھو میں نے آج کی تاریخ میں اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ مگر ماہین کے دکھائی دیتے ہی سردار محبوب کے لیے وہاں موجود باقی ہر ایک وجود، عدم میں جا چکا تھا۔ کوئی میں اور تو کی منزل تھی یا ہستی سے نیستی اور نیستی سے ہستی کے درمیان معلق سفر کہ جہاں رہگذر سمیت ہر ایک شے کہر زدہ، ہر ایک موجود کا نشاں دھند میں ملفوف۔

اپنی جانب سردار محبوب کو متوجہ نہ پا کر بڑا صاحب تو وہیں ٹھہر گیا لیکن ماہین اُسی انداز میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اُس سے آگے نکل آئی کہ اُن دونوں کی نگاہیں اِس طرح آپس میں پیوست چلی آتی تھیں کہ جیسے کوئی ایک بھی ہلا تو دوسرا اپنا توازن کھو کرتنی ہوئی رسی سے گر جائے

گا۔ایسے میں ماہین سے دو چار قدم پیچھے کھڑے ہوئے بڑے صاحب کی نگاہ اچانک اُس کے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں پر پڑی کہ جن سے وہ بمشکل ریوالور سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

عین اُسی وقت سردار محبوب بخش کی نگاہ بھی ماہین کے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ریوالور پر پڑی کہ جس کی نالی کا رخ اگرچہ اُسی کی طرف تھا مگر اپنے آپ کو قدرے سنبھال لینے کے باوجود بھی اُس کے ہاتھ اچھے خاصے کپکپا رہے تھے۔سردار محبوب کو ایک دم جھرجھری سی آئی، اُس کی آنکھیں ماہین کے چہرے سے ہٹ کر ماہین کے ہاتھوں پر مرتکز ہو گئیں۔ایک لمحے سے بھی کم عرصے میں سردار محبوب بخش ماہین کے اوپر جست لگا کر اُسے قابو کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔جست لگانے سے قبل اُس کا اکہرا جسم کسی چیتے کی مانند دوہرا ہوا مگر عین اُسی لمحے دل کے اوپر ہونے والے سیدھے فائر کے سبب وہیں گر گیا۔ماہین نے گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا ۔بڑے صاحب کے ہاتھ میں موجود ریوالور کی دھواں اگلتی نال کا رخ اب فرش کی طرف ہو چکا تھا۔فرش پر گرے ہوئے سردار محبوب بخش کی پتھراتی ہوئی آنکھیں اُسی غیر یقینی کے انداز میں بڑے صاحب کی جانب مرکوز ہو چکی تھیں کہ جیسے آج صبح اُسے اُس کے وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔لیکن بڑے صاحب کی توجہ اب ماہین کی طرف تھی۔

''لڑکی کیا ہو تم! ریوالور میں گولی نہیں اور ہتھیلی میں قتل کی لکیر نہیں پھر بھی دو دو قتل پھڑکائے پھرتی ہو۔''

ماہین نے بڑے صاحب کے سوال کا جواب دینے کی بجائے جلدی سے ریوالور کا چیمبر کھولا مگر اُس میں ایک گولی بھی نہیں تھی۔ابھی وہ حیران آنکھوں اور ماؤف ذہن کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ ہی رہی تھی کہ بڑے صاحب نے اپنے ریوالور کا چیمبر کھولا، پانچوں گولیاں باہر نکالیں اور پہلے والا ریوالور ماہین کے ہاتھ سے لے کر اَب اپنے والا اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔بڑے صاحب کی گیم کی تمام گوٹیاں سیدھی ہو چلی تھیں۔

''بول ری لڑکی! اَب کون سی خبر میڈیا پہ آنی چاہئے؟

''کیا مطلب......؟''ماہین اب پوری طرح اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔

''مطلب یہ کہ زندگی ایک بار پھر تمہیں ففٹی پرسنٹ لی آپشن [illegible]

''وہ کیسے......؟''

''ایک ہی خبر میڈیا پر دو طرح سے آسکتی ہے___اور آپشن تمہارے پاس [illegible]

ماہین نے استفساریہ انداز میں بڑے صاحب کی طرف دیکھا۔

پہلی یہ کہ سپر ماڈل گرل نیلاب نے نامعلوم حالات میں شیدا گی گروپ آف [illegible] کے مالک اور بزنس ٹائیکون سردار محبوب بخش کو قتل کر کے خودکشی کر لی۔''

''اور دوسری......؟''

''دوسری یہ کہ نیلاب نے قتل کے بعد آلہ قتل سمیت خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔''

''دوسری آپشن! یعنی نیلاب نے آلہ قتل سمیت خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔''

ماہین کی آنکھوں میں در آنے والی چمک اور بڑے صاحب کے ہونٹوں پر لہر لہر پھیلتی مسکراہٹ میں اگرچہ کوئی تال میل نہیں تھا مگر پھر بھی کچھ تھا جو ایک جیسا تھا۔

۞

[illegible] ٹاؤن
[illegible] اتھارٹی [illegible]
[illegible] آباد
۱۸ اپریل ۲۰۲۰ء

خود ماہین نے بھی اتنے کم دنوں میں اتنے زیادہ ٹھکانے اور اتنے زیادہ مرد بدلے کہ اُسے عورت کے مزاج میں دخیل پردیسی پن اور عدم تحفظ کی وجوہات سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ ہرنئی جگہ اور ہرنئے مرد سے بہت کم وقت میں جرٔت کا وصف عورت کو شاید اِسی پردیسی پن اور عدم تحفظ کے ردِ عمل میں عطا ہوا ہوگا کہ جو مردوں کے نزدیک بے وفائی سے عبارت ہے۔ ذیشان بھی اگرچہ تمام راستہ خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا تھا مگر ماہین کو گاڑی سے نیچے اُتارنے کے بعد واپس آواز دے کر سمجھانا نہیں بھولا تھا کہ اگر زندہ رہنا چاہتی ہے تو پولیس سے بچ کر رہے ورنہ اُس کے خلاف درج ہو چکے کیس کا نتیجہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بس وہی ایک لمحہ تھا کہ جب ذیشان کے چہرے کی سفاکیت ذرا سی ماند پڑی لیکن نجانے کیوں ماہین کو اُس کا یہ رُوپ اچھا نہ لگا۔ وہ اُس کے ہاتھوں پولیس مقابلے میں اُس کی اکاؤنویں مقتول ہونے کو تو تیار تھی مگر اُس کے چہرے کی سفاکیت کے ماند پڑنے پر کسی صورت بھی راضی نہیں تھی۔ وہ پہلی نظر ہی میں جان چکی تھی کہ اِسی سفاکیت اور اِسی کڑک دھڑک کے نتیجے میں تو ذیشان کی ستواں ناک برچھی بن کر عورتوں کے دل میں اُتر جایا کرتی تھی۔

Book Corner
Jhelum (Pakistan)
bookcornershowroom
bookcornerjhelum
bookcorner
0314-4440882